فکر و نظر
فارسی ادب نمبر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

فکر و نظر

فارسی ادب نمبر

جولائی ۲۰۱۱ء

مدیر

پروفیسر آزرمی دخت صفوی

ا شبلی روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

قیمت:

فی شمارہ: ۳۰/روپے

سالانہ: ۹۰/روپے

برائے طلبائے اے ایم یو

سالانہ ۳۵/روپے

بیرون ملک: سالانہ ۱۵/امریکی ڈالر

اس شمارہ کی قیمت:

☐ سرخ نشان خریداری زرِ سالانہ ختم ہونے کی علامت ہے

ٹیلی فون: 1542/1229 Ext. 700917

email: fikronazaramu@yahoo.in

تزئین: ساجد علی خان

طباعت: اے ایم یو پریس، علی گڑھ

ترتیب

قند مکرر

اداریہ

فکر و نظر نے اپنے نصف قرن سے زیادہ کے سفر میں ہندوستان کی تہذیب و معاشرت، زبان اور ادب کے مختلف جہات کی طرف توجہ دی ہے۔ اس ضمن میں کئی شمارے اہم شخصیات، ادبی اور تہذیبی تحریکات وغیرہ پر شائع ہو چکے ہیں۔ 'عربی ادب نمبر' بھی ان مخصوص شماروں میں شامل ہے۔ اس مفید روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے زیر نظر شمارہ فارسی ادب کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔

فارسی زبان کا ہندوستان کے تمدن و تاریخ، اردو زبان اور ملک کی دیگر مقامی زبانوں سے قدیم، گہرا، متنوع اور پائیدار رشتہ رہا ہے۔ نہ صرف ہندوستان میں تخلیق ہونے والے فارسی ادب سے ہم آشنا ہیں بلکہ سعدی، حافظ اور رومی کے نام ہماری تہذیب اور علمی وراثت کا اہم جزو ہیں اور فارسی زبان ہمارے کلچر کی امین۔ امید ہے کہ موجودہ شمارہ ہندوستان میں فارسی کی اہم حیثیت پر روشنی ڈالنے کا حق کچھ حد تک ضرور ادا کرے گا۔ یقیناً فارسی ادب کے بے شمار گوشے ابھی لائق توجہ ہیں جن کا احاطہ موجودہ شمارہ میں نہیں کیا جا سکتا۔ یوں کہیے کہ یہ فارسی ادب نمبر تو محض ایک یاد دہانی ہے ہماری توجہ اس اہم اور اچھوتے موضوع کی طرف مبذول کروانے کی جس کے سیر حاصل استیعاب، تحقیق اور بیان کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست۔

شمارہ حاضر کی ابتدا تذکرۂ گذشتہ سے کی جا رہی ہے۔ فارسی کے تین نامور اساتذہ اور محققین کے مقالے اس عنوان کے تحت شامل ہیں جو فارسی کے سر کا تاج ہیں۔ مرحوم پروفیسر نذیر احمد صاحب مرحوم، مرحوم و محترم پروفیسر امیر حسن عابدی صاحب اور جناب پروفیسر شعیب اعظمی صاحب کہ خدا ان کو عمر نوح عطا کرے۔ ان بزرگوں کے ارشادات کی شمولیت کے بغیر فارسی نمبر نامکمل تھا۔ شعیب اعظمی صاحب علالت کے باعث اس وقت تازہ مقالہ لکھنے سے معذور تھے لہٰذا ان کا بھی وہ مقالہ شامل کیا جا رہا ہے جو فکر و نظر میں قبلاً شائع ہو چکا ہے۔

ادارہ فکر و نظر ممنون ہے تمام مقالہ نگار حضرات کا جن کے عالمانہ مقالات اس شمارہ میں شامل ہیں۔ شمارہ کی اشاعت کے سلسلے میں سرپرست فکر و نظر جناب پی۔ کے۔ عبدالعزیز صاحب، وائس چانسلر، مسلم یونیورسٹی اور ممبران مجلس ادارت کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے۔ ان کی رہنمائی کے بغیر اس شمارہ کی اشاعت ممکن نہ تھی۔ دوستان عزیز جناب پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب اور پروفیسر قاضی افضال حسین صاحب، ڈین فیکلٹی آف آرٹس کی خصوصی طور سے ممنون ہوں کہ انھوں نے ہمیشہ اپنے تعاون اور قیمتی مشوروں سے نوازا ہے۔

ادارہ فکر و نظر کے رفقا محمد بکر عالم صدیقی اور ساجد علی خاں صاحب کی ہمکاری اور شاکر علی کی محنت کے بغیر اس شمارہ کی اشاعت ممکن نہ تھی۔ میں متشکر ہوں اپنے ان تمام ساتھیوں کی۔

مدیر

پیشگفتار

ہندوستان میں فارسی زبان و ادب نے تقریباً ایک ہزار سال تک اپنا سکہ جمائے رکھا۔ بادشاہوں کے درباروں سے لے کر صوفیا کی خانقاہوں تک یہ شیریں زبان اس ملک میں ایسی سرائیت ہوئی کہ تمام سرزمین ہند کو اپنی آماجگاہ بنا لیا۔ ہم جانتے ہیں کہ ہند-ایرانی تہذیب صدیوں سے ایک دوسرے سے متاثر ہوتی رہی ہے۔ شاید یہ دونوں اقوام ہم ریشہ اور ہم نژاد بھی ہوں۔ ہخامنشی خاندان نے جب ایران میں پہلی سلطنت قائم کی تو اس کے اثرات کشور ہندوستان سے مزید نزدیکی روابط کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ موریہ شاہنشاہوں کے چوبی محلات پر ہخامنشی طرز تعمیر کی جھلک محسوس کی گئی ہے۔ ادب میں جو داد و ستد نوشیرواں کے وزیر برزویہ نے سنسکرت کہانیوں کے مجموعہ پنج تنترا کو ایران لے جا کر شروع کی تھی وہ ایک طویل، معنی خیز اور اہم سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ سنسکرت اور فارسی زبانیں یوں بھی السنہ کے ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ ان کے مزاج کی ہم آہنگی کوئی دور از فہم اور عجیب بات نہیں تھی۔ البتہ اس بنیادی قربت نے آگے بڑھ کر اور صدیوں کے سفر کے دوران طرح طرح کے شگوفے کھلائے۔

فارسی زبان مغل دربار اور جنوبی ہند میں خودمختار ریاستوں کی سرکاری زبان بن گئی۔ تمام فرامین جو دہلی اور آگرہ سے صوبائی حکومتوں- گجرات، بنگال، دکن، کشمیر کو جاری کئے جاتے تھے فارسی زبان میں تھے۔ فارسی زبان میں لکھی گئی بے شمار کتابیں، خطی نسخے، اخبارات، فرامین و اسناد اور پروانے جو مختلف میوزیم اور آرکائیوز میں محفوظ ہیں اس امر کے شاہد ہیں کہ فارسی زبان ہندوستان کی سیاسی اور اجتماعی زندگی کا جز و لاینفک تھی۔

عہد وسطیٰ کی ہزار سالہ تاریخ میں ہزاروں شعرا، نویسندوں اور ہندوستان کی عوام نے اس سے استفادہ کیا اور کتابیں، شعری تخلیقات اور اہم تالیفات وجود میں آئیں جو واقعاً جاویدانی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ بھی ایران و ہند کے دیرینہ روابط کی شاہد ہیں اور ان دونوں ملکوں کی ایک ایسے سکۂ زریں کی طرح نمائندگی کرتی ہیں جس کا ایک رخ سعدی، حافظ اور مولانا جیسی عظیم شخصیات کو جلوہ گر کرتا ہے تو دوسرا پہلو خسرو، بیدل، عرفی، غالب اور اقبال کو۔ ہندوستان میں فارسی زبان و ادب ایسا ریشہ گیر ہوا تھا کہ لاہور کو

'غزنین خورد' اور 'اصفہان ثانی' کا نام دیا گیا۔ مشہور مورخ فخر مدبر تاریخ مبارک شاہی میں لکھتا ہے:

''لاہور مرکز زبان فارسی و ثانی دارالملک غزنین است''

اصطخری نے المسالک والممالک میں لکھا ہے:

''در قرن چہارم زبان مولتان زبان فارسی بودہ''

مغل دور میں فارسی زبان و ادب نے ہندوستان میں ایسا رواج پایا کہ بہار لکھتے ہیں:

''دہلی در بار بہ رنگ فارسی شدہ بود کہ پایۂ آن را در بار ثانی ایران نامید''

اگر ہم عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ، فرہنگ و سیاست، مقامی زبانوں کے تکامل، تصوف اور عرفان کے فکری گسترش، اقتصادی حالات کے متعلق اطلاعات حاصل کرنا چاہیں تو فارسی زبان سے آشنائی اور فارسی مآخذ اور متون کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ہندوستان کی تاریخ سے آشنائی پیدا کرنے کے لیے برنی کی تاریخ فیروز شاہی، منہاج سراج کی طبقات ناصری، بدایونی کی منتخب التواریخ اور دیگر کتب تاریخ مثلاً طبقات اکبری، تاریخ فرشتہ، شاہجہاں نامہ، بادشاہ نامہ، سیر المتاخرین سے زیادہ معتبر ماخذ کیا ہمارے پاس ہیں؟ ابوالفضل کی آئین اکبری شہنشاہ اکبر اور اس کے آئین حکومت کے متعلق فوق العادہ اطلاعات کی حامل ہے۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں، تجارت، علوم و فنون، آداب و سنن، شہروں اور صوبوں کی درآمد، طرز داد گستری وغیرہ پر سودمند اطلاعات اس میں موجود ہیں۔ برصغیر میں لکھی جانے والی فارسی کی اولین تاریخ تاج المآثر جو قطب الدین ایبک کے حکم سے لکھی گئی ایک بہت ہی اہم ماخذ کے طور پر شمار کی جاتی ہے۔ چچ نامہ یا تاریخ سندھ بھی ہندوستان کے ایک معروف علاقے کے بارے میں سودمند اطلاعات کی حامل ہے۔ ہمایوں نامہ، تاریخ شیر شاہی، تاریخ ہمایوں، تذکرۃ الواقعات، طبقات اکبری، تاریخ گجرات اور بالا مبالغہ فارسی تاریخ کی سیکڑوں کتابیں ہندوستان کی فکری، فرہنگی، اجتماعی اور سیاسی احوال کی توضیح و تشریح کرتی ہیں۔ عہد وسطیٰ کی تاریخ کی تحقیق کا دار و مدار ان ہی ماخذ پر ہے۔ تمام دنیا کے مورخین اور مستشرقین ہندوستان کی تاریخ سے آشنائی پیدا کرنے کے لیے ان فارسی ماخذ یا ان کے تراجم سے استفادہ کرنے پر مجبور ہیں۔ ہندوؤں کی بہت سی مذہبی کتابیں بھی فارسی زبان میں ترجمہ ہوئیں جو ان کے دینی عقائد اور ان کے آداب و رسوم کے متعلق اطلاعات فراہم کرتی ہیں۔ جیسے رامائن کا ترجمہ، مہابھارت، اتھرون، جوگ وسشٹھ، مہا وشنو پران وغیرہ کے ترجمے۔ اپنشد جو کہ ہندوؤں کی ایک قدیم ترین اور اہم کتاب ہے اس کا خود دارا شکوہ نے فارسی میں ترجمہ کیا۔ سنسکرت کی ادبی کتابیں بھی فارسی زبان میں منتقل ہوئیں جیسے کتھا سرت ساگر، سنگھاسن بتیسی اور کلیلہ و دمنہ وغیرہ۔

فارسی زبان کے ہزاروں شعرا، ادبا، جو ہندوستان آئے انھوں نے اپنے اپنے انداز میں

ہندوستان کو خراج عقیدت پیش کیا۔ یہ تمام آثار ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ کو جاننے کے لیے بیش قیمت ماخذ ہیں۔ عبدالنبی فخر الزمانی ہندوستان کو دارالامن کہتا ہے اور لکھتا ہے:

"این ملک میان عالمیان اشتہار سرشاری دارد کہ ہر کس یک نوبت سیر ہندوستان نمود وقتیکہ بہ ایران رفت ـــــ در آرزوی این خاک مرادی میرد۔"

اس سے آگے عبدالنبی جو لکھتا ہے وہ اور بھی اہم ہے:

"ـــــ یکی از خوبی ہای ہندوستان آنکہ ہر کس در ہر محل بہ ہر طریق کہ زیست کند ہیچکس را قدرت آن نیست کہ نہی آن امر نماید ـــــ"

عارف ایگی لکھتا ہے:

"وقتیکہ ہندوستان رسیدم، ملکی دیدم بغایت آبادان و معمور، و از برای آسائش و رفاہیت بی نہایت مطبوع، با خود قرار دادم کہ تمام عمر اینجا صرف نمایم۔"

خالص استرآبادی ہندوستان کی ایک اہم خوبی کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

ز خوبی ہای ہند این خویش بس
کہ ہرگز نیست کس را کار با کس

کلیم کاشانی:

ز ہند دیدۂ بد دور عشرتستان ست
دل شگفتہ و طبع کشادہ ارزانست

ہفت اقلیم کے مولف کے مطابق:

"چندان خوبی کہ دران دیار (ہند) است در ہیچ مملکتی نیست ـــــ مسافر حاجت زاد سفر ندارد، در ہر منزل ہر چیز یافت میشود ـــــ از دو جزء خوش، نہ نصیب ہندوستان شدہ یک جزء و ہمہ جہان رسیدہ۔"

لکھتا ہے کہ:

"در ایام توقف آن آستانہ ہر روز از یسار و یمین از تجار و مترددین وصف دارالامان ہندوستان بسیار شنیدم"

ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کے نفوذ کی سب سے اہم مثال خود زبان اردو ہے۔ اردو کی غزل کی فضا کا ملا فارسی غزل کی محیط اور فضا ہے۔

سعدی اور حافظ کی شیریں زبان اور ہندوستان کی فکر اور مخصوص اصطلاحوں کے امتزاج نے

سبک ہندی کی بنا ڈالی اور اس طرح فارسی ادب کا ایک خاص طرز ہندوستان میں وجود میں آیا۔ باریک بینی اور لطافت معنی کی رقت جو سبک ہندی میں ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے یقینی طور پر ایرانی فکر اور ہندوستانی فلسفہ کی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ جیسا کہ شبلی نے شعر العجم میں لکھا ہے "فارسی شاعری نے ہندوستان آنے کے بعد ایک خاص لطافت حاصل کی کہ وہ لطافت اسے ایران میں بھی حاصل نہ تھی۔"

ایران سے ہندوستان آنے والے افراد نے نہ صرف یہاں کے مقامی لوگوں پر اثر ڈالا بلکہ خود بھی مقامی اثر قبول کیا۔ مسعود سعد سلمان، ابوالفرج رونی، فرخی، سنائی وغیرہ نے اپنے کلام میں ہندی الفاظ کا استعمال کیا ہے جو یقیناً اسی باہمی ربط کا نتیجہ ہے۔ سنائی لکھتا ہے:

نے در آں معدہ خوردہ میوہ   نے در آں دیدہ قطرہ پانی

محمد عوفی اپنے تذکرہ لباب الالباب میں مسعود سعد سلمان کے متعلق لکھتا ہے:

"اورا سہ دیوان است، یکی بتازی، یکی بپارسی، و یکی بہندی"

امیر خسرو نے بھی غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھا ہے:

"مسعود سعد را سہ دیوان است در عبارت عربی و فارسی و ہندی"

یہ قول درست ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی لیکن مسعود سعد سلمان کے دیوان کا غائر مطالعہ واضح طور پر مسعود کی شاعری پر ہندوستانی اثرات کی گواہی دیتے ہیں۔ مسعود سعد نے بھی اپنے کلام میں ہندی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

چو رعد [illegible] محمودی   برآمد از پس دیوار حصن مارا مار

'بارہ ماسہ' اور 'اٹھوارہ' ہندی شاعری کے قالب تھے اور فارسی میں اس کا وجود نہیں تھا۔ مسعود سعد نے اسے فارسی زبان میں رائج کیا اور انہیں 'دوازدہ ماہہ' اور 'اسبوعہ' کا نام دیا۔ اس نے سنسکرت زبان کے بکٹ کہانی کے شعری قالب کو بھی اپنایا اور اسے 'شہر آشوب' کا نام دیا۔

محمود غزنوی کے عہد میں ہندوستان کے مقامی زبانوں کے ترجمان کو بھی دربار میں جگہ ملی۔ ان میں تلک ہندی اور بیجا پر کا نام قابل ذکر ہے۔

ہندی یا ہندوی زبان کو مشہور صوفی شیخ فرید الدین مسعود، شیخ نظام الدین اولیا، امیر خسرو وغیرہ کی سرپرستی حاصل رہی۔ شیخ بوعلی قلندر پانی پتی کے دوہے جو شیخ نظام الدین اولیا کے ساتھ ان کے مشاعرات کا حصہ ہوا کرتے تھے مشہور ہیں مثلاً:

سجن سکارے جائیں گے نین مریں گے روئے   بدھنا ایسی رین کر بھور کدھی نہ ہوئے

خسروی عصر میں ہندی یا ہندوی اتنی ہی معزز اور مقتدر تھی جتنی کہ فارسی۔ وہ اسے دنیا کی دیگر

زبانوں سے بہتر سمجھتے تھے:

غلط کردم گر از دانش زنی دم — نہ لفظ ہندیست از فارسی کم

ہندوستانی اور ایرانی اقوام فطری طور پر جذباتی اور اثر پذیر واقع ہوئی ہیں اور ان دونوں ممالک کے لوگ عمدہ افکار اور قدیم تہذیب و تمدن کی حامل تھے۔ جب ہندوستان ان دونوں اقوام کا مرکز اتصال قرار پایا تو دونوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا۔ وہ ارتباط جو ابتدا میں صرف ایک سیاسی حادثہ تھا رفتہ رفتہ اس نے ایک عظیم تہذیب و تمدن کی شکل اختیار کر لی۔ اس تہذیبی آمیزش کے نتیجہ میں بھگتی اور صوفی افکار کی آمیزش ہوئی اور اس نے ہزاروں صوفی سنتوں کو محبت و اخوت اور انسان دوستی کے درس دینے کی طرف مائل کیا۔ شمال سے لے کر جنوب اور مشرق سے مغرب تک انھوں نے بلا تفریق مذہب و ملت اخوت و محبت کی تعلیم عام کیا۔ ان میں مومن عارف، امام تاج فقیہ، پیر شہاب الدین جگجوت، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، شیخ اخی سراج، سید اشرف جہانگیر سمنانی، خواجہ معین الدین چشتی، نظام الدین اولیا وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔

یہاں ہم خاص طور پر سوامی بھوپت رائے کا ذکر کریں گے جنھیں عام طور پر بیغم بیراگی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کی صوفیانہ شاعری کو بھگتی اور ایرانی تصوف کا بہترین سنگم کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً

درفضای عشق جانان بوالہوس را کار نیست — ہر سری شایستۂ سنگ و سزای دار نیست

بیغم بیراگی نے اپنی مثنوی کو مولانا روم کی مثنوی سے متاثر ہو کر لکھا۔ اس کا پہلا شعر اس طرح ہے:

دل طپیدہا حکایت می کند — چشم خونباران روایت می کند

یہاں تک کہ ہندوستان کے مقامی زبان کے شعرا بھی صوفیانہ افکار سے متاثر ہوئے۔ بنیادی طور پر یہ ہند-ایرانی عناصر کے امتزاج کا نتیجہ تھا اور فارسی زبان اور اصطلاحات ان شعرا کے کلام کا جزو غالب۔ پنجابی شاعر سید شاہ مراد لکھتے ہیں:

اوہ قد پیا کا قامت ہے اے شعلہ نور کرامت ہے — اوہ قد نہیں ہے قیامت ہے اوہ دھوم پڑی ہے شور ہویا
ترے مکھڑے پر اک خال پیا جس دیکھا گھر پامال پیا — اک نکتہ ہے بسم اللہ کا جو مصحف پر مسطور ہویا

بنگال میں ست نارائن ست پیر ہو گئے۔ منت پوران کی قدیم کتھاؤں میں فارسی اصطلاحات کی کثرت ہے۔ بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تصنیفات اور شعری تخلیقات کا آغاز حمد اور نعت سے کیا ہے۔

ہندوستانی شعرا کی شعری تخلیقات جس کی بنیاد ہندوستانی لوک گیت (Folklore) پر ہے جیسے سسی پنوں اور ہیر رانجھا ان پر بھی فارسی سبک اور افکار کی گہری چھاپ نظر آتی ہے اور خصوصاً مثنوی کی صنف میں۔ ان میں سے بعض کو فارسی نظم کا جامہ بھی پہنایا گیا اور یہ افسانہ دل پذیر، ارژنگ عشق، دستور

عشق وغیرہ کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ پنجاب کی مشہور کہانی ہیر رانجھا وارث علی شاہ کی منظوم کردہ مثنوی میں کثرت سے فارسی اصطلاحات ملتی ہیں اور ان کے مختلف حصے فارسی عنوان کے حامل ہیں۔ مثلاً در حمد باری، در مدح فرید گنج شکر، در آغاز کتاب، تصنیف وغیرہ۔

لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور یوسف زلیخا کی کہانیوں کو ہندوستانی شعرا مثلاً امیر خسرو، حافظ برخوردار، جشن سنگھ عارف وغیرہ نے فارسی نظم کا جامہ پہنایا۔ ایودیا کرشن بہادر نے مسلم حکمرانوں کا شاہنامہ چار جلدوں میں فارسی میں نظم کیا۔ یہاں گجرات کے ناگر برہمنوں کا ہندوستان کی مشترکہ تہذیب میں جو حصہ رہا ہے اس کا ذکر کرنا بجا نہ ہوگا۔ انھوں نے اپنے بچوں کو فارسی کی تعلیم دی ان میں سے بعض فارسی زبان کے بڑے عالم، فاضل، خطاط اور مورخ ہوئے۔ جیسا کہ چھبیلا داس نے منتخب التواریخ اور مجھوزجی امرجی نے تاریخ سورت رقم کی۔ اس تاریخ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ بجائے بسم اللہ کے شکر بخش ہاتھوں کے نام سے شروع ہوتی ہے۔ فارسی سے سنسکرت اور سنسکرت سے فارسی زبان میں ہونے والے تراجم مثلاً جوگ وششٹ، اپنیشاد، مہابھارت، رامائن، بھگوت گیتا، نل دمن، رزم نامہ، پنچاکیانہ وغیرہ نے ایک دوسرے کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ دارا شکوہ کا سر اکبر کے نام سے اپنیشد کا ترجمہ اس مذہبی اور ثقافتی ہم آہنگی کی بہترین مثال ہے۔ اس کی مجمع البحرین ہندو اور اسلام مذہب کے تقابلی مطالعہ کے موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کوشش تھی۔ اس ضمن میں ابو ریحان البیرونی کا بھی خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جا سکتا ہے۔ بیرونی نے ملتان اور لاہور میں کئی سال گزارے اور سنسکرت زبان سیکھی۔ بیرونی نے ہندو مذہب اور فلسفہ کا بھی مطالعہ کیا اور سنسکرت کی متعدد کتابوں مثلاً سانکھیہ اور پاتنجلی کا ترجمہ کیا۔ ہند شناسی کے تعلق سے اس کا سب سے اہم کارنامہ اس کی شاہکار تصنیف کتاب ما للہند ہے جس کا فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

صدیوں تک ہندوستان کا ہر خطہ، شمال سے جنوب، مشرق سے مغرب فارسی زبان و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ آج ہماری روزمرہ کی گفتگو میں فارسی کے ہزاروں الفاظ اور ترکیبات موجود ہیں مثلاً: آمد و رفت، زر خرید، فروخت، خورد و نوش، گفت و شنید، نشست و برخاست، درآمد، برآمد وغیرہ۔

اس کے علاوہ سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں فارسی ضرب الامثال اردو میں مستعمل ہیں۔ چند سال پہلے ایک کتاب "دو ہزار مثل فارسی" کے نام سے ڈاکٹر ابراہیم کی کوشش سے ایران میں شائع ہوئی ہے۔ جب میں نے اس کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ تین ہزار سے زیادہ فارسی کے ضرب الامثال ہیں جنھیں ہم اردو میں بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔ نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں مثلاً گجراتی، مراٹھی، پنجابی، بنگالی میں بھی فارسی الفاظ و ترکیب کی بہتات ہے۔

پنجاب فارسی زبان و ادب کا ایک اہم مرکز رہا ہے جس نے فارسی کی ترویج و اشاعت میں اہم

کردار ادا کیا ہے۔ لاہور، ملتان، سیالکوٹ، سرہند، جالندھر وغیرہ شہروں میں فارسی کے مشہور ادبا، عرفا اور شعرا جیسے مسعود سعد سلمان، ہجویری، افضل سرخوش، احسن ایجاد، ناصر علی سرہندی، مجدد الف ثانی نے پرورش پائی۔ خود سکھوں کے روحانی رہنما گرونانک نے اپنی مذہبی کتاب میں فارسی کے الفاظ کا استعمال کیا ہے:

یک عرض گفتم پیش تو در گوش کن کرتار   حقا کریم کبیر تو بی عیب پروردگار

فارسی زبان کے سینکڑوں الفاظ اور ترکیبات پنجابی زبان میں داخل ہوئیں اور آج اس کے جزو لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً کتاب، سلطان، رضا، ذات، کرم، بخشش وغیرہ۔

شیرین و خسرو، لیلیٰ و مجنوں اور یوسف و زلیخا کی داستانیں فارسی سے پنجابی زبان میں ترجمہ ہوئیں اور خود پنجاب کے شعرا نے اپنی مشہور عشقیہ مثنویوں مثلاً ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال کو فارسی نظم میں پیش کیا۔ پنجاب کے بعض سکھ شاعروں نے فارسی تخلص اختیار کیا تھا، مثلاً چرن سنگھ شہید وغیرہ۔

بنگال میں فارسی نے مراد علی خلجی کے زمانے میں رواج پایا اور رفتہ رفتہ اس نے اس پورے خطہ کو اپنے تحت تاثیر لے لیا۔ لکھنوتی فارسی زبان و ادب کا ایک اہم مرکز تھا۔ لکھنوتی میں مولانا ابو طوامہ کے مدرسہ نے فارسی زبان کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ صوبہ بہار کے مشہور صوفی شیخ شرف الدین یحییٰ منیری نے یہیں تعلیم حاصل کی۔ نظام الدین اولیا کے شاگرد شیخ اخی سراج نے چشتیہ سلسلہ کے پہلی خانقاہ کی بنیاد بنگال کے ایک شہر پانڈا میں ڈالی۔ ہندوستانی صوفیا کی متعدد فارسی تصنیفات بنگال میں وجود میں آئیں، مثلاً انیس الغربا، مونس الفقرا، نام حق، مقامات وغیرہ۔ مشہور صوفی جہانگیر سمنانی، جن کے فارسی مکتوبات کو عرفانی افکار و عقائد کے ایک اہم مجموعہ کی حیثیت حاصل ہے شیخ عبد الحق بنگالی کے مرید تھے۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی نے لکھا ہے:

''نہ فقط در شہر ما، در دیہ ہای بنگال هم مرکز صوفیان بودند''

بنگال میں فارسی زبان اور ایرانی عرفا کے افکار نے اس حد تک نفوذ حاصل کر لیا تھا کہ وہاں کے برہمن بھی فارسی شعر پڑھتے اور ایرانی صوفیا کا لباس پہنتے تھے۔ رتن گربھ، جو ہندوستان کے مشہور شاعر اور صوفی رابندر ناتھ ٹیگور کے اجداد میں سے تھے، فارسی کے زبردست عالم تھے۔ ٹیگور کے والد کو حافظ اور سعدی سے اس قدر عقیدت تھی کہ انھوں نے حافظ کے شعر کو اپنی عبادت کی تختی پر کندہ کر رکھا تھا:

مرا در منزل جانان چہ امن و عیش چون ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملها

بنگال کا انقلابی شاعر نذر الاسلام حافظ کے شعر کا دلدادہ تھا۔ اس نے حافظ کے دیوان کا بنگالی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

آج بھی بنگالی زبان میں ہزاروں فارسی الفاظ اور تراکیب و اصطلاحات موجود ہیں مثلاً نگار، درخواست، رومال، بارود، باورچی، روزینہ، بخشش، کاغذ، زمیندار، خزانہ، پیالہ، آئینہ، جام وغیرہ۔

یہ امر مسلم ہے کہ مرہٹوں کی سرکاری زبان فارسی تھی اور بھی سرکاری مراسلے وغیرہ اسی زبان میں ہوتے تھے۔ فارسی زبان کے سینکڑوں الفاظ اور ترکیبات مراٹھی زبان میں آج بھی موجود ہیں مثلاً پیشوا، وزیر، ورق نویس، روبہ، حوالہ وغیرہ۔

ایران اور گجرات کے درمیان فرہنگی و تجارتی روابط صدیوں پرانے ہیں۔ گجرات کے حکمرانوں نے فارسی زبان و ادب کی روز افزوں ترقی کے لئے ایک مناسب فضا ہموار کی اور فارسی کی اہم کتابیں جیسے تاریخ محمود شاہی، تاریخ صدر جہان، تاریخ گجرات، طبقات اکبری، گجرات میں لکھی گئیں۔ معروف روحی شاعر شاہ عبد اللطیف جس نے مثنوی مولانا کے تصحیح شدہ نسخہ کو ترتیب دیا، گجرات کا باشندہ تھا۔

گجراتی زبان میں فارسی الفاظ   تازہ، ولایت، وکیل، برف وغیرہ۔

فارسی زبان و ادب جس کی بنیاد عرفان، اخلاق اور انسان دوستی پر رکھی گئی تھی ہندوستانی معاشرہ میں فکری ہم آہنگی پیدا کرنے کا اہم وسیلہ رہے ہیں۔ ہندوستان کے فارسی شعرا، ادبا، اور صوفیا نے انسانی معاشرے کو ایک وحدت کی صورت میں ہر طرح کے تفرقہ اور جدائی سے بالاتر تصور کر کے اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ ان کے ملفوظات، اشعار اور آثار جو سب فارسی زبان میں ہیں بنی نوع انسان کو محبت، برابری اور ہمدلی کا درس دیتے ہیں۔ اس ملک کے شعرا، ادبا یہاں تک کہ بادشاہوں نے بھی فارسی زبان و ادب کی توانمندی سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے افکار و عقائد کو اس شیریں زبان میں آیندہ نسل کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔ غزنوی دور سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر تک ہندوستان میں فارسی زبان کی ایک اہم اور مستحکم حیثیت تھی۔ اگر ہم ہندوستان کی گذشتہ تاریخ اور اپنی تہذیب سے باخبر رہنا چاہتے ہیں تو فارسی زبان کا مطالعہ کرنا لازم ہے۔

آذرمی دخت صفوی

شاید	موضوع است برای مستقبل قریب یعنی نزدیک است کہ این صورت وقوع گیرد	ممکن
تخیل	کف خون آمیختہ کہ بردھان لگام پیدا باشد، پای بند اسپ۔	خوبصورت
شادی	خوشی وسرور	شادی بیاہ
برات	کاغذ نوشتہ تنخواہ کہ بموجب آن از خزانہ زر طلب بدست آید وبمعنی تنخواہ مجاز است	شادی، برات
پاخانہ	بیت الخلا	(اردو معنی مشہور ہے)
صاحب	بمعنی یار وخداوند و وزیر	کلمۂ تعظیم
علاقہ	(بالفتح) علف وخورش وچرخ چاہ ورسن دلو، دلو بزرگ ومال وشتر وخصومت ودوستی ومہر وکابین ومرگ وآویزش وغیرہ (بالکسر) جسم ظاہری کہ بستہ وآویزان باشد چیزی مثل دوال تازیانہ وشمشیر وغیرہ۔	(بالکسر) علاقہ زمین
عرصہ	کشادگی میان سرای کہ در آن بنا نباشد و زمین سرای وجنگ گاہ، میدان۔	وقت
غربت	دوری ودوری از جای خود ودور شدن	محتاجی ومفلسی
غریب	ہر چیز نادر ونو ومسافر ودور شدہ	محتاج ومفلس
غریبی	دوری از خان ومان وقماشی بسیار نفیس	مفلسی
غالبا	اکثر وبیشتر	شاید
فصل	مانع وحاجز میان دو چیز، حصۂ کتاب، موسم	غلے کی فصل
ضبط	نگاہداشتن، حفظ کردن، محکم داشتن	لے لینا، ضبط کر لینا
مضبوط	محفوظ، نوشتہ	سخت، نہ ٹوٹنے والی چیز
کوتوال	صاحب قلعہ، در اصل کوٹ والا بود	پولیس کا افسر
مشکور	پسندیدہ وستودہ	شکرگزار

مگر	بجز، سوای	لیکن
متلاشی	پریشان وخراب ومعدوم ودرین صورت ماخوذ از لاشی واین قسم اشتقاق از مرکبات بسیار آمدہ وآنچہ در مردم متلاشی بمعنی تلاش کنندہ مشہور است محض غلط است۔	تلاش کرنے والا
غلیظ	گندہ وسطبر ودرست، ضد رقیق وبمعنی ناپاک در خلایق شہرت عظیم داشتہ یافتہ نشدہ۔	گندگی
مرغ	پرندہ وانیکہ در ہندوستان ماکیان وخروس ہر دو را بلکہ تنہا خروش را مرغ گویند این اصطلاح ہمیں دیار است	مرغ (مرغا)
مکان	جای بودن صیغۂ اسم ظرف است مشتق از کون (بالفتح) کہ بمعنی بودن است وبمعنی مطلق جا مستعمل۔	گھر۔ خانہ
موضع	جای نہادن چیزی وبمعنی مطلق جا	گاؤں
ناخوش، ناخوشی	بیمار وبیماری	ناراض وناراضی
نہایت	پایان چیزی وغایت	بہت زیادہ (نہایت اچھی)
ولایت	ملک یک بادشاہ وزمین آبادان ودرستی وتصرف وحکومت وتقرب بندۂ نیک باخدا تعالی	دوسرا ملک، خصوصاً انگلستان وغیرہ
(لفظ)	(فارسی یا عربی معنی)	(اردو معنی)
انتقال	از جای بجای رفتن، نقل نمودن، مردن	اردو ترکیب میں مرنا
پوسیدہ	از پوسیدن وتیز از پوسیدن (کہنہ شدن)	اردو میں، کہنہ فرسودہ
تردید	باز گردانیدن وباز آوردن وزبون وفاسد گردانیدن	رد کرنا
پریشان	متفرق وپراگندہ، بسیار گرائیدن ودیوانہ شدن	پریشان۔ متردد
تکلیف	باندازۂ طاقت کار فرمودن کسی را وامر ونہی خدای مر بندہ را وفارسیان بمعنی مطلق کار فرمودن	رنج، پریشانی

تمیز	صاف، ستھرا، درست، عقل، فہم، امتیاز حق و باطل	سلیقہ
تیغ	چیز برندہ چوں کارد و خنجر و شمشیر و استرہ وغیرہ	تلوار
حوصلہ	پوٹہ، کنایہ از تاب و طاقت و تحمل (جاندار و بیجان دونوں کے لیے)	تاب و طاقت (محض جاندار کے لیے)
آبدست	آبیکہ بداں دست و رو بشوید و وضو سازندہ مجازاً بمعنی وضو و استنجا کردن	(مشہور ہے)
دماغ	مغز سر، ناک	سر، مغز سر
سزا	لائق، در خور، پاداش نیکی و بدی	بدی کا بدلہ
فریفتہ	فریفتہ، فریب خوردہ مجازاً عاشق	عاشق
ملازم	ہمیشہ باشندہ، بجائی یا نزد کسی بمناسبت ہمیں معنی نوکر را گویند	نوکر
منظور	دیدہ شدہ و منظر گرفتہ، پاس، مقصود	منظور
ہیچ	کچھ۔ کچھ نہیں	کچھ نہیں

(ج) بعض نئے لفظ بنائے گئے ہیں جو عربی یا فارسی قاعدے سے درست نہیں ہیں مثلاً: مرغن، مجرب، مدغ، مفرور، مبوس، تحقید، تابعدار، راشی، ناراضگی، کرختگی، اداسگی، بادشاہت، یکسانیت، نزاکت وغیرہ۔ اس ضمن میں وہ لفظ بھی لیے جا سکتے ہیں جو عربی تائے مصدری پر ختم ہونے کے باوجود ان کے آخر میں فارسی یائے مصدری کا اضافہ کیا گیا ہے۔ جیسے بہبودی، تنزلی، تبدیلی، سلامتی وغیرہ۔ ان میں سے بعض فارسی میں بھی مستعمل ہیں۔

۲۔ صوری تصرف کی مثال میں عام طور پر وہ لفظ پیش کئے جا سکتے ہیں (الف) جن کے اعراب میں تغیر ہوا ہے۔ اس طرح کی چند مثالیں یہ ہیں:

(اصل تلفظ)	(اردو تلفظ)	(اصل تلفظ)	(اردو تلفظ)
مسرت (بفتح اول)	(بضم اول)	محبت (بفتح اول)	(بضم اول)
فرشتہ (بکسر اول)	(بفتح اول)	قلعہ (بفتح اول)	(بکسر اول)
تخمین (بکسر اول)	(بفتح اول)	عیان (بکسر اول)	(بفتح اول)

بجرہ (بفتح اول)	(بکسر اول)	ستودہ (بکسر اول)	(بفتح اول)
ست (بفتح اول)	(بکسر اول)	خزان (بکسر اول)	(بفتح اول)
نثر (بکسر اول)	(بفتح اول)	بہشت (بکسر اول)	(بفتح اول)
جہالت (بفتح اول)	(بکسر اول)	باقر (بکسر قاف)	(بفتح قاف)
جید (بکسر یا)	(بفتح یا)	میت (بکسر یا)	(بفتح یا)
سید (بکسر یا)	(بفتح یا)	سوال (بضم اول)	(بفتح اول)
موسم (بضم میم و کسر سین)	(بفتح م و س)	برکت، حرکت، رمضان (بفتح دوم)	(بسکون دوم)
رہن، حماقت (بفتح اول)	(بسکر اول)	حقارت، رفاقت، (بفتح اول)	(بسکر اول)
مشکوۃ، خلوت (بفتح اول)	(بکسر اول)	خزان، بجھ پان، (بفتح اول)	(بسکر اول)
دروغ، جمہور (بضم اول)	(بفتح اول)	اہم، مہم (سوم مشدد)	(بحذف تشدید)
آدمیت، (یائی مشدد)	(بحذف تشدید)	کیفیت (یائے مشدد)	(بحذف تشدید)

(ب) وہ لفظ جن میں حرفوں میں تبدیلی ہوئی ہے مثلاً

افراد و تفریط کے بجائے افراتفری، طیار کے بجائے تیار، حرج کے بجائے ہرج، گذشت کے بجائے گزشت، گزارش کے بجائے گذارش وغیرہ۔

علاوہ ان تغیرات کے ایک خاص شکل مرکبات کے سلسلے میں قابل ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ اہل زبان نے آزادی کے ساتھ ہندی لفظوں کو فارسی اور عربی کے ساتھ ملا کر نئے مرکبات بنائے ہیں اور اس طرح ذخیرۂ الفاظ میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ یہ ان سے الگ ہیں جو ہندی کے دو لفظوں، یا فارسی کے یا عربی کے دو لفظوں یا عربی فارسی کے جوڑ سے بنائے گئے ہیں۔ ان مرکبات کے چند نمونے یہ ہیں:

بے بس، بے ٹھکانے، بے چین، بے چٹکی، بے جوڑ، بے ڈھنگا، بے کل، بچپن، بچپنا، کمینہ پن، سفلہ پن، چوراچا، سرچڑھا، سرچڑھا، لاپروا، لاپتہ، لاچار، تابکھ، تو چندی، سمجھدار، اگالدان، اچھت گیری، پاندان، بٹے باز، دھوکے باز، بٹے بازی، دھوکے بازی، پتنگ باز، پتنگ بازی، نخرے باز، نخرے بازی، تھانے دار، جاتے دار، جاتے داری، ناکہ بندی، گاڑی بان، پلنگ پوش، ڈاک چوکی، ڈھنڈورچی، ڈاک خانہ، جیل خانہ، جھلیار خانہ، بیلدار، پٹی دار، ٹھیکیدار، بٹے دار، چوہے دان، چٹنی رساں، پھوپھی زاد، ماموں زاد وغیرہ وغیرہ۔

اردو زبان کی تخلیق و ارتقا میں عربی و فارسی کو غیر معمولی دخل رہا ہے اور اس کی وجہ سے اردو پر ان

دونوں زبانوں کے اثرات کی تہ بڑی گہری ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ اثرات صرفی ونحوی انداز کے ہیں۔ عربی کو فی الحال نظر انداز کیا جاتا ہے اس لیے کہ اس کے بیشتر اثرات بلا واسطہ نہیں بلکہ فارسی کے ذریعے سے ہیں اور اسی بنا پر ان کو فارسی ہی کا اثر سمجھنا چاہئے اور اسی لیے اس وقت اس کی الگ بحث ضروری نہیں معلوم ہوتی ہے۔ البتہ فارسی کے متنوع اثرات کے سلسلے بعض اہم اور ضروری مسائل کا ذکر ذیل کے اوراق میں کیا جاتا ہے۔

فارسی وعربی جمع:

کسی زبان میں دوسری زبان کے مفرد الفاظ کے استعمال پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ شاید ہی کوئی ایسی زبان ہو جس کے سارے لفظ خود اپنی زبان کے ہوں اور اگر ماضی میں کوئی مثال مل جائے تو اب اس کی مثال محال ہے اس لیے کہ اس وقت جو چیزیں سائنس کی ترقی سے دریافت ہو رہی ہیں وہ چند قوموں سے مخصوص ہیں اور ان کے نام بھی ایک ہی قسم کے ہیں۔ یہ سارے نام دوسری زبانوں میں ضرور شامل ہوں گے۔ ان مفرد لفظوں پر زبان اپنے مخصوص صرفی نحوی عمل کرتی ہے البتہ اگر مفرد لفظ مع صرفی ونحوی اثرات کے کسی دوسری زبان میں آئے تو اس زبان کی حق خود ارادی پر ضرب کاری لگتی ہے۔ مثلاً فارسی یا عربی کا ایک لفظ اردو نے لیا تو اس کی جمع، اس کی اضافی اور مفعولی حالت وغیرہ سب اردو قاعدے کے مطابق ہونا چاہیے۔ لیکن بسا اوقات ایسا نہیں ہوتا۔ عربی اور فارسی کی جمعیں اردو میں عام طور سے رائج ہیں اور اب ان کا رواج کافی زور پکڑ گیا ہے۔ اگر مخصوص لفظوں میں ان کا اطلاق ہوتا تو چنداں قابل توجہ نہ تھا لیکن اب وہ بطور اصول کے اپنا لیا گیا۔

فارسی کی جمع کی دو علامتیں ہیں۔ بے جان پر (ھا) بڑھائی جاتی ہے اور جاندار پر (ان) یہ دونوں قسم کی جمع اردو میں مستعمل ہیں۔ (ھا) کی علامت کے باوجود اس کے کہ زیادہ عام نہیں ہے لیکن کبھی کبھی ہم ہندی کے مخصوص الفاظ میں اس کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ فارسی جمع (ھا) کی چند مثالیں یہ ہیں۔

سالہا سال، برسہا برس، مدتہای دراز، گلہائی ناز، تخت جاتھا، صدہا، ہزارہا، کروڑ ہا وغیرہ۔

ان مثالوں سے اندازہ ہوگا کہ (ھا) کا استعمال اکثر فارسی اضافت کی وجہ سے ہوتا ہے، اور فارسی اضافت اردو نثر میں عموماً اور اردو نظم میں خصوصاً اتنی عام ہے کہ اس کے استعمال پر کوئی خاص پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔

جمع (ان) کی مثالیں:

والیان، راجگان، فرماں روایان، افسران، ممبران، صاحبان، ارکان، صاحبزادگان وغیرہ یہ

علامت بھی فارسی اضافت کے عام ہو جانے کی بنا پر مجبوراً استعمال ہوتی ہیں۔ اس میں نثر اور نظم میں اتنا بین فرق نہیں ہوتا جتنا (ھا) کی حالت میں ہوتا ہے، اس علامت کے استعمال کی عمومیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انگریزی اور ہندی کے لفظوں کے ساتھ اس کو ملا دیا جاتا ہے۔

عربی قاعدے کی جمع اردو میں بہت عام ہیں اور فارسی جمعوں کی طرح وہ اضافت کی چنداں محتاج نہیں، بلکہ مفرد طور پر ان کا استعمال بلا تکلف ہوتا ہے، جیسے شعرا، حکما، فضلا، صوفیہ، وکلاء، عرفا، علماء، سوالات، جوابات، باغات، نوشتہ جات، رقعہ جات، بیگمات، کائنات، واردات، خیرات، تسلیمات، مومنین، جامعین، حکام، مسلمین، سامعین، ناظرین، قارئین، کتب، رسائل، مجلات، کاغذات، ابواب، فصول، الفاظ، فقرات، مباحث، وجوہ، اسباب، علل، ملل، اقوام، احوال، حالات، خیالات، افکار، اثرات وغیرہ وغیرہ۔

اس سلسلے میں حسب ذیل امور قابل توجہ ہیں:

(الف) عربی جمع فارسی کے توسط سے اردو میں آگئیں، عربی کی بعض جمع اردو میں ایسی ہیں جو حالت مفعول یا اضافی کی ہیں۔ ان کا حالت فاعلی میں استعمال عربی قاعدے کی رو سے صحیح نہ ہوگا، مثلاً مومنین کے بجائے مومنون، مسلمین کے بجائے مسلمون عربی قاعدے سے درست ہوگا، مگر اردو میں حالت فاعلی کے طریقے کی جمع یعنی مومنون اور مسلمون غلط ہے یہ اردو کی جدت نہیں فارسی کی ایجاد ہے اور اسی لیے اس کو فارسی ہی کا اثر سمجھنا چاہیے۔

(ب) بعض غیر عربی لفظوں کی جمع عربی قاعدے سے بنائی گئی ہے، نوشتہ جات اور بیگمات وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ یہ فارسی والوں کی جدت ہے اور اسی وجہ سے یہ بھی فارسی اثر کی غمازی کرتی ہے۔

(ج) بعض الفاظ جو عربی قاعدے سے جمع ہیں لیکن ان کا استعمال بطور واحد ہوا ہے۔ مثلاً کائنات، واردات، خیرات، تسلیمات وغیرہ میرے خیال میں یہ بھی اہل ایران کی بدعت ہے جو بعد میں اردو میں بھی رائج ہو گئی۔

(د) جمع الجمع کا استعمال اردو میں خاصہ عام ہے۔ فارسی میں بھی کثرت سے اس کی مثالیں ملتی ہیں اسی بنا پر اس رواج میں فارسی اثر کے نشان ملتے ہیں۔

صفت موصوف کی تطبیق:

اردو میں صفت موصوف کی تطبیق بعض حالتوں میں ہوتی ہے، مثلاً جب صفت کے آخر میں الف یا بعض حالتوں میں یائے مختفی ہو تو مونث اور جمع کی حالت میں اس میں تبدیلی ہوتی ہے۔ اس طرح کی مثالیں۔

گندہ لڑکا، گندے لڑکے، گندی لڑکی، گندی لڑکیاں، بڑا گھوڑا، بڑی گھوڑی، بڑی گھوڑیاں۔

باقی حالتوں میں صفت میں کوئی لفظی تبدیلی نمایاں نہیں ہوتی مثلاً:

نیک لڑکا، نیک لڑکے، نیک لڑکی، نیک لڑکیاں

لیکن بکثرت حالتوں میں صفت موصوف کی تطبیق میں عربی قواعد کی پابندی ہوتی ہے۔ عربی کا قاعدہ ہے صفت اپنے موصوف کے ساتھ جنس (مذکر مونث) اور حالت (واحد، تثنیہ، جمع) میں پوری پوری مطابقت رکھتی ہے۔ یہی اصول اردو میں بھی رائج ہے، مثلاً:

والد محترم، والدہ محترمہ، والدین محترمین، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، حرمین شریفین، ارشادات عالیہ، قیامت صغریٰ، بلیہ عظمیٰ، علوم اسلامیہ، شعبہ فارسیہ وغیرہ۔

اس سلسلے میں حسب ذیل امور قابل ذکر ہیں:

(الف) تثنیہ کا استعمال اردو میں صرف چند حالتوں میں ہوتا ہے مثلاً والدین، جانبین، طرفین، وغیرہ یا بعض ناموں میں مثلاً ثقلین، نیرین، نورین، سبطین وغیرہ۔ اس کے باوجود صفت موصوف کی تطبیق حالت تثنیہ میں عجیب معلوم ہوتی ہے جو اردو کے مزاج سے ساز گار نہیں۔

(ب) اوپر کی مثالوں میں والدہ، مکہ، مدینہ، قیامت، بلیہ، شعبہ مونث ہیں اس لیے ان کے لیے صفت مونث استعمال ہوتی ہے۔

(ج) ارشادات اور علوم جمع بیجان ہیں اس لیے صفت مونث آئی ہے۔

(د) عربی (ۃ) تانیث کی بھی علامت ہے، اور اس کے اضافے سے لفظ مونث ہو جاتا ہے، لیکن تائے تانیث کی ہائے غیر ملفوظ میں تبدیلی فارسی اثر کے ماتحت عمل میں آتی ہے، عربی میں تائے (تانیث) وقف کی حالت میں ہائے ملفوظ ہو جاتی ہے، لیکن اردو میں فارسی کی طرح غیر ملفوظ رہتی ہے اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ عربی زبان کا یہ مخصوص قاعدہ اردو میں فارسی کے وسیلے سے آیا اور اپنے ساتھ فارسی اثر کو بھی لایا۔ اسی اثر کے ماتحت بعض حالتوں میں اردو قاعدے کی مطابق جب صفت پہلے آتی ہے تو بھی اس کو مونث بنا لیا جاتا ہے، جیسے مطبوعہ کتاب، مروجہ قاعدہ وغیرہ، مزید برآں حذف (تنوین) یا (ال) بھی فارسی اثر کی غماز ہے۔

کسرۂ اضافی و توصیفی:

اضافت کی حسب ذیل شکلیں رائج ہیں:

(الف) مستوفی کی مثالیں: ارباب دولت، طوفان بے تمیزی، صاحب سخن، صاحب قلم قابل داد، صحرائے ناپید کنار، خون ناحق وغیرہ۔

(ب) حذف کسرۂ اضافت کی مثالیں: اہل کار (اہکار) اہل مد (اہلمد) صاحب قرآن (صاحقران) میر شکار، میر سامان، خان سامان (خانساماں) وغیرہ۔

(ج) اضافت مقلوب کی مثالیں: دست پناہ، تخن تکیہ، تیجال، سنگریزہ وغیرہ۔

صفت کی چند مروجہ شکلیں یہ ہیں:

(الف) مستوفی کی مثالیں: خوی نیک، وقت خوش، امراض پوشیدہ، محبوب شیریں وغیرہ۔

(ب) مقلوب کی مثالیں: نیک بخت، عالی نسب، پاک دامن، نیک خو وغیرہ۔

اردو میں ان صورتوں کے علاوہ خود اردو قاعدے کے لحاظ سے علامت اضافت کے حذف کر دینے کی متعدد مثالیں ملتی ہیں جیسے: ٹڈی دل، ڈاک گاڑی، مال گاڑی، گھر داماد، جیب گھڑی، سبزی منڈی وغیرہ۔ اور فارسی کی طرح اس قسم کے بعض لفظوں کے آخر میں صفت کی علامت بڑھا کر پورے مرکب کو صفت بنا لیتے ہیں۔ شہر شہرے شہر شہرا من موج سے من موجی بالکل اسی طرح بنے ہیں جس طرح میر شکار سے میر شکاری صاحقران سے صاحقرانی وغیرہ اردو مرکب توصیفی فارسی مرکب توصیفی (مقلوب) کی طرح ایک صفت بن جاتی ہے جو صفت مشبہ کا کام دیتی ہے نیک چلن، من چلا بالکل اسی قبیل کے ہیں جیسے فارسی میں نیک بخت، عالی نسبت وغیرہ ہیں۔ ایسے مرکبات پر اردو اور فارسی میں یائی مصدری کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے نیک چلنی، نیک بختی، عالی نسبی وغیرہ۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اردو اور فارسی میں حذف اضافت اور صفت مقلوب کے طریقے کسی حد تک یکساں ہیں۔ لیکن اضافت مستوی اور صفت مستوی کے قاعدے اردو میں پوری طرح بطور اصول کے رائج نہیں ہو سکے، اسی بنا پر ہندی اور فارسی لفظوں میں مستوی طریقہ اضافت استعمال میں نہ آ سکا۔ اور اگرچہ بعض لوگوں نے لب سڑک جیسی ترکیبوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے لیکن ابھی یہ ترکیب فصاحت کے درجہ پر نہیں پہنچی ہے۔ بہر حال اس سلسلے میں احتیاط برتی جاتی ہے، لیکن اردو میں فارسی مرکبات کی کثرت ہے۔ خصوصاً شعراء میں ان کا رواج اتنا عام ہے کہ کوئی شاعر مشکل سے ایسا ملے گا جس کے یہاں ایک چھوٹی نظم میں متعدد بار اس کا استعمال نہ ہوا اور اسی کے نتیجے کے طور پر فارسی جمع کے قاعدے بھی ضرور تا لگائے گئے۔ مژہ ہائے دراز، شگفتن گلہائے ناز وغیرہ کی مثالیں اس سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

عربی کی اضافت بھی اردو میں کثرت سے استعمال ہوتی ہے، جیسے بیت المال، بیت الشرف، علم الحساب، دار الخلافہ، دار الشفاء، ابو البشر، واجب الاداء وغیرہ، ان میں سے بعض خود فارسی یا اردو کی ساخت ہیں۔ اردو والوں میں سے بعض لوگوں نے فارسی اور ہندی مرکبات میں عربی اضافت کا استعمال کیا ہے مگر ایسے مرکبات ابھی فصاحت کے درجے پر نہیں پہنچے ہیں جیسے حسب الفرمودہ الفرمائش، حسب الخواہش، قریب المرگ، فوق البھڑک وغیرہ۔

بہر حال اضافت کا اس طرح استعمال سیکڑوں ہزاروں لفظوں میں کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اس طرح کے استعمال عام سے زبان کی حق خود اختیاری پر ضرب لگتی ہے اور اسی بنا پر مجھے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے اس بیان سے حرف بحرف اتفاق ہے۔ [۵]

''اصول اصطلاح سازی'' کی جگہ اگر ''اصطلاح سازی کے اصول'' ہو تو کیا مضایقہ ہے، بظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات ہے مگر میرے نزدیک بعض ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں بہت اہم ہیں۔ کتابوں کے ناموں، بابوں اور فصلوں کے عنوانوں کے لیے جب اردو ترکیبیں استعمال کی جاتیں تو اردو کی ترقی معلوم سب سے بڑی خدمت ہماری زبان کی یہ ہوگی کہ اس سے اپنے ہاتھ پاؤں پر کھڑے ہونے میں مدد دیجیے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ (وحیدالدین سلیم) کی بھی یہی رائے ہے اس لیے اور بھی آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو اپنی تصنیفوں کے نام، ان کی فصلوں کے عنوان اور گنتی سب کچھ اردو رکھیے۔ اکثر لوگ گنتی فارسی میں لکھتے ہیں۔ فصل دوم، باب پنجم وغیرہ۔ حالانکہ تھوڑی ہی دور چل کے فارسی گنتیاں بول جاتی ہیں اس لیے کہ فارسی کے بہت سے لفظ شانزدھم، ہیجدھم وغیرہ اردو کے لیے ایک بار ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ آپ نے اپنی کتاب مختلف حصوں (یا ٹکڑوں) کے ناموں میں فارسی ترکیب کو بہت کم دخل دیا ہے''۔

اس پورے اقتباس کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اس میں متعدد عربی و فارسی کے لفظ آئے ہیں لیکن سب کی جمع اردو قاعدے سے آئی ہے۔ اسی طرح ایک جگہ بھی فارسی اضافت کا استعمال نہیں ہوا ہے۔

عربی اضافت کے سلسلے میں بھی موصوف کا ایک بیان نہایت اہم ہے جو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

''اصحاب الرائے'' اس سلسلے میں میں آپ (وحیدالدین سلیم) کی رائے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ محض صاحب رائے کہا جائے تو کچھ مضایقہ نہیں۔ میرے نزدیک صاحب رائے اردو میں (مثل مرد) ''آدمی''، ''شخص'' وغیرہ کے) واحد بھی اور حالت قائم میں جمع بھی ہے۔ اس لیے محض ''صاحب رائے موجود تھے'' کہا جائے تو کوئی حرج نہیں البتہ وقت بڑھے گی جمع محرف کی حالت میں کہ اردو کے قاعدے کی مطابق ''وں'' سے جمع بناتے ہیں اور صاحب رایوں ابھی تک فصاحت کے درجے پر شاید نہیں پہنچا ہے۔ میں تو ایسی حالت میں ''صاحب رائے لوگوں'' کہوں گا، بہت تکلف کیجیے تو ''صاحب رائے حضرات'' کہیے''۔

مرکب عطفی:

اردو میں فارسی مرکب عطفی کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ فارسی عطف کی علامت ''واؤ'' ہے جو فارسی اور فارسی، فارسی اور عربی، اور عربی اور عربی لفظوں کو جوڑتا ہے جیسے آب و تاب، رنگ و بو، پیچ و تاب، بے سروپا، بے سروسامان، بحمد و صلوٰت، خد و خال، کر و فر، شیخ و شباب وغیرہ۔ کبھی کبھی عطف گر جاتا ہے مثلاً جیسے گل قند، شیر برنج اور اس طرح کے مرکب کے حیثیت مفرد لفظ کی ہو جاتی ہے۔ خالص اردو ترکیب سے بھی اس طرح کے لفظ بنتے ہیں جیسے تانا بانا، دال گرو، وغیرہ ان میں حذف واو کے ساتھ ساتھ مفرد کیفیت پیدا ہوگئی ہے، یہ دونوں زبانوں کے اصول کی یکسانی ہے، ایک دوسرے کے اثر کا نتیجہ نہیں۔

عطفی مرکبات کے سلسلے میں چند اور باتوں میں دونوں کے قواعد یکساں ہے مثلاً دونوں میں بعض دفعہ الف ربط کا کام کرتا ہے مثلاً

کما بیش، رنا شولی، سراپا، لاکادو، رستاخیز، شبا روزی، تگاپو وغیرہ کی طرح اردو قاعدے کے لفظ ریلا پیلی، دھینگا مشتی، بیچا میچاقی، دھاچوکڑی، کھچا تانی وغیرہ ہیں۔

بعض دفعہ یہ الف ایک ہی لفظ کو جوڑتا ہے۔ یہ قاعدہ دونوں زبانوں میں یکساں طور پر رائج ہے، مثلاً لبالب، لبالب، گونا گوں، رنگا رنگ، سراسر، پیاپے، دمادم، مالا مال کی طرح اردو قاعدے کے لفظ یہ ہیں۔ مارامار، بھاگا بھاگ، بولا بولی، دھیما دھیمی، جھڑا جھڑ، کڑا کڑ وغیرہ۔

البتہ بعض فارسی کے مرکب جو اردو [۱۱] میں کثرت سے استعمال ہیں ان کے درمیان واو عاطفہ حذف ہو جاتا ہے مثلاً آب ہوا، آب دانہ، آمد رفت، خط کتابت، خدا رسول، صرف نحو، عالم فاضل، امیر غریب، پیر فقیر، بیر بیر، وغیرہ حرف عطف [۱۲] کو ہٹا کر عطف کے معنی لینا ہندوستان کی زبانوں کے لیے مخصوص ہے۔ اردو میں ایسے دو اسم جو مل کر ایک معنی دیں یا جن کا تعلق ایک دوسرے سے بہت گہرا ہو تو ان دونوں کے بیچ میں حرف عطف کا لانا نہ صرف غیر فصیح ہے بلکہ اکثر غلط ہوتا ہے جیسے ماں باپ، بھائی بہن، ہندو مسلمان، باپ بیٹا، رنگ روپ، کھیل کود، کھانا پینا وغیرہ بعض لوگ ایسے لفظوں کے درمیان واو عاطفہ لاکر اپنی ناوانی کا ثبوت دیتے ہیں۔ کھیل و کود، رنگ و روپ لکھنا کسی طرح صحیح نہیں۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا خیال ہے [۱۳] کہ فارسی کے جو مرکب عطفی اردو میں مستعمل ہیں مگر ابھی تک پوری طرح متمکن نہیں ہوئے ہیں عطف کا واو ان کا ایک اٹل جز ہے۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ جوں جوں یہ مرکب اردو میں زیادہ استعمال ہوتے جائیں گے اردو صرف نحو ان پر اپنا سکہ بٹھاتی جائے گی۔ ہر زبان میں دخیل لفظوں کا یہی حال ہوتا ہے۔

اسم فاعل:

فارسی اسم فاعل کے جتنے قاعدے ہیں تقریباً وہ سب اردو میں مستعمل ہیں، اور علاوہ فارسی کے مستعمل لفظوں کے ان سے اور نئے لفظ بنائے گئے ہیں، ان میں سے بعض قاعدوں کو اردو لفظوں پر برت کر بالکل نئے لفظ بنائے گئے ہیں، جن سے فارسی صرفی اثر کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مثلاً آہنگر، بازی گر، زرگر، غارت گر کی طرح چوڑی گر بنایا گیا ہے۔ سیاہ کار، غلط کار، تجربہ کار کی طرح کلاکار نیا لفظ ہے۔ اور اسم فاعل ترکیبی (یا صفت مشبہ) جو اسم اور امر کے جوڑنے سے بنتا ہے۔ اس کی مثالیں تو ہزاروں تک پہنچ جائیں گی۔ یہ قاعدہ اردو فارسی دونوں زبانوں میں یکساں ہے اس لیے نئے لفظوں کے بنانے میں بڑی آسانی ہوئی۔ اردو قاعدے کی مثالیں اس طرح پڑھیں [۱۳] مفت چٹ، پنگ توڑ، منہ توڑ، چڑیمار، تیس مار، کفن کھسوٹ، سرتوڑ، مکھی مار وغیرہ۔ ان کے مقابل میں فارسی کی مثالیں دیکھیے۔

دل شکن، خاطر فریب، دلربا، دماغ سوز، شب گیر، قانون ساز، دلکش، دلدار وغیرہ۔

فارسی اسم پر ہندی فعل لگا کر اسم فاعل (یا صفت مشبہ) کی مثالیں اردو میں مل جاتی ہیں جیسے کفن کھسوٹ، مفت چٹ، سرتوڑ، وغیرہ اور مگر ہندی اسم پر فارسی فعل سے اسم فاعل (یا صفت مشبہ) بنانے کی اتنی کثرت ہے کہ اس سلسلے کی ساری مثالوں کا احاطہ کرنا دشوار ہے پھر بھی بعض مشہور لفظوں کی فہرست یہاں [۱۵] درج کی جاتی ہے۔

انگل باز، ڈگی باز، اکڑ باز، دھوکے باز، بے باز، بھٹیر باز، پتنگ باز، پے باز، چال باز، جھکو باز، ٹھٹھے باز، چوسر باز، قلاباز (ی) نخرے باز، بیٹھک باز، چکمے باز، علم بردار، سونا بردار، جھنڈے بردار، چک بند (ی) ہتھیار بند، آزبند، لنگوٹ بند، تلوار بند، ٹھاٹ بند (ی) نمک بند، ناکابند، دھوتی بند، کنبہ پرور، پلنگ پوش، میز پوش، کمبل پوش، بھاجی خور، بیاج خور، جوتی خور، لت خور، بیلدار، بھڑک دار، بی دار، بلے دار، پہرے دار، پھلدار، چھیکے دار، چمکدار، تھانے دار، ٹوپی دار، چھکے دار، جالی دار، جھالر دار، چوکیدار، چٹکے دار، روئیں دار، دھار دار، دھاری دار، ڈگری دار، گھیر دار، ٹوپی دار، بوٹی دار، ڈھکنے دار، کھوٹ دار، کپے دار، پھندے دار، کنڈے دار، گھر دار، لوچدار، لیس دار، چکن دوز، چٹھی رساں، گھڑی ساز، تھوک فروش، گھیا کش، پٹھان گرد، (ی) آیاگر (ی) ماماگر (ی) دائی گیر (ی) چھت گیر، اٹھائی گیر (ا) پالکی نشین، ہاتھی نشین، گدی نشین، پلک نواز، چٹھی نویس، پرچہ نویس، کاپی نویس، اپیل نویس، ہنسی خیز، وغیرہ وغیرہ۔

اردو کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ اسم اور ماضی سے فاعلیت یا وصف کے معنی پیدا کرتے ہیں جیسے گھر چڑھا، پن ڈبا، جیب کترا، دل جلا، کمر جھکا، دماغ چلا، لے مرو وغیرہ۔ اس کے نتیجے میں فارسی ماضی پر اسم لگا کر وصفیت (فاعلیت) پیدا کرتے ہیں جیسے مزگشت۔

اسم مفعول:

فارسی کے اسم مفعول اردو میں کثرت سے رائج ہیں مثلاً آفت زدہ، ستم رسیدہ، دل گرفتہ، دل شکستہ، اجل گرفتہ، بعض اوقات اردو لفظوں پر شدہ، کے اضافے سے اسم مفعول بنا لیتے ہیں جیسے نختھی شدہ، رجسٹری شدہ، وغیرہ اردو فارسی دونوں میں بعض اوقات اسم اور امر سے ملا کر اسم مفعول کی صورت پیدا کر لیتے ہیں خانہ ساز فارسی ترکیب ہے اور گوتو ڑ اردو۔ [۱۶]

اسم ظرف:

متعدد فارسی اسم ظرف اردو کا جزو لاینفک ہو چکے ہیں، بعض ظرفی پیوند (لاحقے) اتنے عام ہو چکے ہیں کہ وہ اردو لفظوں کے ساتھ بلا تکلف جوڑ دیے جاتے ہیں۔ اس سے فارسی کے اثر کا پتہ چلتا ہے مثلاً "دان" کے پیوند کے یہ لفظ اردو میں مستعمل ہیں۔

پاندان، پیک دان، اگال دان، راگردان، چوہے دان، کنوردان، پھول دان، سنگاردان وغیرہ۔

"دان" کی تانیث والی شکل (دانی) بھی ظرفی پیوند کے طور پر استعمال ہوئی ہے، مثلاً سرمہ دانی، گوند دانی، راکھ دانی وغیرہ۔

خانہ اور سار کے ساتھ حسب ذیل الفاظ قابل ذکر ہیں۔ [۱۷]

پاگل خانہ، جیل خانہ، چھاپہ خانہ، پنڈت خانہ، ٹپہ خانہ، جوا خانہ، ڈاکخانہ، بھنگر خانہ، چانڈو خانہ، تاڑی خانہ، مرغی خانہ، بھٹیار خانہ، گاڑی خانہ، لہار خانہ، لوہ سار (لوہار کی دوکان) جھنڈ سار (غلے کی دوکان) گھنڈ سار وغیرہ۔

اس کے ذیل کے وہ تمام فارسی مرکبات نظر انداز کر دیے گئے ہیں جو خواہ صرف فارسی میں مستعمل ہیں یا اردو میں وضع کیے گئے ہیں۔

اسم تصغیر:

فارسی اسم تصغیر کی علامت (چہ) ہے۔ اس سے بنے ہوئے متعدد لفظ اردو میں مستعمل ہیں۔ اردو میں اس کی تانیث (چی) کے اضافے سے بہت سے نئے لفظ بنائے گئے ہیں مثلاً صندوقچی، ڈولچی، دیگچی، بغچی، ریزگی، چمچی، وغیرہ ان میں سے صرف پہلے لفظ صندوقچی کی اصل تصغیری حالت کی یعنی صندوقچہ بھی مستعمل ہے [۱۸] بقیہ سب اسی شکل میں آئے ہیں۔

صفت کے درجے:

فارسی صفت کے درجے "تر" اور "ترین" کے اضافے سے بنائے جاتے ہیں۔ اردو میں کوئی مختصر علامت صفت کے درجوں کے لیے نہیں ہے، بلکہ چند لفظوں کے اضافے سے یہ درجے بنائے ہیں جیسے اس سے اچھا، سب سے اچھا، جو فارسی ترکیب میں بہتر اور بہترین ہیں۔ ظاہر ہے کہ باوجود اس اضافے کے فارسی کے لفظوں کی شکل مفرد ہی رہتی ہیں اس بنا پر ان کا استعمال اردو کے لیے نہایت اچھا اور مستحسن ہے۔ فارسی کے کثیر الاستعمال لفظ یہ ہیں۔

بیشتر، کمتر، کمترین، برتر، برترین، بدتر، بدترین، خوبتر، بلند تر، بلند ترین۔

صفت عددی ترتیبی:

صفت عددی ترتیبی کے لیے اردو کے مخصوص قاعدے میں جو فارسی قاعدے سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی قاعدے سے بنی ہوئی صفت زیادہ مستعمل نہیں، صرف چند صورتیں عام ہیں، جیسے یکم، دوم، سوم، چہارم، پنجم، ششم، ہفتم، نہم، دہم اس کے بعد کی گنتی اردو قاعدے سے آتی ہے، یازدہم کوئی نہیں کہتا۔ گیارہواں فصیح اور کثیر الاستعمال ہے۔ ایک سے دس تک عدد ترتیبی کے فارسی قاعدے کا استعمال غالباً مدرسے کے درجوں اور کتابوں کے بابوں اور فصلوں کے نام کی وجہ سے ہوا ہوگا۔

اسم حالیہ:

فارسی کے اسم حالیہ کی متعدد مثالیں اردو میں موجود ہیں مگر فارسی قاعدے کا اطلاق اردو لفظوں پر نہیں ہو سکا ہے، مزید براں اردو کا اپنا مخصوص قاعدہ ہے جو فصاحت کے درجے پر پہنچا ہے اس لیے فارسی قاعدے کو ترجیح دینے کا کوئی موقع نہیں۔ شعر میں کسی حد تک فارسی اسم حالیہ سمجھ جاتے ہیں مگر نثر میں زیادہ دور تک ساتھ نہیں دے سکتے۔ "وہ شخص افتاں خیزاں جا رہا تھا" اتنا فصیح نہیں ہے جتنا "وہ شخص گرتا پڑتا جا رہا تھا"۔

حروف جار وغیرہ:

فارسی کے چند حرف جار مخصوص لفظوں کے ساتھ اردو میں رائج ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا عمومی استعمال نہیں ہو سکا، وہ فقرات جو حرف جار کے ساتھ اردو میں زیادہ رائج ہیں وہ اس طرح کے ہیں۔

در اصل، بکثرت، بطور، درحقیقت، بغرض، بلحاظ، باعتبار، بر سبیل تذکرہ، دم بدم، کم از کم، بیش از بیش، تہ بہ تہ، قدم بقدم، درپے، پے در پے، بحالت، علاوہ بریں، مشتمل بر، قرین قیاس، از راہ، براہ، برائے خدا وغیرہ۔

حروف جار (بطور مفرد) کے عام نہ ہونے کی ایک وجہ غالباً یہ ہوگی کہ اردو میں وہ اسم کے بعد اور فارسی میں پہلے آتے ہیں اور بعض حالتوں میں عربی کی طرح اسم میں تھوڑا سا صوتی تغیر بھی ہو جاتا ہے جیسے مدرسہ حالت جار میں مدرسے ہو جاتا ہے، یعنی اگر لفظ مختوم بہ الف ہائے مختفی ہوں تو وہ "ے" سے بدل جاتے ہیں۔ فارسی میں کسی قسم کا لفظی تغیر نہیں ہوتا۔

حرف جار کے علاوہ حرف استثناء: بجز، الا، حرف استدراک، لیکن حرف شرط اگر وغیرہ اردو میں مستعمل ہیں لیکن ان سے اردو کے کسی صوتی یا نحوی قواعد کا ٹکراؤ نہیں بلکہ ان سے اردو لفظوں کے خزانے میں اضافہ ہوتا ہے اور اسی بنا پر وہ فصاحت کے درجے پر ہیں اور ان کا استعمال ضروری ہے۔

فارسی لاحقے و سابقے:

جو مثالیں مختلف عنوانوں کے تحت پیش کی جا چکی ہیں ان سے اندازہ ہوا ہوگا کہ فارسی سابقے (Prefix) اور لاحقے (Suffix) اردو زبان میں کس بے تکلفی سے استعمال ہوئے ہیں اور ان کی وجہ سے اردو کے خزانے میں کتنا وقیع اضافہ ہوا ہے۔ ان سابقوں اور لاحقوں سے بنے ہوئے جو فارسی لفظ اردو میں مستعمل ہیں ان کی تعداد ہزاروں سے زیادہ ہوگی۔ خالص اردو لفظوں پر ان کے اضافے سے سیکڑوں نئے لفظ بن گئے ہیں۔ ذیل کے الفاظ اردو لفظوں پر فارسی سابقے یا نیم سابقے یا فارسی لفظوں پر اردو سابقے کے اضافے کی مثالیں ہیں:

بے بس، بے بسی، بے تحاشہ، بے ٹھکانے، بے شعور، بے جوڑ، بے چین، بے چینی، بے ڈول، بے دھڑک، بے ڈھب، بے ڈھنگ، بے ڈھنگا، بے ڈھنگا پن، بے سرا، بے سراپن، بے کل، بے کلی، بے گھرا، بے لاگ، بے لگام، پرشور، پرسوز، پرشور، پرسیری، تپائی، تر اہا، چوبلا، چوپایہ، چوحرفی، چوراہا، چوطرفہ، چوطرفی، سرچڑھا، سر دھرا، سرمنڈا، سرتوڑ، جی توڑ، نا سمجھ، نا سمجھی، نا ملنسار، نا راس، نوچندی، نوسکھ، نیم گرم، نیم سرجھکا ٹا، یک بارگی، یکلخت، یک منہ وغیرہ۔

ان سابقوں کا استعمال اردو زبان کے لیے نہایت مفید ہے۔ اردو زبان کا خزانہ ان کی وجہ سے مالا مال ہے۔ یہ مفرد لفظ خالص اردو کے لفظ ہیں، ان میں کسی قسم کی اجنبیت یا غیریت نہیں دے۔ لیکن ہر کس و ناکس کو اختیار نہیں کہ ان کی مدد سے نئے لفظ رائج کر دے۔ لیکن اگر کوئی کوشش کرتا ہے تو معیوب بھی نہیں، اگر زمانے نے اس پر فصاحت کی مہر ثبت کر دی تو اسے اردو کے خالص لفظوں کی صف میں جگہ مل جائے گی ورنہ اس کا استعمال غلط اور غیر فصیح ہوگا۔

فارسی سابقے کے ساتھ عربی "لا" کا ذکر بے محل نہ ہوگا جس کو اردو یا فارسی لفظوں پر بے تکلفی کے ساتھ جوڑ کر متعدد لفظ بنا لیے گئے ہیں مثلاً لاپرواہ، لاپروائی، لاچار، لاچاری، لاچارگی، لاپتہ وغیرہ۔

اسی ضمن میں ان "متعلقات" کا ذکر ضروری ہے جو عربی تنوین کی مدد سے بنائے جاتے ہیں اور جن کی حیثیت تقریباً مفرد لفظ کی ہو جاتی ہے ہے۔ اس سے جو مفہوم کئی لفظوں میں ادا ہوتا ہے وہ تنوین کی بدولت صرف ایک لفظ سے ادا ہو جاتا ہے ہے۔ اس سے زبان میں چستی آتی ہے اور بڑے خیال کو ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی کوئی علامت نہ اردو میں ہے اور نہ فارسی میں۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی والوں نے عربی کی اس علامت کو اپنی زبان کو جز بنالیا اور فارسی ہی کے توسط سے اردو میں یہ چیز اتنی عام ہوئی ہے کہ خواص و عوام بے تکلفی کے ساتھ ان کا استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح کے کثیر الاستعمال الفاظ یہ ہیں:

کنایۃً، یقیناً، مثلاً، فوراً، عادۃً، وقتاً فوقتاً، نسبۃً، مقابلۃً، حقیقۃً، مختصراً، اختصاراً، خصوصاً، اشارۃً، اصلاً، قدرۃً، فطرۃً، اولاً، ثانیاً، ثالثاً، رابعاً، خاصاً، ایماءً، ابتداءً، صراحۃً، ضرورۃً، ایضاً۔

اس کے کثرت استعمال کی وجہ سے لفظوں لفظوں پر ایک آدھ جگہ تنوین لگائی گئی ہے جو ممکن ہے کھٹکتی ہو، مثلاً نمونۃً، اندازاً۔

ہائے غیر ملفوظ:

یہ "ہ" فارسی زبان کے لیے مخصوص ہے جو دراصل ایک علامت ہے جو اپنے ماقبل کے فتح (زبر) کو ظاہر کرتی ہے۔ لیکن یہ ورثہ پہلوی زبان کا نہیں ہے خود اس فارسی کی جدت ہے جو اسلام کے بعد وجود میں آئی اور ابتداء ان لفظوں میں استعمال ہوئی جن کا آخری حرف 'ک' مشتھا اور وہ گر گیا تھا، جیسے نامک، بندک، جامک وغیرہ جو فارسی میں نامہ، بندہ، جامہ ہو گئے، رفتہ رفتہ جب اس کا استعمال عام ہوا تو عربی کے جن لفظوں کا آخری حرف 'ۃ' ہوتا وہ فارسی میں 'ہائے غیر ملفوظ' پر ختم ہونے لگے اور ان پر اس 'ہ' کے مخصوص عمل برتے جانے لگے جیسے نقطہ، کلمہ، مادہ، مسلمہ، کریمہ وغیرہ۔

اردو میں یہ 'ہ' فارسی ہی کا ورثہ ہے اور اب اس زبان میں اس کا استعمال اتنا عام ہو چکا ہے کہ وہ فارسی و عربی کے لفظوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اردو لفظوں میں بے تکلفی سے استعمال ہوتی ہے۔ بعض جگہ تو وہ الف کی قائم مقام ہو گئی خصوصاً اسم علم میں اس کا استعمال اس کے غیر معمولی اثر کی نشاندہی کرتا ہے۔ ذیل میں اسم علم کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

کوٹہ، آگرہ، پٹنہ، کلکتہ، ٹونڈلہ، اناوہ، پٹیالہ، ایٹہ، ڈھاکہ، بجنڈہ، گونڈہ، شملہ، ناندہ وغیرہ۔

اور اس پر یائے نسبت کا جب اضافہ ہوتا ہے تو فارسی ہائے مختفی کی طرح 'ہ' واو میں تبدیل ہو جاتی ہے، جیسے آگروی، ناندوی، گونڈوی، کلکتوی، بٹالوی، پشتوی وغیرہ۔

اسم عام کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

بلوا، شوالہ، پتہ، پرچہ، دیوالیہ، پاٹ شالہ، کھٹولہ، راجہ، مہاراجہ، روپیہ، آٹا، ٹھوٹھا، پٹھہ، ڈاکہ، ڈیرہ، بیڑہ، مالا، کتبہ، ٹھپہ، پتہ، ڈاکیہ، بارہ ماسہ، دوہا، ڈرامہ، دھاگہ، ٹھیلہ، دوپیالہ، ٹھکانہ وغیرہ۔

ممکن ہے کہ ان میں سے بعض لفظوں کو الف سے لکھنے کی طرف عام میلان ہو چکا ہو لیکن یہ بطور ایک تحریک کے تھا اور اس وجہ یا الف والے 'مختفی' کا پورا اطلاق ہوتا تھا، مثلاً راجہ کی جمع راجگان اور مہاراجہ کی مہاراجگان ہے۔ اس کو بعض مستند ادیبوں نے استعمال کیا ہے۔ مولانا شبلی کہتے ہیں۔

قرابت، راجگان ہند سے اکبر نے جب پیدا کی۔

یہاں مجھے وہی بات پیدا ہوتی ہے کہ فارسی اضافت کا استعمال اس طرح کے اثرات کے پھیلانے کا سبب ہوا۔ راجگان ہند کے بجائے "ہند کے راجاؤں" کا استعمال اس سے مرجح نہیں ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض عربی کے ایسے مستعمل الفاظ جو الف کے ہیں جیسے معما، تقاضہ، تماشہ، تماشا وغیرہ۔

اگرچہ ہائے مختفی کا استعمال بظاہر املائی نوعیت رکھتا ہے، لیکن اس کے پیچھے بعض صرفی مسائل ہیں اس لیے اس کا ذکر بے محل نہیں۔ جمع کی حالت میں (جاندار لفظوں) میں 'گان' کا اضافہ ہوتا ہے (ہائے حذف ہو جاتی ہے) اور اسم کیفیت کی صورت میں (گی) کا اضافہ، جیسے تشنگان، بندگان (جمع) اور تشنگی، بندگی، پردگی، خفتگی وغیرہ اسم کیفیت ہیں۔ لیکن یہ عمل سب لفظوں پر یکساں نہیں ہوتا۔

حوالے:

۱- [illegible]
۲- [illegible]
۳- ڈاکٹر عبادت [illegible] ۱۹۹۱ء ص ۳۹۔
۴- مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی نے "فرہنگ آصفیہ" کے [illegible] لفظوں میں ہندی کے لفظوں کی تعداد [illegible] ہے [illegible] زیادہ ہیں [illegible] اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہماری زبان کی اصل زمین [illegible] ہندی ہے۔ [illegible]
۵- [illegible] "قلب" کی مثالیں ہیں اور عربی میں "قلب" پر الگ رسالے ملتے ہیں۔ حال ہی میں ایک کتاب [illegible] تہران سے بعنوان "قلب در عربی" شائع کی ہے۔

۶- سنائی نے انجمنہا، الوانہا (دیوان سنائی بر صفحہ ص ۱) الحانہا (ص ۲)، ارکہا (ص ۵)، شاقان (ص ۱۳۲)، الفاظہا (ص ۱۹۳) ملوکان (ص ۳۸، ۳۵۸)، اسرار ہا، انقلابیہا، اردو احیا، (ص ۳۱۱) امتحان، ایدالان (ص ۳۵۸، ۳۱۱)، علائق ہا (ص ۳۶۹)، معانیہا (ص ۲۸)، اسرار ہا (۳۸۳) وغیرہ نظم کئے ہیں۔ بس اردو میں اگر الفاظوں، اسراروں، اولیاؤں وغیرہ استعمال ہوں تو کوئی تعجب نہیں۔

۷- شعر کی زبان نثر کی زبان سے اس لحاظ سے ممتاز ہوتی ہے کہ اس میں لفظ کی اصل شکل، فارسی اضافت اور عربی وفارسی جمع کے قاعدے عموماً برقرار رکھے جاتے ہیں۔

۸- دیکھئے نوائے ادب اپریل ۱۹۶۱ء ص ۲۲-۲۳۔

۹- نوائے ادب اپریل سنہ ۱۹۶۱ء ص ۲۲۔

۱۰- اس سلسلے کی مثالیں وضع اصطلاحات سے لی گئی ہیں۔

۱۱- نوائے ادب اپریل ۱۹۶۱ء ص ۳۵۔

۱۲- ایضاً

۱۳- ایضاً

۱۴- اس سلسلے کی بیشتر مثالیں وضع اصطلاحات سے ماخوذ ہیں۔

۱۵- ایضاً

۱۶- وضع اصطلاحات ص ۲۲۹۔

۱۷- یہ مثالیں وضع اصطلاحات سے لی گئی ہیں۔

۱۸- ترکی چی جو صفت یا قاطعیت کے معنی دیتا ہے اس سے الگ ہے۔ (وضع اصطلاحات ص ۷۹)

۱۹- یہ مثالیں ''وضع اصطلاحات'' سے لی گئی ہیں۔

۲۰- دیکھئے مجلہ علوم اسلامیہ جون ۱۹۶۱ء ص ۹۵، ''انجم'' ص ۱۹، ۲۰۰-۲۰۱۔

☆☆☆

امیر حسن عابدی*

قند مکرر

عہد شاہجہانی کا ایک قابل توجہ شاعر یعنی سعید قریشی

شاہجہاں (۱۰۳۷-۱۰۶۹ھ) کے سنہرے عہد میں جہاں زینت وآرائش کے تمام اسباب جمع تھے وہاں شعر وسخن کا بھی بے حد چرچا تھا۔ شاہی دربار کے علاوہ شاہزادوں اور امراء کے درباروں میں بھی متعدد شعراء رہتے تھے جنہوں نے ملک کے کونے کونے میں شعر وسخن کے چراغ روشن کر رکھے تھے۔ انہیں میں سے ایک شاعر سعید قریشی بھی ہے۔

شیخ محمد سعید قریشی ملتانی متخلص بہ سعید عنفوان شباب میں اپنے وطن سے چل کر احمد آباد (گجرات) پہنچا اور وہاں شہزادہ مراد بخش (م: ۱۰۷۱ھ) کا نہایت مقرب درباری بن گیا۔ ایک مرتبہ جب شاہزادہ غسل خانہ میں تھا اور داروغہ نے سعید کو ان کے پاس جانے سے روکا تو اس نے یہ رباعی کہہ کر بھیجی:

ای شاہ جناب تو جناب اللہ است   ہر حکم تو چون حکم کتاب اللہ است

این حیلہ دیو مغل مناع ورت   ابلیس صفت مانع باب اللہ است

اس پر شاہزادہ نے حکم دے دیا کہ سعید حرم کے علاوہ جہاں چاہے اس کے پاس پہنچ سکتا ہے۔ ''تذکرہ حسینی'' میں اس قصہ کے سلسلہ میں بجائے مراد بخش کے شاہجہاں کا نام ملتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

سعید کافی حاضر جواب اور بذلہ گو تھا جس کی وجہ سے امرا اور عوام دونوں اسے پسند کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ جب کہ عید الضحیٰ کے موقع پر شاہزادہ گوسفند ذبح کر رہا تھا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس پر سعید نے بے ساختہ یہ شعر پڑھا:

عید قربان است وی خواہم کہ قربانت شوم   ہمچو چشم گوسفند کشتہ حیرانت شوم

اسی طرح ایک مرتبہ جب عید فطر کے موقع پر عید گاہ جاتے ہوئے مراد بخش نے سعید سے کہا کہ

---

* (مرحوم) پروفیسر ایمریٹس شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

** یہ مقالہ جنوری ۱۹۶۳ء کے ''قند مکرر'' میں شائع ہوا۔

اگر اس موقع پر اس نے کچھ کہا ہو تو سنائے تو سعید نے ایک کاغذ ہاتھ میں لیکر یہ غزل سنانی شروع کر دی۔

روز عید است لب خشک می آلود کنید   چارۂ کار خود ای تشنہ لبان زود کنید
دیر گاہی ست کہ از دیر مغان دور تریم   زود باشید و بکف جام زر اندود کنید
حرف بی صرفۂ واعظ نتوان کرد بگوش   گوش بر زمزمۂ چنگ و نی و عود کنید

مگر جب بعد میں شاہزادہ نے کاغذ مانگا تو پتہ چلا کہ کاغذ بالکل خالی تھا اور سعید نے یہ غزل فی البدیہہ پڑھی تھی۔ ایک مرتبہ احمد آباد کے ایک شکارگاہ میں مراد بخش نے فی البدیہہ یہ مصرعہ پڑھا:

دگر امشب نسیم صبح عنبر بار می آید

اور سعید نے فوراً اس پر ایک پوری غزل کہہ دی:

دگر امشب نسیم زلف عنبر بار می آید   مشام خاطرم را نکہت دلدار می آید

یہ غزلیں بھی سعید نے فی البدیہہ کہی تھی:

ہمدم او اختلاط این و آن تنہا بس است   عاشقان را ہمدمی با خاطر شیدا بس است
ما کہ بدنام جہانیم ز خود کامیہا   کام و نا کام بسازیم بہ بدنامیہا[؟]

جب شاہجہاں بادشاہ کو مراد بخش کی غفلت اور مدہوشی کی خبر ملی تو علی نقی کو دربار سے شہزادہ کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا۔ چونکہ علی نقی کو سعید سے نفرت تھی اس لئے اس نے شاہزادہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ یا تو سعید کو برطرف کر دیا جائے یا خود اس کو اس کے فرائض سے سبکدوش کر دیا جائے۔ جب سعید کو یہ خبر ملی تو وہ خود ہی احمد آباد چھوڑ کر چلا آیا۔ جب شاہزادہ کو پتہ چلا تو بڑی بے چینی سے بلا بھیجا۔ مگر سعید واپس نہ آیا اور معذرت کے ساتھ ساتھ یہ غزل بھی بھیج دی:

مشکل بود بگوئی تو دیگر نشست ما   پیچیدہ است زلف تو بہر شکست ما
فارغ ز دین و کفر شدہ بعد ازین سعید   ما و سر نیاز و بت خود پرست ما

اس غزل کے جواب میں شاہزادے نے پھر سعید کو خط لکھا اور بڑے شوق سے بلایا۔ اس خط کے چند جملے یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

"شجاعت شعار...... محمد سعید...... عرض داشتی کہ از
اجمیر...... فرستادہ بود بنظر...... در آمدہ...... آن تنک حرام
بسزای خود رسید...... باید آن ندامت سرشت...... بزودی
خود را بر کاب سعادت برساند"

احمد آباد سے واپسی پر سعید کچھ دنوں دارا شکوہ (م: ۱۰۶۹) کے دربار میں رہا لیکن جب عالمگیر

تخت پر بیٹھا تو اس کا منشی اور مقرب بنا اور چار صدی منصب تک پہونچا۔ مولف "مخزن الغرائب" کا بیان ہے کہ اس وقت کی وجہ سے اسد خاں گو اور دیوان اعلیٰ ان پر رشک کیا کرتے تھے۔
آخر کار ۱۰۸ھ (۷-۱۶۷۶ء) کے رمضان کے مہینہ میں پنجشنبہ کے دن ملتان میں سعید کا انتقال ہوا اور اپنے بنوائے ہوئے مقبرہ میں مدفون ہوا۔
سعید اپنی شاعری اور خاص کر اپنی غزل گوئی پر فخر کیا کرتا تھا:

سعید شعر غریب تو بس کہ رنگین است   زبان ز خواندن آن می شود چو از پان سرخ

نیز اس فن میں اس نے حافظ اور عراقی سے کافی استفادہ کیا اور ان کی پیروی کی کوشش کی ہے:

بہرہ   شیخ   عراقی   شدہ   ز   آن   باقلیم   سخن   خاقانی

عراقی کی مشہور غزل کے جواب میں کہتا ہے:

میان خود بستہ بہر قتل مردم   اجل را درمیان بدنام کردند
بہم پیچیدہ اول دانہ و دام   و زان پس خال و زلفش نام کردند

حافظ کی غزل کے جواب میں ہے:

در باطن است از دل و جان پیش تو سعید   در ظاہرا بجانب بنگالہ می رود

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سعید کے دیوان غزلیات (۱۳۰۳ شعر) میں ایسے شعر ملتے جن میں روانی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ مثلاً کہتا ہے:

آشکارا می کند اشکم غم جانانہ را   فاش می سازند طفلان راز ہای خانہ را

چاک شد جامۂ تقوی و جنوز   عقل در بند رفو کاریہاست

اسلام بہ قتادۂ چشم سیاہ اوست   کفر انتخاب نسخۂ سحر نگاہ اوست

جو فروشی دیدہ از گندم نمایہای دوست   دشمن گندم فروش جو نما ہم دیدہ ام

اللہ اللہ باوجود این وفا   پیش یارا بی وفا شرمندہ ام

عقل و ساقی و صہبا سعیدا از سر مستی   برغم صوفیان خود را قلندر می توان کردن

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ سعید کے یہاں ایسے اشعار بھی بکثرت ملتے ہیں جو حسن غزل سے عاری اور رسمی شاعری کا نمونہ ہیں جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے واضح ہو سکے گا:

رقیب سگ ز سالوس خیالی رو بھی دارد　　گذشت از دعوی شیری و سر گروہ شغالی را

پامال کردہ فیل دمان ماست در دہی　　ہر چیونٹی کہ یافتہ از عون او کمک

سعید کی ایک غزل کے متعلق مؤلف "مرآت الخیال" لکھتا ہے:

"این غزل عجیب برا این طرز غریب از واردات خاطر اوست"

وہ غزل یہ ہے:

نفس نفس من ای بو الہوس ہوس بہ ہوس　　مرو چو مرغ اسیر از قفس قفس بقفس

بغیر یاد خدا ہر نفس کہ می گذرد　　ندامتی ست مرا زآن نفس نفس بنفس

سعید نے حسب ذیل غزلیں خواجہ معین الدین حسین مخدوم زادہ مشہور بشاہ غازی اور مرزا احمد بیگ حقیقی کو بھیجی تھیں۔

در ازل دلہا چو باہم آشنا داریم ما　　تا ابد از خود دہان چشم وفا داریم ما

چشم در کار فسون کاریہا ست　　شمع سر گرم گہر باریہا ست

تا نثار سر پروانہ کند　　شمع سر گرم گہر باریہا ست

چشم بیمار و لبت گفت دوائیم ہمہ　　از پی خستہ دلان عین شفا ایم ہمہ

شاہ غازی اور حقیقی نے بھی ان غزلوں کے جواب میں غزلیں کہہ کر سعید کو بھیجیں:

در جہان آباد اگر صد آشنا داریم ما　　چشم یاری دایم از لطف شما داریم ما

تا مگر در گلشن وصل تو رہ پیدا کنیم　　نیست ہمراہی باد صبا داریم ما

دیدہ سرشار گہر باریہاست　　دل گرفتار دل افگاریہا ست

در حقیقت دگری نیست خدائیم ہمہ　　لیکن از گردش یک نقطہ جدائیم ہمہ

مرزا روشن ضمیر، شاہ غازی اور محمد فاروق نے درج ذیل غزلیں کہہ کر سعید کے پاس بھیجیں:

ای بوصل دیگران شاد از جدائیہای ما　　وی زما بیگانہ یاد از آشنائیہای ما

آخر از بیزدان پرستی خود پرستی شیوہ شد　　مکتب فریاد و داد از آشنائیہای ما

ای خوش آن ساعت کہ باہم آشنا بودیم ما　　خوشنما در چشم ہم بچون حیا بودیم ما

قطرہ بگریست کہ از بحر جدائیم ہمہ　　بحر بر قطرہ بخندید کہ مائیم ہمہ

اور سعید نے ان کی غزلوں کے جواب میں یہ غزلیں کہی ہیں:

ای ضمیرت آگہ از درد جدائیہای ما　　بر تو چون خورشید روشن آشنائیہای ما

باہم آن عہدی کہ از روز ازل بستیم ما　　شکر للہ بردہائیم و دہان بستیم ما

روز و خورشید صفت عین ضیائیم ہمہ　　چون توان گفت کہ از خویش جدائیم ہمہ

غزل کے علاوہ سعید نے قصیدے (۳۶ عدد ۱۳۹۷ شعر) مثنویاں (۳ عدد ۸۸۰ شعر) رباعیاں (۶۹ عدد) اور قطعے (۲۰ عدد ۱۹۰ شعر) بھی کہے ہیں۔ قصیدوں میں مناجات، رسول، اہل بیت اور خلفائے راشدین کی منقبت، شیخ عبدالقادر جیلانی شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، خواجہ معین الدین حسن سجزی کی مدح اور مراد بخش، شاہ شجاع، مرزا نور اللہ، مرزا امیر، مرزا احمد بیگ حقیقی، رستم رای وکنی، لطف اللہ خاں مازندرانی کی ستائش ہے۔ سعید نے اپنے بعض قصیدوں کے یہ نام بھی رکھے ہیں: عروۃ الوثقی، خلاصۃ العقاید، مرآۃ الصفا، شمس المعانی، مصداق الصدق، صفات العشق، اقتدار الفصحا، عدوسوز، رسوخ الاعتقاد، مسالک العشق، عین الوضاحت، مفتاح الفتوح۔

سعید کی مثنویوں میں ایک مثنوی "رسالہ شوق" ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے:

آن ذات کہ واجب است و مطلق
ممکن نرسد بکنہش الحق

اس مثنوی کی تصنیف کا سبب لکھتے ہیں:

بودم بحضور خاطر شاد　　از کش مکش زمانہ آزاد

کامد ز درم گروہ یاران　　چون بوی نسیم نو بہاران

گفتند بمن ز فرط اخلاص　　کای گشتہ بحر عشق غواص

بگوی ز عشق داستانی　　تا از تو بجا بود نشانی

گفتم کہ کجا دماغ دارم　　کافسانہ دیگران نگارم

من چون شدہ ام فسانہ عشق　　فارغ نیم از ترانہ عشق

گویم سخن ز شوق آن یار   کز دوری او چنین شدم زار

اس مثنوی میں کچھ سعید کے خطوط بھی ہیں جو مثنوی کی شکل میں لکھے گئے ہیں:
اس کے علاوہ دو مثنویاں اور بھی ہیں جو سعید کی عرضداشت اور خط کی صورت میں ہیں۔

سعید کی رباعیوں میں بھی مناجات و نعت رسول کے علاوہ خلفاء راشدین کی منقبت حضرت شیخ احمد گنج بخش گجراتی، شیخ احمد، حضرت شاہ عالم[۸]، خواجہ بہاء الدین نقشبند[۹] وغیرہ کی مدح اور مراد بخش وغیرہ کی ستائش ملتی ہے۔ اس کے علاوہ سعید نے کچھ رباعیاں کہہ کر باقی کی مصنف، میر مظفر حسن اسکی، دیانت خان[۱۰]، آنندرای ہندو، مخلص خان[۱۱]، اسلام خان[۱۲]، اور میاں محمد صالح[۱۳] وغیرہ کو بھیجی تھیں۔

قطعوں میں سعید نے فتح بلخ و بدخشان، فرار نذر محمد، ولادت سلطان ایزد بخش، بنائی "گلشن مراد"[۱۴]، نیز مرزا احمد باقی اور علی احمد کے لکھے ہوئے دیوان سعید کے نسخوں کی تاریخیں کہی ہیں۔ مرزا ذوالفقار موید[۱۵] اور خواجہ محمد رضا حاجی وغیرہ نے سعید کو قطعے بھیجے تھے اور سعید نے بھی قطعوں میں ان کا جواب دیا تھا۔ نیز ان کا ایک قطعہ وہ ہے جسے سید نعمت اللہ[۱۶] کے پاس بھیجا گیا تھا۔

دیوان سعید کے اس قلمی نسخہ میں جو ایشیاٹک سوسائٹی (۱۷۷) میں ہے تین دیباچے ہیں۔ پہلے دیباچہ (۴۳ صفحے) میں لکھتے ہیں:

"از روز ازل سخن بوجہ احسن نصیب... سعید خان... شد... در اوایل حال... اکثر اوقات از طواف مزارات متبرکہ مشایخ... ملتان کہ مسقط الراس این احقر الناس است، اکتساب انواع سعادت... نمودہ، خصوصاً آستان بوسی روضہ... حضرت شیخ بہاء الدین زکریا و حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتح... سعادت اندوز... بود۔ تا آنکہ... در رویای صادقہ مشاہدہ نمود کہ... حضرت بہاء الملۃ والدین کہ خلف الصدق سجادہ نشین آن سلسلۂ عالیہ بود... کلبۂ احزان این حزین رسیدہ... محرک استحکام سلسلۂ سخن... می شود۔ داعی از آن خواب... چشم... کشادہ... گویا آن مصرعۂ... لسان الغیب کہ "آن شب قدری کہ گویند اہل خلوت امشب است" مصداق حال... آن شب بودہ... یکبارہ... مایل بایجاد و کلام منظوم... گشت... فردای آن... این مطلع با چند بیت... در سلک نظم آورد:

ای نکہ تو ندیدہ و گر دلبر آفتاب   ہر چند گشتہ گرد جہان یکسر آفتاب

... سامعان... محو حیرت گشتند... بعد از چند گاہ روزی... در محفل آن سلالۂ صدر نشینان انجمن عرفان رسیدہ و توجہ... آن والا درجات... ازآنچہ در خواب دیدہ بود بصد وجہ زیادہ... برای العین دید... کاہی می بود کہ روزی چہار، غزل و پنج غزل بداہۃً گفتہ می شد... روزی... در... ملتان... فقیری... رسیدہ آمدہ... خواندن اشعار جانسوز... آغاز کردہ بعد از ساعتی بداعی خطاب کرد کہ تو ہم شعری... بخوان... حسب الارشاد... شروع در خواندن غزل کردہ بجز بیت تخلص نرسیدہ بود کہ آن مہر تعلیم حضرت معبود فرمودہ کہ تخلص شما سعید خواہد بود" ص ۳۲-۳۳

دوسرے دیباچہ (۱۱ صفحے) میں لکھتے ہیں:

"میر معین الدین محمد المتخلص بخاری... بر زبان آوردند کہ از قیام این امر بزرگ متقاعد گشتہ ابواب معذرت طلبی را دست آویز طبع بہانہ جو ساختن دور از آئین مروت و اخلاص است... لاجرم فرخ در رجب سال ہزار و ہفتاد و یک ہجری این چند کلمہ... مرقوم گردید" ص ۱۰

اور تیسرے بے نقط دیباچہ (۹ صفحے) میں کہتے ہیں:

"اسم اللہ المحمود الودود... کہ در دلہا در ہمہ دلہا ورود... الحمد للہ کہ در سال دو صد و سہ و ہکرد وسہ وداع مرحلہ سر کرد... در عرصہ ملاء و کلوطہ الا آمد" ص ۴

سعید نے اپنے دیوان کے آخر میں اپنے بعض اشعار کو الگ کر کے لکھا ہے اور نثر میں ان کی تصنیف کا سبب بھی بتلایا ہے۔ دیوان کے اس نسخہ میں بعض وہ خطوط بھی ہیں جن کو خود سعید نے لکھا تھا۔ اسی طرح وہ خطوط بھی ہیں جو مرزا عبدالرسول استغنا[۱۷] وغیرہ نے سعید کو لکھا تھا۔

آخر میں اس نسخہ کے کاتب علی احمد لکھتے ہیں:

"سنہ ہزار و ہفتاد و یک ہجری از بنگالہ بدہلی رسیدہ برادر... ناصر خان را کہ از خویش برادر یکی ماندہ بود صاحب فراش یافت بجوار

رحمت پیوست ـــــ حال من ـــ از کجا بکجا رسید ـــ از
اتفاق ـــ سعید خان کہ مدتہا ... بخدمت ایشان در ـــ قندھار و
بلخ و غیر آن ـــ روزگار ـــ را ـــ خوش و خرم گذرانیدہ چندی از
گردش فلک جدا ماندہ بود ـــ رسیدند ... گفتم .. بسا اشعار رنگین ...
بمنصۂ ظہور آمدہ .. اگر بقید ترتیب در آوردہ مجلد سازند ... منت
جسیم بر جان و دل دوستان ... گذشتہ می آید .. فرمودند کہ آری
مسودات اکثر ضایع شدہ ... بعد از آن اشعاری کہ جمع شدہ بود در
سنہ ہزار و شصت و سہ بامر ... مراد بخش بقید تحریر ... در آوردہ و
بدیباچہ ئی نقطہ حزین ساختہ ارادہ داشتیم کہ مدون شود ... بفعل
نیامد ۔ در این ایام ... میرزا امیر ... باعث شد کہ آن مسودات
حال جمع کردہ اند ... در اواخر شہر ذی قعدہ سنہ ہزار و ہفتاد و یک
ہجری ... این دیوان ... بخط شکستہ من صورت اتمام گرفت۔"

حوالے:

۱۔ گوئندہ شیر شاہ ـــ در قصبہ دہلی مکان مقرر کردہ بود کہ بعد از فراغ از غسل در آن می نشست ـــ چون نوبت بہ ... اکبر ... رسید آرا دیوان خاص نام گذاشت ـــ و آن مکان را غسل خانہ می گفتند ہر چند رسم غسل تیز بر طرف شدہ ۔ (فرہنگ آنند راج ج ۳ ص ۸۲۹)

۲۔ سعید کی اس غزل کے جواب میں ان کے ایک دوست مرزا محمد حسین خدائی نے یہ غزل کہی تھی:

ما کہ رویا فتنۂ نیم رنگ نما سیما — کامیاب دو جہانیم لا کاسیما

۳۔ نواب عمدۃ الملک امیر الدولہ مخاطب بہ اسد خان و ذوالفقار خاں بہادر نصرت جنگ مغلوں کے زمانے میں ایک اہم شخصیت کے مالک تھے ۔ ملا حاجی لاہوری متخلص بہ بجو رنے آپ کے بڑے لڑکے مرزا اسمٰعیل کی تاریخ ولادت کہی ہے۔

۴۔ ص ۱۷۴

۵۔ مرزا محمد بیگ متخلص بہ جنتی کے آبا و اجداد ماوراء النہر کے رہنے والے تھے ۔ مؤلف "مرآۃ الاقبال" لکھتے ہیں:
"جوانی خوش طلعت پاکیزہ روزگار بود در عین شباب مرگ روحش بسر پنجۂ شاہین اجل گرفتار گردید شیخ محمد سعید بادی نظر داشت ۔ مؤلف از زبان شیخ شنیدہ کہ در احمد آباد چند روز در حویلی اقامت اتفاق افتاد کہ ہمسایہ جا می گفتند در یکی از جنیان گذر دارد یکی از روز ہا میرزا محمد بیگ جام صبوحی زدہ وارد گردید وحیدۂ سبز رنگ با

شراب ارغوانی ہمراہ داشت بجانب آن نگاہ کردہ ... گفت "چہ رنگ است این چہ رنگ است" ناگاہ از گوشۂ حجرۂ ایوان کہ در آن مجلس منور بود آواز آمد:

بحیائی امرد کون بی عقل — چہ رنگ است این چہ رنگ است — ص ۹-۷

۶۔ سعید نے یہ غزل فی البدیہہ کہی تھی

۷۔ مرزا روشن ضمیر متخلص بہ ضمیر شاہ جہاں اور عالم گیر کے زمانہ میں ممتاز عہدوں پر فائز ہوتے رہے سنہ ۱۰۷۷ھ (۷-۱۶۶۶ء) میں ضمیر نے انتقال کیا ان کو عربی، فارسی اور ہندی میں بڑی قدرت حاصل تھی اور فارسی اور ہندی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ علم موسیقی کی مشہور کتاب "پاچا تک" کو ضمیر نے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے اس فارسی ترجمہ کے قلمی نسخہ رام پور (۱۴۵۴) اور علی گڑھ (۱۳) میں موجود ہیں۔ ضمیر کو موسیقی میں بڑا کمال حاصل تھا۔ مؤلف مرآۃ الاقبال لکھتے ہیں "در علم ... موسیقی بجائی رسید کہ او ستادان ماہر پیشہ گروش مباہات نمودند ... گویند بیناردہ ہزار و نواین صدا بین سامعہ او از اہل صحبت گردیدہ بود" (ص ۱۵۰)۔

۸۔ محمد فاروق حقیقی اور سعید کے دوست تھے۔ حقیقی کے مشہور مطلع کے مقابلہ میں اس نے بھی مطلع کہا ہے:

حقیقی: در حقیقت ذرّہ ای نیست خدا ایم ہمہ — جمیں از گردش یک نقطہ جدا ایم ہمہ

فاروق: قطرہ دگر نیست کہ از بحر جدا ایم ہمہ — بحر بر قطرہ دہند یہ کہ ما ئیم ہمہ

غالباً یہ وہی فاروق ہیں جس کو مقالات الشعراء کے مؤلف نے ملتانی کہا ہے۔

۹۔ آپ کا مزار احمد آباد میں ہے:

۱۰۔ آپ کا اصل نام محمد بن محمد بخاری ہے۔ آپ سنہ ۷۱۸ھ (۱۹-۱۳۱۸ء) میں پیدا ہوئے اور سنہ ۷۹۱ھ (۸۹-۱۳۸۸ء) میں آپ کا انتقال ہوا۔

۱۱۔ حکیم جمال کاشی مخاطب بہ دیانت خاں شاہجہاں اور عالمگیر کے عہد میں مختلف معزز عہدوں پر فائز رہے آپ دو ہزاری سات سو سوار کے منصب تک پہنچے۔ شاہجہاں کے عہد میں آپ چار صوبوں کے دیوان اور عالمگیر کے زمانہ میں دیوان بیوتات مقرر ہوئے۔ آخر میں آپ معزول ہوئے اور سنہ ۱۰۸۳ھ (۷۳-۱۶۷۲ء) میں آپ کا انتقال ہوا۔

۱۲۔ قاضی نظام کرہرودی مخاطب بہ مخلص خاں عہد شاہجہانی میں ڈیڑھ ہزاری دو سو سوار کے منصب تک پہنچے۔ دارا شکوہ کی پہلی جنگ میں آپ شاہی فوج کے ساتھ تھے اور جب دوسری جنگ میں دارا شکوہ نے شائستہ خاں کو اپنے ساتھ لیا تو مخلص خاں ان کی جگہ ناظم اکبر آباد مقرر ہوئے۔ عالمگیر کے عہد میں آپ دو ہزاری تین سو سوار کے منصب تک پہنچے۔

۱۳۔ میر ضیاء الدین حسین بخشی مخاطب بہ اسلام خاں نے ۱۰۷۴ھ (۶۴-۱۶۶۳ء) میں انتقال کیا۔ غنی کشمیری نے آپ کی وفات کی تاریخ کہی ہے مؤلف آثر الامرا لکھتے ہیں

''اسلام خان خالی از کمال نبود و اشعار آبدار از جوئبار طبع شگفتہ بارش تراوش کرد۔ این دو بیت از و مشہور است:
پی تو شام غم بروز ماشبخون می زند مردم چشم ز گریہ غوطہ در خون می کند (ج ۱ ص ۲۴۰)

۱۴۔ یہ غالباً وہی ہیں جن کا ذکر مولف مقالات الشعرا نے بھی کیا ہے۔ مولف عمل صالح بھی خوشنویسوں کے سلسلہ میں غالباً انہیں کے لئے لکھتے ہیں: میر محمد صالح و میر محمد مومن پسران میر عبداللہ مشکین قلم میر صالح در فارسی و در ہندی سبحان تخلص می کند ہر دو را با نغمہ ہندی گوشہ خاطر بست'' ج ۳ ص ۴۴۴۔

۱۵۔ مراد بخش نے یہ باغ احمد آباد گجرات میں بنوایا تھا۔

۱۶۔ ''دبستان مذاہب'' کو مختلف لوگوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ منشی غلام محمد نوی نے ۱۲۰۹ ہجری کے لکھے ہوئے نسخہ سے انتخاب رکی (Lect Rugby) کے لئے جو نسخہ نقل کیا تھا اس میں اس کتاب کا مصنف انہیں کو موبد کو بتلایا ہے اور پورا نام یوں ملتا ہے: میر ذوالفقار علی الحسینی المتخلص بہ موبد شاہ'' ملا فیروز کے دبستان کے نسخہ میں بھی یہ کتاب انہیں موبد کی طرف منسوب کی گئی ہے۔

۱۷۔ حضرت شاہ نعمت اللہ نارنول کے رہنے والے تھے۔ بنگال پہنچ کر آپ نے چند دن اکبر نگر عرف راج محل میں گزارے۔ اس کے بعد فیروز پور پہنچے اور وہیں سکونت اختیار کرلی شاہ شجاع (متوفی بسال ۱۰۷۰ھ-۱۶۵۹-۶۰ء) وغیرہ آپ کے مرید تھے۔ شاہ شجاع کی شکست کے بعد معظم خاں حاکم بنگال کو عالمگیر کا حکم پہنچا کہ سید رحمت اللہ کو دربار بھیجا جائے مگر اس کی نوبت نہ آئی اور آپ نے سنہ ۱۰۷۷ھ (۶۷-۱۶۶۶ء) میں انتقال کیا۔

☆☆☆

شعیب اعظمی*

قند مکرر

شبلی کی فنکارانہ شخصیت

ان کے فارسی اشعار کی روشنی میں

شاعری از من مجو دور از سواد ہمچنی
حالیا شبلی شدم رند غزلخوان نیستم

شبلی کی ایک فارسی غزل کا یہ مقطع اُس وقت کا ہے جب ان کی عمر اکیاون سال کی ہو چکی تھی اور وہ بقول خود علی گڑھ اور ندوہ کی کھکھیڑ اور حیدرآبادی دربار کی حضوری سے آزاد ہو کر اعظم گڑھ کی بنجر اور بیہڑ سرزمین میں بقول غالب ''قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم'' اپنے خون دل سے ہر سر خار کی آبیاری کر رہے تھے اور اپنی دو معروف و شہرۂ آفاق تصنیفات 'شعر العجم' اور 'سیرۃ النبی' کی تصنیف و تکمیل میں دل و جان سے لگے ہوئے تھے۔ ملک کی سیاسی اور قوم کی تہذیبی اور تعلیمی سرگرمیوں سے گھبرا کر، انگریز سرکار اور سامراج سے بیزار ہو کر اور مدرسوں کی گھٹی ہوئی محدود ذہنیت سے فرار ہو کر وہ ایسی دنیا بسانا چاہتے تھے جو قدیم اور جدید علوم اور تمدن سے آشنا ہو اور مسلمانان ہند کے لیے ایک باعزت زندگی کی تعمیر کی ضامن ہو۔

ندوہ کے مقابلہ میں دارالمصنفین کا قیام، الندوہ کی ہمسری میں معارف کے اجرا کا مقصد، مسلمانوں کو علمی اور عقلی طور پر جدید فکر اور علوم اسلامی سے مشترکہ طور پر آراستہ کرنا تھا۔ شیخ اکرام کے بقول ''سرسید کے راستے سے دور ہو جانے کا سبب سید جمال الدین افغانی اور محمد بن عبدہ کی تحریک کے زیر اثر تھا۔'' شبلی نیشنل اسکول کی بنیاد ڈال کر دنیاوی طور پر وہ برادران قوم کو منصفی، تحصیلداری اور ڈپٹی کلکٹری کے عہدوں پر فائز دیکھنا بھی چاہتے تھے۔ اگرچہ وہ علی گڑھ کا قدیم بھاری بھرکم لبادہ بہت پہلے اتار کر

---

* سابق پروفیسر و صدر شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔ ۳۳۲-ئے/۲۳ ابوالفضل انکلیو نئی دہلی
** یہ مقالہ جون ۱۹۹۶ فکر و نظر کے خصوصی شمارہ کے شبلی نمبر میں شائع ہوا۔

پھینک چکے تھے مگر اس کی روح ان سے چمٹی ہوئی تھی۔ غیر شعوری طور پر ان تمام تر کوششوں کے باوجود وہی کام انجام دیے رہے تھے جس سے ایک زمانہ میں پیچھا چھڑاتا چاہا تھا۔

لیکن دارالمصنفین کے لیے زمین کا حاصل کرنا، عمارتیں تعمیر کروانا، اسکول کے لیے اساتذہ کی تلاش، ان کی تنخواہوں کی دائمی کی الیے برادری کے سربرآوردہ حضرات سے ماہانہ چندہ اگاہنا، زمین کے کاغذات کے لیے عدالتوں کے چکر کاٹنا اور غیر مشترک مستراح کا میسر نہ ہوتا۔ ان کے پرسکون قیام اور خوشگوار خوابوں میں حائل تھے۔ وہ اس کور دہ مقام پر اپنی ایک مثالی دنیا بسا کر اپنے ذوق کی تسکین کے لیے وہ کام کرنا چاہتے تھے جو انھیں دین و دنیا دونوں جگہ سرخ رو کر سکے مگر وہ جگہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے بجائے پالن جی ہوٹل بمبئی میں حاصل ہوئی جہاں ان کی معرکۃ الآرا کتابیں ہی نہیں وجود میں آئیں بلکہ ان کی اُردو اور فارسی شاعری پروان چڑھی اور پختہ ہوئی۔

شبلی کے شاگردوں نے یہ بات خاص طور پر لکھی ہے کہ وہ بچپن ہی سے فجر کی نماز کے بعد حماسہ کے اشعار اس ذوق و شوق سے گنگنایا کرتے گویا کلام پاک کی تلاوت کر رہے ہوں۔ اپنے استاد مولوی فاروق چڑیا کوٹی سے فارسی زبان میں مکالمہ اور مراسلہ بازی اس طرح ہوتی گویا استاد اور شاگرد نہیں، دو دوست ہوں۔ طالب علمی کے زمانہ سے ہی لوگوں کے مرثیے، تحریک نامے اور مراسلے فارسی زبان میں لکھے۔ اپنے بے تکلف دوست سمیع کو منظوم فراق نامہ بھیجا تو دوستوں کے دل تڑپا دیے:

تا نہ پنداری کہ خرم می رویم   از وطن با چشم پُرنم می رویم
از گداز شعلۂ غم ہچو شمع   بزم ما را کردہ برہم می رویم
از فریب مار گیسوئی کسی   زین جنان مانند آدم می رویم
شبلیا از گردش گردون دون   دوستان رفتند و ما ہم می رویم

(مقالات شبلی، ص ۷۶)

مولوی سمیع جن کو بہت عزیز رکھتے تھے اور جن کو ایک بار تاکید ایہ لکھا تھا:

''این نامہ ہا را نزد خود نگاہ باید داشت وضائع نخواہد کرد۔''

اپنے فارسی مکتوبات کی حفاظت کے لیے جو ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئے۔ مولوی سمیع کو بار بار لکھا پر جب کوئی جواب نہ آیا تو منظوم شکایت نامہ بھیجا۔ چند اشعار ملاحظہ کے قابل ہیں:

نگاہی بر من مسکین خدارا   کہ گاہی شاہ بنوازد گدارا
فغان کز ہجر تاب و صبر و آرام   غمت نگذاشت در دل ہیچ جارا
نہ یاد آری گہی از خستۂ خویش   فرامش ساختی حرف وفا را

سخن را رہ نباشد در وہانت   ز تنگی ہچو در غنچہ صبا را
کجا در بارگاہش بار بخشند   چو تسنیم غریب بی نوارا

داغؔ اور عزیز کے رنگ میں غزلیں لکھنے والے شبلی اس زمانہ میں تسنیم تخلص کرتے تھے اور اس عزیز دوست کے منظوم شکوہ میں کسی محبوب سے کم شکوہ طلبی نہیں ہے۔

تقریباً اسی زمانہ میں انھوں نے ایک نعتیہ ترکیب بند لکھا تھا جس کا نمونہ یوں ہے:

بنگر کہ چون در ہر فنی افزانہ کردم خرمی   ہم از گلی و گلشنی آراستم صد گلشنی
گردون ندارد چون منی فضل و ہنر را معنی   ایک بطلر روشنی معصمیم در ہر انجمن
بنگر کہ باچندین ہنر از جور چرخ ہفت سر   چون لالہ ام خون شد جگر ناسازی ختم مگر
کاندر چنین حالی بتر ہر دم دہد داغی دگر   از من کہ بگذارد خبر در بزم آن شاہ زمن

اور جب ان کے اپنے استاد فیض الحسن نے اس دار فانی سے کوچ کیا تو شبلی نے مرثیہ کے اشعار میں اپنا وہ درد اتار دیا جو سننے اور پڑھنے والوں کو خون کے آنسو رلا گیا:

درین آشوب غم عادم بہ کز نالہ زن گریم   جہانی را جگر خون شد ہمین تنہا نہ من گریم
بہ تحسین صبوری چند بفریبی مرا ناصح   وی بگذار تا در ماتم فیض الحسن گریم
بہ مرگش علم و فن در نالہ با من ہمنوا باشد   ہنر بر خویشتن گرید چو من بی خویشتن گریم
گہی بی خود بہ برہم گشتن بزم ہنر نالم   گہی بی خویش بر روز سیاہ علم و فن گریم

مولانا شبلی کا یہ مرثیہ فارسی کے مشہور مرثیہ ہفت بند کاشی کی یاد دلاتا ہے۔ مولانا اقبال احمد خان سہیل جو شبلی کے خورد عزیز بھی تھے اور شاگرد بھی، انھوں نے اپنے استاد شبلی کی شاعرانہ مہارت اور اصناف سخن میں ان کی قصیدہ گوئی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''شعرائی ایران میں قصیدہ گوئی کے اعتبار سے انوری، ظہیر فاریابی، کمال اسمٰعیل، خلاق المعانی، سلمان ساوجی، صف اول میں شمار کیے جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کے قصائد عام طور پر شائع ہو چکے ہیں اس لیے مولانا کے قصائد سے ان کا موازنہ بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ طویل الذیل قصائد کو میں یہاں قصداً نظر انداز کر رہا ہوں۔ صرف ایک نا تمام قصیدہ کے چند اشعار اور اُن کے شان نزول سننے کی زحمت دوں گا۔'' (افکار سہیل، ص ۷۶)

شان نزول کی داستان طویل ہے۔ مختصراً یہ ایک ایرانی شاعر تقی الدین کمال خنجر طہرانی رامپور،

لکھنؤ اور دہلی کے ادبی حلقوں میں اپنی فارسی شاعری کی داد لیتے ہوئے علی گڑھ وارد ہوئے اور یہاں کے اہل ذوق نے اور طلبہ نے شبلی سے ان کا مقابلہ کرادیا مگر وہ حضرت شبلی کے بہاریہ قصیدہ کے چند اشعار سن کر علی گڑھ سے چپ چاپ رخت سفر باندھ گئے۔ اس قصیدۂ بہاریہ کے چند اشعار اس طرح ہیں:

دوش ایں مژدہ بگوش گل و ریحان آمد   کہ بہار آمد و بسیار بسامان آمد
ابر گوہر ہمہ افشاند چو گریان بگذشت   گل ہمہ زر بہ پراگند چون خنداں آمد
آب را سلسلہ بر پائی بہ بستند ز موج   بسکہ دیوانہ وش از طرف بیابان آمد
ہر حبابی کہ سر از آب بر آرد گوید   بایہ از سر بہ تماشائی گلستان آمد
بوئی گل ہست کہ بر دوش صبا تکیہ نداشت   من غلط کردم و گفتم کہ سلیمان آمد
لالہ چو مغبچگان چہرہ بر افروخت بباغ   سنبل آشفتہ تر از طرہ و خوبان آمد

(افکار سہیل، ص ۷۷)

شبلی کے اس نامکمل بہاریہ قصیدہ کی فصاحت اور شعریت کے بارے میں بس صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ شبلی نے موازنہ انیس و دبیر اور شعر العجم میں شعر میں فصاحت پر جتنا زور دیا ہے کیا ان مذکورہ بالا اشعار میں وہ وقعت کارفرما نہیں ہے۔

شبلی نے یہ قصیدہ ۱۸۸۸ء میں لکھا اور اسی سال ایک دوسرا قصیدہ کشمیریہ لکھا۔ ان کو کشمیر سے بہت لگاؤ تھا اور متعدد خطوط میں کشمیر کے سفر کا ذکر ملتا ہے مگر ایران کی سفر کی مانند کشمیر کا سفر بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا اور وہ نینی تال اور کاٹھ گودام کے سفر کی رنگا رنگ تفصیل سے اپنے دوستوں کے دل گرماتے رہے۔ ۱۹۰۲ء میں مصر و شام کا شاندار سفر کیا۔ اسلامی جذبہ سے سرشار خلافت کے شیدائی، خلیفہ کی شاندار منظم سواری فوجی پریڈ دیکھ کر ان کا دل خوشی سے بھر آیا۔ مسلمانان ہند کے حال زار پر دل فگار اور اسلامی آثار میں کتاب خانوں کے جواہر پاروں کے لیے بیقرار شبلی، جوش مسلمانی میں تجہیز جیسی غیر شرعی شے سے بھی لطف اندوز ہوئے بنا نہ رہ سکے۔

در حقیقت ان کے اندر مولانا فاروق چریاکوٹی کی رنگا رنگ طبیعت اور روشن خیالی کا گہرا اثر تھا۔ وہ اعظم گڑھ کے رئیس المتغزلین تھے۔ شہر کے مشاعروں کے میر مجلس ہوا کرتے تھے اور گرم اور عاشقانہ غزلیں کہتے تھے۔ انھیں اثرات کے شاعرانہ شوق کے تحت اس سفر میں ان کے شوق کو جلا ملی اور وہاں کی ہر محفل ان کے اس ذوق کا سامان فراہم کرتی رہی۔ ذیل کے چند ابیات کس قدر پرکشش اور شاعرانہ سحر کاری کا نمونہ ہیں:

گاہ در بزم فقیہان گرانمایہ رسید   گاہ در حلقۂ رندان نظر باز آمد

گاہ با سادہ دلان شیوۂ تقلید گرفت   گاہ با دیدہ در آن پردہ در راز آمد
گاہ در تربت مقدس بہ تملق شد   از رخ شاہد فن پردہ بر انداز آمد
گاہ در قاہرہ و شام بہ تقاضائی ہوس   بہ تحیر شدہ و در جلوہ گہ ناز آمد

(یادگار شبلی، ص ۳۰۴)

اور جب اس یادگاری سفر سے لوٹے تو علی گڑھ کے ایک استقبالیہ میں خود اپنی شاعرانہ حیثیت کا ذکر کیے بنا نہ رہ سکے:

قاصد خوش خبر امروز نوا ساز آمد   کز سفر یار سفر کردۂ ما باز آمد
از سفر شبلی آزادہ بہ کالج برسید   یا مگر بلبل شیراز بہ شیراز آمد
دوستان مژدہ کہ آن بلبل خوش لہجہ دگر   اندرین تازہ چمن زمزمہ پرداز آمد

(یادگار شبلی، ص ۱۳۲)

جن لوگوں نے سفرنامہ مصر و روم و شام پڑھا ہے ان پر یہ امر روشن ہے کہ اس خشک واقعہ نگاری کے مقابلہ میں شبلی کے یہ اشعار کس قدر پرکیف اور رنگین ہیں۔

علی گڑھ میں سرسید کی رفاقت میں زعماء کی آمد پر قصیدے اور استقبالیے لکھنا اور بالبداہہ منظوم سپاس نامے مرتب کرنا شبلی کے لیے بڑی معمولی چیزیں تھیں۔ ۱۹۰۱ء میں میر عثمان علی خاں والی دکن علی گڑھ کے دارالعلوم میں قدم رنجہ ہوئے تو شبلی نے ۱۹ ابیات کا قصیدہ لکھا جس کا مقطع یوں تھا:

یا رب این رمز چہ پیداست کہ از زینت و ساز   ہست ہر گوشہ تماشا کدہ عربدہ ناز

۱۹۰۸ء میں سلطان جہاں بیگم والی بھوپال مدرسۃ العلوم ندوہ میں تشریف فرما ہوئیں تو شبلی نے ۱۹ اشعار کا قصیدہ تہنیت پیش کیا جس کے چند ابیات قابل توجہ ہیں:

آنچہ با دشت و دمن ابر بہاران کردہ است   خسرو کشور بھوپال بہ ما آن کردہ است
ندوہ را گر سرو سامان ندہد از دل چہ عجب   زان کہ ہر کار کہ او کرد بہ سامان کردہ است
چرخ از چشم جہان رابعہ را گر بہ نہفت   باز در پیکر پاک تو نمایان کردہ است
گوشہ مقنعہ اش قیمت افسر بشکست   نقش دیہیم کو کردہ کہ سلطان کردہ است
ہمہ مردان ہمہ آئین عمل خواہد بود   آنچہ در تربیت عالم نسوان کردہ است
دانش آموختن پردہ نشینان عفاف   مشکلی بود کہ از فکر خود آسان کردہ است
کار آموزش و تعلیم زنان گرچہ خوش است   نہ بآن شیوہ کہ آن گروہ کہ نادان کردہ است

سلطان جہاں بیگم کو رابعہ عصر کہا۔ ان کی تعلیم نسواں کی کوششوں کو مردوں کے لیے آئین عمل

قرار دینا اور بیگم کے برقعہ کے سامنے تاج کو بے حیثیت گردانتا اور ان کے لقب کو اسم بامسمیٰ قرار دینا شبلی ہی کی کارفرمائی تھی۔ اسی موقع پر انھوں نے "ایوان ندوہ" کے عنوان سے ایک ترکیب بند نظم کیا۔ اس کا ہر ہر بند اپنے اندر ایک جہان معنی سموئے ہوئے ہے۔ شبلی کی فارسی دانی، اسلامی تاریخ کی معلومات، صناعات کا بھرپور استعمال اور فصیح و سلیس زبان میں شعری قالب کو ایرانی اساتذہ کے ہم پلہ بنا دینا شبلی کی شاعرانہ مہارت کا بین ثبوت ہے۔ اس کا ایک بند دیکھیے کیا سبک خراسانی اور سبک عراقی کا اس سے بہتر نمونہ فارسی شاعری میں مل سکتا ہے:

ای کہ نیرنگ سرا پردۂ عالم دیدی — جاہ کیخسرو و فر و حشم جم دیدی
گونہ گون بازی گردون بہ نگاہ آوردی — بگر آرائی این برشدہ طارم دیدی
مسند آرائی جم را بہ نظر آوردی — تاج ملکوتی و علم طرۂ ویلم دیدی
داستانہائی جہانگیری خسرو خواندی — زور بازوئی کمند افگن رستم دیدی
فرۂ افسر و دیہیم تماشا کردی — سر بر افروختن رایت و پرچم دیدی
ہم جہانگیری شمشیر و سنان بشنیدی — ہم طرازندگی خلعت و خاتم دیدی
الغرض ہرچہ جہان را سر و سامان باشد — ہمہ را دیدی و خود گیر کہ ہیچم دیدی
خود گرفتم کہ در جلوہ گہ دولت و جاہ — آنچہ ہرگز نتوان دید تو آن ہم دیدی

لیک بالاتر ازین جملہ جہانی دگر است
کہ در و کالبدی دیگر و جانی دگر است (ص ۸)

شبلی کا شاعری کا ایک اصولی نظریہ تھا جس میں جامعیت، زور بیان، تخیل کی قوت، زور کلام کو بنیادی درجہ قرار دیا گیا تھا۔ کلام موزوں ہو اور متکلم نے بہ ارادہ موزوں کیا ہوں اور ان کی نظر میں شاعری بقول نظامی عروضی سمرقندی ایسی صنعت ہے جو خورد کو بزرگ اور بزرگ کو خورد، اچھے کو برے لباس میں اور برے کو اچھی شکل و صورت میں جلوہ گر کر دے۔ شبلی نے استوارٹ مل کے نظریہ شاعری کی بھی پیروی کی یعنی جو کلام اس قسم کا ہوگا کہ اس سے جذبات انسانی برانگیختہ ہوں اور اس کا مخاطب حاضرین نہ ہوں بلکہ انسان خود اپنا مخاطب ہو اس کا نام شاعری ہے چنانچہ کلاسیکل اور ماڈرن طرز کی شاعری کے دو نمونے شبلی کی نمائندگی کے گواہ ہیں:

روز عید است و دگر کار جہان گشت بساز — باز شد بر رخ گیتی در امید فراز
دست بیداد فلک آن ہمہ کوتاہ شدہ است — کہ دگر فتنہ نیارد کہ کند پای دراز
خلق را باز لب خندہ فراہم آمد — چون گل تازہ کہ غنچہ اش نتوان کردن باز

تن ازین پیش کی بادہ بہ خواہی امروز — نشۂ عیش ندارد بہ تہی و بادہ نیاز
خوشبہ الذات درون آئی کہ دیوان دارد — این ہمہ گرمی ہنگامہ و این زینت و ساز (ص ۱)

۱۸۹۸ء کے ایک عید یہ قصیدہ کی تمہید و تشبیب شبلی کے زور قلم کی ہی نہیں بلکہ ذہن رسا اور غرابت اور ثقل سے پاک منتخب الفاظ اور شستہ تراکیب کی بھی دین ہے۔ شبلی بامقصد شاعری کے قائل تھے اور اسی لیے ۱۸۹۰ء میں ایک اور سے قصیدہ کی نئی شان ملاحظہ ہو۔ غالب کی مانند شبلی بھی تقلید سے بیزار تھے:

شیوۂ مدح و غزل گرچہ ان آرا و ضیعت — مبتذل گشت نہ چندان کہ گوارا ماند
شعرا گرد و سخن دل کی نہ بود باتک فراست — نوگرامیست دل آشوب بخوغا ماند
بان دہان چند توان بود بہ تقلید اسیر — داشتی آن ہمی کہ بہ سلسلہ بہ پا ماند
جادۂ مغربیان گیر کہ این طرز نوی — دل پذیر و دل آویز و دل آرا ماند
راستی ورز و جہان دیگر گفتار آرائی — کہ فروغ اش از ناصیہ پیدا ماند

علی گڑھ میں جب تک سرسید کی رفاقت میں رہے ان کے چشم و ابرو کے اشارہ پر قصیدے، تہنیت نامے، رثائیہ ترکیب بند نظم کرتے رہے۔ سرسید نے جب حیدرآباد کا سفر کیا تو "شہر بیان دیار" کے عنوان سے سرسید کی شخصیت اور ان کے مشن کا سراپا ان چند ابیات میں منظوم کر دیا:

ای خجستہ کہ سرسید ما تو بفضل — رہبر قافلہ ماست بہ ہم راہ گذار
ذاتی خیرش [illegible] است کہ باشوکت و جاہ — مادرین ملک نبودیم بہ ہر پایہ فراز
مردی از غیب میان گشت و یاران ہمہ — ہم گرمی کہ ز تیغ بود بہ درون دار شرار
پست [illegible] ضعف بدن — از علی گڑھ بدکن آید وجیہ تمار
[illegible] قرطاس و قلم — ہمہ را بودیم از نسبت مذہب و طراز
الغرض [illegible] یاران ترتیب — تا کند خستہ دلان را نوازش تمار

تا بہ کی حسرت غرناطہ و بغداد خوری
قدر تجدید کہن در حرم مدرسہ آئی (ص ۴)

سرسید کی قربانیاں، بیدار قوم کی تیمارداری اور ان کو "مردی از غیب برون آید" کہنا اور خستہ دلوں کا مسیحا قرار دینا پھر ان کے مدرسۃ العلوم کو غرناطہ اور بغداد کی قدیم درسگاہوں کا مداوا اور بدل بنا دینا شبلی کے خلاصۂ نظم کا اعجاز ہے۔

قصائد اور ترکیب بند کی طرح ان کے قلم کی جادوگری مرثیہ کے میدان میں استاد مولانا فیض الحسن

سہارنپوری کے ماتم میں دیکھی جا چکی ہے۔ شبلی نے ۱۸۸۵ء میں نواب ضیاء الدین خاں نیر کا مرثیہ، ۱۸۸۷ء میں جنرل عظیم الدین خاں کا مرثیہ اور ۱۹۰۰ء میں اپنے والد شیخ حبیب اللہ کی وفات پر نظم کیا۔ والد کا مرثیہ ۳۲ رابیات پر مشتمل تھا جس کا مطلع اس طرح تھا:

ہاں ای پدر نہ گو یت این ورزد و آن مکن — زنہار عزم رہروی آن جہان مکن (ص ۱)

مثنوی قدیم شعراء کی دلچسپ صنف سخن تھی۔ نظامی گنجوی اس کے بادشاہ تھے۔ شبلی نے کوئی مثنوی باقاعدہ نظم نہیں کی لیکن وہ مثنوی نگاری پر بھی اسی طرح قادر تھے۔ منظر نگاری اور بزم آرائی کا کمال دیکھنا ہو تو شبلی کی مثنوی عید قسطنطنیہ اٹھا کر مصوری اور جذبات نگاری کا ایک نظر فریب جان نواز مرقع بقول اقبال سہیل ملاحظہ فرمالیجے۔ یہ مثنوی انھوں نے ۱۸۹۲ء میں عینا ملاحظہ کر کے نظم کی تھی جب کہ خلیفہ سلطان ترکی نماز عید اضحیٰ ادا کرنے تشریف لے جا رہے تھے۔ علامہ اقبال نے اردو کے بجائے فارسی زبان کو اپنے پیغام کا وسیلہ بنایا اور شبلی نے فارسی زبان سے اُردو کی طرف رُخ کرتے ہوئے 'سیرۃ النعمان' کے دیباچہ میں معذرت خواہی فارسی میں کی، وہ زور بیان، جذبات کی فراوانی، خیالات کی ہم آہنگی، تسلسل کلام اور جوش بیان بھی اس مثنوی کے میدان میں شبلی کی قادر الکلامی کی شہادت دیتا ہے:

گرچہ مرا شیوۂ این فن نبود — حرف بہ اُردو زدن آئین نہ بود
بزم چون آن فرہ و آن ساز داشت — ساغر من بادۂ شیراز داشت
لیک چون آن مطرب و ساقی نماند — بوئی از آن میکدہ باقی نماند
بزم بطرز دگر آراستم — خوشتر از آن نیز کہ می خواستم
گرچہ سرو برگ سخن دیگر است — شیخ ہمان است و لکن دیگر است

بادہ گوارا بہ عزیزان تمام
بادۂ گلگو نہ بہ سفالینہ جام

زخمہ کہ بر تار سخن می زنم — بان مگر تا بچہ فن می زنم
غارت بتخانۂ چین کردہ ام — تا صنمی چند گزین کردہ ام
خاک در میکدہا بیختم — کین ہمی صافی بقدح ریختم
پاچون درین معرکہ افشردہ ام — پایۂ فن تا بکجا بردہ ام
حرمت این کار نگہ داشتن — نامہ بہ لعل و گہر انباشتن

کار من است این نہ ہر خام نیست
این بود آن می کہ بہ ہر جام نیست (افکار سہیل، ص ۷۸-۷۹)

غرض شبلی ایک شاعر کی مانند ہر موقع و محل اور تقاضائے وقت کے مطابق شعر کہتے رہے۔ ۱۸۹۰ء میں "بزم تعلیم علی گڑھ" کے عنوان کے تحت ۱۶ ربندوں کا ترکیب بند لکھا۔ ۱۸۹۱ء میں امین الدین خواجہ کے نام "از لکھنؤ تا حیدرآباد" کی داستان سفر منظوم کی۔ ۱۸۹۰ء میں حیدرآباد میں سرسید کے ساتھ "دریوزہ گری" پر منظومہ لکھا۔ ۱۹۰۷ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کا ترکیب بند وغیرہ ان سب کے علاوہ ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

لیکن یہ سب کچھ ادھورا ہے کیونکہ فارسی اور اُردو کا شاعر جب تک غزل میں استادی نہ دکھائے وہ شاعر کہاں تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ اعظم گڑھ، علی گڑھ، حیدرآباد اور لکھنؤ میں ان کی صحبتیں مختلف رہیں۔ علی گڑھ میں آورد تھی مگر بقیہ جگہوں پر آمد کا نزول تھا۔ بقول شیخ اکرام حیدرآباد میں شرر، داغ، مرزا عزیز، ظفر علی خاں اور مولوی عبدالحق کی محفلوں میں غزل گوئی کا چرچا رہا اور داغ کا رنگ چھایا رہا۔ ملاحظہ ہوں ایک اُردو عشقیہ غزل کے چند اشعار:

اڑ کے پیچھے دل حزیں نے سراغ چھوڑا نہیں کہیں کا — گئے ہیں نالے جو سوئے گردوں تو اشک نے رخ کیا زمیں کا
وہی لڑکپن کی شوخیاں ہیں وہ اگلی سی ہر شرارتیں ہیں — سیانے ہوں گے تو ہاں بھی ہوگی ابھی تو سن ہے یہ نہیں نہیں کا
یہ نظم آئیں یہ طرز بندش سخن گری کیا فسوں گری ہے — کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی مزہ ہے طرز علی حزیں کا
(ذکر شبلی، ص ۲۳)

شعر العجم کے مصنف شبلی نے ہر اچھے شاعر کو اپنے تذکرہ شعراء کی فارسی کا جز بنالیا ہے۔ علی حزیں کی فارسی شاعری کی طرف اُن کا اشارہ بطور فخر ہے۔ کیا ہوا اگر وہ نظیری نہ بن سکے لیکن علی حزیں کی پیروی تو کرسکتے ہیں۔

شبلیا کیست کزو داد سخن می خواہی — گر نظیری نبود شیخ حزین میباید (ص ۱۰)

لیکن اس تمام ہنائی اور مہارت اور قدرت اور خداداد صلاحیت شعری کے باوجود اپنے آپ کو شاعر نہ مانتے تھے۔ یہ تفنن طبع تھی، تضیع اوقات تھی اور مزید برآں کہ ان کے پاس وقت کہاں تھا۔ وہ تسنیم سے شبلی اور شبلی سے کشاف بنے تا کہ قومی مسائل، اسلامی برادری، انگریزوں کی مخالفت اور ملکی اتحاد اور آزادی وطن کے لیے اپنے قلم کو نثر و نظم کے لیے وقف کردیں۔ چنانچہ ہمارا شاعر شبلی اپنے دلی جذبات کو سینہ میں دبا کر صرف اور صرف دوسرے موضوعات پر طبع آزمارہا۔ الہلال کے صفحات اور مکاتیب و مقالات شبلی اس درد مند قوم کے ہزار زخم سے بھرے ہیں چنانچہ وہ جا بجا شاعر ہونے سے انکار کرتا ہے اور برملا کہتا ہے:

فغان کہ از خرد و عشق کردہ ایم قبول — دو کارخانہ کہ با یکدگر نمی گردد

خرد و عشق فردوسی سے لے کر مولانا روم، سعدی، حافظ، غالب اور اقبال تک نبرد آزما رہے ہیں۔ شبلی ایک دوراہہ پر ایستادہ یہ کہنے پر مجبور ہیں:

''ندوہ کی جھنجھٹ اور شاعری ساتھ ساتھ چلنے کی چیزیں نہیں ہیں لیکن بہر حال چارہ بھی نہیں۔ ندوہ فرض مذہبی ہے اور شاعری فرض طبعی، کس کو چھوڑ دوں۔'' (ذکر شبلی، ص ۳۱۴)

۱۹۰۹ء میں ایک صاحب کو لکھتے ہیں:

''آپ نے اپنے پرچہ میں لکھا ہے کہ میں خواجہ عزیز الدین صاحب کا شاگرد ہوں لیکن میں ان کا شاگرد نہیں، نہ میں شاعر ہوں نہ میں نے کسی شاعر سے اصلاح لی ہے۔ یہ جو کبھی میں موزوں کر لیتا ہوں، یہ شاعری نہیں تفریح طبع ہے۔'' (ذکر شبلی، ص ۳۲۱)

۱۹۰۶ء میں کسی کو لکھا تھا:

''میری شاعری محض اتفاقی ہے، نہ کبھی اس میں اشتغال رہا اور نہ برسوں کچھ کہنے کا اتفاق ہوا۔''

(مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۱۸۳)

علی گڑھ کی ایک تقریر میں فرمایا تھا:

''میں آج سے بہت پہلے شعر بھی کہتا تھا لیکن وہ کس قسم اور کس درجہ کے تھے یہ نہ خیال فرمائیں کہ میں اپنی شاعری کو اعلیٰ رتبہ کی خیال کرتا ہوں۔ آج کی میری شاعری اگر پست ہے تو اس وقت پست تر تھی۔'' (مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۹۶)

مگر یہ سب فنکارانہ خاکساری تھی اور وہ بھی زمانہ اور دوستوں دشمنوں کی معاندانہ روش، اپنوں بیگانوں کی دل آزاری اور پھر قوم اور رہنمایان قوم کی بے حسی۔ انھوں نے اپنا قلم الکلام، علم الکلام، اسکات المعتدی الفاروق، النعمان، موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم جیسی مایہ ناز تصانیف کے علاوہ ملک و قوم کو درپیش ہزارہا مسائل کے حل کے لیے وقف کر دیا تھا اور دار المصنفین کی گوشہ گیری میں بہت کچھ کرنا چاہا تھا مگر وہاں بھی چین نصیب نہ ہوا اور بالآخر گھبرا کر عروس البلاد بمبئی کے ہنگامہ خیز ماحول میں جا بسے جہاں نہ صرف ہمارے ادب العالیہ کی مہتم بالشان ادبی تصانیف وجود میں آئیں بلکہ شبلی کی متاع گم گشتہ اور راز ہائے سربستہ ان کی غزلوں کی شکل میں یا پھر یوں کہیے کہ ''بوئے گل'' اور ''دستہ گل'' کی شکل میں ہمارے مشام جان کو معطر کرنے اور قلوب پژمردہ کو زندگی بسر کرنے کا سامان فراہم کیا۔

بمبئی میں ۱۹۰۶ء میں آمد ہوئی۔ وہ ادھیڑ عمر ہو چکے تھے اور شکست پائی نے بقول انھیں کے ''اللہ کے افضال سے تیمور'' ہو چکے تھے اور جیتے جی شبلی مرحوم و مغفور ہو چکے تھے مگر یہاں آنے کے اسباب متعدد تھے کیونکہ علمی کام کرنے کا اتنا عمدہ موقع ان کو اب تک کسی شہر میں نہ مل سکا تھا۔ دعوتوں کی فراوانی، یافت سہ گنی، اگرچہ مصارف زیادہ مگر پھر بھی وطن بنا لینے کے قابل۔

شبلی کے خیال میں ہندوستان کا کوئی شہر اس قابل نہ تھا کہ علمی یا اسلامی تحریک کا محل بن سکے۔ سوانح مولانا روم کے تکملہ کا شرف بمبئی کو ہی حاصل ہوا۔ شعر العجم کے بیشتر اجزا کی تسوید کا اعزاز پالن جی ہوٹل، فلارنس ہوٹل، کلیر روڈ، مرکھاری وغیرہ کو حاصل ہوا اور اسی باب الہند میں سیرت پاک جیسی بے مثال تصنیف کے تار و پود اور تانے بانے بنے گئے اور اسی چمنستان بمبئی میں شبلی حافظ شیرازی کی مانند بلبل ہند بن کر چہکے۔

وہاں کے موسم کو کشمیر کے موسم سے تشبیہ دینا، چوپاٹی اور اپالو کو شالامار اور نشاط باغ کے علاوہ حافظ شیراز کے رکن آباد اور مصلا کے ہم پلہ قرار دینا اور ترسازادان کو ایوان جمال کے جھوٹے طلسم قرار دینا اور بجی تصویروں کی طرف اشارہ کر کے ان کے دل کی عاشقانہ ذہنیت کے غماز ہیں:

فغان از کرزنی بیگمات خوبان زردشتی — ہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت و ضو را
بدہ ساقی مئی باقی کہ در جنت نخواہی یافت — کنار آب چوپاٹی و گلگشت اپالو را

۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۴ء تک (سال وفات) شبلی نے اپنے صدہا مکاتیب میں ابوالکلام، سید سلیمان ندوی اور دیگر قریبی دوستوں کو بمبئی کی دلچسپیوں اور موسم اور رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دی ہے۔ سید سلیمان ندوی کو لکھا کہ: (۳ر اگست ۱۹۰۶ء) یہاں کا موسم انتہائی خوشگوار ہے۔ قدرت اور مقدرت ہوتی تو یہیں کا ہو جاتا۔ (مکاتیب شبلی، ص ۶۷)

(۲۵ر جنوری ۱۹۱۴ء) کو بے تکلف نوجوان دوست مہدی کو لکھتے ہیں:

''اب تو خدا کے لیے بمبئی چلیے، وہاں کے سب کے سب مصارف میرے ذمہ۔ صرف ایک مشکل ہے۔'' (ذکر شبلی، ص ۳۳۲)

انھیں کو ایک اور خط میں ۱۵ر جون ۱۹۰۹ء کو لکھتے ہیں:

''اپنی دستہ گل کی کم مائگی پر افسوس ہوتا ہے۔ بمبئی پہنچوں تو کچھ پھول اور ہاتھ آئیں۔'' (ص ۳۱۷)

''میرا دوسرا دیوان بوئے گل نکلا لیکن بالکل پھیکا ہے سب محسوس کرتے ہیں۔ اب وہ سامان کہاں۔''

مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے خاص دعوت تھی اور اتفاقاً علمی تذکرہ ضرور ہوتا۔ ۲۸؍جولائی ۱۹۱۴ء کا ایک خط ہے:

"شعر العجم کا پہلا حصہ چھپ گیا لیکن اشاعت روک دی ہے کہ تینوں حصے ساتھ نکلیں۔ چوتھا حصہ زیر تحریر ہے چاہتا ہوں کہ بمبئی اور جنجیرہ میں لکھوں۔ بمبئی میں سارا دن کام کے لیے ملتا ہے۔ دن بھر کوئی جھانکتا نہیں اس لیے برس دن یہاں سے ٹلنے کا ارادہ نہیں۔"

بمبئی میں براؤن، تاریخ ادبیات ایران، لباب الالباب، خیام، خواجو، امیر خسرو، کمال خجند، خسرو، سعدی وغیرہ کی مجالس یہیں تھیں۔ صدر یار جنگ، حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور سر عبدالقادر وغیرہ سے قلمی کتابوں اور حوالوں کی چیزیں تو خیر تھیں ہی۔ ان کو شعر العجم کے لیے حافظ شیرازی کی صفات اور شاعرانہ کمال پر مطالعہ کا موقع یہیں میسر آیا اور بابا کوہی کے مزار پر حاضری کے بعد جس طرح حافظ کے کلام کی شیرینی اور لطافت میں اضافہ کا باعث "شاخ نبات" کا یادگاری نام قابل ذکر ہے۔ غالباً شبلی کے کلام میں نفاست، دلآویزی اور شیریں بیانی کا اضافہ جنجیرہ کا قیام ہے۔ جس کے بارے میں ان کی اردو غزل کا درج ذیل اقتباس کافی ہے:

یاد صحبت ہائے رنگیں جو جزیرہ میں رہیں　　وہ جزیرہ کی زمیں تھی یا کوئی میخانہ تھا
لطف تھا، ذوق سخن تھا، صحبت احباب تھی　　مطرب و رود و سرود و ساغر و پیمانہ تھا
سبزہ و گل سے بھرا تھا دامن کہسار سب　　غیرت خلد بریں ہر گوشۂ ویرانہ تھا
غنچہ و گل کا تبسم تھا ہر ایک دم برق ریز　　عندلیبوں کی زباں پر نالۂ مستانہ تھا
نشہ آور تھی نگاہ مست ساقی اس قدر　　خود بخود لبریز ہی ہر ساغر پیمانہ تھا
اب نہ وہ صحبت نہ وہ جلسے نہ وہ لطف سخن　　خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

لیکن وہ صحبت، وہ جلسے اور وہ لطف سخن جو خواب نہیں حقیقت تھا۔ اس کے تاثرات بھی انھیں کے دوسری غزل کے اشعار میں پڑھتے چلیے جہاں حافظ شیرازی کی شاخ نبات کا عشق موجود تھا:

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہوگی تو کیوں ہوگی　　خیال روزہ و فکر وضو ہوگی تو کیوں ہوگی
جو وہ دن بھی بسر کرے گا اس قصر معلی میں　　اسے خلد بریں کی آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی
کہاں یہ لطف، یہ منظر، یہ سبزہ، یہ بہارستان　　عطیہ تم کو یاد لکھنؤ ہوگی تو کیوں ہوگی

بمبئی شبلی کے رگ و پے میں اس قدر حلول کر گیا تھا کہ اس زمانہ کی کوئی تحریر علمی، ادبی، شعری اس کے ذکر سے خالی نہ تھی چنانچہ وہاں کی لکھی ہوئی ۲۶ غزلوں میں سے ۱۲ غزلوں کے مقطعے ملاحظہ کے قابل ہیں:

زہی جان بخشی آب و ہوائی بمبئی شبلی　　طراز خلخ و نوشاد و فرخار است پنداری

دامن عیش ز دستم نرود تا شبلی　　دامن بمبئی از کف ندہم تا باشم (ص ۵۸۱)

نازد بمبئی کہ ہر متاع کہ دو تو را　　طراز مسند جمشید و فرتاج خسرو را (ص ۵۸۱)
شبلی عنان گسستہ مرو سوی بمبئی　　مانیز با تو ہم سفریم این شتاب چیست (ص ۵۸۵)

از ذوق طبع شبلی من در اول روز دانستم　　کہ در آشوب گاہ بمبئی در بازد ایمان را (ص ۵۸۳)

این غزل اول فیض اثر بمبئی است　　باش تا بادہ این میکدہ در جوش آید (ص ۵۸۵)

شبلی بیا کہ گرمی بازار بمبئی　　امسال نیز بست بجنگی کہ پار بود (ص ۵۸۶)

شاعری از من مجو دور از سواد بمبئی　　حالیا شبلی شدم بند غزلخوان نیستم (ص ۵۹۳)

در حیرتم کہ پائی نگارش از کجاست　　شبلی مگر ز مردم ہندوستان نبود (ص ۵۹۶)

شبہا آن جلوہ ہای بمبئی　　بود تا وقتی کہ من خواب گرانی داشتم (ص ۵۹۲)

دانم کہ بہار چمن بمبئی امسال　　برعادت پیشینہ جنون خیز نبودہ است (ص ۵۹۸)

بمبئی بود مرا منزل مقصود و ہمیشہ　　پیش از این کام طلب در رہ حرمان زدہ ام

جن لوگوں نے حافظ کو پڑھا ہے، شبلی کے ان مذکورہ بالا ابیات میں ان کی تراکیب، تشبیہات، محاورے اور بسا اوقات وہی الفاظ اور کلمات بعینہٖ مستعمل نظر آئیں گے۔ درحقیقت شبلی حافظ کے شیدائی تھے۔ دیوان حافظ سے فالیں نکالتے تھے ان کا بیشتر کلام ان کو یاد تھا۔ ان کے بیشتر اچھے اشعار سے شعر العجم کے صفحات رنگین ہیں اور اس بات میں کوئی کلام نہیں اگر یہ کہہ دیا جائے تو مبالغہ بھی نہ ہوگا کہ حافظ کے اشعار کا اس سے اچھا انتخاب آج تک ایران میں بھی نہ ہوا ہوگا۔

شبلی ۱۹۰۸ء میں خواجہ شیراز کے دربار سے فارغ ہوئے تھے اور ان کے ذہن و دماغ پر حافظ چھائے ہوئے تھے جس میں بمبئی کی خوشگواری اور سازگار ماحول نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا چنانچہ ان مقطعوں میں ذیل کے اشعار حافظ کی جھلک ملتی ہے:

بود کہ لطف ازل رہنموں شود حافظ   وگرنہ تا بہ ابد شرمسار خود باشم
(دیوان حافظ، ص۲۳۲)

زاہد شراب کوثر و حافظ پیالہ خواست   تا درمیان خواستۂ کردگار چیست
(دیوان حافظ، ص۳۱)

بسوخت حافظ و در شرط عشق بازی او   ہنوز بر سر عہد وفائی خویشتن است
(دیوان حافظ، ص۵۲)

آتشی بود عذاب اندہ حافظ بی تو   کہ بر ہیچ کسش حاجت تفسیر نبود
(دیوان حافظ، ص۱۵۷)

آرزو مند رخ شاہ چو ماہم حافظ   ہمتی تا بسلامت ز درم باز آید
(دیوان حافظ، ص۳۷۱)

غزل گفتی و در سفتی بیا و خوش بخوان حافظ   کہ بر نظم تو افشاند فلک عقد ثریا را
(دیوان حافظ، ص۲۰)

بگو حافظ بخرابات روم جامہ قبا   بو کہ در بر کشد آن دلبر نوخاستہ ام
(دیوان حافظ، ص۲۳۳)

بمبئی آ کر وہ سی سالہ تقوی کی پاسداری نہ کر سکے اور وہ شبلی اور شمس العلماء جن کے علم کا ڈنکا ہند و بیرون ہند بجتا تھا، حافظ کی مانند رندی اور عشق ورزی میں جو اشعار کہہ گئے ان کو کسی صفائی اور شہادت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر لفظ میں حافظ غالب ہیں:

شبلی امروز بسجادۂ تقوی بنشست   آن کہ صد سالہ رہ شیخ و برہمن زدہ بود

ہست چل سالہ کہ بیہودہ گمبد اشتغل   گرنہ بر سنگ زنم شیشۂ تقوی چکنم
جامۂ زہد چو بر قامت من راست نبود   شیشۂ تقوی سی سالہ بسندان زدہ ام

مایۂ تقوی سی سالہ فراہم شدہ است   از مغانش بہ نگاری بدہم یا چکنم

توبہ از بادہ نہ کار من تا کس باشد   وین قدر ہم اگرم عقل بود بس باشد

ہاں بیا تا کم از بوسہ نشان بر لب تو   شاہ حسنی و ترا نقش و نگین می باید

ہزار حیف کہ در وقف حسن نتوان یافت   بجز متاع جفائی کہ ہست در ہر جاست

بالفعل دکان مغبچہ فروشی کشادہ است   این مژدہ ام بگوش ز باد صبا رسید

شوقی کہ از غرور بہ خود ہم نمی رسد   عذرش بہ اگر نتواند بما رسید

مگر خاتم دست حسود نتوان بودن   این قدر ہست کہ بت خانۂ دل آویزد
از ستانی کہ از چاشنی لعل شکر خا گفتی   گفتۂ شبلی از این بیچ شکر ریز تر است

در جلوہ گاہ حسن دل پارہ پارہ را   شبلی نگر کہ تا بچہ عنوان فروختم

نیمی از آن بہ نرگس مستانہ باختم   نیمی دگر بغمزۂ پنہان فروختم

شبلی کے اشعار ہی نہیں، ان کی بعض غزلوں پر حافظ کے کلام کا دھوکہ ہوتا ہے چنانچہ ذیل کی ایک غزل کے اشعار میں دل تنہم، جلوہ زیبائی تو، شعبدہ پردازی حسن اور لعل شکر خا کی ترکیب حافظ کے یہاں واضح طور پر استعمال ہوئی ہے۔ کلمات کی ہم آہنگی، ترکیبوں کی مناسبت اور ردیف جائے و پائے تو ہست خالص حافظ کا حصہ ہے جسے شبلی نے انتہائی خوبصورتی سے اپنے اشعار کا حسن بنایا ہے:

جز تو کس را نبود در دل تنہم راہی   خانۂ مختصری ہست و ہمین جای تو ہست
از نظر رفتی و از شعبدہ پردازی حسن   ہم چنان در نظرم جلوۂ زیبائی تو ہست
ای کہ در قتل من از بندہ نشان می جوئی   این ندیدی کہ سری ہست کہ بر پای تو ہست
می ندانی کہ شکر ریزی شبلی بہ سخن!
ہست از دولت لعل شکر خائی تو ہست

یہاں تک کہ شبلی کے کلیات فارسی کی آخری غزل پر بھی حافظ کے کلام کا اسی لیے دھوکا معلوم ہوتا

ہے کہ اس کے الفاظ، تازہ ترکیبیں، تلمیحات، فصاحت اور شیرینی کا امتزاج حافظ کی شاعرانہ صفات سے میل کھاتا ہے:

امشب این غلغلہ در کوچہ و بازار افتاد | کہ فلان می زدہ بیخود شدہ و سرشار افتاد
سخن از صومعہ و اہل ورع چند کنی | کہ مرا کار بآن چشم قدح خوار افتاد
بسکہ غارتگر حسن تو جہان برہم زد | یوسف از خانہ بدر جست و بہ بازار افتاد
چہ عجب گر نگہ مست تو افتد برمن | بادہ بیرون فتد از جام چو سرشار افتاد
شیوہ مہر ز خوبان نتوان داشت طمع | کہ مرا کار باین طایفہ بسیار افتاد

محتسب از پی جمعی و حریفان رنگین
شبلیا رندی پنہان تو دشوار افتاد

(کلیات فارسی شبلی، ص ۲۵)

غلغلہ در کوچہ و بازار، فلان می زد، صومعہ و اہل ورع، یوسف از خانہ بدر جست، کار بآن چشم قدح خوار، غارتگر حسن تو جہان، بادہ از جام بیرون افتادن، شیوہ مہر اور کار باین طایفہ، رندی پنہان، ساری ترکیبیں اور تشبیہیں حافظ کے یہاں کام آئی ہیں اور شبلی نے سرقہ نہیں، تتبع نہیں کیا ہے، تضمین نہیں لکھی ہے بلکہ انھیں موضوعات کو اور ترکیبات کو ایک نیا آہنگ و رنگ بخشا ہے جس میں حافظ کے کلام کی لطافت اور شگفتگی کے ساتھ خود ان کی برجستگی اور دردمندی شامل ہے۔

شبلی دوسرے تمام فارسی شعراء کو بھول کر اس روح پرور فضا میں فقط حافظ کا تغزل اختیار کر چکے تھے۔ حافظ ان کے ہمراز و ترجمان بن گئے تھے۔ شعر العجم کے فارسی مترجم سید فخر داعی اس نکتہ کی وضاحت ان الفاظ میں اور اشعار میں کر گئے ہیں:

"باہمہ علوم بی حد متواضع و بی تکلف، وارستہ و بی آلایش بود. نشاط روحی وی حیرت انگیز بود، در ظرافت طبع، بذلہ گوئی، حسن محضر، لطف بیان نظیر نداشت. شعر را زیادہ دوست میداشت. شعر خوب در وجود او از ہر چیز بیشتر تاثیری بخشید۔ یک روزی یادم می آید در اثنائی صحبت این اشعار خواجہ را خواند:

مشکل خویش بر پیر مغان بردم دوش | کو بتائید نظر حل معما می کرد
دیدمش خرم و خندان قدح بادہ بدست | واندران آینہ صد گونہ تماشا می کرد
گفتم این جام جہان بین بتو کی داد حکیم | گفت آن روز کہ این گنبد مینا می کرد

دیدم حالت وجدی بوی دست داد کہ سراپائی وجودش را با اہتزاز در

آوردہ بعد تبسمی کردہ فرمود اگر ایران را بمن بدہند آنقدر کیف نمیکنم بقدر یکی ازین سہ شعر لذت بردہ کیف میکنم۔" (مقدمہ شعر العجم فارسی، چاپ تہران)

مولانا حالی، سید سلیمان ندوی، مہدی افادی، شیخ اکرام، علی جواد زیدی، آل احمد سرور، احتشام حسین وغیرہ نے شبلی کی مسلم الثبوت حیثیت اور شاعرانہ فنکاری کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن شبلی کے شاگرد رودھانی اقبال سہیل کے الفاظ میں:

"حد سے زیادہ خوددار بھی اور غیر معمولی طور پر متواضع اور خاکسار بھی۔ اظہار حق میں بیباک بھی اور انداز بیان میں محتاط بھی، اپنے عقائد میں متشدد بھی، اور دوسرے کے ساتھ وسیع المشرب بھی، جمالیات کے نکتہ شناس بھی اور مدعیان تقویٰ سے زیادہ پاکباز بھی، خمخانہ کہن کے ساقی بھی اور بادہ نو کے جرعہ نوش بھی۔ اکابر اسلاف کے رتبہ شناس بھی اور کورانہ تقلید سے بیزار بھی، اسرار شریعت کا پردہ کشا بھی اور معاملات دنیاوی کا فیاض بھی، اور جس کے قلم کا ہر رقص اور جس کی زبان کی ہر جنبش ایک مستقل فقہ رنگیں ہو مگر جس کا تقویٰ ہم چنگ و رباب تو کیا مجلس حال و قال تک جانے کی اجازت نہ دے۔" (شبلی کی جامعیت، افکار سہیل، ص ۵۷)

کیا شبلی کی اس تصویر میں حافظ شیرازی کی ہمہ جہت شخصیت کی جھلک نہیں ملتی ہے؟ شبلی ایک مکمل انسان عالم و فاضل، دانشور، مورخ، محقق اور نقاد تھے اور جن کی علمی شان اور شاعرانہ عظمت کا اعتراف دوسرے ایرانی فضلا کے علاوہ ولغت نامہ دہخدا کے مرتب علی اکبر دہخدا نے بھی کیا ہے۔ وہ ایسے شاعر تھے جو زاہد خشک نہ تھے اور حقیقی معنوں میں ایک فنکار تھے جن کو شاعری کی ہر صنف میں قدرت حاصل تھی اور غزل گوئی میں تو "دستہ گل" اور "بوئے گل" ان کا شاہکار ہیں۔ ایک بار پھر شیخ اکرام کے بقول:

"دستہ گل صحیح معنوں میں ایک پھولوں کا گلدستہ ہے اور پھول بھی ایسے جن کی شادابی اور خوبی رنگ و بو کا ہندوستان کی فارسی شاعری میں جواب نہیں۔ الفاظ کے انتخاب، خیالات کی تازگی، اور طرز ادا کی شستگی میں ترشے ہوئے ہیرے ہیں۔ دستہ گل اور

بوئے گل میں جذب وسلوک کا فرق تھا۔ ایک میں جذب وسرمستی
کے ایام کی داستان ہے اور دوسرے میں سالک راہ دشواریوں کی۔''
(ذکرِ شبلی، ص ۳۳۳)

عمر دگی کی اس زندگی میں شبلی سالک راہ بن بیٹھے تھے کیونکہ وہ اب رند غزلخواں نہیں بلکہ مشہور عارف شبلی رماوندی ابوبکر دلف بن مجہد شبلی تھے۔ پیر کے حادثہ کے بعد کسی مخلص کے تعزیت نامہ کے جواب میں لکھا تھا کہ ''افسوس جس شخص کا سر کٹا جانا چاہیے تھا اسے صرف پیروں سے کیوں محروم کر دیا گیا۔'' ان کے قلم سے نکلا ہوا یہ جملہ کسی منصور اور بایزید کے جملے سے کم نہ تھا اور جسے شاید شبلی نے قطعہ ذیل میں بیان کر کے خود کو زندہ جاوید بنا لیا۔

حالت از گردش ایام اگر گشت بتر — صبر فرما کہ ازیں نیز بتر می بایست
شبلی نامہ سیہ را بہ جزائی عملش — بابریدند وصد اخاست کہ سر می بایست

کتب حوالہ واستفادہ:

۱- سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء
۲- سید سلیمان ندوی، مکاتیب شبلی، مطبع معارف اعظم گڑھ،
۳- شبلی نعمانی، مقالات شبلی، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۳ء
۴- شبلی نعمانی، سفرنامہ روم ومصر وشام، قومی پریس، دہلی
۵- مہدی افادی، افادات مہدی، لکھنؤ ایڈیشن، ۱۹۵۸ء
۶- ڈاکٹر عبید اللہ فراہی، علامہ شبلی کا نظریہ تعلیم، بکٹو ورکس چتلا پوری، دہلی ستمبر ۱۹۸۸ء
۷- افکار سہیل شبلی نیشنل کالج میگزین، معارف پریس اعظم گڑھ، اگست ۱۹۵۷ء
۸- شبلی نعمانی، بوئے گل، کتابخانہ ذاکر حسین جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی (قدیم ونادر)
۹- شبلی نعمانی، دستہ گل، کتابخانہ ذاکر حسین جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
۱۰- شبلی نعمانی، شعر العجم، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۳۳۹ھ
۱۱- سید سلیمان ندوی، انتخابات شبلی، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۵۰ء
۱۲- محمد امین زبیری، ذکر شبلی، کتابخانہ ذاکر حسین جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی قدیم
۱۳- کلیات فارسی شبلی نعمانی، کتابخانہ ذاکر حسین جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی قدیم

☆☆☆

سید انوار احمد*

ہندوستان میں فارسی مثنوی سرائی کا ایک اجمالی جائزہ

ہندوستان میں مغلوں کے تسلط سے پہلے غزنوی حکمرانوں اور سلاطین مملوک کے ادوار میں مثنوی سرائی کی طرف مائل شاعروں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ اس طویل عرصے میں جو سلاطین مسعود بن محمود غزنوی کے ایام سلطنت سے ابراہیم لودی کے دورِ سلطنت کو محیط ہے، بہت سارے باکمال شعراء منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے، لیکن ان کی شعر گوئی بیشتر قصیدہ، غزل، قطعات و رباعیات کی صنفوں پہ مشتمل ہے۔ تاہم مجموعی اعتبار سے ہندوستان میں مغلوں سے قبل کا یہ دور در خور توجہ ہے اور ادبی لحاظ سے قدر و اہمیت کا حامل ہے۔ شعر و سخن کے علاوہ اس عصر میں نثر نگاری کے مختلف شعبوں میں دانشمندوں نے نہایت گرانمایہ کارنامے انجام دیے ہیں۔ خصوصیت سے تاریخ نویسی کی صنف میں 'تاج المآثر' مؤلفہ حسن نظامی نیشاپوری، طبقات ناصری، مصنفہ مولانا منہاج الدین عثمان، تاریخ فیروز شاہی، تالیف ضیاء الدین برنی ''فتوحات فیروز شاہی'' تصنیف شمس سراج عفیف جیسی وقیع و بیش بہا کتابیں لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ یہ زمانہ فرہنگ نویسی، مکتوب نگاری اور آثار عرفانی کے لئے بھی نہایت ارزشمند ہے۔ 'فرہنگ قواس' 'لسان الشعراء' 'زفان گویا' اور 'شرف نامہ منیری' جیسے بیش قیمت لغات کی تصنیف کا تعلق اسی عہد سے ہے۔ حضرت ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری نے اسی زمانے ۴۷۰ھ میں اسلامی تصوف پہ اپنی مستند و معروف کتاب موسوم بہ 'کشف المحجوب' لکھی فخر مدبر کے دو اہم نثری کارنامے ''آداب الحرب والشجاعۃ'' اور ''شجرۂ انساب'' کا بھی تعلق اسی دور سے ہے۔ حضرت مخدوم شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کی مکتوبات صدی، مکتوبات دوصدی، شرح آداب المریدین، ارشاد السالکین، ارشاد الطالبین، فوائد المریدین، وغیرہ اسی عہد میں معرض تخلیق میں آ گئیں۔

بہرحال، اس عہد کے معروف و معتبر شاعروں میں امیر خسرو اور حسن سجزی کے علاوہ مسعود سعد سلمان، لاہوری، ابوالفرج رونی، شہاب الدین مہمرہ، عقیہ الدین، عصامی، بدر چاچ، شیخ بوعلی قلندر پانی پتی، سلطان

---

* سابق پروفیسر و صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

احمد چرم پوش متوفی ۷۷۶ھ، مولانا مظفر بلخی متوفی ۷۸۸ھ، حضرت نوشۂ توحید اور احمد لنگر دریا وغیرہ ہیں، لیکن مثنوی سرائی کے میدان میں امیر خسرو سے قطع نظر جو بلاشبہ شمار و معیار دونوں اعتبار سے اس میدان کا شہسوار یکہ تاز ہے، کوئی مقتدر و عالیمقدار شاعر نظر نہیں آتا۔ شیخ شرف الدین بوعلی قلندر نے متصوفانہ موضوع پہ ایک مختصر مثنوی موسوم بہ "ہدایت و بشارت" لکھی تھی، موصوف ایام شباب میں ہی عراق سے ہجرت کر کے ہندوستان چلے آئے تھے۔ کچھ دنوں دہلی میں اقامت کے بعد شہر پانی پت منتقل ہو گئے۔ اسی شہر میں ۷۲۴ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ شیخ کی یہ مثنوی اسرار تصوف کے شرح بیان سے متعلق ہے۔ اس مثنوی پہ مولانا روم کے طرز نظر اور شیوۂ بیان کا خاصا اثر ہے۔ مثنوی کے چند ابتدائیہ اشعار بشرح ذیل ہیں:

مرحبا ای بلبل باغ کہن   از گل رعنا بگو با ما سخن
مرحبا ای ہدہد فرخندہ فال   مرحبا ای طوطی شکر مقال
مرحبا ای قاصد طیار ما   می دہی ہر دم خبر از یار ما

اور اختتامیہ دو شعر اس طرح ہیں:

گر حرامت می کنی بر خود حلال   میکنی تسکین دلت با صد ملال
چون مسلط بر تو گردد این مرض   عدل و انصافی بود از تو غرض

مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری کے مرید و خلیفہ حضرت مولانا حسین نوشۂ توحید متوفی ۸۴۴ھ جو سلسلۂ فردوسیہ کے ایک بلند مرتبت صوفی اور مستند شاعر تھے، نے بھی ایک مثنوی موسوم بہ "افتخار حسینی" لکھی تھی اس مثنوی میں "قصہ چہار درویش" کو منظوم کیا گیا ہے۔ حضرت نوشۂ توحید کی مثنوی 'مثنوی مولوی' کے وزن میں ہے۔ داستان سرائی کے ساتھ جا بجا اس میں تصوف کے غوامض و نکات کی توضیحات بھی ملتی ہیں۔ عصامی جس کے احوال حیات تاریخی مآخذ اور تذکروں میں نہیں ملتے تغلق سلطنت کے عہد کا ایک جہاندیدہ شاعر تھا، اس نے "فتوح السلاطین" نام کی ایک منظوم تاریخ لکھی تھی۔ یہ منظوم تاریخ جو 'شاہنامہ فردوسی' کے وزن میں لکھی گئی ہے۔ ہندوستان کے غزنوی اور مملوک سلاطین کے تین سو پچاس سال کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے عہد سے لیکر سلطان محمد بن تغلق تک کے حالات اس میں شامل ہیں۔ عصامی نے واقعات کی فراہمی میں بڑی دقت و تحقیق کا ثبوت دیا ہے۔ "فتوح السلاطین" بارہ ہزار ابیات پر محتوی ہے۔ یہ مثنوی سلطان علاء الدین بہمن شاہ کی خدمت میں تقدیم کی گئی تھی۔ عصامی کو واقعات کی ترتیب میں بڑی مشقتیں اٹھانی پڑی تھیں۔ جس کی بابت وہ بقرار ذیل اشارے کرتا ہے:

حدیثی کہ بشنیدم از باستان   کشیدم بہ نظمش در این داستان
دگر آنچہ اندر کتب یافتم   سر از ورج آن نیز کم تافتم

پراگندہ بس در قیمت گران   کشیدم در این سلک چون ناقدان
بہ تحقیق افسانہ ہای کہن   بسر بردم بسی رنج در ہر سخن

مملوک سلاطین کے عہد کا جلیل القدر شاعر جو ہندوستان کا عظیم ترین شاعر محسوب کیا جاتا ہے دس مثنویوں کا خالق ہے، پانچ مثنویاں اس نے تاریخی موضوعات پر اور دیگر پانچ مثنویاں اس نے خمسۂ نظامی کی تقلید میں منظوم کیں۔ تاریخی مثنویوں میں "قران السعدین" "مفتاح الفتوح" "دولرانی خضر خان" "نہ سپہر" اور "تغلق نامہ" ہیں۔ جبکہ خمسۂ خسروی کے عناوین اس طرح ہیں: "مطلع الانوار" "شیرین و خسرو" "مجنون و لیلیٰ" "آئینۂ اسکندری" اور "ہشت بہشت" جو نظامی کی مثنویات موسوم بہ "مخزن الاسرار" "خسرو و شیرین" "لیلیٰ مجنون" "سکندر نامہ" اور "ہفت پیکر" کے جواب میں لکھی گئیں۔ امیر خسرو بلاشبہ نظامی کا موفق ترین مقلد ہے۔ خمسۂ نظامی اس کی تمام عمر کا سرمایہ ہے جبکہ امیر خسرو نے اپنے خمسہ کی ساری مثنویوں کو محض تین سال کی مدت میں پایۂ تکمیل کو پہونچایا۔ خسرو کی تاریخی مثنویوں میں اولین مثنوی قران السعدین ہے جو سلطان بغرا خان اور اس کے بیٹے کیقباد کی ایک دوسرے کے خلاف لشکر آرائی اور انجام کار دونوں کے درمیان مسالمت اور مصالحت پہ محتوی ہے۔ یہ مثنوی اگرچہ موضوع کے اعتبار سے بیزار کن اور ناخوشگوار ہے لیکن امیر خسرو نے بزم و رزم کی واقعہ نگاری کے ذریعے اس میں تفریح و نشاط کے عناصر کو اس میں منظوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ خسرو نے اسے مطبوع و مقبول بنانے کے لئے رقص و سرور کی محفلوں کے مناظر اور ضیافتوں کی مشروح و مفصل واقعات کی عکاسی کی ہے۔ دوسری مثنوی 'مفتاح الفتوح' ہے جو ۶۹۰ھ میں مکمل ہوئی۔ یہ مثنوی جلال الدین فیروز شاہ خلجی (۶۸۹-۶۹۵ھ) کے جنگی معرکوں اور فتوحات کے وقائع پہ مشتمل ہے۔ امیر خسرو کی تیسری تاریخی مثنوی 'دولرانی خضر خان' ہے۔ اس مثنوی کا دوسرا نام عشقیہ بھی ہے۔ مثنوی ہذا خضر خان فرزند سلطان علاء الدین اور دیول دیوی دختر رائے کرن والئی گجرات کی عشقیہ داستان پہ مبنی ہے۔ جب امیر خسرو نے اس مثنوی کو خضر خان کے نام تقدیم کیا تھا اس وقت اس کی ابیات کی تعداد بیالیس سو تھی (۴۲۰۰) لیکن خضر خان کے قتل کے بعد امیر خسرو نے اس میں اضافے کئے اور ابیات کی تعداد چار ہزار پانچ سو انیس (۴۵۱۹) تک پہنچ گئی۔ امیر نے اس مثنوی کے ۷۱۵ھ میں انجام تک پہنچایا تھا۔ خسرو کی چوتھی تاریخی مثنوی 'نہ سپہر' ہے قطب الدین مبارک شاہ خلجی (۷۱۶-۷۲۰ھ) نے اس مثنوی کو منظوم کرنے کی فرمائش کی تھی۔ یہ مثنوی ۷۱۸ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کے اشعار کی تعداد پانچ ہزار چار سو نو ہے (۵۴۰۹)۔ 'نہ سپہر' نو حصوں پہ مبنی ہے۔ ہر حصے کو سپہر کہا گیا ہے۔ اور ہر سپہر کے لئے جداگانہ بحر بروئے کار لایا گیا ہے۔ اس مثنوی میں جنوبی ہند میں خسرو خان کی لشکر کشی کا ذکر ہے۔ یہ منظومہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ امیر خسرو نے اس میں ہندوستان کی ثقافت اور مراسم مذہبی کا شرح و تفصیل کی ساتھ ذکر کیا ہے۔

امیر خسرو کی آخری تاریخی مثنوی 'تغلق نامہ' ہے۔ خسرو کی یہ مثنوی مکمل نہ ہو سکی تھی۔ مغل شاہنشاہ

جہانگیر کے عہد میں اس کی بازیافت ہوئی بادشاہ کے حکم سے حیاتی گیلانی (متوفی ۱۰۱۵ھ) نے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس مثنوی میں حیاتی گیلانی نے ایک سوانتیس (۱۲۹) ابیات شامل ہیں۔

غزالی مشہدی معنی طراز و متکبر شاعر تھا۔ لیکن اپنے ملحدانہ خیالات اور غیر سنجیدہ مذہبی افکار و اظہارات کے سبب وہ اپنے ہم وطنوں کی طعنت و نفرت کا نشانہ بن گیا تھا۔ ساکنان مشہد اس درجہ اس سے متنفر و متوحش ہوئے کہ وہ ترک وطن پہ مجبور ہو گیا۔ وہ ہندوستان کے لئے عازم سفر ہوا اور دکن کے راستے کو طے کر کے جونپور پہنچا۔ حاکم جونپور خان زمان نے اس کے فضل و کمال و ہنر و شاعرانہ قدرت و استعداد کی قدردانی کی۔ غزالی نے خان زمان کی مدح میں "نقش بدیع" نام کی مثنوی لکھی تھی۔ یہ مثنوی ہزار شعروں پہ مشتمل ہے۔ خان زمان نے ہر شعر کے عوض ایک اشرفی غزالی کو بخشش کے طور پر عطا کیا تھا۔ اس مثنوی کے کچھ اشعار بقرار ذیل ہے۔

خاک دل آن روز کہ می بیختند   شبنمی از عشق برو ریختند
دل کہ بہ آن رشحہ غم اندود شد   بود کبابی کہ نمک سود شد
بی اثر مہر چہ آب و چہ گل   بی نمک عشق چہ سنگ و چہ دل

خان زمان کی وفات کے بعد غزالی دربار اکبری سے وابستہ ہوا اور یہاں وہ ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ شاہان مغل کا یہ پہلا ملک الشعراء تھا۔ اس نے یہاں "مرآۃ الصفات" نام کی مثنوی لکھی۔ اس مثنوی کے چند اشعار اس طرح ہیں۔

تاج دہ تارک روئین تنان   سر شکن گرز قوی گرد نان
شاہ فلک مسند و خورشید رشک   ملک ستانندہ و اقلیم بخش
گر بہ کشد تیغ جہان سوز را   قطع کند سلک شب و روز را

"نقش بدیع" اور "مرآۃ الصفات" کے علاوہ اس کی مثنویوں کی فہرست میں "مشہد انوار"، "آئینۂ خیال"، واردات اور مواہب وغیرہ شامل ہیں۔ غزالی کی وفات ۹۸۰ھ میں ہوئی۔ دربار اکبری کا ملک الشعراء فیضی فیاضی نے بھی خمسۂ نظامی کے جواب میں پانچ مثنویوں کو نظم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس ہدف کی تحصیل میں کچھ پیشرفت بھی ہوئی تھی۔ لیکن سرانجام مثنوی نل دمن کے سوا فیضی کسی مثنوی کو مکمل نہیں کر سکا۔ نل دمن کو فیضی نے انچاس ۴۹ سال کی عمر میں مکمل کیا تھا۔ اس وقت اکبری بادشاہی کا انتالیسواں سال تھا۔ فیضی نے اس مثنوی کو لیلی مجنون کے جواب میں منظوم کیا تھا۔ یہ مثنوی چار ہزار دو سو ابیات پر حاوی ہے۔ اس کی داستان قدیم ہندوستان کی معروف رزمیہ کہانی "مہا بھارت" سے ماخوذ ہے۔ فصاحت و روانی اور فکر و اندیشہ کے اعتبار سے یہ ہندوستان میں لکھی گئی تمام مثنویوں میں افضل ہے۔ یہ مثنوی ہندوستان کی قدیم ثقافت و فرہنگ اور مذہب و روایت کی آئینہ داری کرتی ہے۔ اس بنا پر شاہان مغل کے عہد میں یہ بے حد مقبول ہوئی۔ بدایونی فیضی سے

بغض و عداوت رکھنے کے باوجود اس کے اس شعری کارنامے کی ستائش کرتا ہے: "والحق مثنویست کہ درایں سیصد سال مثل آن بعد از امیر خسرو شاید در ہند کسی دیگر نگفتہ باشد"۔ فیضی کی نامکمل مثنویاں "مرکز ادوار"، "سلیمان و بلقیس"، "اکبر نامہ" اور "ہفت کشور" ہیں جو نظامی کی مخزن الاسرار، شیرین خسرو، سکندر نامہ اور ہفت پیکر کے جواب میں لکھی جا رہی تھیں۔ محمد رضا نوعی خبوشانی قریۂ خبوشان من مضافات خراسان سے ترک وطن کر کے بادشاہ اکبر کے زمانہ سلطنت میں ہندوستان آیا اور شاہزادہ دانیال کی ملازمت سے وابستہ ہوا۔ شاہزادہ کی رفاقت میں وہ لاہور میں مقیم تھا جہاں اس نے ایک ہندو نوجوان کی نعش پہ اس کی زوجہ کے ستی ہونے کے واقعہ کو دیکھا تھا جس سے وہ بے حد ملول و متاثر ہوا۔ چنانچہ شاہزادہ موصوف کے ایما پہ اس واقعہ کو مثنوی کی صورت میں منظوم کیا۔ یہ مثنوی مسمی بہ "سوز و گداز" بہت مقبول ہوئی۔ نوعی کی وفات ۱۰۱۹ھ میں برہان پور میں ہوئی۔ مثنوی "سوز و گداز" کو پروفیسر امیر حسن عابدی نے مرتب کیا ہے۔ اور برسوں پہلے بنیاد فرہنگ ایران سے اس کی اشاعت و طباعت ہوئی تھی۔ عہد جہانگیر میں سعد اللہ مسیحا پانی پتی نے ہندوستان کے حماسی منظومہ رامائن کی بنیاد پہ "رام و سیتا" نام کی مثنوی لکھی ہے جو شایستہ توجہ ہے۔ مسیحا پانی پتی ملا شیدا کے ہم صحبتوں میں تھا۔ اس مثنوی میں نعت بیتا ہے اس کا درج ذیل شعر نہایت معنی خیز ہے۔

تنش را پیرہن عریان ندیدہ   چو جان اندر تن و تن جان ندیدہ

مسیحا نے رامائن کو فارسی میں منظوم کرنے کی قصد سے رامائن میں رو کر سنسکرت زبان سیکھی تھی۔ یہ مثنوی ۱۸۹۹ء میں نول کشور پریس سے چھپ چکی ہے۔ مسیحا کی رامائن اور دوسری منظوم فارسی منظوم رامائنوں پہ مکارم شعری کے لحاظ سے فوقیت رکھتی ہے۔ اس مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

خدا وندا از جام عشق کن مست   کہ در مستی فتادم در جہان دست

مسیحا ہندو خواتین کی صفات بیان کرتا ہے۔

زنان است و بی کند کار جوان مرد   گرد و ہنگامۂ پروانہ شد سرد
بمردن عاشقان بی اختیار اند   ولی معشوق ایشان جان سپارند
ہمی علم بی ہندی نژادان   کہ خود را بر صنم سازند قربان

اس مثنوی میں نعت سید المرسلین سے متعلق ایک شعر مطبوع خاص و عام ہوا ہے جو بقرار ذیل ہے

ولی از عشق محبت ریش دارم   رقابت با خدای خویش دارم

جہانگیر کے عہد حکومت میں گرددھرداس نے بھی ایک فارسی رامائن منظوم کی تھی۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

ثنا و شکر آن بخشندہ جان را   پدید آورد کو ہر دو جہان را

اورنگ زیب کے عہد میں چندرمن بیدل پسر سری رام لاہوری نے "نرگستان" کے عنوان سے رامائن کو

منظوم کیا تھا اس مثنوی کی تکمیل ۱۱۰۵ھ میں ہوئی تھی دو گستان چھ دفتروں پر مشتمل ہے۔ پانچ دفتر بحر ہزج میں نظم کئے اور چھٹے دفتر میں بحر متقارب کا استعمال اس بنا پر کیا کہ جنگ کے ماجرا کو بیان کرنا تھا۔

امانت رائے کی معروف رامائن بھی حائز اہمیت ہے۔ یہ ضخیم منظومہ تیس ہزار ابیات پر محتوی ہے۔ اس مثنوی کو نظم کرنے میں پینتیس سال صرف ہوئے تھے۔

محمد اکرم غنیمت مشہور عشقیہ مثنوی "نیرنگ عشق" کا خالق ہے۔ غنیمت لاہور کے مضافات میں واقع قصبہ کنجاہ کا باشندہ تھا۔ میر محمد زمان راسخ کی خدمت میں اس نے مشق سخن کی تھی۔ غنیمت اپنی خداداد شعری لیاقت کے سبب اپنے معاصر شاعروں پر فوقیت رکھتا تھا۔ اس مثنوی کی داستان میرزا عبدالعزیز خلف والی سیالکوٹ کا ایک رقاص امرد پسر پہ فریفتہ ہو جانے سے متعلق ہے۔ اس مثنوی کے چند ابتدائی اشعار حسب ذیل ہیں:

بنام شاہد نازک خیالان   عزیز خاطر آشفتہ حالان
ز مہرش سینہ ها جولان گہ برق   دل ہر ذرہ در جوش انا الشرق
دل مستان عشق خود مقامش   شکست رنگہا مہتاب بامش

اور خاتمہ کتاب بصورت ذیل ہے:

چو احوال عزیز نیک فرجام   بدین صورت کہ گفتم یافت انجام
مرا آمد ز روی حسن ارشاد   دو مصرع از کلام مولوی یاد
متاب از عشق رو گر چہ مجازیست   کہ آن بہر حقیقت کارسازیست
بیا ای ساقی میخانہ راز   غنیمت کش نگاہی بر من انداز
شرابی دہ کہ صورت بر گدازم   بجسن لا یزالی عشق بازم

ہندوستانی قصوں کی بنیاد پہ جو فارسی مثنویاں لکھی گئیں ان میں عاقل خان رازی کی "مہر و ماہ" اور "شمع و پروانہ" نہایت جاذب و دل انگیز ہیں۔ پہلی مثنوی منوہر اور مدھومالتی کے قصے پہ مبنی ہے اور دوسری مثنوی راجہ رتن سن اور پدماوت کی داستان ہے۔ پدماوت کی کہانی کا نام رت پدم بھی ہے۔ اس قصے کو ملک محمد جائسی نے اودھی زبان میں ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ کے لئے لکھا تھا۔ ملا عبدالشکور پسر شیخ منور نے اس کو فارسی زبان میں منتقل کیا تھا۔ عاقل خان رازی سے قبل جہانگیر کے زمانہ سلطنت میں بزمی گجراتی ترک وطن کرکے ۱۰۲۸ھ میں گجرات آیا تھا۔ اس نے تین ہزار چودہ ابیات کے احاطے میں پدماوت کو منظوم کیا تھا۔ بزمی کی وفات آگرہ میں ۱۰۷۳ھ میں ہوئی۔

بزمی کی مثنوی کا آغاز مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے:

ای نام تو نقش لوح جانہا   ورد مانند یوسف او زبانہا

یہ مثنوی لکھنؤ سے ۱۸۴۳ء اور ۱۸۶۵ء میں مطبع ہو چکی ہے۔ عہد اورنگ زیب میں میر عسکری عاقل خان رازی متوفی ۱۱۰۸ھ نے بھی پدماوت کو مثنوی کی صورت میں منتقل کیا۔ عاقل خان رازی کے آباء و اجداد کا وطن خاف تھا لیکن اس کی زادگاہ ہندوستان ہے۔ وہ اورنگ زیب کے جلیل القدر امراء میں شمار ہوتا تھا۔ چہار ہزاری منصب سے سرفراز تھا اور دارالخلافہ دہلی کی گورنری کے عہدے پہ بھی امتیاز و اقتدار کے ساتھ فائز رہا۔ عاقل خان کی پدماوت حمد و مناجات و نعت سید المرسلین وغیرہ کے بعد اس طرح شروع ہوتی ہے:

قصہ پرداز ہندی افسانہ   محرم راز شمع و پروانہ
چون ازین قصہ دم کشید چو شمع   شعلہ زد این چنین دمش در جمع
کہ بہ ہند از شہان ہندو کیش   بود شاہی بہ طالع درویش
در شکل سپہ پای تمکنش بود   کام دل در کنار تمکنش بود

مثنوی کے اختتامیہ اشعار اس طرح ہیں:

رازیا بس کن این حکایتہا   دم مزن دیگر از روایتہا
ما بہ اقلیم کس نخواہد ماند   یادگاری دو سطر خواہد ماند
ہر کہ ما را کند بہ نیکی یاد   نام او در جہان بہ نیکی باد

پدماوت کو کچھ اور شاعروں نے بھی منظوم کیا تھا۔ آنند رام مخلص نے اس داستان کو "ہنگامہ عشق" کے نام سے نظم کیا تھا۔ پھر رای گوبند منشی نے "تحفۃ القلوب" کے عنوان سے اسے مثنوی کی صورت دی۔ ان کے علاوہ حسین غزنوی اور حسام الدین نے بھی اس عشقیہ افسانے کو منظوم کیا تھا۔ دربار شاہجہانی کا خوش فکر شاعر مرزا ابوطالب کلیم ہمدانی جو سبک ہندی کے شعرائے عظام میں شمار ہوتا ہے، نے بھی ایک مثنوی بعنوان "پادشاہ نامہ" لکھی ہے۔ کلیم کی یہ مثنوی شاہجہان کے شاہانہ جاہ و جلال، اس کی حکومت کے انتظام و استحکام اور اس کی عسکری اور اجتماعی کامیابیوں کے متعلق ہے۔ یہ مثنوی ابھی مرحلہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی تھی کہ ۱۰۶۲ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ مثنوی کا ابتدائیہ شعر حسب ذیل ہے:

بنام خدائی کہ از شوق جود   دو عالم عطا کرد و سائل نبود

اور مثنوی اس شعر پر ختم ہوتی ہے:

چو اقبال این شاہ گردون سریر   نبیند دگر در جہان قلعہ گیر

عہد شاہجہانی کا معروف شاعر ابوالبرکات منیر لاہوری متوفی ۱۰۵۴ھ بھی متعدد مختصر مثنویوں کا خالق ہے۔ مثلاً "آب و رنگ"، "توصیف باغات اکبرآباد"، "درد و الم در تشریح عشق" اور "در صفت بنگالہ" وغیرہ۔ آخرالذکر مثنوی شعری محاسن کے ساتھ علمی افادیت بھی رکھتی ہے۔ منیر نے اس مثنوی میں بنگالہ کی آب و ہوا، موسمی تحولات

کے زیر اثر کیف و حال، بادو باران، سبزہ زار، اور وہاں کے ندیوں کے تلاطم و طغیانی کو شاعرانہ ہنر مندی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثنوی میں بنگال کے وحوش و طیور کا بھی بیان ہے۔ مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

بنام فیض بخش آتش آموز ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ دلہا گشتہ از وی فیض اندوز
بدرگاہش خرد جستہ توسل ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ز فیضش گشتہ انسان مظہر کل

اور خاتمے کے اشعار بطور ذیل ہیں:

ضمیری جبہ افروز معانی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ دلت ماہ سپہر نکتہ دانی
سخن را نیست پایانی بہ بخش باش ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ خمش باش و خمش باش و خمش باش

نور الدین محمد ظہوری ترشیزی (متوفی ۱۰۲۵ھ) ۹۸۸ھ میں ہندوستان آیا۔ دکن پہنچ کر وہ عادل شاہ کے دربار سے وابستہ ہوا۔ ساقی نامہ کی صورت میں ایک مثنوی احمد نگر کے والی برہان شاہ کی مدح میں لکھی۔ اس کے عوض میں بادشاہ نے سو زنجیر ہاتھی، درہم و دینار، نفیس ملبوسات ظہوری کو بطور انعام و اکرام مرحمت کیے۔ اس مثنوی میں پینتالیس سو (۴۵۰۰) ابیات ہیں۔ ساقی نامہ ۱۸۴۹ء میں مطبع نول کشور سے چھپ چکا ہے۔

"ہیر و رانجھا" کی داستان محبت جس کا تعلق خطۂ پنجاب سے ہے ہندوستان کی رقت انگیز داستانوں میں سے ایک ہے۔ فارسی زبان میں بشمول برہان لاہوری متعدد شاعروں نے اس عشقیہ داستان کو منظوم کیا ہے۔ اس قصے کو فارسی میں مثنوی کی شکل دینے والا اولین شاعر سعید سعیدی تھا۔ مثنوی کے آغاز میں وہ کہتا ہے کہ یہ داستان ہندی کا جامۂ کہن پہنے ہوئی تھی۔ میں نے اس لئے حلۂ نو میں ملبوس کیا، کہتا ہے:

در جامہ کہنہ بود عریان ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ در ہندی ہمی نمود عریان
پیراہن نو بنظم گفتار ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ پوشیدہ ز بندہ ہیر دلدار

سعیدی کے علاوہ ایک دوسرے شاعر متخلص بہ چناہی نے بھی اس افسانے کو منظوم کیا تھا۔ اس کی مثنوی کا نام ہیرو ماہی ہے۔ اپنی مثنوی کے بابت اس طرح اظہار کرتا ہے:

این قصہ چہ تمام کردم ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ شادان دل خاص و عام کردم
آرایش نظم دادم او را ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بہ کرسی زر دادم او را
ممتاز بہ فارسیش کردم ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ آزاد ز ہندویش کردم

کھیا لعل متخلص بہ ہندی نے بھی ہیر و رانجھا کی کہانی کو منظوم کیا تھا۔ اس کی مثنوی کا عنوان "نگارین نامہ" ہے۔ ہیر و رانجھا کو فارسی میں منظوم کرنے والے اور دوسرے شاعروں میں میر قمر الدین منت، محمد عاشق متخلص بہ لائق ہیں، لیکن ان تمام مثنویوں میں فقیر اللہ آفریں کی مثنوی مسمّی بہ "ناز و نیاز" سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ آفریں کی مثنوی کا آغاز درج ذیل شعر سے ہوتا ہے۔

بنام چمن ساز ناز و نیاز ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ خار نیازش بود سرو ناز

اور مثنوی کا آخری شعر اس طرح ہے:

گلستان کن صبح و شام توئی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ چمن ساز عیش مدام توئی

آفریں کا وطن لاہور تھا، وہ ایک آزاد طبع شاعر تھا۔ اپنے اوقات بیشتر قہوہ خانوں میں گزارتا تھا۔ اس کی وفات ۱۱۵۴ھ میں ہوئی۔ یہ مثنوی فرخ سیر کے زمانۂ سلطنت میں مکمل ہوئی تھی۔ عبد القادر بیدل عظیم آبادی (متوفی ۱۱۳۳ھ) صنف غزل میں منفرد طرز تفکر کا شاعر محسوب ہوتا ہے۔ اس کی غزل کے خصائص میں نزاکت ہائے معنی، اشکالات و تکلفات اور تشبیہات لطیف و دقیق خیالبافیاں شامل ہیں۔ اس نے سبک ہندی کے مخصوص عناصر کو منتہا کی منزل کو پہنچا دیا تھا۔ لیکن غزلوں کے علاوہ اس نے مثنوی کے صنف میں بھی نہایت شائستہ توجہ صرف کی۔ بیدل چار مثنویوں کا خالق ہے۔ "محیط اعظم" بیدل کی پہلی مثنوی ہے جو تقریباً دو ہزار ابیات پر حاوی ہے۔ شاہنامہ فردوسی کی بحر میں لکھی گئی اس مثنوی میں آٹھ ابواب ہیں۔ اس کا موضوع ابیات ہے اور تصوف کے معروف نظریہ وحدت الوجود کو بیان کرتی ہے۔ بیدل کی دوسری مثنوی موسوم بہ "طلسم حیرت" ہے۔ چار ہزار ابیات پر مشتمل یہ مثنوی نظامی کی مثنوی "شیریں خسرو" کے وزن پر لکھی گئی ہے۔ اس مثنوی کے مدعا اور مفہوم کا تعلق بھی مسائل ابیات سے ہے۔ تصوف کے رموز و نکات کے شرح و توضیح کے مقصد سے یہ مثنوی معرض نگارش میں آئی ہے۔ بیدل کی تیسری مثنوی مسمّی بہ "طور معرفت" میں ایک ہزار تین سو ابیات شامل ہیں۔ اس مثنوی کو نظم کرنے کے زمانے میں بیدل میوات میں نواب شکر اللہ کا مہمان تھا۔ مثنوی خطۂ میوات کے کوہستانی مناظر کو بیان کرتی ہے۔ بیدل نے اس سے محض دو روز کی مدت میں نظم کیا تھا۔ بیدل کی آخری مثنوی بعنوان "عرفان" ہے سنائی کی مثنوی "حدیقۃ الحقیقہ" کے وزن میں (فاعلاتن مفاعلن فعلن) لکھی گئی اس مثنوی میں خدا، انسان اور جہان کے رشتہ و پیوند کو بیان کیا گیا ہے۔ اشعار کی تعداد تقریباً چار ہزار ہے، بیدل نے اس مثنوی کو تین سال کی مدت میں مکمل کیا تھا۔

فرخ سیر کے دورۂ سلطنت میں میر محمد شریف الحسینی رے سے مہاجرت کر کے ہندوستان آیا تھا۔ وہ ایک مستند و معتبر شاعر ہے۔ اس کے کلیات کا قلمی نسخہ کتابخانہ خدا بخش میں تحت شمارۂ فہرست ۳۴۸ موجود ہے۔ اس کلیات میں ایک مختصر عشقیہ مثنوی شامل ہے، جس کا عنوان بقرار ذیل ہے: "عاشق شدن یعقوب علی خان ملک باشی بر صفیہ بیگم کہ در قریہ برم پوری بہم رسانیدہ بود"۔ مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

شنو افسانۂ ای در عشق بازی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ آوردم بنظم بی نیازی
رفیق و ہم جلیسم بود مردی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ حریفی مرد رندی اہل دردی

مثنوی کا اختتام اس طور ہے:

توئی عاشق توئی معشوق عالم　　توئی عزت دہ اولاد عالم
توئی روزی رساں جملہ مخلوق　　توئی عاشق توئی خلاق معشوق
بلطفی کن حسینی را سر افراز　　کہ گردد در جہان عشق ممتاز

شمس الدین فقیر ہندوستان میں بارہویں صدی ہجری کا ایک باکمال شاعر تھا۔ علی قلی والہ داغستانی سے اس کے بڑے گہرے روابط تھے۔ فقیر شاہجہان آباد میں ۱۱۱۵ھ میں متولد ہوا۔ اس کی وفات ناگہانی طور پر اس کشتی کے غرق ہو جانے کے سبب ہوئی جب وہ زیارت خانہ خدا سے لوٹ رہا تھا۔ فقیر نے متعدد مثنویاں لکھی ہیں اور اس صنف میں وہ منفرد مقام رکھتا ہے۔ "در مکنون" فقیر کی اہم ترین مثنوی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

خداوندا رہ تفرید بنما　　بروی من در توحید بگشا
از آن راہم ببر تا کوی مقصود　　وزاین در جلوہ گر کن روی مقصود
در دل بر رخم از لطف بگشای　　وز آن پس از درم تا گہ درون آی

یہ مثنوی دوازدہ امام کے مناقب اور نرجس خاتون ملقب بہ ملیکہ بنت قیصر روم کی دل پذیر کہانی اور اس کا امام محمد حسن عسکری علیہ السلام کے حبالۂ ازدواج میں آنے کے ماجرے کو بیان کرتی ہے۔ خاتمہ کے چند اشعار اس طرح ہیں:

بحمد اللہ کہ این در گرامی　　گرفت از کلک من نظم تمامی
بنام من ز دیوان ارادت　　مسجل گشت توقیع سعادت
ز بحر دل چو جوشید این لآلی　　خطابش در مکنون گشت حالی

فقیر کی ایک دوسری مثنوی موسوم بہ "تصویر محبت" ہے۔ یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ اس میں ایک تنبول فروش کے بیٹے رام چند کی عشقیہ داستان کو بیان کیا گیا ہے۔ مثنوی کے اشعار کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود فقیر کو تنبول فروش کے اس بیٹے سے عشق ہو گیا تھا۔ مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

خدا وندا دلی دہ شعلہ سامان　　کہ از سوزش فتد آتش بجانم

فقیر کی مثنوی "والہ و سلطان" والہ داغستانی اور خدیجہ سلطان کے عشق کی رقت انگیز داستان کو بیان کرتی ہے۔ والہ کو اپنی چچازاد بہن سے عشق ہو گیا تھا۔ ایام طفلی میں ہی دونوں ایک دوسرے سے منسوب ہو گئے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے دونوں کی عروسی انجام پذیر نہیں ہو سکی۔ ناکام محبت کی اس داستان کو فقیر نے نظم کیا ہے۔ مثنوی کے اشعار کی تعداد تین ہزار دو سو تیس (۳۲۳۰) ہے۔ مثنوی کے خصوصیت کے بابت فقیر اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

این نظم ز گلہای دیگر　　از چند چمن بود نکوتر

اولی آنست کہ این حکایت　　منقول نگشتہ از روایت
نبود چو حکایتی سماعی　　یا ہیچو فسانہ اختراعی
تقویم کہ شدہ است اکنون　　شور فرہاد و عشق مجنون
آن بہ کہ رہ تازہ پویم　　حرفی کہ بود نگفتہ گویم
لیلی نہ بہ از خدیجہ سلطان　　مجنون نہ بہ از علی قلی خان

فقیر کی ایک مثنوی بعنوان "شمس الضحیٰ" عرفان و تصوف کے موضوع پر ہے۔ مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

ای بہ ثنات زبان سحر طراز　　نطق را دادہ مایۂ اعجاز

اس مثنوی میں ائمۂ دوازدہ کے کرامات و خوارق العادہ کارناموں کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مطالب معتبر منابع سے اخذ کئے گئے ہیں۔ مثلاً ساتویں امام موسیٰ بن جعفر کی غیر معمولی فضیلتوں کی توصیف محمد بن علی بابویہ کی کتاب سے ماخوذ ہے۔ ابوجعفر محمد بن علی بابویہ شیعوں کے بزرگ فقیہ تھے۔ یہ مثنوی ۱۱۷۳ھ میں تصنیف ہوئی تھی۔ فقیر نے ایک مثنوی بعنوان "مثنوی در واقعۂ جان سوز کربلا" لکھی تھی۔ اس مثنوی کربلا کے المدوہ ناک واقعہ کو نہایت موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

"سیر المتاخرین" کے مصنف غلام حسین طباطبائی نے ایک مثنوی مسمی بہ "بشارت الامامت" لکھی تھی۔ اس مثنوی میں طباطبائی نے اپنے بزرگوں کے ماورائے طبیعی کرامتوں کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ مثنوی کا آغاز درج ذیل شعر سے ہوتا ہے:

بنام خدای کہ جان آفرید　　زمین آفرید و زمان آفرید

کتابخانہ خدابخش میں اس مثنوی کا قلمی نسخہ فہرست شمارہ ۱۹۹۱ کے تحت موجود ہے۔ یہ نسخہ ۹۹ اوراق پر محتوی ہے۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی شورش و سرکشی کی بابت ایک عیسائی بنام فراسو نے ایک مثنوی بعنوان "فتحنامہ انگریز" لکھی تھی۔ مصنف اس وقت کے وقائع و حوادث کا چشم دید شاہد تھا۔ یہ مثنوی مخطوطہ کی صورت میں کتابخانہ خدابخش میں فہرست شمارہ ۱۹۳۹ کے تحت محفوظ ہے۔ مثنوی ایک سو پانچ اوراق پر حاوی ہے اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

در نظم سخن بنام خدای　　کریم و رحیم است و ہم رہنمای

میر فرزند علی موزوں کا وطن سامانہ تھا۔ فن شاعری میں میر شمس الدین فقیر کا تلمیذ تھا۔ وہ تیرہویں صدی ہجری کے اوائل میں اودھ کا ایک ذو لسانین شاعر تھا۔ اس کے اشعار فارسی و اردو دونوں زبانوں میں ملتے ہیں بڑا کثیر الکلام اور شیریں گفتار شاعر تھا۔ اس کی وفات لکھنؤ میں ۱۲۲۹ھ میں ہوئی اس نے ایک تاریخی مثنوی موسوم

یہ "آصف نامہ" لکھی تھی۔ موزوں نے اس مثنوی میں معرکۂ جنگ مابین آصف الدولہ سربراہ مملکت اودھ اور غلام محمد خان سربراہ قوم روہیلہ کو نظم کیا ہے۔ اس مثنوی کا قلمی نسخہ بخط مصنف پچانوے صفحات پر مشتمل کتابخانہ خدابخش کا مملوکہ ہے۔ جس کا سلسلہ وار نمبر ۲۶۷۱ ہے۔ مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

بنام خداوند رب العباد — کہ ملک سلیمان بہ آصف بداد

اور اس شعر پر یہ مثنوی انجام پذیر ہوتی ہے:

ز تیغش دل خصم او چاک باد — سر دشمنش زیب فتراک باد

یہ مثنوی ۱۹۶۲ء میں ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ سے اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔

اورنگزیب کے عہد کا معروف شاعر ملا بینش کشمیری بھی کئی مثنویوں کا مصنف ہے برٹش میوزیم لندن میں محفوظ "کلیات بینش" کے قلمی نسخے میں بینش کی پانچ مثنویاں ہیں، جبکہ سالار جنگ میوزیم حیدر آباد کے کتابخانہ میں جو مثنویات بینش کا نسخہ ہے اس میں چھ مثنویاں شامل ہیں۔ اس مخطوطے کا فہرست نمبر ۱۰۹۳ ہے۔ بینش کی مثنویوں کے نام اس طرح ہیں: بینش ابصار، گنج روان، گلدستہ، شور خیال، رشتۂ گوہر، اور جواہر خانہ۔

بینش کشمیری کے مندرجہ بالا تمام مثنویوں میں "شور خیال" شعری محاسن کے اعتبار سے زیادہ در خور توجہ ہے۔ یہ مثنوی بنارس کی ایک عشقیہ داستان کو بیان کرتی ہے۔ آغاز میں شہر بنارس کی خوشگوار فضا، وہاں کی دوشیزگان دلربا، فرح بخش مناظر و مظاہر کو منظوم کیا گیا ہے۔ پھر ایک مسلم جوان اور ہندو دوشیزہ کی عشقیہ داستان ہے جو ایک دن دریا میں غسل کرتے ہوئے دریا کے گرداب میں پھنس کر غرق ہو جاتے ہیں مثنوی کے ابتدائیہ چند اشعار اس طرح ہیں:

خداوندا ز شور دل خرابم — نمک پروردہ چو مرغ کبابم
بنارس را عجب آب و ہوائیست — برای عشق بازی طرفہ جائیست

آرزو اکبر آبادی ایک مستند و محکم نثر نگار ہونے کے باوجود ایک مسلم الثبوت شاعر بھی تھے۔ ان کی مثنوی "جوش و خروش" شہرت رکھتی ہے جو نوعی خبوشانی کی مثنوی "سوز و گداز" کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ ان کی ایک دوسری مثنوی کا نام "مہر و ماہ" ہے ان کے علاوہ ایک مثنوی مسمی بہ "حسن و عشق" زلالی کی مثنوی "محمود و ایاز" کے جواب میں لکھی گئی۔ آرزو کی وفات ۱۱۶۹ھ میں ہوئی۔

کشمیر میں چک سلاطین کا عہد ہندوستان میں مغلیہ بادشاہوں کا ہم زمان رہا ہے۔ حالانکہ ۲۷ سال کی مدت سلطنت میں ناموافق سیاسی اوضاع کے باوجود اس دور میں فارسی شعر و ادب کو فروغ ہوتا رہا۔ اس زمانے کے مشہور شاعر شیخ یعقوب صرفی نے نظامی گنجوی کی تقلید میں "مسلک الاخیار"، "وامق عذرا"، "مغازی النبی"، "لیلی مجنون" اور "مقامات مرشد" نام کی پانچ مثنویاں تصنیف کیں۔ اکبر کے زمانے میں کشمیر سلطنت مغلیہ کا حصہ بن

گیا۔ مغلیہ دور میں فارسی شعر و ادب کی پیشرفت میں مزید تیزی آئی۔ شیخ محمد چشتی نے تصوف کے موضوع پر ایک مثنوی "کنز العشق" لکھی تھی۔ میرزا کمال الدین بیگ خان کامل بدخشی نے ایک مثنوی بنام "بحر العرفان" لکھی تھی جو چار جلدوں میں اسی ہزار اشعار پر مشتمل ایک عارفانہ مثنوی ہے۔ افغانی دور کے کشمیری مثنوی نگاروں میں سعد اللہ شاہ آبادی سب سے زیادہ معروف ہے۔ اس نے "باغ سلیمان" نامی مثنوی میں حکام شہر کے جور و ظلم کو بیان کیا ہے۔ ملا اشرف بلبل نے خمسہ تصنیف کیا ہے جو درج ذیل مثنویوں پر مشتمل ہے۔ رضا نامہ، ہشت اسرار، ہشت بہشت، مہر و ماہ، اور ہیمال و ناگرائے۔ ہیمال و ناگرائے دو کشمیری عاشق و معشوق تھے۔ افغانی حکومت کے دور میں شیخ محمد رفیق نے "تحفۃ الاحباب" اور "مصابیح الدجا" نامی دو مثنویاں لکھی تھیں جن کے موضوعات پند و موعظت سے متعلق ہیں۔ سید محمد خورشید امامی بلگرامی پسر افتخار الدین فروغ شیر آرہ کے مضافات میں واقع قصبہ کوات میں ۱۲۱۲ھ میں متولد ہوا تھا۔ امامی بلگرامی تیرہویں صدی ہجری کے نیمہ اول میں ایالت بہار کا ایک مستند اور ارجمند شاعر محسوب ہوتا تھا اس کی وفات ۱۲۷۴ھ میں ہوئی۔ امامی دو مثنویوں کا خالق ہے۔ اس کی پہلی مثنوی موسوم بہ "شورش عشق" ۱۲۳۳ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ یہ مثنوی تقریباً پانچ سو پچاس ابیات پر محتوی ہے اس المناک و شور انگیز مثنوی کی اساس ادیب عرب اصمعی کی روایت کردہ ایک عاشقانہ داستان پر ہے۔ آغاز مثنوی میں امامی اشارہ کرتا ہے:

عرب را بحر سازی اصمعی نام — فصاحت را ز نامش شہد در کام
بدینسان گفت حرفی غارت ہوش — کزو در بحر ماتم غرق تا گوش

حمد و نعت اور منقبت کے بعد مثنوی کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

بیا ای خامۂ شیرین زبانم — بیا ای طوطی ہندوستانم
بسوی ہند دولت خویش رو کن — وزان سر چشمۂ معنی وضو کن

امامی سے قبل شیخ علی حزین نے اس داستان کو منظوم کیا تھا جس کا ذکر گنج کے "تذکرۃ الاحوال" میں موجود ہے اختتامیہ کے اشعار درج ذیل ہیں:

چو این افسانہ آرد شورش عشق — نہادم نام آن را شورش عشق
برایش گوہر تاریخ سفتم — بود سلک در خوشاب گفتم

۱۲۹۲ھ میں یہ مثنوی مطبع نور الانوار (آرہ) سے اردو کے معروف شاعر صفیر بلگرامی کے تحت اہتمام اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔

امامی بلگرامی کی دوسری مثنوی بنام "ثمر مراد" ایک ہزار نو سو ابیات پر مشتمل ہے۔ امامی کا یہ ایک طربیہ منظومہ ہے جو ۱۲۲۹ھ میں انجام پذیر ہوا تھا۔ اس مثنوی کی تاریخ اتمام سے متعلق کئی شاعروں نے قطعات لکھے

تھے انور علی یاس آروی نے اس کی تاریخ تکمیل ''طاقت خامۂ امامی'' اور ''باغ مراد'' جیسے کلمات سے نکالی ہے
مثنوی کا اختتامیہ اس طرح ہے:

لوائم خامہ و لفظ است لشکر   بہ میدان آدم اللہ اکبر
بدست طبع قوس زور بازو   خدنگ خامہ از کاغذ ترازو

اردو کے معروف شاعر صفیر بلگرامی اپنے تذکرہ موسوم بہ ''جلوۂ خضر'' میں لکھتے ہیں کہ: امامی کی مثنوی ''ثمر مراد'' کا مرتبہ قیمت کنجاہی کے ''نیرنگ عشق'' سے بلند تر ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۹۲ھ میں مطبع نور الانوار آرہ سے چھپ چکی ہے۔

راجہ پیارے لعل الفتی پسر رای مکھن لعل کائستھ فارسی کا ایک برجستہ صاحب دیوان شاعر تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت پرورش و پرداخت عظیم آباد میں ہوئی تھی سن شعور کو پہنچنے پر الفتی اکبر ثانی اور شاہ عالم کے ایام حکومت میں شاہجہان آباد میں دیوان کی خدمات پر مامور تھا۔ دہلی کے ایام ملازمت کی مدت کو الفتی نے بڑی عزت و احترام کے ساتھ گزارا لیکن رمد چشم کی بیماری کے سبب اسے ملازمت ترک کر کے عظیم آباد لوٹنا پڑا۔ یہاں پچاس ہندو و مسلمان طلباء اس کے حلقۂ تدریس میں داخل تھے۔ اس کے تلامذہ میں سب سے زیادہ شہرت وزیر علی عبرتی کو حاصل ہوئی۔ الفتی کا دیوان زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔

اس نے ''نیرنگ تقدیر'' نام کی ایک مثنوی لکھی تھی، جو اس وقت ارباب شعر و ادب کے درمیان بہت مقبول ہوئی تھی۔ یہ مثنوی ۱۲۹۸ھ میں طبع ہو چکی ہے۔ الفتی کی وفات ۱۲۵۰ھ میں ہوئی تھی۔ ''نیرنگ تقدیر'' ایک عشقیہ مثنوی ہے جو تقریباً چھبیس سو (۲۶۰۰) ابیات پر محتوی ہے مثنوی کی ابتدا حمد ایزد متعال سے اس طرح ہوتی ہے:

بیار همت نجوم افلاک   افتادہ بہ طاق چشم ادراک
نہ چرخ بہ کنہ تو ز آغاز   سرگشتہ چو گوی در تگ و تاز
ناخن بہ جگر ہلال از تو   خواہندہ ہر کمال از تو

یہ مثنوی خطۂ باختر کے ایک امیر کی اکلوتی خوبرو دختر کی عشقیہ کہانی کو بیان کرتی ہے جس کا رشتۂ مناکحت صغرسنی میں ہی قبیلہ کے ایک پسر نکو چہر سے باندھ دیا گیا تھا۔ الفتی نے ''نیرنگ تقدیر'' کے علاوہ چند مختصر مثنویاں بھی منظوم کی ہیں مثلاً موسوم بہ ''طلائی دست افشار'' جو ایک سو پچپن ۱۵۵ ابیات پر حاوی ہے۔ اس کا قلمی نسخہ کتاب خانہ خدابخش میں فہرست نمبر ۳۶۱۰ کے تحت موجود ہے۔ الفتی نے اس مثنوی میں ایک تیز طرار زن بیوہ کی کہانی کو بیان کیا ہے۔ یہ مثنوی نظامی کی ''مخزن الاسرار'' کے وزن میں منظوم ہوئی ہے۔ حمد باری تعالی کے بعد مثنوی اس طرح شروع ہوتی ہے:

بیوہ زنی بود یکی تیز ہوش   چابک و شیریں لبق و لبو کوش
برق تہ برقع ابر سیاہ   در تتق ابر بہ شرق ماہ
شوخ تر از نرگس شہلای خویش   در پی رسوائی شیدای خویش

الفتی کی ایک دوسری مختصر مثنوی بعنوان ''کلیچ خرد'' احتراز صحبت بازنان کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اس میں عجم کے ایک بادشاہ کی داستان اور اس کے وزیر کے پند و نصیحت کو بیان کیا گیا ہے چودہ صفحات پر لکھی گئی یہ مثنوی حمد و نعت کے بعد اس طرح شروع ہوتی ہے:

بہ یکی از پادشاہان حشم و کوش   خوردہ از دست ہوس صہبای نوش
بستہ زنجیر کاکل جان و دل   در ہوای سرو نازی پا بہ گل

اس مثنوی کا قلمی نسخہ فہرست نمبر ۳۶۱۱ کے تحت کتابخانہ خدابخش میں موجود ہے۔
الفتی کی تیسری مختصر مثنوی مسمی بہ ''ابر'' ہے۔ یہ مثنوی ۱۵۲ ابیات پر مشتمل ہے اور بارہ صفحات میں لکھی گئی ہے۔ مثنوی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

بعد حمد خالق ارض و سما   گوییت نغزک مقال غم زدا
بود قاضی بہ سر دستار خوان   ناگہان بگذشت رند نوجوان

کتابخانہ خدابخش میں اس مثنوی کا مخطوطہ نسخہ فہرست ۳۶۱۲ کے تحت موجود ہے
شاہ امین احمد فردوسی متخلص بہ ثبات ۱۲۴۸ھ میں بہار شریف میں متولد ہوئے۔ خوش فکر شاعر تھے اور عرفان و تصوف کے انوار و اشراق کے ساتھ علوم ظاہری میں بھی غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔ ان کی وفات ۷۳ سال کی عمر میں ۱۳۲۱ھ میں ہوئی۔ حضرت ثبات متعدد مثنویوں کے مصنف ہیں۔ ''گل فردوس'' حضرت ثبات کی طویل ترین مثنوی ہے۔ یہ مثنوی مطبع نولکشور سے ۱۳۰۱ھ میں طبع ہو چکی ہے۔ حضرت ثبات نے اس مثنوی میں سلسلۂ فردوسیہ کے اولیاء و مشائخ کی منقبتیں بیان کی ہیں۔ اشعار کی تعداد تقریباً پانچ ہزار ہے۔ مثنوی بحر رمل کے فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن کے وزن میں لکھی گئی ہے۔ ابتدائیہ شعر اس طرح ہیں:

وانما از معرفت آنکس کہ دل آگاہ بود   اینکہ در ارض و سماوات یک اللہ بود

شاہ ثبات کی دوسری مثنوی مسمی بہ ''گل بہشت'' میں میر نجات اصفہانی کی مثنوی ''گل کشتی'' کے فنی اسلوب کی تقلید کی گئی ہے۔ لیکن معنوی اعتبار سے یہ مثنوی ''گل کشتی'' سے مختلف ہے۔ اس کا موضوع یکسر متصوفانہ ہے۔ یہ مثنوی بھی لکھنؤ کے مطبع انوار محمدی سے چھپ چکی ہے۔ جو ۲۲۴ صفحات پر حاوی ہے۔ اس مثنوی میں معروف و بلند مرتبت صوفیوں کے مدائح و مناقب بیان ہوئے ہیں۔ جن میں چند نام اس طرح ہیں۔ حضرت ابو العلا، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بختیار کاکی اور خواجہ فرید الدین گنج شکر وغیرہ۔ مثنوی کا آغاز درج ذیل شعر سے ہوتا ہے۔

از ہمہ راہ رو فقر چہ دلخواہ بود　　زانکہ الفقر اذا تم ہو اللہ بود

مثنوی میں اشعار کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہے۔

شاہ ثبات کی مثنوی "روضۃ النعیم" کا سال طباعت ۱۳۰۱ھ ہے۔ یہ مثنوی مطبع اشرف الاخبار بہار شریف سے طبع ہوئی تھی۔ اس مثنوی میں شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کے علاوہ چند دوسرے جلیل القدر صوفیہ کی خدمت میں منقبتیں پیش کی گئی ہیں۔ چند اشعار حضرت غوث الاعظم کی منقبت سے اس طرح ہیں۔

حضرت شیخ جہان سید عبد القادر　　آنکہ انواع کرامات شد از وی صادر

از سوی ام علوی بود و حسینی بہ نسب　　بود آمادہ پی تربیتش رحمت رب

حضرت ثبات کی ایک مثنوی شہد و شیر کے نام سے ہے۔ یہ مثنوی "نان و پنیر" نام کی مثنوی کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ مثنوی "نان و پنیر" میں صوفیوں کے جماعت کی اہانت کی گئی تھی۔ اور اہل تصوف کے افکار و اطوار کو مورد طنز و تضحیک قرار دیا گیا تھا۔ شاہ ثبات نے اس مثنوی کے ذریعہ صوفیا کا دفاع کیا ہے اور مصنف "نان و پنیر" کا شافی اور دندان شکن جواب دلائل و شواہد کی روشنی میں دیا ہے۔ مثنوی کے چند اشعار اس طرح ہیں۔

بو زنہ لذات ادرک کی شناخت　　شپرہ در روز روشن کی بتافت

صوفیان پاک را ذم می کنی　　نسبت تر پاک باسم میکنی

کاملی را ناقصی گر گفت بد　　باعث آن نیست جز بغض و حسد

عبدالجلیل بلگرامی کے فرزند میر محمد متخلص بہ شاعر ۱۱۰۱ھ میں متولد ہوئے تھے۔ بڑے زیرک و ذہین تھے اور فارسی کے مستعد و ہنرمند شاعر تھے۔ ان کی تصنیف کی ہوئی مثنوی موسوم بہ "ناز و نیاز" سید علی بلگرامی اور شاہ فیاض کی عاشقی کے موضوع پر ہے۔

میرزا اسد اللہ خان غالب متوفی ۱۸۶۹ء شاعر روزبانہ فارسی و اردو، فارسی غزل گوئی میں غیر معمولی قدرت و استعداد رکھنے کے باوصف ایک ہنرمند مثنوی سرا بھی تھے۔ وہ کئی مثنویوں کے خالق ہیں۔ مثلاً 'ابر گہر بار' 'درد و داغ' "چراغ دیر" اور مثنوی در بیان نموداری' شان نبوت و ولایت' کہ در حقیقت پر تو نور الانوار حضرت الوہیت است" مثنوی ابر گہر بار کا موضوع غزوات سید المرسلین ہے۔ لیکن غالب اس مثنوی کو مکمل نہیں کر سکے تھے۔ فقط چند تمہیدی عنوانات کے تحت اس موضوع پر اشعار لکھے جا سکے تھے۔ ۱۸۶۴ء میں یہ مثنوی زیور طبع سے آراستہ ہوئی تھی۔ اس ناتمام مثنوی کے باب معراج سید المرسلین کے کچھ اشعار اس طرح ہیں۔

شبی دیدہ روشن کن دلفروز　　ز اجزای خود سرمۂ چشم روز

در آن روز فرخندہ آن شب نخست　　ہمہ روز خود را بہ خورشید شست

شدہ چشم انجم در آن جوش نور　　تماشا گر حال اہل قبور

اس ناتمام مثنوی میں دس سو اٹھانوے (۱۰۹۸) ابیات ہیں۔

غالب کی مثنوی موسوم بہ "درد و داغ" اس فکر پر مبنی ہے کہ مقدر بشر میں جو چیز لکھی جا چکی ہے وہ تغیر ناپذیر ہے۔ انسان ہزار ہاتھ پاوں مارے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ مثنوی تین بدنصیب اشخاص کی ایک اندوہناک کہانی ہے۔ یہ ہیں ایک جوان دہقان اور اس کے ماں باپ۔ یہ مثنوی ایک سو ستاسی ۱۸۷ ابیات پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز بطرز ذیل ہوتا ہے۔

بی ثمری بزرگری پیشہ داشت　　در دل صحرای جنون ریشہ داشت

دست تہی آئینۂ قسمتش　　زخم دل و داغ جگر دولتش

خانہ اش از دشت خطر ناک تر　　پیرہنش از جگرش چاک تر

قضا و قدر نے اس الم نصیب خانوادے کی تقدیر میں مفلسی و محرومی لکھ دی تھی۔ اس لئے ایک فقیر روشن ضمیر کی دعاؤں کی برکت سے عیش و نشاط کی زندگی حاصل کر لینے کے باوجود اسے یہ آخر الامر یہ راس نہیں آئی۔ غالب کی ایک مثنوی بعنوان "در بیان نموداری شان نبوت و ولایت کہ در حقیقت پرتو نور الانوار حضرت الوہیت است" ہے۔ اس مثنوی کو غالب نے اپنے دوست مولانا فضل حق خیرآبادی کی فرمائش پر لکھی تھی۔ اس کا موضوع حضرت خاتم النبین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نظیر کا امتناع ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور مسائل بھی مثلاً رسول کریم کے موئے مبارک کی حرمت، میلاد النبی کی محفلوں کا انعقاد وغیرہ اس میں شامل ہیں۔ یہ مثنوی ایک سو اکاسی اشعار پر محتوی ہے۔ دراصل مسلک اہل حدیث کے بعض خیالات کو رد کرنے کے مقصد سے مولانا خیرآبادی نے غالب سے یہ مثنوی لکھوائی تھی۔ امتناع نظیر رسول کریم کی بابت مولانا اسمعیل شہید کی رائے یہ تھی کہ مثل حضرت محمد اس وجہ سے ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ ان کی خاتمیت کے منافی ہے لیکن مولانا خیرآبادی کا نظریہ یہ تھا کہ مثیل رسول کریم ممتنع بالذات ہے۔ غالب کی ایک اور مثنوی بعنوان "چراغ دیر" ایک سو نو (۱۰۹) اشعار میں منظوم ہوئی ہے۔ یہ ۱۸۲۶ء کے فروری مارچ کے مہینوں میں منظوم ہوئی تھی، جب اثنائے مسافرت برائے کلکتہ غالب اسی سال جنوری کے اواخر میں بنارس پہنچے تھے۔ بنارس کے دلفریب مناظر نے ان کی طبیعت میں جذب و جنون کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ رود گنگ میں غسل کرتی ہوئی پری تمثال سے حسینوں کے جلوے، صبح و شام کی روح پرور فضا اور نہایت لطیف آب و ہوا سے غالب بے حد محظوظ و متمتع ہوئے تھے۔ چنانچہ ان نشاط انگیز کیفیتوں سے مغلوب ہو کر انہوں نے اس مثنوی کو منظوم کیا تھا۔ "چراغ دیر" کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

نفس با صور دمساز است امروز　　خموشی محشر راز است امروز

رگ سنگم شراری می نویسم　　کف خاکی غباری می نویسم

مثنوی کا خاتمہ درج ذیل صوفیانہ اشعار پر ہوتا ہے:

ہوس را سر بہ بالین فنا نہ　　نفس را از دل آتش زیر پا نہ

دل از تاب بلا بگداز و خون کن   ز دانش کار مگشاید جنون کن

ز لا دم حزن تسلیم لا شو   بگو اللہ و بدق ما سوا شو

اقبال ابتدا میں اردو زبان میں شعر کہتے تھے۔ لیکن جب ان کا اندیشہ و خیال وطنیت کے محدود دائرے سے نکل کر نوع انسان، حیات و کائنات، اور تمام عالم کے مظلوم انسانوں خصوصیت سے ایشیا کے باشندوں کی طرف منعطف ہوا اور اس کے سبب نگاہ و نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور مفاہیم و موضوعات میں عمیق و ابعاد کی افزونی ہوئی تو انہوں نے محسوس کیا کہ اردو زبان من حیث وسیلۂ اظہار ان کے لیے ناکافی اور ناقابل انحصار ہے۔ لہٰذا اپنے بلند و بالیدہ افکار کے ابلاغ کے لئے انہوں نے فارسی زبان کو بروئے کار لانا لازم سمجھا۔ اقبال کہتے ہیں:

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است   طرز گفتار دری شیرین تر است

پارسی از رفعت اندیشہ ام   در خورد با فطرت اندیشہ ام

اقبال نے اپنے افکار گرانمایہ کی ترسیل کے لئے غزل، رباعی، قطعہ کے علاوہ مثنوی کے قالب کو بھی بروئے کار لایا۔ انہوں نے پانچ مثنویاں نظم کی ہیں۔ ان کی پہلی مثنوی "اسرار خودی" ہے۔ اس مثنوی میں اقبال مولوی رومی کا ذکر ارادت و شوق صمیمانہ کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد اس خواب کی تعبیر و تشریح کرتے ہیں جس میں انہیں رومی کے دیدار کا فیض حاصل ہوا تھا۔ وہ اسی خواب کو اس مثنوی کا محرک قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

روی خود بنمود پیر حق سرشت   کہ بہ حرف پہلوی قرآن نوشت

گفت ای دیوانۂ ارباب عشق   جرعہ ای گیر از شراب ناب عشق

آتش استی بزم عالم را فروز   دیگران را ہم ز سوز خود بسوز

اسرار خودی رومی کی معروف بحر (رمل مسدس محذوف یا مقصور) میں لکھی گئی ہے۔ ۱۹۱۵ء میں پہلی بار یہ مثنوی طبع ہوئی تھی۔ ذکر خودی پر محتوی اشعار میں عظمت و قوت عشق کو بیان کیا گیا ہے۔ جس سے مترشح ہوتا ہے کہ خودی و عشق کے تصورات کو اقبال نے رومی کے الہام بخش پیام سے اخذ کیا ہے۔ کہتے ہیں:

شمع خود را ہمچو رومی بر فروز   روم را در آتش تبریز سوز

"رموز بیخودی"، "اسرار خودی" کا ایک دوسرا بخش ہے۔ یہ مثنوی ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی تھی اقبال نے جس طرح خودی کو مخصوص معنی و مفہوم کے لئے استعمال کیا ہے، اسی طرح وہ بیخودی کی اصطلاح کو بھی نئی معنویت بخشتے ہیں، اس مثنوی میں بھی فکر رومی کے اثرات واضح ہیں۔ اقبال رومی کے اشعار کی تضمین بطور ذیل کرتے ہیں:

مرشد رومی چہ خوش فرمودہ است   آنکہ یم در قطرہ اش آسودہ است

مگسل از ختم الرسل ایام خویش   تکیہ کم کن بر فن و بر گام خویش

اقبال نے اس مثنوی میں فرد و ملت کے رابطے کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ وہ اس امر پہ تاکید کرتے ہیں کہ فرد ملت سے اور ملت فرد سے قوت حاصل کرتی ہے۔ اور حیات بشر کو کمال اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ جماعت سے اپنا رشتہ استوار کرتا ہے۔

"جاوید نامہ" اقبال کی معروف ترین مثنوی ہے۔ یہ دراصل شاعر کی ایک خیالی سیر افلاک کا ماجرا ہے۔ یہ مثنوی انسان کی معراج کا ایک موثر و نہایت ہنرمندانہ انداز بیان کیا ہوا نمائش نامہ ہے، جس میں اقبال نے فلسفۂ حیات کو تمثیل و تخیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس مثنوی کی نگارش کی محرک دانتے کی "کمدی الٰہی" اور ابن عربی کی "فتوحات مکیہ" رہی ہیں۔ سیر افلاک میں ابتدا سے انتہا تک پیر رومی اقبال کی دستگیری کرتے ہیں۔ اور افلاک میں ان کی ملاقات عظیم المرتبت وفات یافتہ شخصیتوں سے کراتے ہیں۔ رومی حقیقت کے جلووں کے دیدار کے لئے اقبال کو ورائے افلاک لے جاتے ہیں۔ اقبال رومی سے وجود و عدم کی حقیقت کی بابت سوال کرتے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب میں رومی کی روح شعور و آگہی کے نکات و رموز کو نہایت دلنشین انداز میں بیان کرتی ہے۔ اقبال رومی سے اپنی قربت و صحبت اور حصول فیض و سعادت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

رومی آن عشق و محبت را دلیل   تشنہ کامان را کلامش سلسبیل

پیر روم آن صاحب ذکر جمیل   ضرب او را سطوت ضرب کلیم

مثنوی "مسافر" کو اقبال نے افغانستان کی مسافرت کے بعد نظم کیا تھا، اقبال کا یہ سفر ۲۱-اکتوبر ۱۹۳۳ء کو افغانستان کے بادشاہ کی دعوت پہ ہوا تھا۔ یہ مثنوی "خطاب بہ اقوام سرحد" کے عنوان کے تحت مخلصانہ پند و موعظت کے ساتھ اختتام پذیر ہوتی ہے۔ کہتے ہیں:

رزق از حق جو مجو از زید و عمر   مستی از حق جو مجو از بنگ و خمر

دل بجو تا جاودان باشی جوان   از تجلی چہرہ ات چون ارغوان

اقبال کی آخری مثنوی "پس چہ باید کرد ای اقوام شرق" ہے۔ اقبال اس مثنوی میں استعماری حکومتوں کی سیاست اور ان کے طرز نظام کا مقایسہ حکومت الٰہی سے کرتے ہیں، تمہید میں پیر رومی کا ذکر ہے۔ کہتے ہیں مشرق میں حیات نو کے آثار ایسی دانائے راز کے افکار سے ظہور میں آئیں گے۔ چند اشعار اس طرح ہیں:

پیر رومی مرشد روشن ضمیر   کاروان عشق و مستی را امیر

منزلش برتر ز ماہ و آفتاب   خیمہ را از کہکشان سازد طناب

نور قرآن درمیان سینہ اش   جام جم شرمندہ از آئینہ اش

منابع و ماخذ:

- ☆ مجمع النفائس، سراج الدین علی خان آرزو، نسخۂ خطی خدا بخش پٹنہ، شمارہ ۴۳۷
- ☆ نشترِ عشق، عاشق عظیم آبادی، نسخۂ خطی خدا بخش پٹنہ، شمارہ ۴۳۱
- ☆ کلیات حسینی، میر محمد شریف الحسینی، نسخۂ خطی خدا بخش پٹنہ، شمارہ ۳۳۹۲
- ☆ مثنوی رزِ مکنون، شمس الدین فقیر، نسخۂ خطی خدا بخش پٹنہ، شمارہ ۳۵۴۷
- ☆ مثنوی "بشارت الامامت"، غلام حسین طباطبائی، نسخۂ خطی خدا بخش پٹنہ، شمارہ ۱۹۹۱
- ☆ صحف ابراہیم (تذکرہ)، ابراہیم خلیل، نسخۂ خطی خدا بخش پٹنہ، شمارہ ۲۱۹
- ☆ تذکرہ "ریاض الشعرا"، والہ داغستانی، مطبوعہ، مرتبہ۔ شریف حسین قاسمی، کتابخانہ رضا رام پور
- ☆ تذکرہ "سفینۂ خوشگو"، بندرابن داس خوشگو، مطبوعہ، مرتبہ۔ عطاء الرحمان کاکوی، ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ
- ☆ تذکرہ "سفینۂ ہندی"، بھگوان داس ہندی، مطبوعہ، مرتبہ۔ عطاء الرحمان کاکوی، ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ
- ☆ تذکرہ "انیس الاحبا"، موہن لعل انیس، مطبوعہ، مرتبہ۔ پروفیسر سید انور احمد، کتابخانہ خدا بخش پٹنہ
- ☆ مثنوی "ہدایت و بشارت"، بوعلی قلندر، مطبوعہ، مرتبہ۔ علی حیدر نیر، ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ
- ☆ مثنوی "نیرنگ تقدیر"، غنیمت کنجاہی، مطبوعہ نول کشور
- ☆ مثنوی "ثمر مراد"، امامی بلگرامی، مطبوعہ مطبع نور الانوار (آرہ) ۱۲۹۲ھ
- ☆ مثنوی "شورش عشق"، امامی بلگرامی، مطبوعہ مطبع نور الانوار (آرہ) ۱۲۹۲ھ
- ☆ مثنوی "نیرنگ تقدیر"، پیارے لعل الفتی، مطبوعہ پٹنہ ۱۲۹۸
- ☆ مثنوی "نہ سپہر"، امیر خسرو، مطبوعہ علی گڑھ
- ☆ مثنوی "قران السعدین"، امیر خسرو، مطبوعہ علی گڑھ
- ☆ مثنوی "دول رانی خضر خان"، امیر خسرو، مطبوعہ، مرتبہ۔ رشید احمد
- ☆ مثنوی "آصف نامہ"، میر فرزند علی موزوں، مطبوعہ ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ
- ☆ مثنوی "والہ و سلطان"، شمس الدین فقیر، مطبوعہ ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ
- ☆ مثنوی "گل فردوس"، شاہ امین احمد ثبات، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ
- ☆ مثنوی "گل بہشتی"، شاہ امین احمد ثبات، مطبوعہ انوار محمدی لکھنؤ
- ☆ فہرست کتابخانہ نسخہ ہای خطی کتابخانہ ایوان ہند، لندن
- ☆ فہرست کتابخانہ موزۂ بریتانیا، لندن
- ☆ فہارس توصیفی (شعر فارسی) کتابخانہ خدا بخش

- ☆ قند پارسی (فارسی مجلہ) شمارہ ۱، ۱۹۹۰ء
- ☆ قند پارسی (فارسی مجلہ) شمارہ ۱۳۱-۹، ۱۲
- ☆ فصل نامۂ دانش (اسلام آباد) شمارہ ۱۹۹۳ء
- ☆ فصل نامۂ دانش (اسلام آباد) شمارہ زمستان ۱۳۶۸
- ☆ فصل نامۂ دانش (اسلام آباد) شمارہ پائیز ۱۳۸۳
- ☆ فصل نامۂ دانش (اسلام آباد) شمارہ ۲۵-۲۳، ۱۳۶۹
- ☆ فصل نامۂ دانش (اسلام آباد) شمارہ ۵۲-۴۹، ۵۵-۵۷، ۶۴، ۶۹، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰ و شمارہ ۹۲-۹۳

☆☆☆

بنگال میں ہندوؤں کی فارسی زبان وادب سے دلچسپی

فارسی ادب کے ارتقا میں بنگال نے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ تاریخ ادبیات فارسی میں زریں حرفوں میں نقش ہے۔ بنگال کا نام ایران کے مشہور ترین شاعر حافظ شیرازی کے ساتھ اس طرح جڑا ہوا ہے کہ جب تک فارسی ادب میں حافظ کا نام زندہ ہے اس وقت تک بنگال کا نام بھی تابندہ و پائندہ رہے گا کیونکہ یہی صوبۂ بنگال ہے جس نے حافظ کو یہاں آنے کی دعوت دی اور جس کے جواب میں حافظ نے اپنی وہ مشہور غزل سلطان غیاث الدین فرمانروای بنگالہ کی خدمت میں بھیج دی جس کا مطلع ہے۔

ساقی حدیث سرو وگل و لالہ می رود

این بحث با ثلاثۂ غسالہ می رود

اور خصوصیت سے بنگال کے متعلق یہ شعر کہا جو آج تک زبان زد خاص وعام ہے۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند

زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

فارسی ادب کے ارتقا میں بنگال کے خدمات کی ایک طویل تاریخ ہے۔ اس سرزمین پر اسلام کی آمد کے ساتھ ساتھ فارسی کا بھی ورود ہوا۔ اختیار الدین بن بختیار خلجی کے عہد سے لے کر برطانوی سلطنت کے تسلط تک فارسی بنگال کی سرکاری زبان رہی۔ یہ زبان نہایت تیزی کے ساتھ ترقی کے منازل طے کرتی گئی اور اس نے بنگال کی اجتماعی زندگی کو اس طرح متاثر کیا کہ ہر گھر میں اس کی مقبولیت کے ڈنکے بجنے لگے۔ ایک زمانے میں بنگال کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں فارسی پڑھی اور پڑھائی نہ جاتی تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ صرف مسلمان ہی اس کے شیدائی نہ تھے بلکہ ہندو بھی اس کے دلدادہ تھے۔ نہ صرف اس لیے کہ فارسی اس صوبے کی سرکاری زبان تھی بلکہ فارسی شعر وادب کے اخلاقی اور عرفانی مطالب نے بھی ان کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ بنگال کے ہندو بھی دیوان حافظ، گلستان و بوستان سعدی،

* سابق پروفیسر وصدر، شعبۂ عربی، فارسی، اردو واسلامیات، وشوبھارتی یونیورسٹی، شانتی نکیتن، مغربی بنگال

مثنوی مولانا جلال الدین رومی بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ فارسی ادب کے مطالعے نے بنگال کی اجتماعی زندگی کو اتنا زیادہ متاثر کیا کہ اس کی وجہ سے سوسائٹی میں غیر معمولی تبدیلیاں آگئیں۔ بنگال کے ہندوؤں نے اسی فارسی ادب کے مطالعے کے زیر اثر مسلمانوں کے طور طریقے اختیار کیے اور مسلمانوں جیسے لباس زیب تن کرنے لگے۔ ہر پڑھا لکھا ہندو فارسی سے لازماً واقف ہوتا تھا کہ جس شخص نے فارسی نہ پڑھی ہوتی اسے غیر شائستہ اور غیر مہذب سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر چیتموی دت بنگال پر فارسی کے اثر ونفوذ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"The principal Islamic language that influenced Bengali and enriched it, was , no doubt Persian. The Turko-Afghan or Mughal rulers, who freely imbibed Persian manners and culture, introduced Persian as the court language and thereby made the subject nations accustomed to it. Persian culture had pervaded not only the Muslim but also the Hindus, especially the upper class, who acquired the Persian language as well as adopted Persian manners and customs and the etiquette of the aristocracy. The educated and enlightened Hindu families regarded education incomplete and ineffectual without at least some knowledge of Persian. Not only that, a thorough knowledge of Persian was the pre-requisite to the raising of the status of a person in society."

''اصل اسلامی زبان جس نے بنگالی کو متاثر کیا اور اسے غنی تر بنایا وہ بلاشک وشبہ فارسی زبان تھی۔ ترک اور افغان یا مغل فرمانرواؤں

نے فارسی تہذیب وتمدن کو بالعموم اپنا لیا تھا اور فارسی زبان
کو سرکاری زبان بنا دیا۔ اس طرح رعایا کو بھی اسی تہذیب وتمدن
کا عادی بنا دیا۔ فارسی تہذیب نے نہ صرف مسلمانوں کو متاثر کیا
بلکہ ہندوؤں کو بھی۔ ہندوؤں کے اعلیٰ طبقے نے نہ صرف فارسی
زبان کو اپنایا بلکہ طبقۂ اشراف کے طور طریقے اور فارسی آداب ورسوم
کو بھی گلے لگا لیا۔ تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاندان میں فارسی کی
کم از کم تھوڑی استعداد کے بغیر تعلیم کو نامکمل اور غیر موثر سمجھا جاتا
تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ سوسائٹی میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے
لیے فارسی میں تبحر کامل اولین شرط تھی۔''

بنگال کے ہندوؤں نے نہ صرف فارسی کی تعلیم حاصل کی اور فارسی کلچر کو اپنایا بلکہ فارسی ادب کے ارتقا میں بھی ایسی گراں قدر خدمات انجام دیں جو انتہائی قابل تعریف ہے۔ محققین سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ فارسی کا سب سے پہلا اخبار بنام ''مرآۃ الاخبار'' اسی سرزمین بنگال سے شائع ہوا۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا اور اس کا پہلا شمارہ ۲۰ اپریل ۱۸۲۲ عیسوی کو منصہ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ بنگال یا ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں یہ پہلا فارسی اخبار تھا تو شاید غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ اس وقت تک ایران میں بھی کسی اخبار کا اجرا نہیں ہوا تھا۔ اس اخبار کے مدیر رلجہ رام موہن رائے تھے۔ استاد محترم پروفیسر عطا کریم برق نے اس اخبار کے بارے میں یوں اظہار نظر کیا ہے:

''مرآۃ الاخبار اولین خبر نامہ ای بفارسی در ہندوستان بود و مقصود
راجا رام موہن رای از چاپ این خبر نامہ تعلیم و بیداری توده مردم
بوده۔ خبر نامۂ فارسی ''مرآۃ الاخبار'' کہ راجا رام موہن رای آن
را اداره و چاپ میکرد حتی بہ کابل وتہران وسمرقند و بخارا ہی رفت۔
وباین نحو راجا رام موہن رای خدماتی بزرگ بزبان وفرہنگ فارسی
وکلتور اسلامی بانجام رسانید۔
چون لرد ہسٹنگس (Lord Hastings) بہ اول
ژانویہ ماه ۱۸۲۳ میلادی از شغل خود کنار کشید و آدم بجای او
متصدی امور سلطنتی شد و در اثر بہ اجرای خبر نامہ جات تاریخ چہار
دہم مارس ماه ۱۸۲۳ میلادی انفاذ قانون کرد و آن در نظر راجا رام

موہن رای بی احترامی وبی آبروئی بہ اخبار نویسی ومطبوعات
بوده۔ در نتیجہ آن او کہ اخبار نویس بود کہ عملاً اقدام کرد و خبر نامہ
''مرآۃ الاخبار'' را تعطیل کرد۔ آخرین سر مقالہ راجا رام موہن
رای بتاریخ چہارم آوریل ماه بسال ۱۸۲۳ میلادی بہ چاپ
رسانید ودر آن شہامت وشجاعت خود را نشان داد۔''

کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ''حبل المتین'' فارسی کا پہلا اخبار ہے جو کلکتہ سے شائع ہوا۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ ''حبل المتین'' ۱۳۱۱ ہجری میں شائع ہونا شروع ہوا جیسا کہ محمود نفیسی کے مندرجہ ذیل عبارت سے واضح ہے:

''یکی دیگر روزنامہ ہای منتشر شده در خارج ایران، روزنامہ
''حبل المتین'' است۔ این روزنامہ ہفتگی در سال ۱۳۱۱ ہجری در
کلکتہ منتشر گردیده است۔

۱۳۱۱ ہجری ۱۸۹۳ عیسوی ہے جب کہ مرآۃ الاخبار کی اشاعت ۱۸۲۲ میں شروع ہو چکی تھی۔ اس اعتبار سے بہرحال اولیت کا سہرا مرآۃ الاخبار ہی کے سر ہے۔

مرآۃ الاخبار کے علاوہ اور بھی فارسی اخبارات ہندوؤں کی ادارت میں کلکتہ سے شائع ہوئے۔ ان میں ایک اخبار ہفتہ وار ''جام جہاں نما'' بھی تھا جو کلکتہ سے ہر ہفتہ چہارشنبہ کے روز شائع ہوتا تھا۔ جام جہاں نما اردو کا پہلا اخبار تھا جو ۲۸ مارچ ۱۸۲۲ کو منظر عام پر آیا لیکن ۱۶ رمئی ۱۸۲۲ سے اس میں فارسی میں بھی خبریں چھپنے لگیں۔ اس لیے جام جہاں نما کو ہندوستان میں اردو کا پہلا اور فارسی کا دوسرا اخبار شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے مدیر لالہ سدا سکھ تھے اور یہ اخبار ۱۸۷۶ تک جاری رہا۔

دوسرا فارسی اخبار جسے ایک ہندو نے اپنی ادارت میں نکالا وہ ہفتہ وار ''شمس الاخبار'' تھا۔ اس کے مدیر متھرا موہن مترا تھے۔ یہ کلکتہ ہی کے رہنے والے تھے۔ انھیں اردو اور فارسی دونوں میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ یہ اخبار ۱۸۲۳ء میں شروع ہوا لیکن پانچ ہی سال کے اندر ۱۸۲۸ء میں بند ہو گیا۔

راجہ رام موہن رائے صرف مرآۃ الاخبار کے ایڈیٹری کی حیثیت سے نہیں جانے جاتے بلکہ ایک مصلح اور برہمو سماج کے بانی کی حیثیت سے بھی خاص شہرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے برہمو سماج کی تبلیغ وترویج کے لیے فارسی کو بطور آلہ استعمال کیا۔ اسی مقصد کے پیش نظر انھوں نے ''تحفۃ الموحدین'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کا متن فارسی میں اور مقدمہ عربی میں ہے۔ یہ انتہائی اہم کتاب ہے۔ چونکہ رام موہن رائے خدا کی وحدانیت کے قائل تھے لہٰذا انھوں نے اپنے اس نظریہ کو اس کتاب میں شرح وبسط کے ساتھ

بیان کیا ہے۔ دوسری طرف چونکہ وہ عربی اور فارسی کے علاوہ دیگر علوم اسلامی جیسے فلسفۂ اسلام، علم کلام اور مسائل تصوف وغیرہ پر بھی عبور رکھتے تھے اس لیے انھوں نے برہموسماج کی تبلیغ میں ان تمام علوم سے استفادہ کیا۔ صرف راجہ رام موہن رائے ہی نہیں بلکہ برہموسماج کے دوسرے مبلغین نے بھی حصول مقصد کے لیے فارسی زبان کا ہی سہارا لیا۔

کیشب چندرسین نے جو راجہ رام موہن رائے کے بعد برہموسماج کے سب سے بڑے مبلغ ہوئے اپنے دوست اور ہم مسلک بھائی گریش چندر اسین سے درخواست کی کہ وہ فارسی کی اخلاقی وعرفانی کتابوں کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کریں تا کہ برہموسماج کی تبلیغ میں معاون ثابت ہوں۔ چنانچہ گریش چندر اسین نے جو فارسی زبان میں تبحر کامل رکھتے تھے اپنے دوست کی درخواست قبول کرتے ہوئے شیخ سعدی کی گلستان و بوستان، خواجہ فرید الدین عطار کی کتاب تذکرۃ الاولیا، حافظ کا دیوان اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات کے کچھ حصے اور فارسی کی دیگر کتابوں کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کر کے چھپوایا[1]۔ اس طرح فارسی زبان صرف بنگالی سوسائٹی ہی پر اثر انداز نہیں ہوئی بلکہ ان کے مذہبی معاملات میں بھی اس نے اہم رول انجام دیا۔

مہاراجہ شتاب رائے کے لڑکے مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں صوبہ بہار کی دیوانی اور نظامت کا عہدہ تفویض کیا تھا۔ بعد ازاں وہ کلکتہ چلے آئے اور یہاں تیس سال سے زیادہ اقامت گزیں رہے، چنانچہ خود ہی کہتے ہیں:

مدت سی سال شد ہستم بہ کلکتہ مقیم
تا کہ گویم ای عزیزان حال زار خویشتن

کلیان سنگھ عاشق فارسی کے برگزیدہ شاعر اور نثر نگار تھے۔ کلکتہ کے دوران قیام میں فارسی نظم ونثر میں اپنی جولانی طبع کا خوب مظاہرہ کیا۔ کلکتے میں ایک مثنوی انھوں نے ''تاریخ زیبا'' کے نام سے لکھی جس میں آٹھ ہزار اشعار ہیں۔ مثنوی کے اخیر میں اپنی عمر کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں:

تمام این مثنوی شد درد و سہ ماہ
شد آخر داستان الحمد للہ
تمامی داستان چون کردم انشا
نہادم نام او ''تاریخ زیبا''
گذاشت از عمر اکنون شصت وشش سال
بود ضعف و نقاہت عائد حال

اس مثنوی کے علاوہ ان کی جن کتابوں کا علم ہے وہ ہیں ''خلاصۃ التواریخ''، ''عجایب البلدان''، ''مجموعہ قصاید فارسی'' اور ''جدید السیر''۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ان کے علاوہ بھی بہت ساری کتابیں تصنیف کیں وہ سب زینت طاق نسیاں ہو گئیں۔

لالہ کھیم نرائن رند دہلی سے کلکتہ آئے تھے۔ انھوں نے ایک کتاب بنام ''فتوحات حیدری'' تصنیف کی۔ وہ اچھے شاعر بھی تھے اور فارسی و اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اسی طرح جے گوپال ترکالنکار (۱۷۷۳-۱۸۴۶) نے ایک فارسی- بنگالی لغت تالیف کی جسے ان کا ایک اہم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

''تذکرہ نسخۂ دلکشا'' کے مولف جنم جے متر ا رمان بنگال ہی کے باشندہ تھے۔ یہ نہ صرف اردو اور فارسی سے بخوبی واقف تھے بلکہ ان دونوں زبانوں میں شعر بھی کہتے تھے۔ ان لوگوں کے علاوہ فارسی کے بہت سے ایسے شاعر اور نثر نگار تھے جو ہندوستان کے مختلف گوشوں سے کلکتہ آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ ان میں لالہ کھیم نرائن رند کے علاوہ شیو پردھان بہادر ثاقب، منشی دولت رام شوق، بھوری سنگھ مشرب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مہاراجہ شیو پردھان جی گوپال سنگھ بہادر ثاقب فارسی کے اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے۔ ان کا وطن کانپور تھا لیکن کلکتہ ہی میں زندگی گزاری۔

حقیقت یہ ہے کہ واجد علی شاہ جب معزول ہونے کے بعد کلکتہ آئے تو ان کے دم سے مٹیا برج لکھنؤ ثانی بن گیا۔ یہاں اردو اور فارسی شعرا کا ایک جم غفیر جمع ہو گیا اور اپنے کلام بلاغت نظام سے انھوں نے لوگوں میں کافی مقبولیت حاصل کی۔ جو شعرا واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ آئے ان میں راجہ بھولا ناتھ کے پوتے منشی دولت رام شوق بھی تھے۔ انھوں نے مٹیا برج میں ہی مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہ بھی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ دوسرے شاعر جو واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ تھے وہ منشی میدولال قرار کے چھوٹے بھائی تھے جو نادم تخلص کرتے تھے۔ یہ صاحب دیوان شاعر تھے۔ دو دیوان اردو میں اور ایک دیوان فارسی میں ان کی یادگار ہے۔ انھوں نے بھی واجد علی شاہ کی رفاقت میں زندگی گزار دی اور یہیں ۱۲۹۱ ہجری کو انتقال کیا۔

دوسرے شعرا میں اجاگر چند الفت کا نام لیا جا سکتا ہے جو ناظم بنگالہ کے متوسلین میں تھے۔ اسی طرح بھوری سنگھ مشرب جن کا وطن اکبرآباد تھا، کچھ دنوں تک بنگال کے مشہور علمی و ادبی علاقہ مرشدآباد میں مقیم رہے اور اپنی بلند پایہ شاعری سے لوگوں کے دلوں کو گرماتے رہے۔ ان کے دو اشعار پیش ہیں:

ندیدہ ایم رخش آن قدر کہ روز جزا
توان شناخت کہ این ظالم است قاتل ما
زبنگ کردنت ای ترک جنگجو شادیم
کہ گاہ گاہ شوی زین سبب مقابل ما

ایسے ہندو شعرا اور اہل قلم کی تعداد جنھوں نے بنگال میں زندگی گزاری اور ادبیات فارسی کے ارتقا میں انتہائی اہم رول ادا کیا، بہت زیادہ ہے اور اس مختصر مقالے میں سبھی کا احاطہ کرنا ممکن نہیں اس لیے صرف نظر کیا جاتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ کم از کم ٹیگور خاندان کا جو تعلق فارسی زبان و ادب سے رہا اس کا ذکر مختصراً یہاں کر دیا جائے۔

ٹیگور خاندان کا ادبیات فارسی سے ایک خاص تعلق تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے دادا پرنس دوارکا ناتھ ٹیگور "بنگادوت" کے نام سے ایک اخبار نکالا کرتے تھے جس میں ایک صفحہ فارسی کا بھی ہوتا تھا۔ اس میں خاص طور پر سرکار برطانیہ کے فرامین، احکامات، آئینی امور اور نوکریوں کے لیے خالی جگہوں کا اعلان ہوتا تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے والد مہارشی دیبندر ناتھ ٹیگور برہمو سماج کے پیروکار تھے اور خاص طور پر راجہ رام موہن رائے نے خود انھیں برہمو سماج میں شامل کیا تھا۔ جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں ذکر کیا گیا کہ برہمو سماج کی تبلیغ و اشاعت میں فارسی کے اخلاقی اور عرفانی اشعار سے بہت استفادہ کیا گیا۔ چنانچہ دیبندر ناتھ ٹیگور نے بھی اپنے مذہبی عقاید کو سمجھنے اور اسے سنوارنے کے لیے حافظؔ کا سہارا لیا۔ وہ حافظؔ کو بے انتہا پسند کرتے تھے۔ اپنی خودنوشت سوانح حیات میں خود لکھتے ہیں کہ جب میں کچھ دنوں ہمالیہ پہاڑ پر تھا تو آدھی رات تک برہمو سنگیت یا بالفاظ دیگر برہمو سماج میں گائے جانے والے نغمے اور حافظؔ کے اشعار نہایت ذوق و شوق سے گایا کرتا تھا۔ اس سفر میں رابندر ناتھ ٹیگور بھی اپنے والد کے ساتھ تھے اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ انھوں نے حافظؔ کا کلام اپنے والد کی زبان سے سنا ہوگا اور ان سے اس کے مطالب و مفاہیم بھی سمجھے ہوں گے اور ان کا اثر بھی قبول کیا ہوگا۔ ان کے والد کو پورا دیوان حافظؔ زبانی یاد تھا اسی لیے ان کو حافظ حافظؔ بھی کہا جاتا تھا۔ حافظؔ کے اشعار ان کو اس طرح از بر تھے کہ وہ دوستوں سے گفتگو کے دوران یا خط لکھتے وقت موقع و محل کے اعتبار سے موزوں اشعار بیساختہ استعمال کرتے تھے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ حافظؔ کے ایسے عاشق تھے کہ وہ عبادت کے وقت بھی حافظؔ کو فراموش نہیں کرتے تھے۔ چونکہ برہمو سماج کسی مورتی کی پوجا نہیں کرتے بلکہ صرف اپنیشد کی تلاوت کرتے ہیں، چنانچہ مہارشی دیبندر ناتھ ٹیگور عبادت کے وقت اپنیشد کی تلاوت تو کرتے ہی تھے ساتھ ہی حافظؔ کے اشعار بھی گایا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں عبادت کے وقت جو گھنٹی وہ بجاتے تھے اس پر حافظؔ کا درج ذیل شعر لکھا ہوا تھا۔

مرا در منزل جانان چہ امن و عیش چون ہر دم
جرس فریاد میدارد کہ بر بندید محملہا

یہ گھنٹی آج بھی شانتی نکیتن کے ٹیگور میوزیم میں محفوظ ہے۔

ایک بار دیبندر ناتھ ٹیگور بنارس کے سفر پر تھے۔ اس سفر کے بارے میں وہ اپنی خودنوشت سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ میں نے ایک کشتی کرائے پر لی اور بنارس کی طرف روانہ ہوا۔ اچانک دریائے گنگا میں طغیانی آگئی اور موجوں کے تھپیڑوں سے کشتی بری طرح ڈگمگانے لگی۔ میں نے خدا کی طرف رجوع کیا اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر کہا:

کشتی شکستگانیم ای باد شرطہ برخیز
باشد کہ باز بینیم آن یار آشنا را

خدا کے فضل و کرم سے میں اس حادثے سے سلامت نکل آیا۔ اسی حادثے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں کہ اس روز تو میری زندگی سلامت رہی لیکن رہزن دہر خوابیدہ نہیں ہے آج اگر وہ زندگی چرا نہ لے گیا تو کل لے جائے گا۔ اور اس پر حافظؔ کے اس شعر سے استشہاد کرتے ہیں:

رہزن دہر نخفتہ است مشو ایمن ازو
اگر امروز نبردہ است کہ فردا ببرد

ان کی خودنوشت سوانح کا مطالعہ کیجیے تو پتہ چلے گا کہ کوئی صفحہ ایسا نہیں ہے جس میں انھوں نے اپنی زندگی کے حالات و واقعات بیان کرتے ہوئے حافظؔ کے برمحل شعر کا استعمال نہ کیا ہو۔

کہا جاتا ہے کہ وفات کے وقت انھوں نے اپنے پیروکاروں سے یہ خواہش ظاہر کی کہ دیوان حافظؔ کی پہلی غزل جس کا مطلع یہ ہے:

الا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا
کہ عشق آسان نمود اول ولی افتاد مشکلہا

ان کے سامنے پڑھی جائے۔

ان کے لائق و فائق صاحبزادے رابندر ناتھ ٹیگور کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ یہ ایشیا میں پہلے شخص ہیں جنھیں "نوبل پرائز" سے نوازا گیا۔ وہ نہ صرف دنیا کے ایک عظیم شاعر بلکہ افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، مصور، موسیقار اور ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی عالمی شہرت کے مالک ہیں۔ گرچہ وہ خود فارسی سے واقف نہ تھے لیکن والد کی صحبت نے انھیں فارسی زبان کی زیبائی و لطافت اور شیرینی و حلاوت کے علاوہ حافظؔ و رومی کے کلام میں پنہاں عرفانی نکات سے بھی بخوبی واقف کرا دیا تھا۔ لہٰذا اگر کلام ٹیگور کا بنظر غائر

مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے شعوری یا لاشعوری طور پر حافظ و رومی کا اثر قبول کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے عرفانی نغموں میں حافظ و رومی سے کافی مشابہت و مماثلت پائی جاتی ہے۔
روان فرہادی نے ٹاگور اور مولانا جلال الدین رومی پر ایک مقالہ لکھا ہے جس میں انھوں نے ان دونوں عظیم شاعروں کے عرفانی نظریات پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ ٹیگور کی فارسی دوستی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ انھوں نے انتھک جد و جہد سے وشوا بھارتی یونیورسٹی، شانتی نکیتن میں شعبہ فارسی کی بنیاد ڈالی۔ نیز اپنے سفر ایران کے دوران شاہ ایران سے درخواست کی کہ وہ اس ایرانی استاد کا اس شعبہ میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے تقرر فرمائیں۔ شاہ نے ان کی درخواست قبول کرتے ہوئے ایران کے مشہور ادیب و شاعر آقای پور داؤد کو یہاں بھیج دیا۔ ضیاء الدین امر تسری اس زمانے میں شعبہ فارسی سے وابستہ تھے۔ انھوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور پور داؤد کے ساتھ مل کر ٹیگور کی ہو بہو نظموں کا فارسی میں ترجمہ کر کے وشوا بھارتی یونیورسٹی ہی سے شائع کروایا۔ بعد میں بکرماجیت حسرت اس شعبے میں آئے انھوں نے داراشکوہ پر ایک عمدہ تحقیقی کام کیا اور دارا کی تمام فارسی تصنیفات کا احاطہ کرتے ہوئے انگریزی میں ایک کتاب Dara Shikoh - Life and Works لکھی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر ترو د بھوشن رائی نے جو سنہ ساٹھ کی دہائی میں شعبہ فارسی کے صدر کے عہدے پر فائز ہوئے ایک فارسی تاریخ ''مخزن افغانی'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ یہ دونوں کتابیں بھی وشوا بھارتی یونیورسٹی ہی سے شائع ہوئیں۔
ان کے علاوہ بہت سارے ایسے ہندو تھے جنھوں نے فارسی کے منظوم و منثور ادبی شہ پاروں کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لیے طوالت کے خوف سے چند لوگوں کا سرسری طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔

۱- چاندی چرن منشی نے جو کلکتہ کے نزدیک سیرام پور (موجودہ سری رام پور) کے باشندہ تھے۔ نخشبی کے ''طوطی نامہ'' کا ''طوطا اتہاس'' کے نام سے ترجمہ کیا۔
۲- دوارکا ناتھ گوپندو نے ''گل صنوبر'' کا
۳- مہیش چندر امترا اور دوارکا ناتھ نے باہمی معاونت سے ''لیلیٰ مجنوں'' کا
۴- اوماچرن مترا اور پران کرشنا مترا نے مل کر 'گل بکاؤلی' کا اور
۵- کانتی چندر اگھوش نے ''رباعیات عمر خیام'' اور ''غزلیات حافظ'' کا ترجمہ کیا۔

دوسرے ہندوؤں میں جنھوں نے غزلیات حافظ کا بنگلہ ترجمہ کیا کیشب چندر سین، ستیندر ناتھ دت، گریش چندر اسین وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔
گرچہ بیسویں صدی میں انگریزی زبان نے ہندوستان میں اپنی جڑیں کافی مضبوط کر لیں اور

زندگی کے ہر شعبے میں انگریزی ناگزیر ہو گئی لیکن پھر بھی بنگال میں ہندوؤں کی دلچسپی فارسی زبان و ادب سے کم نہ ہوئی۔ بکرماجیت حسرت اور ترو د بھوشن رائی کے علاوہ بھی بہتیرے ہندوؤں پر بھی فارسی زبان و ادب کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا۔ بیسویں صدی میں ہندوستان کے دو عالمی شہرت یافتہ مورخین سر جادو ناتھ سرکار اور جگدیش نراین سرکار نے اپنی تاریخ نویسی میں فارسی ہی کو ماخذ اور منبع قرار دیا۔ مستند فارسی تواریخ کی بنیاد پر ہی ان دونوں نے اپنی تاریخ کی عمارت کھڑی کی۔ جادو ناتھ سرکار کے پاس فارسی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا جو آج نیشنل لائبریری کلکتہ میں ''جادو ناتھ سرکار کلکشن'' کے نام سے محفوظ ہے۔
علاوہ ازیں ایک صاحب ہیں جن کا نام ایس. پی. رائے ہے۔ یہ آئی. اے. ایس آفیسر ہیں اور ایران سوسائٹی کے بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ انھوں نے حال ہی میں رباعیات خیام کا بنگلہ میں ''دو ٹی ہاتھے لوٹے تاؤ'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ یہ فارسی زبان میں نہ صرف کافی مہارت رکھتے ہیں بلکہ روانی سے جدید فارسی بولنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔
اسی طرح ہریندرا چندرا پال کرشنا نگر کالج میں فارسی کے لیکچرار تھے۔ یہ گورنمنٹ کالج ہے اور گورنمنٹ کالجوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ اساتذہ کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے چنانچہ ان کا تبادلہ کرشنا نگر کالج سے مولانا آزاد کالج کلکتہ میں ہو گیا جہاں وہ ریٹائرمنٹ تک بی. اے. آنرس کے طالب علموں کو فارسی زبان و ادب کا درس دیتے رہے۔ انھوں نے مولانا جلال الدین رومی پر ایک تحقیقی مقالہ بعنوان "Jalaluddin Rumi and His Tasawwuf" لکھ کر کلکتہ یونیورسٹی سے ڈی فل (موجودہ پی ایچ ڈی) کی ڈگری حاصل کی۔
ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ فارسی ادب کی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انھوں نے فارسی میں یا فارسی سے متعلق انگریزی میں بے شمار مقالے لکھے۔ یہ مقالے ملک اور بیرون ملک کے مختلف تحقیقی رسائل و جرائد بالخصوص ''انڈو ایرانیکا'' میں شائع ہوتے رہے۔ زندگی کی آخری سانس تک ایران سوسائٹی کلکتہ سے وابستہ رہے اور غالباً ''انڈو ایران سوسائٹی دہلی'' کے بھی ممبر تھے۔ حکومت ایران کی دعوت پر ایران گئے اور ''بھگوت گیتا'' کا فارسی میں ترجمہ کیا جس پر تہران یونیورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی۔
ہیرالال چوپڑہ نہ صرف ایک اچھے نثر نگار تھے بلکہ فارسی کے ایک بہترین شاعر بھی تھے۔ ان کے فارسی کلام انڈو ایرانیکا اور دیگر رسائل کے صفحات پر بکھرے پڑے ہیں۔ اگر اس اظہار کو خود ستائی پر محمول نہ کیا جائے تو یہ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ آنجہانی ہیرالال چوپڑہ نے راقم الحروف کی شادی کے موقع پر فارسی میں سہرا لکھا تھا جو آج بھی اس ناچیز کے مجموعۂ سہرا ''ساز نشاط'' میں موجود ہے۔

اخیر میں یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ بنگال کے ہندوؤں نے ابتدا سے لے کر آج تک فارسی زبان و ادب میں کافی دلچسپی دکھائی اور اپنی گراں بہا تخلیقات سے فارسی ادب کے خزانے میں قابل قدر اضافہ کیا۔ یہاں مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق ایک ہلکی سی جھلک پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ فارسی زبان و ادب کے ارتقا اور اس کے تحفظ میں جو خدمات انھوں نے انجام دی ہیں وہ بنگال میں فارسی زبان و ادب کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ ان کی خدمات کی فہرست اتنی طویل ہے کہ ایک مختصر مقالے میں اس کا حق ادا کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے اس مقالے کو یہ کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

☆☆☆

سید الظفر چغتائی*

سعدی اور ان کی نثر و نظم نغز

میرے بچپن تک شمالی ہندوستان میں فارسی نہ جاننے والا تعلیم یافتہ نہیں سمجھا جاتا تھا اور قدیم ایران کے اساطیر (Legends) پر مبنی شاہنامۂ فردوسی، سکندر نامۂ نظامی، یوسف زلیخائے جامی وغیرہ سے بہت پہلے کریما، ماقیمان، گلستان اور بوستان بچپن میں ہی پڑھادی جاتی تھیں کہ علمت عامہ کے یہ خزانے بچپن میں ہی متعارف ہو جانے والا بچہ، عمر پختہ پر فراموش نہ کرے گا اور بار بار دہراتا رہے گا، لفظوں میں بھی اور عمل میں بھی گو ایسا بہت نہیں ہوتا تھا۔ آزادیٔ وطن سے پہلے ہندوستان کا ادبی مزاج فارسی تھا، عربی اس کے ذریعہ پڑھائی جاتی تھی۔ ہوتا یہ بھی تھا، جیسا کہ قاضی خورشید احمد نے مجھ سے کہا کہ پڑھنا شروع کی عربی، مگر اس میں بات قدِ نحو سے آگے نہ بڑھی اور فارسی پر مجبور ہو گیا۔ آزادی کے بعد مذہبی احیائے مسلمانوں کو سیدھے سیدھے عربی سے جوڑ دیا اور غیر مسلم عربی و فارسی دونوں سے دور ہو گئے۔

میں نے سعدی شیرازی کا نام بچپن ہی میں سن لیا تھا۔ مگر پندرہ برس کا ہو گیا تھا جب رائے سدھا تھ لی فراقی سے گلستان سبق سبق پڑھی، اور ماجد میاں نے فرمائش کی "سعدی ایک جہاں دیدہ بزرگ" کے عنوان سے مضمون لکھواؤ۔ بوستان پوری بھی نہ پڑھ سکا۔ کریما، جس کا شیخ کی تصنیف ہونا مشتبہ ہے، کئی بار پڑھی اور ہر بار نہ صرف اور بہتر آدمی بننے کی خواہش ہوئی بلکہ ایک کیفیت بھی محسوس کی۔ غزلیات سعدی صرف چند پڑھیں، لیکن ان میں حافظ، اقبال، غالب، اصغر یا جگی کی فارسی یا اردو غزلوں سے کم لطف نہ آیا۔

روی تو میناد دگر دیدۂ سعدی   گر دیدہ بجز باز کند روی تو دیدہ

سعدی کی تحریر نثر میں ہو یا نظم میں، پڑھتے ہی اُس کا جادو پروپگنڈا لٹریچر اور ادب برائے ادب، دونوں کی تردید کر دیتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ ادب میں مغز چاہیے بغایت اور کمال حسن عبارت بہ نہایت!

غزل کے اولین پیمبر در اصل مرد میدان اخلاقی مثنوی کے ہیں۔ فردوسی اور نظامی نے رزم

* سابق پروفیسر، شعبۂ فارسی، 480E، کیرا کالونی علی گڑھ

میں کمال کر دکھایا۔ جلال الدین بلخی وقونی ورومی نے اشاعرہ والے مذہبی فلسفہ کو الہام بنا دیا، تو سعدی نے شاہ سے گدا تک کو معاملات زندگی کی اونچ نیچ اس خوبی اور لطافت سے سمجھائے کہ پڑھنے اور سننے والے بھول ہی گئے کہ انھیں نصیحت کی جا رہی ہے۔ مذہب کے تین مرحلے ہیں: عقیدہ، رسومات اور اخلاق۔ داعیان پہلے دو پر زور دیتے ہیں کہ ان کی گروہ بندی مضبوط رہے، حالاں کہ اہمیت اخلاق اور حسن عمل کی ہے جو ہر مذہب اور ہر انسان دوستی کی جان ہیں، وحدت الوجودی ہے کہ مکان وزمان، توانائی اور مادّہ سب کی ابتداء عظیم دھماکہ سے ہوئی اور ہر طرح کی زندگی اسی کی حرکت کا تسلسل ہے!

ادبیات عالم، خاص طور پر فارسی میں اخلاقیات پر دفتر کے دفتر موجود ہیں۔ لیکن ان کا اصل اصول بزرجمہر کا ایک جملہ ٹھہرا:

''کاریکہ بر خویشتن پسندید، بر دیگری ہم روا مدار۔''

یعنی جس فعل کا اپنے ساتھ کیا جانا پسند نہ کرو وہ دوسرے کے ساتھ نہ کرو۔ بائبل اور دوسرے مقدس صحیفوں میں اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ سعدی کی معروف عالم گلستان و بوستان ہی نہیں ان کے سارے قصائد موثر اور اخلاقی تعلیم سے لبریز ہیں، جو روایتی نہیں، ان میں اہل قلم کی انفرادیت مسلم ہے۔

یادگار غالب پڑھنے والے کے ذہن میں الطاف حسین حالی اپنی شعر فہمی و نکتہ رسی بصفائے کمال منقل کر دیتے ہیں۔ اس باقاعدہ شرح مطالب کے بغیر ہم نہ غالب کو یوں سمجھتے ہوتے اور نہ اس کے فن کو۔ 'حیات سعدی' میں حالی کی متاع ہنر کم نہیں ہے، مگر لوگوں نے اس کی قدر اتنی اس لیے نہیں کہ ہندوستان میں فارسی کا ذوق کم ہو گیا تھا اور اس لیے بھی کہ لوگ حالی کے اس کمال سے اتنے واقف ہو گئے تھے کہ وہ سمجھے سعدی کے بارے میں بھی ساری باتیں اسی طرح کہی جا چکی ہیں، حالانکہ حالی نے اس کتاب میں سعدی کی گلستان، بوستان، غزلیات، قصائد اور عربی شاعری کا ایک ایک کر کے ایسا تفصیلی، باقاعدہ اور پرمغز جائزہ لیا ہے کہ شعر العجم کے لیے اس پر اضافہ کرنا شبلی کو بھی دشوار ہو گیا۔ یہ دشواری علامہ نے مطالب کے تحت عنوانات قائم کر کے دور کی۔ شعر العجم کے دفتر میں نے پہلی بار گورکھپور میں پڑھے تھے۔ اب پینتالیس سال بعد ان میں سے بعض تحریریں دہرائی ہیں۔ مجھے ادب یا تنقید سے کوئی رسمی رابطہ نہیں رہا ہے لیکن میں نقد ادب (Evaluation of Literature) کو تنقید کا ہم معنی نہیں سمجھتا۔ اور مجھے لگتا ہے کہ تنقید کے نام پر یوروپی حوالوں سے لکھی جانے والی زیادہ تر تحریریں مضامین (Essays) ایسے ہیں جنھیں پڑھ کے طلبا اپنی خوش ذوقی، استعداد اور خوش نصیبی یا خوش اعتقادی کی بدولت کچھ نکال لیتے ہیں۔

نقد ادب کے ان دو شہ پاروں کے علاوہ سعدی پر ایک اور تحریر میری نظر سے گزری۔ میرے ایک کرم فرما اسماعیل مہدی زادہ کرمان یونیورسٹی میں طبعیات کے استاد ہیں اور انھوں نے جرمنی میں

پروفیسر ڈیمس ترےودر (Demstroeder) کی تجربہ گاہ سے 'لیزر رسالہ طیف شناسی' میں ایک یادگار چھوڑی ہے۔ مہدی زادہ نے ۱۹۹۱ء میں از راہ نوازش مجھے گلستان کا ایک نہایت خوشخط نسخہ بھیجا۔ جسے محمد علی فروغی نے ۱۳۱۹ میں مرتب کیا ہے اور اس پر ۱۹ صفحہ کا مقدمہ لکھا ہے۔ کہتے ہیں:

''شیخ سعدی پر لکھا بہت گیا ہے مگر تحقیق بہت کم ہوئی ہے۔ 'نگارش بسیار اما تحقیق کم' ان کے حالات زندگی کچھ تو دوسروں نے لکھے ہیں ورنہ خود انھیں کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ مگر فروغی کے مطابق خود شیخ بزرگ نے اپنے بارے میں لوگوں کو گمراہ کرنے کا اہتمام کچھ کم نہیں کیا ہے۔

'حکایاتی ساختہ وقایعی نقل کردہ و شخص خود را در آن وقایع دخیل نمودہ و از ان حکایات فقط تمثیل در نظر داشتہ است۔' (ص ۶)''

تمثیل کی خاطر انھوں نے حکایتیں بنائیں اور بیانات نقل کیے اور ان بیانات میں اپنی شخصیت داخل کر دی۔ اس طرح ساری باتیں خلط ملط ہو گئیں۔ سعدی کا تخلص ہی ہمیں وثوق سے معلوم ہے۔ ہندوستان میں ہم انھیں مصلح الدین جانتے مگر ان کا نام مشرف الدین ہو سکتا ہے اور مصلح الدین ان کے والد کا۔ ان کی کنیت ابوعبداللہ تھی یا عبداللہ ان کے والد کا یا خود ان کا نام تھا۔ اس اختلاف سے حالی واقف تھے۔

فروغی کے نزدیک سعدی کے بابت جو مسلم ہے یہ ہے:

''علماء دین کے خانوادے سے تھے۔ ساتویں صدی ہجری کے اولین برسوں میں بمقام شیراز پیدا ہوئے۔ جوانی میں بغداد چلے گئے اور مدرسہ نظامیہ وغیرہ درسگاہوں میں دینی اور ادبی علوم کی تکمیل کی۔ عراق، شام و حجاز گئے، حج ادا کیا۔ سعد ابوبکر زنگی (جو اتابکان سلغری میں سے تھا) اس کے عہد میں ایران واپس آئے۔ ۶۵۵ھ میں بوستان تمام کی اور ۶۵۶ھ میں گلستان، جن کے باعث مشہور و مقبول ہوئے۔ امرائے فارس، معاصر مغل سلاطین اور ان کے وزراء کے لیے نصیحت آموز قصیدے لکھے، غزلیں کہیں اور ۶۹۱ھ سے ۶۹۴ھ کے بیچ انتقال کیا۔ ان کی تحریروں میں ہندوستان، غزنین، ترکستان، آذربائیجان، ایشیائے صغیر، بیت المقدس، یمن اور شمالی افریقہ کے سفروں کا ذکر ملتا ہے مگر شبہ

ہے کہ شیخ وہاں گئے تھے یا انھوں نے دوسروں کے دیکھے حالات قلم بند کر دیے ہیں۔ ان کی زندگی کے دوسرے حالات جیسے نقل ہوئے ہیں یا جن لوگوں سے ان کی ملاقات کا ذکر ملتا ہے ان میں بھی شبہ ہوتا ہے۔ جنھیں مانا جا سکتا ہے وہ ہیں کہ سعدی نے شیخ ابوالفرج بن جوزی اور شیخ شہاب الدین سہروردی سے استفادہ کیا۔ سعدی کے والد نے ان کے لڑکپن میں انتقال کیا اور خود شیخ سعدی کا بیٹا ان کے سامنے جوان مرگ ہوا۔ صلیبی جنگیں دیکھیں۔ شام میں اہل یوروپ کے ہاتھوں قید ہوئے تو ایک آشنا نے خرید کے آزاد کیا اور اپنی بیٹی عقد میں دے دی۔ معروف بھائی شمس الدین محمد اور علاء الدین ملک جوینی، جو مغلوں کے وزیر تھے، ان سے شیخ کی دوستی میں شبہ نہیں ہوتا۔ ان کی تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تصوف و عرفان پر اعتقاد رکھتے تھے اور بیعت تھے۔ مذہب سے سنی تھے اور شاید اشعری۔ وعلیٰ کہتے تھے۔" (مقدمہ ص ۲ تا ۲)

فروغی کے اس تصدیق نامہ پر مجھے عرض کرنا ہے کہ (اول) سعدی کی تاریخ وفات لفظ "خاص" سے نکلنے کی روایت ہے (۶۹۱ھ)۔ ورنہ مصرع "ز خاصان بود از ان تاریخ شد "خاص"" الحاقی قرار پائے گا۔

(دوم) یہ کہ اگر سعدی کے امام جوزی کا شاگرد ہونا مشتبہ نہیں (جن کا سن وفات ۵۹۷ھ ہے) اور سعدی اپنے والد کی وفات کے بعد شروع نوجوانی میں بھی تحصیل علم کے لیے بغداد گئے تھے تو ان کی پیدائش ۵۸۰ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی۔ ورنہ ماننا پڑے گا کہ وہ ابن جوزی اور سہروردی کے تحریر شدہ یا مشہور و روایت شدہ خیالات کی بنا پر انھیں استاد مانتے تھے۔ اس طرح سعدی کی عمر (جو ۱۲۰ سال مشہور ہے) بہرحال ۱۱۰ سال ہجری کے بقدر تو ٹھہرتی ہی ہے۔

فروغی نے سعدی پر کام کرنے والوں کے لیے جس نئے اور پرانے مواد کی نشاندہی کی ہے وہ ہے: (۱) تاریخ و تذکرہ ہائے شعر (۲) عبدالعظیم گرگانی نے جو گلستان چھاپی ہے اس پر ان کا مقدمہ، اور (۳) "سعدی نامہ" جو وزارت فرہنگ ایران نے سعدی کے سات سو سالہ تقریبات کے موقع پر چھاپی ہے۔

سعدی کی زندگی کے بعد ان کی تخلیقات کی طرف آئیں تو ان کی تصانیف میں گلستاں سب سے اہم ٹھہرتی ہے۔ وہ فارسی کا پہلا اور انتہائی مغز و شگفتہ نثر پارہ ہے کہ اس میں اب سے پونے آٹھ سو سال قبل

سعدی نے فارسی زبان کا جو معیار قائم کیا، آج تک کوئی ادیب اس کی بھرپور پیروی نہ کر سکا۔ فروغی لکھتا ہے:

"ما پس از ہفتصد سال بزبانی کہ از سعدی آموختہ ایم سخن میگوییم،
یعنی سعدی شیوۂ نثر فارسی را چنان متمکن ساختہ کہ زبان او زبان
رائج فارسی شدہ است۔" (مقدمہ، ص ۹)

اسلوب میں ہیر پھیر سے یہ فرق ضرور آیا ہے کہ اب نثری تحریروں میں اشعار نہیں دیے جاتے یا دیے جاتے ہیں تو بہت کم۔ سعدی نے بے تکلف لکھا ہے۔ بلیغ لکھا ہے۔ کہیں ایک لفظ ضرورت سے زیادہ نہیں تحریر کیا۔ معانی و مطالب کا سبق دیا ہے کہ "ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد" کی پابندی کی ہے۔ لفظی پابندی کی ہے۔ ہدایتیں دی ہیں اور نصیحتیں کی ہیں مگر پیشہ ور واعظوں کی طرح لکھی لکھائی اور سنی سنائی روایتیں نہیں بیان کیں۔ تحریر کی بنیاد اپنے تجربے، اپنی آپ بیتی پر رکھی۔ انھیں کی تائید میں قرآن یا حدیث سے کچھ مل گیا تو وہ بھی ڈال دیا، ورنہ ان کی تحمیر نہیں کی۔ یہ بات سعدی کو رومی سے ممتاز کرتی ہے۔ سعدی نے استدلال واقعات سے کیا ہے، فلسفہ و منطق سے نہیں۔ جیسا کہ اخلاق محسنی و ناصری وغیرہ بعد کی کتب اخلاقیات میں ملتا ہے۔ اس لیے سعدی کے مربوط اور مختصر بیانات اتنے دل آویز ہیں۔ فراق اور یادوں نے ۱۹۵۱ء میں مجھے گلستاں پڑھائی۔ کتاب شروع کرتے ہی "ہر نفسے کہ فرو میرود ممد حیاتست و چوں بر می آید مفرح ذات" پڑھا تو گویا ہوئے۔ "یہ سب سنسکرت ہے اور ویدانت!" اس تجربے سے مجھے کچھ اندازہ ویدانت کا ہوا، کچھ وحدت الوجود کا اور کچھ سعدی کے بیان کی وسعت کا!

بوستان تمام تر منظوم ہے اور گلستان کے آٹھ ابواب کے مقابلہ میں دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اسلوب بیان میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جو گلستاں میں ہے۔ مگر بوستاں میں سعدی کی زندگی کے واقعات زیادہ ہیں اور زیادہ مفصل، وہ بھی جن کی تاریخیت مسلم ہے اور وہ بھی جو زیر بحث ہیں۔ بوستان و گلستان دونوں ملا کے حسن معنی، حسن بیان، صنائع بدائع، مناسبات لفظی، معنوی اور بڑی حد تک سہل ممتنع کے طور پر آج تک سعدی کی انفرادیت کے کارنامے زندہ ہیں۔ مضامین کی کچھ مثالیں بعد میں دوں گا۔

زمانۂ جاہلیت ہی سے عربی قصیدے کے تین حصے رہے ہیں۔ تشبیب، مدح اور دعائیہ حرف سوال۔ پہلے دو کے بیچ ایک دو شعر کا گریز۔ عام قصیدے ممدوح کو آسمان یا کم از کم بانس پر چڑھا کر شاعر کو نوازنے پر آمادہ کرنے کے طریقے رہے ہیں یا مانگنے کا منظوم وسیلہ۔ سعدی نے قصیدہ کو نصیحت کرنے اور سلاطین و امراء کو تربیت سکھانے کا ذریعہ بنایا۔ وہ مدح کے چند شعر اس لیے لکھتے ہیں کہ ممدوح سننے پر آمادہ ہو اور ان کی نصیحت صدا بصحرا نہ ہو جائے۔ جو باتیں ہم تک پہنچی ہیں ان کے مطابق ان کی نصیحتوں کا، جو برملا اور اکثر سخت باتوں پر منحصر ہیں، اثر ہوا ہے۔ سعدی کی نصیحتوں کی چند مثالیں نقل کرتا ہوں۔

اول: اباقاخاں (پسر ہلاکو) کی فرمائش پر یہ دو شعر لکھے:

شہی کہ حفظِ رعیت نگاہ می دارد   حلال باد خراجش کہ مزد چوپانی
وگرنہ راعیِ خلق است، زہر مارش باد   کہ ہرچہ میخورد از جزیۂ مسلمانی

(شعر العجم، حصہ ۲، ص ۳۱)

دوم: فارس کے بادشاہ اتابک ابوبکر سعد کی تعریف میں لکھا:

چہ حاجت کہ نہ کرسیِ آسمان   نہی زیر پای قزل ارسلان
مگو پای عزت بر افلاک نہ   بگو روی اخلاص برخاک نہ

(حیاتِ سعدی، قصائد، ص ۱۹۸)

یا

پس از گرفتن عالم چو کوچ خواہد بود   رواست گر ہمہ عالم گرفتہ انگاری
بہ نیک و بد چو بباید گذشت، آن بہتر   کہ نام نیک بدست آوری و بگذاری
ہزار سال نگویم بقای عمر تو باد   کہ این مبالغہ دانم ز عقل نشماری
ہمیں سعادت و توفیق بر مزیدت باد   کہ حق گزاری و ناحق کسی نیازاری

سوم: سردار انکیانو فرماں روائے فارس کا قصیدہ یوں ختم کرتا ہے:

چنین پنداز پدر نشنیدہ باشی   الا گر ہوشیاری، بشنو از عم
نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ   سخن ملکیست سعدی را مسلم
مقامات از دو بیرون نیست فردا   بہشت جاودانی یا جہنم

(حیاتِ سعدی، قصائد، ص ۳۰۲)

"غزل کے پیرایہ کی شاعری حسنِ فکر میں لپٹے ذاتی محسوسات کا بیان ہے۔ حالی اور شبلی دونوں نے سعدی کی غزل کی خصوصیات نکات در نکات بیان کی ہیں کہ وہ اتنی مقبول کیوں ہوئی، جس کو حافظ نے اس درجۂ کمال تک پہنچایا اور اُس نے ہمارے دور تک مزید ارتقا پذیر ہو ہو کر اپنی چھاپ چھوڑی۔ سعدی غزل میں گوشت پوست کے معشوق کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ خیالی بھی ہو تو خیال مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی ہوتا ہے۔ اپنے تمام والہانہ جذبات اور بیان کے فنی کمالات کے ساتھ، جو رشید احمد صدیقی کے بقول، غزل کی اچھی شاعری کو تصوف بنا دیتے ہیں مگر مضامین کی وسعت دیکھیے:

چنان بموی تو آشفتہ ام، ببوی تو مست   کہ نیستم خبر از ہرچہ در دو عالم ہست

مطربان رفتند و صوفی در سماع   عشق را آغاز ہست، انجام نیست

دلی کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است   ز عشق تا بصبوری ہزار فرسنگ است

محتسب در قفائے رندان است   غافل از صوفیان شاہد باز

عیب تست ار چشم گوہر بیں نداری ورنہ ما   ہر یک اندر بحرِ معنی گوہر یک دانہ ایم

روی تو میناد دگر دیدۂ سعدی   گر دیدہ بجز باز کند روی تو دیدہ
در ازل بود کہ پیمان محبت بستند   نشکند مرد، اگرش سر برود پیمان را
جمال در نظر و شوق ہمچنان باقی ست   گدا اگر ہمہ عالم بدو دہند گدا است
ہر کس از دست غیر نالہ کند   سعدی، از دست خویشتن فریاد

(ضرب المثل)

مبارزان جہاں قلب دشمناں شکنند
ترا چہ شد کہ ہمہ قلب دوستاں شکنی

آٹھ صدیاں گزرنے کو ہیں اور مندرجہ بالا اشعار کی تازگی بھی سلامت ہے اور انفرادیت بھی۔

بوستان و گلستان میں بیان ہونے والے مطالب بہ کثرت ہیں اور ناقدوں نے انھیں بیان بھی خوب کیا ہے۔ شیخ کو بعض حکایتیں اور ان کے نتیجے اب تک ضرب المثل ہیں، جیسے

دو درویش در گلیمے بخسپند و دو بادشاہ در اقلیمے نہ گنجند،

آنرا کہ حساب پاک ست، از محاسبہ چہ باک ست

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست   در پریشاں حالی و درماندگی

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود

عاقبت گلوخ انداز را سنگ است

میں یہاں چند ایسی باتیں پیش کروں گا جنھیں دہرانے کی بھی ان کے بعد والوں نے ہمت نہ کی۔

۱- خاموشی یا گفتار کے موضوع پر اخلاقیات میں بہت کچھ ملتا ہے۔ خود سعدی نے اس موضوع پر جگہ جگہ لکھا ہے کہ خاموشی کو گفتگو پر کئی طرف فضیلت ہے مگر ہمیشہ نہیں۔ لکھتے ہیں:

دو چیز طیرۂ عقل است: دم فرو بستن
بہ وقت گفتن و گفتن بہ وقت خاموشی

اس جامع تعریف پر اضافہ ناممکن ہے۔

۲- سچ بولنے کی تاکید میں زبان و قلم کبھی تھکتے نہیں۔ مگر سعدی نے ایک مختصر کہانی سے صورتِ حال کو

مصور کر کے گوہر نایاب نکالا: موت کی سزا سن کے ایک قیدی اپنی زبان میں سخت سست بکنے لگا۔ بادشاہ نے پوچھا کیا کہتا ہے۔ رحم دل وزیر نے قرآن کی آیت پڑھی "غصہ کو ضبط کر کے لوگوں کو معاف کرنے والے۔" دوسرے وزیر نے تردید کی اور بتایا کہ وہ بد دعا دے رہا ہے۔ مگر قرآن بادشاہ کے دل میں گھر کر چکا تھا، بولا:

دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز

شیطان (ابلیس) کی برائی سے دفتر کے دفتر لبریز ہیں۔ مگر سعدی کے ذہن مجوبہ کار نے اس کے حوالہ سے بھی ایسی نئی بات پیدا کی کوئی جس کے قریب بھی نہ پھٹک سکا۔ حکایت یہ بیان کی کہ کسی نے ابلیس کو خواب میں کمال کا خوبصورت دیکھ کر تعجب کیا تو اس نے کہا، میری اصل صورت تم دیکھ رہے ہو مگر اسے کیا کروں کہ قلم دشمن کے ہاتھ میں ہے!

مر ابلیس را دید شخصے بخواب — بقامت صنوبر، بروی آفتاب
نظر کرد وگفت ای نظیر قمر — ندارند خلق از جمالت خبر
ترا سہمگین روی پنداشتند — بگرمابہ در زشت بنگاشتند
بخندید وگفت آن نہ شکل منست — ولیکن قلم در کف دشمن است

دشمن کے پروپیگنڈہ کا اس سے ننگا بیان اور کیا ہو سکتا ہے؟ کتنی بڑی حقیقت اس چونکا دینے، دہلا دینے والے انداز اور الفاظ میں کہہ ڈالی۔ سیاسی، صحافتی بیانات میں کب ایسا نہیں ہوتا۔

۴- شیخ سعدی ایک جہاں دیدہ بزرگ تھے۔ جس نے لڑکپن میں باپ کی شفقت کھوئی، پچیس تیس برس تک وطن سے دور تحصیل علم اور سیاحت کے شوق میں ہزاروں میل مارے پھرے، قید کی مشقت اٹھائی، فرزند دلبند کو اپنی آنکھوں کے سامنے دفن کیا۔ ایک رات عالم اضطرار میں اس کی قبر کھود ڈالی اور اس کے اندر ہولناک تاریکی دیکھ کر نتیجہ نکالا:

شب گور خواہی منور چو روز
ازیں جا چراغ عمل بر فروز

ہم اور تم جب تنہا ہوں گریبان میں منھ ڈال کر خود سے سوال کریں کہ آیا ہم نے کبھی عمل کا کوئی ایسا چراغ جلایا ہے جس سے ہماری زندگی کی کوئی اندھیری رات روشن ہو گئی ہو؟

سعدی نے کم از کم دو رقت آمیز مرثیے لکھے ہیں: سعد بن زنگی کا اور آخری عباسی خلیفہ معتصم باللہ کا (عربی میں)۔ شبلی نے آخر الذکر کو ایک شخص سے کہیں زیادہ ایک ملت اور اس کے سماج کا مرثیہ قرار دیا ہے اور فن مرثیہ گوئی پر اضافہ کہا ہے۔

شیخ سعدی کے سامنے فارس، عراق اور توران میں انقلاب آئے۔ لاکھوں انسان تلوار کے گھاٹ اترے، دریاؤں کا پانی سرخ ہو گیا۔ ننگے پاؤں رہے کہ جوتی میسر نہ تھی، قحط میں بھوکے پیاسے جیے۔ مخالفوں سے تو تو میں میں کی، دست و گریبان ہوئے۔ جان ہتھیلی پر لے کے ظالم بادشاہوں کو برملا نصیحت کی اور کھلم کھلی۔ ان کی انسانیت دو دن کی محض نیکوکاری نہ تھی، اس کے لیے انھوں نے ریاضت کی تھی، زبان سے قلم سے۔ گویا آج کی اصطلاح میں قلم کے غازی تھے یا Activist جن سے ارون دھتی رائے اور میدھا پاٹکر کو دلچسپی ہوگی۔ لیکن آٹھ صدیاں گزریں انسانی ذہن نے کتنی کروٹیں بدلیں اور آگے بڑھا مگر تعجب ہوتا ہے کہ ہمیں آج بھی سعدی کی چند ہی باتوں سے اختلاف ہوتا ہے۔ انھوں نے یہودی، سیہ فام اور مخنث کے لیے روایتی حقارت کا اظہار کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کی اولاد کو بھی ناقابل اصلاح لکھا۔ آج کی نفسیات سماج کے صرف چند فیصد جرائم پیشہ کو ہی ایسا مانتی ہے۔ انھوں نے بعض شخص کی بدسلوکی مدت مدید تک یاد رکھی اور اسے معاف نہ کیا۔

ادبیات عالم میں سعدی کے علاوہ کسی اور اہل قلم کے اتنے فقرے، مصرعے اور اشعار ضرب المثل نہیں۔ ایک مضمون میں کسی مصنف یا مفکر کا تعارف کراتے یا یاد دلاتے وقت ہم ان کی تحریروں اور افکار سے چند ہی باتیں چن کے بطور نمونہ پیش کر سکتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ مختصر تحریر پڑھنے والے متعلقہ تخلیقات تفصیل سے پڑھ کے سیکھیں اور حظ اٹھائیں۔ یہ باتیں پرانی ہیں مگر آج بھی زندہ ہیں اور ان کا دہرانا فائدہ سے خالی نہیں۔

آزرمی دخت صفوی*

طوطیِ ہند خسرو دہلوی

ادب دوستوں کے لیے طوطیِ ہند، صوفیا کے حلقے کا ترک سینہ سوز، کہہ مکرنیوں، پہیلیوں، دوہوں، گیتوں کا خالق، انشاء پردازی کے اصول مرتب کرنے والا، زبان دان، زبان شناس، رعایت لفظی، مثل وجمل، ہیئت، نجوم، فقہ، صرف ونحو کا ماہر، ہندوی زبان کا شائق و مربی، خمسے کا شاعر، فارسی شعر میں سبک ہندی کا پیشرو اور پیش قدم، غزل گو، مثنوی نگار، مورخ، درباری، موسیقی دان، کشور ہندوستان کی تاریخ وفرہنگ کا عاشق اور ان کو اپنے کلام میں زندہ ور رکھنے والا، ہمارے ملک کے فارسی شعرا کے سر کا تاج، خسرو دہلوی جس کو امیر خسرو کے نام سے شہرت حاصل ہوئی، ایسی رنگا رنگ، دلچسپ اور غیر معمولی شخصیت اور فکر وفن کا نمائندہ ہے جس کا ثانی دنیا کی سینکڑوں سال پرانی تاریخ ادب میں ملنا مشکل ہے:

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچین بہار تو ز دامان گلہ دارد

طرفہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت کے بعض پہلو کم سے کم دو اہم پہلو ایک دوسرے کے کاملاً متناقض ہیں۔ ایک طرف محبوب الٰہی کا محبوب ترک زادہ جس کے سینہ صافی کی آتش تابندہ اس کے مرشد کے لیے شمع فروزاں تھی تو دوسری طرف سات بادشاہوں کے دربار میں فرائض کی بجا آوری کرنے والا شاہی مامور جو خود کہتا ہے کہ جب تک سر کا پسینہ پیر کو نہ پہنچے لبوں تک لقمہ نان نہیں پہنچتا۔

واقعی خسرو جیسا غیر معمولی ذہن اور صلاحیت رکھنے والا ہی ان تضادوں سے عہدہ برآ ہو سکتا تھا۔ روحانیت کے ساتھ عملی زندگی، دانشوری کے ساتھ جذباتیت، عرفان کے ساتھ بے خبری، انقطاعیت کے ساتھ حسن جمال، تاریخ کے ساتھ نغمہ وموسیقی اور قومی شعور کے ساتھ ذاتی انفرادیت ان کی شخصیت میں سموئے ہوئے ہیں۔ خسرو کی فکر جب مائل پرواز ہوتی ہے تو مکان ولامکان کی بندشوں سے آزاد ہو کر اس محفل میں شریک ہو جانے کی جسارت کرتی ہے جو شمع نبوت کے لازوال نور سے جگمگا رہی ہے، اور یہی فکر

* پروفیسر وڈائریکٹر مرکز تحقیقات فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جب بچوں کی طرح معصوم، دلچسپ اور دل لبھانے والا روپ دھارتی ہے تو ایک دور افتادہ بیٹی سے ساون کے موسم میں یہ تقاضہ کرواتی ہے:

اماں میرے باوا کو بھیجو جی کہ ساون آیا

یہ رنگارنگی، یہ تنوع، زندگی کے ہر Nuance کو سمجھنا، تجزیہ کرنا، اس کی تہوں کو کبھی دانشوری، کبھی احساس و جذبہ کی کلید سے کھولنا خسرو ہی کا کام ہے۔ قدیم وجدید ہندوستان میں خسرو کی شخصیت ایسی عبقری اور Charismatic یا کرشمہ شخصیت ہے، جس کے ایک ایک پہلو پر گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ خسرو سے متعلق بہت کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے لیکن ابھی ان کے کلام کی تحقیق وتدوین ان کے فکری اور اسلوبیاتی محرکات، ان کے آثار کی اجتماعی اور فرہنگی اہمیت کے بابت بہت سے گوشے تشنۂ توجہ ہیں۔ خسرو بخصوص شعر وادب کے محبوب ہونے کے ساتھ عامہ مردم سے، اس ملک کی عام زندگی سے بھی سید ھا رشتہ رکھتا ہے۔ کم سے کم میرے بچپن تک ان کی پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، دوہے، لطیفے، گیت، کہ یقیناً ان میں سے خاص تعداد کا انتساب خسرو سے درست بھی نہ ہوگا، گھر گھر دہرائے جاتے تھے۔ ہر بچہ، ان کے نام سے واقف تھا۔ انتساب غلط ہو یا صحیح، وہ پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کے ذریعہ کم سے کم اس عظیم فنکار کے نام سے تو واقف ہو جاتا تھا۔ بے شک ان کو ہم سے قریب کرنے میں مولانا محمد حسین آزاد جیسے اور بہت سے تذکرہ نگاروں کا رول بھی یاد رکھنے کی چیز ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اس افراتفری، نفسانفسی اور وحشت افزائی کے دور میں اپنے ملک کی اس اہم ادبی، اسلوبی، اور فرہنگی میراث کو ایک بار پھر لوگوں کے درمیان لائیں، ان کو اس امر سے روشناس کروائیں کہ خسرو جیسے لوگ بار بار پیدا نہیں ہوتے اور اگر کسی ملک اور اہالیان ملک کو یہ نعمت ملی تھی تو وہ اس کو اپنی حرز جان بنائیں۔

ظاہر ہے اس مختصر مقالہ میں ان کے فکر وفن کا احاطہ کرنا ممکن ہی نہیں، فقط چند پہلو جو ان کی شخصیت اور فن وفکر کے تنوع کی طرف اشارہ کر سکیں حاضر خدمت ہیں۔

خسرو کی غزل:

ہندوستان کی فارسی شاعری بنیادی طور پر غزل کی شاعری تھی۔ یوں سچ پوچھیے تو مشرقی شاعری، خصوصاً ایران وہند کی شاعری کو لازوال بنانے والی غزل ہی ہے اور غزل ہی کی صنف نے ہمارے شعرا کی فکر، ان کے تخیل اور حسی اور نفسیاتی تجارب کو ایک فلسفیانہ آمیزش کے ساتھ کائناتی حقائق میں ڈھالا ہے۔ یہ ایک ایسی صنف سخن ہے جو اپنی بنیادی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف حالات اور افکار سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، جو اس کے جاندار ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ سینکڑوں برس کا سفر کرنے والی اور اس طولانی راہ میں ہر پیچ وخم کے اعتبار سے اپنا راستہ معین کرنے والی، اپنے حسن کو روپ

بدل بدل کر نکھارنے والی فارسی غزل کا پہلا قدم جب ایران کی سرزمین پر پڑا تھا تو وہ عربی میں "سخن باز نان کردن یا سخن از زنان کردن" کی محدود تعریف سے متصف تھی۔ فارسی ادب کی تجربہ گاہ میں ایرانی دراک ذہن نے اس کو اس تنگنای سے نکال کر حیات و کائنات کی وسعتوں سے روشناس کروایا اور رودکی کی شیریں بیت

بوی جوی مولیان آید همی یاد یار مهربان آید همی

سے تغزل کا رنگ لے کر اس کو انسانی ذہن کے فکری اور حسی تجربوں میں سمو دیا۔ سعدی اور حافظ غزل کے اس سفر کے دو اہم سنگ میل ہیں۔ سعدی نے غزل کو ایک منفرد مکمل شناخت دی اور حافظ نے اس کو رموز علایم کے اس طلسم کی طرف گامزن کیا جس کی انتہا سبک ہندی پر ہوئی۔ خسرو دہلوی کی غزل سعدی کے تغزل، شیرینی، سادگی اور سبک ہندی کے رموز و علائم و ابہام کا انوکھا سنگم ہے۔

خسرو نے جس محیط و ماحول میں آنکھیں کھولیں اس وقت سرزمین ہندوستان میں فارسی شعر و ادب کے شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ ملک میں نئے نئے حکمرانوں کا دور دورہ تھا، ادب پرور اور علم دوست سلاطین دہلی کے دربار کا ہمہمہ، ولولہ اور جوش شعرا کے کلام اور ادبا کی تحریروں میں مستقیم اور غیر مستقیم طور پر سرایت کر رہا تھا۔ ہندوستان میں فارسی شعر گوئی کی جس روایت کا آغاز عہد غزنوی میں ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان سے لاہور اور اس کے قرب و جوار میں ہوا تھا، تیرہویں صدی عیسوی تک پہنچتے پہنچتے وہ اوچ، اور دہلی کے مراکز حکومت میں بسط و گسترش پا رہی تھی۔ یوروپین ناقد De Bruijn لکھتا ہے: "جب دہلی نئے حکمرانوں کا دارالسلطنت قرار پایا تو اس نے ایک نئے ادبی رستاخیز کی داغ بیل ڈالی۔ اس نئے ادبی رستاخیز کے بنیادی عوامل امیر خسرو اور حسن دہلوی تھے۔

خسرو کی ماں ہندوستانی تھیں اور باپ ترکستان کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کو اپنی اس مشترک وراثت کا شدت سے احساس تھا۔ فارسی لکھتے وقت فارسی ادب کی وہ وسیع تر دنیا ان کی نگاہ میں تھی جس کی سرحدیں Greater Khurasan ایران اور ایشیائی مرکزی تک پھیلی ہوئی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے مخاطب ہندوستان میں ان کے وہ ہم وطن بھی تھے جن کے درمیان وہ سانس لیتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ترک اور ہندو کا فرق مٹ گیا ہے اس لیے کہ اب خراسان اور ہندوستان ایک ہو گیا ہے۔ یہی اشتراک، ہندی، خراسانی اور وسط ایشیائی فکر و فرہنگ کا یہ امتزاج ہی خسرو کی پہچان ہے۔ De Bruijn لکھتا ہے: "خسرو نے دو مختلف اور منفرد فرہنگوں اور روایتوں کو ایک دوسرے میں سمو دیا۔ وہ گویا دو ایسے سمندروں کے مابین ایک معبر تھے جس سے ہند ایرانی روایت وجود میں آئی۔

خسرو کو "طوطی ہند" اور "سعدی ثانی" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ شاید ان دونوں صفات کو عام طور پر مترادف مانا جاتا ہے اور دونوں کا مافی الضمیر اور معہود ذہنی ایک ہی ہے۔ یعنی شیریں سخنی، طلاقت بیان اور سعدی

جیسی غزل گوئی پر قدرت۔ میرا عرض کرنا ہے کہ آیئے ہم ان دونوں صفات کا Connotation الگ الگ مان لیں اور ان کو ایک دوسرے سے متمایز کر دیں یعنی سعدی جیسے غزل گو ہونے کے علاوہ اور بادصف خسرو ہندوستانی فکر و فن اور اسلوب اور طرز کے نمائندہ بھی ہیں۔ صرف سعدی کا ثانی ہونا خسرو کے لیے مابہ الامتیاز نہیں ان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ طرز ہندی، بہ الفاظ دیگر سبک ہندی کے پیش قدم، نمائندہ اور بنیا گزار ہیں اور ان کی غزل ایرانی روایت کی تابع ہونے کے ساتھ، ان کی اپنی سرزمین کی خوشبو میں بھی بسی ہوئی ہے:

اگرچه خسرو روی زمین شدم به سخن
هم از وفا سوی تو روی بر زمین دارم

سروی چو تو در اچه ودر دهه نباشد گل مثل رخ خوب تو البته نباشد

ان کے دیوان کی پہلی غزل ہی ہندوستانی گیتوں کے رس میں ڈوبی ہوئی ہے۔ وہ برہا کے گیت جن میں ساون کی پھواریں اور بادلوں کا امنڈنا، محبوب سے جدائی کو اور بھی ناقابل برداشت بنا دیتے ہیں۔

ابر می بارد و من می شوم از یار جدا چون کنم دل به چنین روز ز دلدار جدا
ابر باران و من و یار ستاده بوداع من جدا گریه کنان ابر جدا، یار جدا

لیکن غزل کی صنف اور وہ احساسات، جذبات اور افکار جن کی وہ نمائندہ ہوتی ہے زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتے ہیں۔ غزل کی عام اور دائمی کشش کا باعث اس کی یہی Universality اور کائناتی عنصر ہے چنانچہ خسرو کی غزل فقط ہندوستان کے محیط و ماحول کی چار چوب میں بند نہیں، ہاں ان کی غزلوں کے ایک معتدبہ حصے میں رمزیت، الفاظ کا دروبست، علائم و تمثیل کی کارفرمائی، استعارہ کا نظام، اختراع فکر، اور معنی آفرینی کی گوناگوں صلاحیت اس کو سبک ہندی سے نزدیک اور کلاسیکی ایرانی غزل سرایوں سے مختلف اور متمایز ضرور ٹھہراتے ہیں۔ بطور مثال خسرو کی یہ چند ابیات سبک ہندی کے خصایص کو مشخص کر سکتی ہیں:

داغیست از شرار آه کسی مگر خال سیه که بر رخ چون ارغوان تست
راز خون آلود خود ای دل مده دامن برون کاین ورق خام است حرف از وی برون خواهد گذشت

خرمی ای کامران عیش برنگی عیش من که من خود داشتم اندازهٔ خود کامرانیها
ماجرای نقش می پرسی که چون بگذشت حال ای سرت گردم چه می پرسی بدشواری گذشت

لیکن اس کے پہلو بہ پہلو ان کا وہ کلام بھی ہے جس کو اگر سعدی کے دیوان میں شامل کر دیا جائے تو یہ شناخت کرنا مشکل نہیں ناممکن ہوگا کہ سعدی کی ابیات کون سی ہیں اور خسرو کے اشعار کون سے ہیں۔ فقط چند مثالیں کافی ہوں گی۔

دلم در عاشقی آوارہ شد آوارہ تر بادا / تنم از بیدلی بیچارہ شد بیچارہ تر بادا

خبری دہ بمن ای باد کہ جاناں چونست / آں گل تازہ و آن غنچۂ خندان چونست

باکہ می می خورد آں ظالم و در می خوردن / آں رخ پرخوی وآن زلف پریشان چونست

روزہا شد کہ دلم رفت و در آن زلف بماند / یارب آں یوسف گم گشتہ زندان چونست

لہجے کی نرمی، الفاظ کا انتخاب، بیان کی شیرینی، اور وہ مخصوص Pathos جو lyric اور سعدی کی غزل کا خاصہ ہے، خسرو کے اشعار کا طرۂ امتیاز ہے اور ایسے اشعار کی ان کے دواوین میں بہتات ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خسرو کی سہ بعدی Three dimensional شخصیت ان کا لامحدود نابغۂ فکر، بے چین طبیعت اور سب سے بڑھ کر گونا گوں تجربے کرنے کی ان کی زبردست خواہش ہر قدم پر خسرو کی فکر اور ان کے اسلوب کو نئے نئے قالبوں میں ڈھالتی ہے اور وہ کسی ایک طرز کے پابند ہو کر نہیں رہتے۔ ان کو خود اس کا احساس تھا کہ ان کا کلام مختلف رنگ و آہنگ سے مخلل ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں میں اپنے چار دیوانوں تحفۃ الصغر، وسط الحیوٰۃ، غرۃ الکمال اور بقیہ نقیہ کے کلام کو چار عناصر سے تشبیہ دیتا ہوں:

”دراصل اوصاف غزل چہار تشبیہ چہار عناصر برای نمونہ شعر بہ آئینہ تخیل حکما از چہار طبع خویش روان سازم:

تا بدانند کہ یک طبع رہی ہست چہار / کہ ہمی زاید از و معدن حیوان و نبات

بمرتبہ اول غزلیات بمثابہ خاک سرد و خشک است و آن دیوان اول تحفۃ الصغر است کہ آن طفل خاک است در ایام خاکبازی۔ و مرتبہ دوم غزلہا آب بود چون آب لطیف و از خاک برتر است و از کدورت الفاظ کثیف منزی و آن وسط الحیوٰۃ است۔ مرتبہ سوم غزلہای است برشتۂ باد و این غزلہا روان و مانند باد است و این غزلہا از آن غرۃ الکمال است۔ و مرتبہ چہارم غزلہا مثال آتش است چنانکہ آتش بہ علو میل دارد و آن غزلہای بقیہ نقیہ است۔“

ترجمہ: پہلی منزل میں غزل مثل خاک کے سرد اور خشک ہے، اور یہ میرا پہلا دیوان تحفۃ الصغر ہے جو فی المثل ایک مٹی میں کھیلنے والا بچہ ہے۔ غزل دوسری منزل میں پانی کی طرح لطیف اور خاک سے برتر ہوتی ہے اور مثل الفاظ کی کدورت سے پاک و صاف۔ اور یہ دیوان وسط الحیوٰۃ ہے۔ غزل تیسری منزل میں ہوا کی مانند رواں ہوتی ہے اور یہ کیفیت دیوان غرۃ الکمال کی غزلوں کی ہے۔ اور غزل چوتھی منزل میں آتش ہوتی ہے، گرم اور مائل بہ بلندی۔ اور دیوان بقیہ نقیہ کی غزلیں اس منزل میں ہیں۔

اس تبصرہ سے خسرو نے انتہائی رمزیہ پیرائے میں بطور نمونہ اپنی غزل کی اور درحقیقت صنف غزل کی جمالیات ان چار عناصر میں مقرر کردی ہے جو انسانی زندگی اور اس کائنات کے وجود کو محیط ہیں یعنی غزل کے اجزائی ترکیبی گویا وہی چار عناصر ہیں جو زندگی کے ضامن ہیں۔ اور غزل انسانی زندگی کے حرکت اور نمو میں رچی ہوئی ہے۔ ان کے اس بیان میں اور اشاروں میں معانی کی وسعتیں اور گہرائیاں پنہاں ہیں، رمزو علائم کی دنیا آباد ہے۔ خود خسرو کی غزل میں معنی کی خوبصورتی رمز وابہام کے نازک اور حریری پردوں میں ملفوف نظر آتی ہے کہ یہی سبک ہندی کے ابتدائی نقوش راہ تھے۔

رمز وابہام کے طلسم سے خسرو کی غزل کے شعر میں پیچیدگی لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہے لیکن یہ تو اس صنف سخن کا عیب نہیں بلکہ خوبی ہے۔ غزل زندگی کی ترجمان ہے اور زندگی کے تجربے بڑے پیچیدہ۔ لہذا اگر اس کے تجربوں کے اظہار میں پیچیدگی آ جائے تو یہ بات خلاف فطرت نہ ہوگی۔ اردو میں میر جیسے غزل گو کے ہاں زبان کی سادگی کے باوجود رمز کی چاشنی بھی موجود ہے۔

خسرو اور سعدی کی غزل کا فرق رمز و کنایہ و استعارہ سے بھی ناشی ہے۔ سعدی کی شاعری شفاف اور بلورین ہے، اسی لیے ان کے ہاں تشبیہیں زیادہ اور استعارے کم ہیں، خسرو کی بیشتر غزلیں شعوری اور حسی تجربات کے ساتھ یا شاید اس سے بھی زیادہ تخیل اور انسانی لاشعوری کیفیات سے سرشار ہیں لہذا ان کا ذریعہ ابلاغ و ترسیل استعارہ ہے۔

سعدی فارسی غزل کی روایت کے بانی تھے اور سب سے پہلے انھوں نے عاشقانہ اور رندانہ مضامین کو حسن ادا میں سمو کر غزل میں ڈھالا ہے۔ قلمرو سعدی کا مصنف لکھتا ہے:

”در دیوان ارجمند او نہ غرابت مضمون تراشان راہی یابید و نہ ابداع باریک خیالان ہمہ ماجراہای دل بدبخت انسانی است و آرزومندی ہای جان“

خسرو بھی 'ماجراہای دل بدبخت انسانی اور آرزومندیہای جان' کے ترجمان ہیں لیکن سیدھے اور مستقیم طرز میں نہیں، اشارہ وکنایہ اور رمزیت کے ساتھ جس سے ان کی غزل کا سوز اور poignancy اور بڑھ جاتی ہے۔ سعدی کی غزل فصاحت، شیرینی اور رنگینی میں اپنا جواب نہیں رکھتی لیکن اس میں وہ بے پناہ سوز و گداز اور جوش و جذبہ نہیں جو انسان کے خوابیدہ احساسات کو بیدار کردے، اس کے دل کو برمادے اور جو خسرو کی غزل کی پہچان ہے:

ہر شب منم فتادہ بگرد سرای تو / تا روز آہ و نالہ کنم از برای تو

دی مست میرفتی بتاراج کردہ از ما یکطرف / شبدیز را مطلق عناں پیچیدہ از ما یکطرف

دل رفت زتن بیرون دلدار ہمان در دل / افتاد سخن در جان گفتار ہمان در دل

خسرو کی غزل جذبۂ عشق سے سرشار ہے۔ عشق جو ہمیشہ سے فنی تخلیق کو نشاط و سرمستی کا سامان مہیا کرتا رہا ہے اور اسی نشاط و سرمستی سے غزل میں وہ سوز و سرور، وہ کیفیت، وہ بے خودی پیدا ہوتی ہے جو خسرو کی غزل کا خاصہ ہے۔ عرفان و جذب میں ڈوبا ہوا ان کا کلام اس بات کا شاہد ہے کہ ان کی صورِ خیال، ان کا وجود از سرتا پا محبوب کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ وہ رنگ جو مولانا روم سے بے اختیار رقص کرواتا ہے، وہ رنگ جو حافظ کو شراب کے پیالے میں معشوق کا جلوہ دکھاتا ہے، وہ رنگ جو عبودیت اور بشریت کو عشق میں بدل دیتا ہے۔ خسرو کا عشق اپنے ان وجدانی تجربوں اور واردات کو بیان کرنے کے لیے جذبہ و تخیل کے سارے وسائل بروئے کار لاتا ہے۔

ان کی غزل میں انسان اور کائنات کا حسن عشق الٰہی کا آئینہ ہے۔ یہ وہ عشق ہے جو سبحہ و زنار میں فرق نہیں کرتا۔ خسرو وہ کافر عشق ہیں جن کی رگ رگ میں محبوب کا عشق سرایت کر گیا ہے۔ پھر ان کو تسبیح و زنار سے کیا غرض:

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست   ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

سعدی کی غزل عارفانہ جذبہ کی ابہام و تفہیم کا راستہ ضرور صاف کرتی ہے اور بات کو سادہ تعبیر سے ادا بھی کرتی ہے:

بجہان خرم از آنم کہ جہاں خرم از اوست   عاشقم برہمہ عالم کہ ہمہ عالم از اوست

شاعر نے اپنا مافی الضمیر فصاحت سے ادا کر دیا، اس کا موقف بھی پڑھنے والے پر صاف ہو گیا کہ وہ تمام جہان کو حسن ازلی کا پرتو سمجھ کر اس کا عاشق ہے۔ لیکن خسرو کی بے تابی، ان کے شعر کا جذب دل میں اتر جاتا ہے اور معاملہ سمجھ سے بڑھ کر احساس تک پہنچ جاتا ہے:

ہمیشہ در فراقت پادل افگار می گریم   غمت را اندکی میگویم و بسیار می گریم
اگر مردم بہ مستی گاہ گاہی گریہ می دارند   چہ حال است اینکہ من ہم مست وہم ہشیار می گریم
گہی در خلوت تاریک از ہجر تو می نالم   گہی در فرقت در کوچہ و بازار می گریم
چہ سوز است این کہ می دانم بہ جان خسرو مسکین   کہ چوں ابر بہار اندر سر کہسار می گریم

خسرو کی غزل ایک طرف پوری مشرقی تہذیبی روایت کا علم بردار ہے تو دوسری طرف وہ اس روایت میں اضافہ بھی کرتی ہے۔ ان کی غزل میں تغزل، تعشق اور تصوف شیر و شکر کی طرح ایسے گھلے ہوئے ہیں کہ اس کی مثال دوسرے غزل گو شعرا کے ہاں مشکل سے ملے گی۔

غم عشق کا لازمہ ہے اور عشق ہی کی طرح معنی خیز۔ اس سے عاشق اور عارف کو عرفان ذات حاصل ہوتا ہے۔ یہی غم غزل کا محرک ہے، بالخصوص خسرو کی غزل کا۔ عام طور پر ان کی غزل پر نظر ڈالی جائے

تو اس میں ایک سرور و کیف، نشاط و سرخوشی کی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عشق کا ایک رخ جوش و مستی ہے تو دوسرا اور زیادہ ہمہ گیر پہلو، غم۔ نشاط اور غم کا یہ رشتہ لازم و ملزوم ہے۔

نشاط سے لطف اندوز ہونے والا دل ہی غم کی دھار کو محسوس کر سکتا ہے۔ سرور و سوز کی اس دولت کا ورثہ دنیا کی ہر عظیم شاعری کو ملا ہے۔ انگریزی ادب کے معروف شاعر شیلی نے اپنے ان لازوال اشعار میں غم کی عظمت اور طرب میں الم کی زریں لہروں کو بیان کیا ہے:

Our sincerest laughter with
some pain is fraught
Our swetest songs are those
that tell of saddest thoughts.

خسرو کی غزل طرب انگیز اور نشاط پرور ہے لیکن اس کا اصل سرمایہ اس کے گداز، رقت، دلسوزی اور تاثر کی اساس غم ہے جس کا عرفان اس صوفی شاعر کو عشق نے عطا کیا ہے۔ یہ وہ غم ہے جو جاودان ہے جس کی دولت کو وہ غمگسار سے بھی بانٹنا نہیں چاہتا، جس کی تابسامانی اس کی زندگی کا ساز ہے:

غم خود از عشق است گو در جان من جاوید باش
گر غمم را غم گساری نیست گو ہرگز مباش

خسرو کی غزل حسن کا شاہکار ہے۔ زبان کا حسن، بیان کا حسن، آہنگ و ترنم کا حسن، جذبہ و تخیل کا حسن، فکر کا حسن اور سب سے بڑھ کر زیبائی کا ادراک اور اس کو بیان کرنے کا حسن ان کے دیوان غزلیات کے صفحات کو ایک عمدہ مصور کا نگار خانہ بنا دیتے ہیں۔ درحقیقت یہ ان کا ادراک و احساس زیبائی ہی ہے جو ان کے فن اور زبان و بیان و فکر و آہنگ کو منفرد بناتا ہے۔ اس احساس زیبائی کا سرچشمہ ہے عشق۔ خسرو کی عارفانہ نظر کے لیے کائنات اور ہستی کے ذرہ ذرہ میں حسن ازل آشکار ہے۔ گل میں، سبزہ میں، قمر میں، بادو باراں میں، نرگس و سنبل میں، صحرا کی وسعت میں، چمن کی رنگینی میں، بارش کے قطروں میں، پھول کی خوشبو میں۔ ہر طرف اس کا جلوہ، اسی کا رنگ بکھرا ہوا ہے:

سحر گاہاں کہ باد از سوی گل عنبر فشاں آید
چو گل جامہ درم کاندم زگل بوی نشان آید

خسرو کی بے شمار غزلیں مناظر فطرت کی زیبائی اور حسن محبوب کے بیان میں ہیں۔ ان غزلوں کو پڑھنے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا شاعر اپنے جذبہ عشق کو عالم فطرت پر بھی طاری کر دیتا ہے اور حسن محبوب پر بھی اور ان دونوں پر وارفتہ اور فریفتہ ہو کر وہ ایک بے اختیاری کے عالم میں اس کا بیان کرتا چلا جاتا

ہے۔ ''بے اختیاری'' کا یہ احساس اس لیے بھی ہوتا ہے کہ اکثر خسرو کی وہ غزلیں جو حسن فطرت اور معشوق کے سراپا اور اسکے حسن کے بیان میں ہیں وہ مسلسل ہیں۔ غزل کی روایت سے ہم واقف ہیں اور اس روایت کے مطابق عموماً اس کا ایک شعر دوسرے شعر سے موضوعاتی مناسبت نہیں رکھتا۔ خود امیر خسرو کی غزل بھی اس روایت کی پیروی کرتی ہے۔ لہٰذا جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی وہ غزلیں جو فطرت کی خوبصورتی اور محبوب کے حسن کو بیان کرتی ہیں وہ خاصی تعداد میں مسلسل ہیں تو معاً یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر اس عظیم حسن کے آگے بے بس ہو کر بیت پر بیت اس کے بیان میں کہتا چلا جا رہا ہے:

ہوای خرم است و ہر طرف باران ہمی بارد
نہ گویم قطرہ کز بالا گل و ریحان ہمی بارد
چگوں سر شاخہای سبزہ گوئی در ہمی جنبد
زبس کابر در افشان لولوی غلطان ہمی بارد
چکان قطرہ ز سرہای انار تازہ پنداری
کہ ہر دانہ کہ بودست اندرون پنہان ہمی بارد

سات شعر کی یہ مسلسل غزل گل و سبزہ و قطرہ ہای باران کی خوبصورتی کے بیان میں ہے۔ چند اور غزلیں:

ہوائی خرم است و ابر لولو بار می بارد
ز لال زندگی بر شاخ خضر آثار می بارد

سات مسلسل شعر

بیا ساقی و می دردہ کہ گل در بوستان آمد
ز جام لالہ بلبل مست گشت و در فغان آمد

آٹھ شعر کی مسلسل غزل

سفیدہ دم چو در از ابر گلفشان بچکد
بہ کام لالہ و سنبل زلال جان بچکد

تیرہ شعر کی مسلسل غزل

رسید موسم عید و صلای می در داد
پیالہ برکف خوبان ماہ پیکر داد

سات شعر کی مسلسل غزل

باز ابر آمد و بر سبزہ در افشانی کرد
برگ گل را صدف لولوی مرجانی کرد

یہ فقط مشتے نمونہ از خروارے چند غزلیں پیش کی گئی ہیں۔ تمام دیوان غزلیات میں ایسی مسلسل غزلیں موجود ہیں اور مثنویوں میں بھی اس حسن فطرت کے بیان کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی ایک غزل کو جو ''برگ ریز'' اور ''خزان'' کے افسردہ حسن کے بیان میں ہے ہم انگریزی ادب کے معروف شہ پارہ Ode to the West wind کے مقابل رکھ سکتے ہیں:

برگ ریز آمد و برگ و گل و گلزار برفت
سرخروئی ز رخ لالہ و گلنار برفت

سرو بشکست و سمن زرد شد و نرگس خفت
گو برو این ہمہ چوں از بر من یار برفت

اسی طرح معشوق کے حسن کے بیان میں خسرو کی متعدد مسلسل غزلیں معشوق کے بے مثال حسن اور ان کے عشق و ارفتہ سے سرشار ہیں۔

عرفان کے رنگ میں بھی خسرو کی بعض غزلیں مسلسل ہیں مثلاً وہ کہنا چاہتے ہیں کہ عرفان کے آخری مرحلے کے فائز ہونے کے لیے ماسوا اللہ اور دوئی سے دامن چھڑانا ہوگا اور مے اور ساقی اور مستی سب کو ایک ہی زمرہ میں شمار کرنا ہوگا۔ ایک مسلسل غزل اس مضمون میں ملاحظہ ہو:

اگر اصحاب عشرت می پرستند
بیا ساقی کہ من ساقی پرستم

مرا گویند در مستی چہ دیدی
کہ می گویی دل اندر بادہ بستم

تعالی اللہ ازین بحر چہ یابد
کہ از ننگ وجود خویش رستم

جلوہ معشوق ہر طرف ضوفگن ہے اس کی معرفت ہر ایک کے بس کی بات نہیں، ور در کی خاک ہی کیوں نہ چھان لی جائے:

تحت بہ سرو گویم غیرت زیاد برم
تو درون دیدۂ ہستی ز کسان چرات بوہم

بدل و بہ دیدہ و جان ہمہ جا نہفتہ ہستی
چو نہ ہم آشکارا بکدام جہات جویم

تو کہ بود تو گم شد سر و تاج پادشاہان
چہ خیال فاسد است این کہ من گدات جویم

عرفان خسرو کی غزل کے سر کا تاج ہے لیکن طبیعت کی اسی رنگارنگی، مطالب کے اسی تنوع کے تحت جو ان کے ذوق کا خاصہ ہے، ان کی غزل سلوک و عرفان کی اعلیٰ ترین منازل طے کرنے کے بعد زمین کا پتہ بھی دیتی ہے۔ چنانچہ عاشقانہ مضامین اور معاملہ بندی بھی ان کی غزلوں کی جان ہیں اس بات کا شاہد ان کا دیوان غزلیات ہے۔

خسرو کی مثنویاں:

غزل کے بعد خسرو کی بے پناہ شاعرانہ صلاحیت کی آئینہ دار ان کی مثنویاں ہیں۔ خمسہ نظامی کی پیروی میں انھوں نے پانچ مثنویاں کہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تاریخی مثنویاں قرآن السعدین، مفتاح الفتوح، دول رانی خضر خان اور تغلق نامہ ہیں۔ خمسہ میں وہ نظامی کے پیرو ہیں لیکن غزل کی طرح مثنوی میں بھی وہ اپنی انفرادیت، فکر و فن کے تنوع، اور جدت پسندی کے باعث ایک منفرد اور مخصوص مقام رکھتے ہیں۔ خسرو کی مثنویاں ایک ایسا سمندر ہیں جس میں طرح طرح کے بیش بہا اور بے بہا موتی موجود ہیں۔ ایک ایک مثنوی خسرو کی استادی، ان کی نو آوری، زبان و بیان پر ان کی قدرت، ان کے علم و فضل و اطلاعات، جذبات و

احساسات کے اظہار پر ان کی گرفت، صنائع و بدائع کے ماہرانہ استعمال، مناسبات لفظی کے اہتمام، منظر نگاری، واقعہ نگاری، دلچسپ پیرایہ بیان کا مسحور کن اور جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ ہر مثنوی اس کی متقاضی ہے کہ اس کا سیر حاصل مطالعہ کیا جائے۔ اس کے ایک ایک پہلو پر روشنی ڈالی جائے اور خسرو کی صناعی اور جودت ذہنی کا تفصیلی تجزیہ کیا جائے۔ ان میں سے بعض مثنویاں تو ہمارے ملک کی Socio-cultural History کی اہم ترین دستاویز کا درجہ رکھتی ہیں مثلاً مفتاح الفتوح، نہ سپہر اور دول رانی خضر خان۔ یہاں ان کی بعض مثنویوں کے فقط چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

خسرو قصیدہ لکھیں، اعجاز خسروی کے دفتر تحریر کریں، صنائع بدائع، قواعد و بلاغت پر رسالے تصنیف کریں، تاریخی اور نیم تاریخی مثنویاں نظم کریں، بنیادی اور فطری طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں اور تغزل ان کے مزاج کا خاصہ۔ خدا نے انھیں جو ذہن رسا اور غیر معمولی صلاحیت دی تھی اس کے سبب یوں تو وہ جس چیز کی طرف توجہ کرتے تھے اس کے ماہر معلوم ہوتے تھے اور ان کے کلام کے ایک پہلو کو دوسرے پہلو پر ترجیح دینا تقریباً ناممکن ہے، لیکن ان کا تغزل اور Lyrical quality ایک ایسی خصوصیت ہے جو ان کی دیگر خصائص کلام پر حاوی ہے اور جس نے ان کی مثنویوں، خصوصاً عشقیہ مثنویوں کو غزل کی سی دلکشی بخشی ہے۔ وہ نظامی کے تتبع میں خمسہ کہتے ہیں۔ نظامی دور سلاجقہ کے اہم ترین مثنوی گو شاعر اور قابل شخصیت تھے۔ ان کے خمسے میں دو مثنویاں خالص عشقیہ داستانیں ہیں۔ ایک کا تعلق ایران سے ہے، یعنی خسرو و شیرین اور دوسری کا عربستان سے، یعنی مجنوں و لیلیٰ۔ خسرو نے بھی اس دونوں مثنویوں کے جواب میں ان دونوں عشقیہ داستانوں کو نظم کیا، خسرو و شیرین اور لیلیٰ و مجنون۔ فارسی ادب سے تعلق رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ نظامی گنجوی کے پایہ کا شاعر خود ایران کی سرزمین پر بھی کم گزرا ہے۔ بلندیٔ فکر، طلاقت بیان، واقعہ نگاری کی زبردست قدرت اس بزرگ منش شاعر کے کلام کی خصوصیات تھیں۔ چنانچہ اس کا خمسہ بھی ان خصوصیات سے مزین ہے۔ خصوصاً سکندر نامہ اور مخزن الاسرار ان کے منفرد تخیل، ندرت فکر، اچھوتی تشبیہوں اور استعاروں اور بلاغت کلام کا زبردست نمونہ ہے۔ بادشاہ کے تاج میں موتی لگانے کے لیے یہ استاد شاعر جس طرح سورج کو بلند ہونے، ابر کو آسمان پر چھانے اور پانی برسانے، قطرہ کو صدف کے بطن میں جانے، صدف کو اس قطرہ کی پرورش کرنے اور موتی بنانے اور موتی کو جوہری کے ہاتھوں تاج شاہنشاہی پر جگہ پانے کا حکم دیتا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ یہ ابیات اس شعر سے شروع ہوتی ہیں:

علم برکش ای آفتاب بلند　　خراماں شوای ابر مشکیں پرند

شاید خسرو کی تمام مثنویوں میں ان ابیات کا جواب نہ ملے لیکن جہاں تک واردات قلبی، نزاکت احساس، سوز و گداز اور تغزل کا تعلق ہے اس میں خسرو دہلوی آذربائجانی استاد سے بازی لے جاتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں اور غزل کا شاعر انسانی جذبات کا ترجمان ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی عشقیہ داستانیں اور وہ تاریخی مثنویاں بھی جس میں عاشق و معشوق کے کردار ہیں، تغزل، احساسات و جذبات کے سوز و گداز سے سرشار ہیں۔ لیلیٰ مجنوں میں خسرو کی لیلیٰ اپنے دور افتادہ اور مقید و محبوس مجنوں کو جو نامہ تحریر کرتی ہے وہ اپنے احساس کی شدت، رقت متن اور بے پناہ تغزل کے سبب فارسی ادب میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ چند ابیات ملاحظہ ہوں:

ای عاشق دور مانده چونی　　وای شمع ز دور مانده چونی
چونست سرت بیالش خاک　　خون از رخ تو که می کند پاک
از من به که می بری حکایت　　با خود ز که می کنی شکایت
در گوش که ناله می رسانی　　در پای که قطره می چکانی
تا بستر تو زمین شنیدم　　من نیز ہوان زمین گزیدم
آن سینه بی فراغ چونست　　زندانی بی چراغ چونست

حسن کے بیان میں بھی خسرو نظامی سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ نظامی نے عشقیہ داستانیں نظم ضرور کیں لیکن ان کا دل خسرو کی طرح معشوق کے حسن سے دوچار نہیں ہوا، انھوں نے انفس و آفاق کی گردش، بتوں کے عشق کو پرکھنے اور ہزاروں حسینوں کا جلوہ دیکھنے کا تجربہ نہیں کیا جو خسرو نے کیا تھا۔ اسی لیے ان کے حسن کے بیان میں اس "چیز دیگر" کی کمی ہے جو خسرو کو نصیب ہے۔

نظامی کی شیرین پر ایک نظر ڈالیے:

برون آمد ز طرف حلقه پرده　　بلا معجزه رخ سحر حلقه کرده
بگویم چون شکر شکر کرامت　　طبرزد نه که او نیزش غلامت
ق کاله پرستیدن علاقش　　بجشتی نقد بازار جمالش

بہت سی ابیات ہیں لیکن شیرین کی خوبصورتی گوشت پوست میں ہمارے سامنے نہیں آتی۔ وہ ایک حسین مگر بے جان تصویر ہے۔

اب ذرا خسرو دہلوی کی شیرین ملاحظہ فرمایئے:

دولب ہم نگیں ہم باده در دست　　دو چشم شوخ ہم ہشیار ہم مست
فتاده نرگسش در فتنه جوئی　　میان خواب و بیدار بیست گوئی
بہ مژگان داده مجر جان خراشی　　گہی جاندار و گاہی دور باشی

فریب غمزۂ جادو زبان بند   شکاف چشمۂ شیرین شکر خند

ایک ہنستی جاگتی، ہنستی مسکراتی، اپنی جھپکتی ہوئی آنکھوں سے جادو دکھاتی ہوئی یہ شیرین خسرو ہی کے تخیل کا حصہ ہے۔

خسرو کا unbounded genius ان کی بے پناہ صلاحیت ان کو ہر ہر لمحہ نئے میدان تلاش کرنے، نئی راہیں ڈھونڈنے، تازہ اسالیب وضع کرنے، عام روش سے ہٹ کر اپنا راستہ بنانے پر ابھارتے تھے۔ وہ اگر پرانی راہ پر چلے بھی تو کچھ اس طرح کہ ان کے نقش قدم دوسروں سے مختلف رہے۔ غزل کہی تو ایک نئے سبک کی بنیاد ڈال دی، نثر لکھی تو ایسی کہ نہ ان سے پہلے کسی نے لکھی، نہ ان کے بعد اور مثنوی کے سینکڑوں سال پرانے میدان میں قدم رکھا تو وہاں بھی نئے نئے تجربوں، نو آوری اور جدتوں سے اپنی مثنوی کو ایک انفرادیت دے دی۔ قرآن السعدین خسرو کی پہلی مثنوی ہے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ مثنوی انھوں نے سلطان معزالدین کیقباد کے حکم سے نظم کی تھی۔ اس میں تاج پوشی کے بعد کیقباد اور اس کے باپ ناصرالدین شاہ کی ملاقات کا حال ہے۔ موضوع چنداں دلچسپ نہ تھا اور خسرو کو اس کا احساس تھا۔ لیکن انھوں نے طرح طرح کی گل کاریوں اور جدتوں سے اس میں ایسا رنگ بھرا کہ وہ ان کی چند نمایاں مثنویوں میں شمار ہوتی ہے۔ بقول مولانا محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم اس مثنوی میں چند خصوصیات ایسی ہیں جن سے شعرائے عجم کی مثنویاں بالکل خالی ہیں۔ یہ خسرو کی جدت آفرینی ہے جو انھوں نے اس مثنوی کو دلاویز بنانے کی غرض سے اختیار کی ہے۔ مولانا نے ان میں سے بعض خصوصیات اس طرح بیان کی ہیں:

۱- منظوم عنوان: خسرو نے مثنوی کے ہر باب اور قصہ کا عنوان منظوم رکھا ہے۔ جس کی بحر مثنوی کی بحر سے مختلف ہے۔

اسم مثنوی : نام این نامہ والاست قران السعدین   کز بلندیش بسعدین بکمرست قران
نعت رسول : نعت سلطان رسل آنکہ مسیحا بدرش   پردہ داریست نشستہ زپس شادروان
پادشاہ کی مدح : مدحت شاہ کہ نامش بفلک رفت چنانک   نقش آن داغ شدہ خنگ خنگ رابران
صفت دہلی : صفت حضرت دہلی کہ سواد اعظم   ہست مشہور وی از حرسہا اللہ نشان

اگر یہ سب عنوان جمع کیے جائیں تو ۳۷ شعر کا ایک قصیدہ مرتب ہو جائے گا۔

۲- بیان میں تازگی اور جدت لانے کے لیے اور ایک طویل موضوع کی کسالت دور کرنے کے لیے خسرو نے مثنوی کے درمیان میں قصیدہ اور غزل کو تضمین کیا ہے۔ مثنوی کی طوالت اور قصہ کی یکسانی کو کم کرنے کے لیے فارسی شعرا نے ساقی نامہ، مغنی نامہ وغیرہ کو تو اس میں جگہ دے دی ہے لیکن مثنوی کے درمیان قصیدہ اور غزل نظم کرنا خسرو کی جدت تھی۔ باپ بیٹے کی ملاقات کے بیان میں ایسی رنگین اور سرشار

غزل لکھی ہے جس پر آج بھی صاحبان دل سر دھنتے ہیں۔

خرم آن لحظہ کہ مشتاق بیاری برسد   آرزومند نگاری بہ نگاری برسد

۳- وصف نگاری: مثنوی قرآن السعدین میں خسرو کی سب سے دلچسپ اور با مزہ جدت "وصف نگاری" ہے۔ انھوں نے مختلف اشیا کا وصف بڑے ہی دلپذیر اور پر لطف انداز میں پیش کیا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا مثنوی میں جس قصہ کا بیان کیا ہے وہ کچھ زیادہ دلچسپ نہ تھا۔ لیکن خسرو نے اپنے ذہن کی اپج اور رنگینی فکر سے اس مثنوی میں وصف نگاری کے ایسے گل بوٹے کھلائے کہ وہ ان کی بہترین مثنویوں میں شمار ہوتی ہے۔

ہندوستان کے موسم، مختلف اشیا، دلی کی عمارات، پھول، پھل، غرضیکہ بے شمار چیزوں کی وصف نگاری خسرو نے بڑے دلآویز طرز پر کی ہے:

صفت خربزہ: خربزہ گویی کہ بہ صحرا و کشت   گوی ربود از ثمرات بہشت
از حرم گرد آمدی در وی نبات   تمام شکر پختہ چو آب حیات

وصف کشتی: ماہ نوی کاصل وی از سال خاست   یک مہ نو گشت بہ یک سال راست
گرچہ بدریا گذرد بیش و کم   آب نیابد کمرش تا شکم
با سبکی باد تواند کشید   از سبکان بار کشیدن چہ دید

اور پان کا یہ مشہور بیان:

نادرہ برگی چو گل بوستان   خوب ترین میوہ ہندوستان
خوردن آن بوی دہن کم کند   سستی دندان ہمہ محکم کند
سیر خورد گرسنہ وارم شود   گرسنہ را گر نخی کم شود

پچاس سے زیادہ چیزوں کی صفت و تعریف قرآن السعدین میں موجود ہے۔ یہ مثنوی اپنے اس انوکھے انداز بیان کی وجہ سے خسرو کی تمام مثنویوں میں سب سے زیادہ مقبول کہی جا سکتی ہے۔

اعجاز خسروی یا رسائل الاعجاز:

خسرو کی یہ انوکھی نثری تصنیف واقعی اعجاز سے کم نہیں۔ ان کی رنگارنگ، قوس قزحی فکر و فن کا ایک اور شاہکار فارسی زبان کے قواعد و بلاغت اور انشا پردازی کے اصول و ضوابط کے متعلق لکھی گئی، پانچ دفتروں پر محیط ان کی ضخیم تصنیف ۷۱۹ ہجری میں مکمل ہوئی جس وقت خسرو کی عمر تقریباً ستر سال تھی۔ خزائن الفتوح میں انکی نثر دیکھنے والا اعجاز کے انداز بیان سے حیران رہ جاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ انھوں نے اعتراف کیا ہے اعجاز کا مقصد ہی یہ تھا کہ نثر کے مزین اور مرصع نمونے پیش کیے جائیں اور صنائع بدائع، رعایت لفظی،

مناسبات وغیرہ کے استعمال کا ہنر دکھایا جائے۔ اعجاز میں خسرو نے یہ التزام کیا ہے کہ ایک خاص نسبت یعنی مناسبت سے الفاظ استعمال کیے جائیں مثلاً اگر 'آب' کا لفظ ہے تو باقی عبارت میں 'آب' ہی کے متعلقات اور مناسبات مذکور ہوں اور اگر 'آتش' کا استعارہ ہے تو آگ ہی کے لوازمات اس پارۂ نثر میں رکھے جائیں۔ اگر اس کے لفظوں کے طلسم سے خوانندہ عہدہ برآ ہو سکے تو اس کو خسرو کی یہ تصنیف فقط فضل فروشی کی ایک کوشش، جس کا التزام اعجاز پر ہمیشہ گراں گزرتا رہا ہے، نہ معلوم ہوگی بلکہ اس زمانے کے بہترین نثری نمونوں اور اسالیب کا شاہکار معلوم ہوگی۔ اس کے علاوہ اعجاز خسروی لغوی، نحوی، ادبی، تاریخی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے بے شمار اور بیش بہا اطلاعات کا خزانہ ہے اور اس کا انوکھا اسلوب اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ نظم کے ساتھ ساتھ خسرو نثر کے بھی بادشاہ ہیں۔ یہ سچ ہے کہ آج اس کتاب کی نثر کو پڑھ کر سمجھنے والے شاید خال خال ہی ہوں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اعجاز خسروی ہمیشہ ہی بڑے چیدہ اور ماہر انشاء پردازوں کے خاصے کی چیز رہی ہے۔ عام فارسی داں قاری خسرو کے اس Magnumopus کو پڑھنے کی ہمت بہت مشکل سے ہی کرتا ہے۔ جو بھی ہو رسائل الاعجاز خسرو کی ہمہ دانی اور ہمہ جانبہ فکر وفن کا ایک اور انتہائی بین ثبوت ہے۔ اعجاز خسروی کا ایک اقتباس آپ کے تفنن طبع اور خسرو کی استادی کا لوہا منوانے کے لیے پیش ہے۔ نسبت ہے دریا و دُر:

> بدانکہ بعضی از الفاظ از آنجاست کہ اگر در غور هر یک فرو روند دریای یابند گوهر دار و یا ابری دُر بار و اگر بکاوند البتہ عین معنی بیرون تر اود و روی آب آید۔ غواصیکہ در محیط آشنایی دارد و نهنگیہ در قطر کلمہ ژرف نگاہ کند غوص نا کردہ گوهر را بشناسد و اگر تعمق نماید تواند کہ در یتیم معنی بر دارد و آنکہ غواص نیست هر چند در وی فرو رود بہ در مکنون نرسد۔

زبان شناس اور ناقد شعر:

خسرو کی جامعیت کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ وہ خالق شعر ہونے کے ساتھ ساتھ ناقد شعر وشاعری کے ہوش مند پارکھ اور زبان شناس بھی تھے۔ اس کے واضح اشارے نہ صرف ان کی نظم میں نظر آتے ہیں بلکہ اپنے مختلف دیوانوں کے دیباچوں میں انھوں نے شعر کے حسن وقبح، فارسی اور عربی زبان کی شعری صلاحیت، غزل کی صنف، مختلف زبانوں، ہندوستانی فارسی کے خصائص اور اس قبیل کے متعدد موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے یہ افکار وعقاید بڑی دقت نظر اور سوجھ بوجھ کے حامل ہیں۔ مختلف زبانوں، ان کے قواعد واصول، صرف ونحو اور ان کی بیانیہ صلاحیت پر ان کی گہری نظر تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ خود کئی زبانوں کے ماہر تھے اس لیے ان کی یہ آرا اور نظریات اہمیت کے حامل ہیں۔ 'نہ سپہر' میں انھوں

نے عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندوستان کی دوسری کئی زبانوں کا ذکر کیا ہے، مورخین ادب کا خیال ہے کہ شاید وہ پہلے شخص تھے جس نے ان زبانوں کو اس طرح مشخص کر کے بیان کیا:

سندی و لاهوری و کشمیر و گبر   دهور سمندری و تلنگی و گجر
(سندھی) (پنجابی) (ڈوگری) (تامل) (تیلگو) (گجراتی)

معبری و گوری و بنگال و اودھ   دهلی و پیرامنش اندر همہ حد
(کنڑ) (آسامی) (اودھی)

این همہ هندویست از ایام کہن   عامہ بکار است بہ هر گونہ سخن

خسرو کہتے ہیں کہ سنسکرت ہندوستان میں خواص اور برہمنوں کی زبان ہے اور انتہائی اہمیت کی حامل ہے:

لیک زبانیست دگر کز سخنان   آنست گزین نزد همہ برهمنان
سنسکرت نام ز عهد کهنش   عام ندارد خبر از کن مکنش

ان کی نظر میں سنسکرت بھی عربی زبان کی طرح ایک مکمل زبان ہے۔ اس کا صرف ونحو ایسا ہی مستحکم ہے جیسے عربی کا:

گر آئین عرب نحو است و گر صرف   از آن آئین درین کم نیست یک حرف

ہندی زبان کی نسبت خسرو کہتے ہیں کہ جو شخص علم رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ ہندی زبان فارسی اور ترکی سے کم نہیں:

غلط کردم گر از دانش زنم دم   نہ لفظ هندی است از پارسی کم

معنی کی باریکی اور وسعت میں بھی ہندی کسی زبان سے کم نہیں:

وگر پرسی نمایش از معانی   در آن نیز از دگرها کم ندانی

لیکن عربی کو وہ دوسری زبانوں کا سردار قرار دیتے ہیں:

بجز تازی کہ میر هر زبان ست   کہ بر جملہ زبانها کامران است

شاعری کے کنہ وکیف اور اسرار وغوامض پر ان کی گہری نظر ہے۔ انھوں نے خود اپنے دواوین اشعار کے متعلق اظہار خیال کیا ہے کہ اور ہر دیوان کی غزلیات کو ایک الگ زمرہ میں رکھا ہے، 'تحفۃ الصغر' کو سبب استعمال صنائع وبدائع کثیرہ، 'خاک' سے تشبیہ دی ہے کہ اس میں لطافت نہیں پائی جاتی، وہ اس کو ''بطفل خاکباز'' کہتے ہیں۔ 'وسط الحیوۃ' کا کلام آب کی طرح رواں اور ''گرم وتر'' ہے، 'غرۃ الکمال' کی غزلیں ''بادگرم'' کی مثال پر جوش اور مایل بہ بلندی ہیں اور 'بقیہ نقیہ' کا کلام مثال آتش است چنانکہ است بہ بلندی میل دارد و ہیچ سر بہ پستی فرو دنیارد و در دلہای نرم چوں آتش در پنبہ گزرد و دل آھنین را نرم سازد'' جیسا

کہ قبلاً عرض کیا گیا خسرو نے گویا غزل کو کائنات کے چار عناصر کا مکمل مانا ہے اور علامتی طور پر اس کو ''کائنات کا ترجمان بتایا ہے۔

غرۃ الکمال کا مفصل دیباچہ زبان وادب وشعر سے متعلق خسرو کے نظریات کا ایک سمندر ہے جس میں قدم قدم پر قابل غور نکات ہماری جانب توجہ کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دیباچہ ایک مستقل اور جدا بحث چاہتا ہے۔ یہاں مختصراً صرف دو ایک دلچسپ نکتوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

امیر خسرو عربی اور فارسی زبان کا مقابلہ کرتے ہوئے دونوں زبانوں کی نثر ونظم، اس کے خصائص سے بحث کرتے ہیں۔ بعض باتوں میں وہ عربی کو فارسی سے بہتر اور بعض خصوصیات میں فارسی کو عربی سے افضل مانتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں: ''باز ثابت میدارم کہ پارسیان بطبع شاعری بر عربیان راجح اند''۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر عرب کا کوئی افضل اور افصح شاعر، فارس اور خراسان جائے تو 'الطریق فارسیان' فری نتوانند زد۔ اس کے برخلاف فارسی گو شاعر عربی میں مہارت حاصل کر سکتا ہے۔ وہ مثال کے طور پر زمخشری کا حوالہ دیتے ہیں کہ وہ خوارزم سے تھا اور عربیوں کے درمیان ''علامہ'' کہلاتا تھا۔ ایک اور بات خاص طور پر دلچسپ ہے: خسرو ہندوستان کے فارسی گو شعرا کی ذہانت اور موزونی طبع کو سراہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے عالم خصوصاً وہ جو دہلی میں مقیم ہیں ان تمام اہل ذوق سے جو دنیا میں کہیں بھی پائے جاتے ہوں بہتر ہیں۔ عرب، خراسانی، ترک اور دوسری قومیں جو ہندوستان آتی ہیں مثلاً دہلی، ملتان یا لکھنوتی میں، اگر تمام عمر بھی یہاں گزار دیں تو بھی اپنی زبان نہیں بدل سکتے اور شعر اپنی ہی زبان میں کہیں گے۔ برخلاف اس کے ہندوستان کا شاعر بغیر کسی ملک کو دیکھے، اس ملک کی زبان اور طرز میں لکھ سکتا ہے۔ وہ ہندوستان میں رائج فارسی زبان کو دوسرے ملکوں کی فارسی سے خالص تر بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری فارسی وہی قدیم پارسی ہے اور دریائے سندھ سے لے کر سمندر کے ساحل تک ایک اور یکساں ہے برخلاف اس کے ایران کے مختلف علاقوں میں لسانی فرق پایا جاتا ہے: خراسانی 'چہ' کو 'چا' کہتا ہے، بعض جگہ 'کیا' کو 'کیو' کہتے ہیں۔ آذربائیجان میں 'کردہ' کی جگہ 'کردہ کن' کہا جاتا ہے۔ سیستان میں بعض افعال 'سین' پر ختم ہوتے ہیں مثلاً 'کردوس' 'گفتہ سن' وغیرہ۔ خسرو ''لفظ'' یا ''نطق'' کی اہمیت کے قائل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بغیر 'لفظ' کے جس کو وہ 'سخن' سے تعبیر کرتے ہیں، علم بیکار ہے کیونکہ اگر معنی کی دلہن کو الفاظ کا لباس نہ پہنایا جائے گا تو وہ کیونکر ذہن کی خلوت گاہ سے باہر آئے گی۔ یعنی الفاظ علم سے افضل ہیں۔ ''اگر عرایس علم را لباس سخن نباشد ہرگز از خلوت گاہ ذہن بیرون نیاید۔ پس معنی علم محتاج است بصورت عبارت''۔ موسیقی میں لحن ہے بغیر شعر کے بیکار ہے:

ہر سرودی کش نہ از شعرات زیب معنوی
بان دہان و ہون وہون بیہدہ ست تا بشنوی

خسرو کا یہ بیان ماہر لسانیات کی توجہ کا مستحق ہے۔

اس دیباچے میں وہ ردیف، قافیہ، صنائع، بدائع، علم بیان و بدیع وغیرہ سے متعلق دقیق بحثیں کرتے ہیں۔ شعر میں دانائی کی پانچ قسمیں بتاتے ہیں: فاضلانہ، حکیمانہ، نیکو طبعانہ، عاشقانہ وشاعرانہ اور شاعروں کے تین مرتبے مقرر کیے ہیں:

۱- استاد تمام، جو کسی طرز کا موجد ہو، جیسے سنائی، انوری، ظہیر، نظامی وغیرہ۔
۲- استاد نیم تمام: جو خود کسی طرز کا موجد نہ ہو لیکن کسی خاص طرز کا پیرو ہو اور اس میں کمال پیدا کیا ہو۔
۳- سارق: جو دوسروں کا کلام چراتا ہو۔

استادی کی وہ چار شرطیں بتاتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ میں درحقیقت استاد نہیں ہوں کیونکہ مجھ پر فقط دو شرطیں پائی جاتی ہیں۔ پھر ان صنائع بدائع کو بالتفصیل لکھتے ہیں جو خود ان کی وضع کردہ ہیں اور جن کی تعداد دس سے زیادہ ہے۔ مثلاً ایہام ذوالوجوہ، جس میں ایک ہی ترکیب یا لفظ سات سے زیادہ معنی رکھ سکتا ہے۔ بڑی دلچسپ ذولسانی مثالیں بھی ان صنائع وبدائع کے ذیل میں ملتی ہیں:

آئی آئی ہمان بیاری آئی ماری بِراو موری آئی

ان کا یہ فاضلانہ دیباچہ، زبان شناسی، شعر وادب اور ان کی کنہ وکیف پر ان کا عالمانہ اظہار خیال ایک طرف، اور بارگاہ خداوندی میں ان کا وہ بے ساختہ، عاجزانہ، اور منکسرانہ استغفار اور معذرت دوسری طرف جہاں وہ ایک عجیب تاسف انگیز لہجے میں شعر وشاعری کو مکر ودروغ گوئی سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے خسرو، تو بہت حرف زنی کرتا ہے اور مبالغہ تیرا حد سے زیادہ ہے، توبہ واستغفار کر اور خدا سے دعا کر کہ وہ تجھے جو ایک دروغ زن شاعر ہے، راہ راست دکھائے کہ میں خود اب اپنی دروغ گوئی سے تنگ آ چکا ہوں۔ میرے ایمان کا حاصل کیا ہوگا کہ میں نے تو کذب کو کمال کی حد تک پہنچا دیا ہے۔

خسرو کا ہندوستان اور ہندوستان کا خسرو:

خسرو کو ہندوستان اور ہندوستانی کلچر سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کے اجداد پدری ہندوستانی نہیں تھے اس کے باوجود وہ پورے طور پر اس رنگارنگ ملک کی تہذیب کے دلدادہ اور اس کے علمبردار تھے۔ کتنا فرق نظر آتا ہے ہم کو غالب اور خسرو کے افکار میں۔ غالب اپنے تورانی النسب ہونے پر ناز کرتے ہیں:

اور فارسی کو ہی اپنی زبان اور اپنے کلام کی معراج جانتے ہیں:

فارسی بین تا بہ بینی نقشہای رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بی رنگ من است

خسرو کہتے ہیں:

چو من طوطی ہندم ار راست پرسی
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب — شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

ان کے کلام خصوصاً ان کی مثنویوں میں ہندوستانی تاریخ فرہنگ، روزمرہ کی زندگی، یہاں کے رسوم ورواج، عمارتوں، باغوں، پھولوں، خوشبوؤں، موسموں اور بے شمار دوسری چیزوں کے بارے میں اطلاعات ملتی ہیں۔ خسرو کی تاریخی مثنویوں میں تو ظاہر ہے ان کا مقصد ہی اس ملک کے تاریخی واقعات، اشخاص وکردار کا بیان کرنا تھا لیکن ان تاریخی واقعات کے علاوہ ان کا فطری رجحان اس ملک کی طرف ہی نظر آتا ہے۔ مثلاً قرآن السعدین، نہ سپہر، دول رانی خضر خان میں خسرو کی توجہ کا مرکز ہندوستان ہے اور ہر وہ چیز جو ہندوستان سے تعلق رکھتی ہے۔ نہ سپہر کا پورا تیسرا اور چوتھا سپہر ہندوستان کے لیے مخصوص ہے۔ تیسرے سپہر میں جو سب سے بڑا بھی ہے اور اہم بھی، ہندوستان کی تقریباً ہر چیز کو سراہا گیا ہے۔ یہاں کے باشندوں کی ذہانت، علم ودوستی، زبانوں، رسوم ورواج، موسم غرضیکہ کشور ہندوستان کی ہر ہر چیز کو جی بھر کر سراہا گیا ہے۔ ساتویں سپہر میں موسم بہار کا بیان، شہزادہ محمد کی پیدائش پر دہلی کی آرائش اور جشن کی تشریح اور نویں سپہر میں دہلی کے شعرا کی ستائش ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خسرو کا کلام قرون میانہ کے ہندوستان سے متعلق ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے اور ان کے کلام میں اس ملک کا دل دھڑکتا ہے۔ انھوں نے ہندوستان میں تہذیب مشترک کو فروغ دینے اور استحکام بخشنے میں انتہائی اہم اور ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا ہے۔ ہندوستان سے ان کا عشق دیکھنا ہے تو دیکھیے کس طرح وہ دنیا کی ہر چیز پر ہندوستان کی سرزمین اور ہندوستان کی چیزوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہندوستان کے پھول تمام دنیا کے پھولوں سے بہتر ہیں:

ز گلہای تر ہندوستان ہم — شدہ سرگشتہ باد و بوستان ہم
دگر مادلسری کز طرفہ نامی — برنگ طرفہ مروارید خامی
دگر آن رای چمپا شاہ گلہا — کہ بویش مشکبار آید چو صہبا
چو معشوق سمن برناز پرورد — ولی رنگش چو روی عاشقان زرد

ان پھولوں کو صرف اس لیے کم نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کے نام ہندوستانی ہیں یہ رنگ و بو میں سب سے افضل ہیں:

گل مارا بہ ہندی نام زشت است — وگر نہ ہر گل باغ بہشت است

ہندوستانی کپڑا غیر ملکی کپڑے سے بہتر ہے:

نکو دانند خوبان پری کیش — کہ لطف دیوگیری از کتان بیش

ہندوستانی زبانوں کی صفت میں ان کے شعر پہلے نقل کیے جا چکے ہیں، اب یہاں کے علم وفلسفے اور حکمت کے

بارے میں ان کے خیالات ملاحظہ فرمائیں۔ حالانکہ فلسفے میں روم کا نام لیا جاتا ہے لیکن ہندوستان کی سرزمین بھی حکمت وفلسفے سے معمور ہے۔ یہاں کے برہمن اپنے علم اور دانشمندی میں ارسطو کو مات دیتے ہیں:

گرچہ بہ حکمت سخن از روم شدہ — فلسفہ ز آنجا ہمہ معلوم شدہ
لیک نہ ہند است از آن مایہ تہی — ہست درو یک یک از اندیشہ بہی
برہمنی ہست کہ در علم و خرد — دفتر قانون ارسطو بدرد

پان جو خالص ہندوستانی تہذیب کی علامت ہے خسرو کو جان کی طرح عزیز ہے:

شاہد آنکہ مرد زندگانیست — کہ ذوق برگ خائی ذوق جانیست

خسرو ہندوستان کے آم کو انجیر سے بہتر سمجھتے ہیں اور ان لوگوں پر معترض ہیں جو ایسا نہیں سمجھتے:

وگر کس سوی خود گردد جہت گیر — نغزک مارا ز انجیر

صرف وہ لوگ دجلے اور دریائی نیل کی تعریف کر سکتے ہیں جنھوں نے گنگا کو نہیں دیکھا:

کسی کز گنگ ہندوستان بود دور — ز نیل و دجلہ لافد ہست معذور

ان کے لیے تو ہندوستان ہی کا موسم سب سے اچھا ہے کہ یہاں کا دہقان بار یک کپڑا لپیٹ کر چراگاہ میں اپنے جانور چرا سکتا ہے:

ہندوی دہقان بہ کہن چادر کی — شب بہ چراگاہ بود با بقری
برلب جو ز آب خنک برہمنان — غسل کنند آخر شب غوطہ زنان

اگر ہندوستان کا موسم گرم ہے تو کیا ہوا۔ خراسان کی خنکی اس کے آگے ہیچ ہے کیوں کہ یہ گرمی وفا کی گرمی ہے:

گرچہ درین ملک ہوا ہست گرم — از خنکی ہای خراسان چہ شرم
مہر فلک گرم شد اندر وفاش — گرم از آن گشت جہان را ہوا

اور پھر یہاں کے گندم گوں معشوق تو دنیا میں سب سے زیادہ حسین اور دلربا ہیں ہی: کجا معشوقان ہند اور کجا معشوقان چین و تاتار:

بتان ہند را نسبت ہمین است — کہ ہر یک موی شان صد ملک چین است
چہ یاد آری چپیدہ سرخ رارو ی — چو گلہای خراسان رنگ بی بوی
ازین ہر دو گہر رنگ سبز است — کہ زیب اختران زاو رنگ سبز است

بقول خسرو ہندوستان کے تمام رہنے والے نرم خو، نیک دل، خوش خو، گرم جوش اور فرشتہ صفت ہیں اور اس لائق ہیں کہ ان کو جان سے عزیز رکھا جائے:

مردم از جملہ فرشتہ سرشت — خوشدل و خوشخوی چو اہل بہشت

ہر ہمہ نزدیک دل و گرم خوں   رفتہ چو جان در تن مردم درون

دنیا میں جو بھی علم اور فن ہے ہندوستانی اس سے بدرجۂ وافر بہرہ مند ہیں۔ خسرو اس بات کو سراہتے ہیں کہ اس ملک میں طرح طرح کی نئی نئی زبانیں، مختلف علاقوں میں بولی اور کہی جاتی ہیں اور وہ ان سے متمتع ہوتے ہیں:

ہر طرفی ہند زبان تو است   ریزہ چیں گنتر شان خسرو است

میری نظر میں امیر خسرو کی شاعری کی یہ ایک بہت بڑی خصوصیت ہے کہ انھوں نے اپنی اکثر تصانیف نظم و نثر میں ہندوستان کے متعلق بہت کچھ اور بہت جذبے کے ساتھ لکھا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ان کا کلام نہ صرف عہد خلجی بلکہ اس سے ماقبل اور مابعد کے ہندوستانی معاشرہ کی صحیح اور مستند تاریخ ہے۔

خسرو کی ہندوی شاعری:

ہندوی زبان کے بیسیوں دوہے، کہہ مکرنیاں، پہیلیاں، لطیفے وغیرہ خسرو سے منسوب رہے ہیں جو اب تحقیق کرنے والوں نے معرض شک میں ڈال دیے ہیں۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی ہوں کہ خسرو کی ہندوی شاعری کہاں تک معتبر اور مصدقہ ہے۔ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ممکن ہے اس میں بہت سا کلام خسرو کا نہ ہو لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ خود خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچے میں اپنے ہندوی کلام کی طرف اشارہ کیا ہے اور ایک بیت جس میں فارسی اور ہندی کی آمیزش ہے نقل کی ہے:

آری آری ہمہ پیاری آری   ماری ماری برہ کی ماری آری

اور ایک رباعی یوں لکھی ہے:

رفتم بہ تماشای کنار جوئی   دیدم بلب آب زن ہندوئی
گفتم صنما بہای زلفت چہ بود   فریاد بر آورد کہ دُر دُر موئی

اس سے ہم یہ نتیجہ ضرور نکال سکتے ہیں کہ ممکن ہے بہت سا ہندوی کلام اور دوہے وغیرہ جو خسرو سے منسوب کیے گئے ان کے نہ ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ ہندی میں شعر کہتے تھے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے تحقیق کے بعد اشپرنگر کے نسخے کی رو سے خسرو کی معروف ذولسانی غزل کا انتساب ان سے درست بتایا ہے:

زحال مسکیں مکن تغافل ورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم ای جان نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

اسی طرح خسرو سے منسوب کم سے کم دو دوہے معتبر مانے گئے ہیں اور علی گڑھ سے شائع ہونے والے مجموعہ "جواہر خسروی" میں نقل کیے گئے ہیں:

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرو من پیو کو دوؤ بھئے اک رنگ

گوری سوئے سیج پہ مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چہوں دیس

وحید مرزا کا کہنا ہے کہ جہاں تک پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کا تعلق تھا وہ خسرو کی افتادِ طبع سے خاصی مناسبت رکھتی ہیں کیونکہ خود اعجاز خسروی میں بھی انھوں نے جا بجا لغز و معما وغیرہ قلم بند کیے ہیں اور ہم آسانی سے باور کر سکتے ہیں کہ اس قبیل کی پہیلیاں خسرو نے کہی ہوں گی:

فارسی بولی آئی نہ   ترکی ڈھونڈھی پائی نہ
ہندی بولوں آرسی آئے   خسرو کہے کوئی نہ بتائے

اور

پون چلت وہ دیہ بڑھاوے   جل پیوت وہ جیو گنوائے
ہے وہ پیاری سندر نار   نار نہیں پر ہے وہ نار

بہر حال انتساب درست ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، اس کا ایک بہت بڑا مثبت نتیجہ یہ ضرور برآمد ہوا تھا کہ خسرو کی کہہ مکرنیاں، پہیلیاں، دوہے، ترانے وغیرہ بچے بچے کی زبان پر تھے اور اس زبردست شاعر اور دانشور کو عام ہندوستانی سے نزدیک لانے والے اس کا فارسی کلام نہیں، یہی چیزیں تھیں۔

خسرو اور علم موسیقی:

مطربی می گفت خسرو را کہ ای گنج سخن   علم موسیقی ز گنج نظم نیکوتر بود
پاسخش گفتم کہ من در ہر دو معنی کاملم   ہر دو را سنجیدہ بر وزنی کہ آں بہتر بود

خسرو کے اس قطعے کے بعض اشعار سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ فن موسیقی میں درک رکھتے تھے۔ یوں تو موسیقی میں ان کے ایجادات کے متعلق بہت مبالغہ آمیز اطلاعیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ خسرو موسیقی کا علم رکھتے تھے اور آلات موسیقی سے واقف تھے اس کا اظہار قران السعدین اور نہ سپہر میں ہوتا ہے۔ واجد علی شاہ نے جو خود موسیقی کے ماہر تھے، اپنی تالیف 'صوت المبارک' میں لکھا ہے کہ خسرو نے ہندوستانی موسیقی میں ایک بڑا تغیر پیدا کیا اور ایک نئے اسکول کی بنا ڈالی۔

خسرو کی شخصیت، فکر اور فن کے ہزار پہلوؤں میں سے صرف چند آپ کے سامنے بہت اختصار کے ساتھ پیش کیے جا سکے کہ ان سب کا احاطہ کرنا کسی ایک مقالے میں ممکن ہی نہیں۔ ان کی وہ صلاحیت جو صغر سنی میں ہی نمودار اور نمایاں ہو گئی تھی "دوران صغر سنی کہ دندان می افتاد سخن می گفتم و گوہر از دہانم می ریخت" جب اپنے کمال کو پہنچی تو اس نے اپنا لوہا ہندوستان سے لے کر ایران اور وسط ایشیا تک منوا لیا۔ دولت شاہ ان کو اپنے تذکرہ میں "خاتم الکلام فی آخر الزمان" اور "دُر دریای معانی" کے القاب سے یاد کرتا ہے اور ان کا نام

عصر مورخ ضیاء الدین برنی کہتا ہے:

''اگر استادان نظم ونثر در یک دو فن بی ہمتا بودند، خسرو در جمیع فنون ممتاز و مستغنی بود۔''

اپنے اس تمام علم وفضل اور فارسی دانی کے باوصف خسرو نے اپنی زندگی کے شدید ترین سانحے پر جذبات کا اظہار اپنے ملک کی میٹھی زبان میں کیسے سادہ اور دلدوز انداز میں کیا ہے۔ یہی وہ بلاغت ہے جو ان کو ہندوستانی قاری سے قریب تر لے آتی ہے:

گوری سوئے سیج پہ مکھ پہ ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چھوں دیس

☆☆☆

سیدہ جعیس فاطمہ حسنی*

مولانا جلال الدین رومی حیات وافکار کی روشنی میں

آن سرخ قبائی کہ چو مہ پار برآمد
امسال در این خرقۂ زنگار برآمد
(مولوی)

مولانا محمد جلال الدین رومی کی بین الاقوامی شخصیت خود ان کی عظمت کی غماز ہے۔ آیات الٰہی کا مطالعہ کرنے والے اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ جس کسی نے پیام ربانی کو عوام تک پہنچانے میں بے دریغ کوشش کی خدا نے اس کے نام کو ''ورفعنا لک ذکرک'' کی سند دے دی۔ موصوف کا نام محمد اور لقب جلال الدین تھا۔ نیز خداوندگار کے لقب سے بھی جانے جاتے ہیں۔ اپنے دور حیات میں ہی مولانائی روم اور ملائی روم کے نام سے موسوم تھے۔ نویں صدی تک مولوی کے نام سے معروف نہ تھے۔ جب کہ مثنوی کی ایک بیت میں ''مثنوی معنوی مولوی'' تحریر ہے۔ استاد فروزانفر کا خیال ہے کہ ترجمہ کے دوران رومی کا لفظ بار بار استعمال ہوا اور شاید اسی بنا پر یہ نام زبان زد خاص وعام ہوا۔ مولانا کا تخلص خاموش تھا۔ دیوان شمس میں شعری مناسبت سے لفظ خموش، خاموش، خموشی تخلص باندھا ہے۔ ابیات کے تجزیہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے اپنے دیوان میں ۱۰۱ مرتبہ یا اس سے زیادہ غزلوں میں تخلص کا استعمال کیا ہے، جسے ہم امر اتفاقی نہیں کہہ سکتے یہ ضرور ہے کہ اس کا استعمال صرف مقطع پر منحصر نہیں ہے بلکہ غزل میں کہیں بھی یہ لفظ آ گیا ہے۔ البتہ اکثریت مقطع ہی میں ہے۔

مولانا کی ولادت ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ میں بلخ میں ہوئی اور ۶۱۰ھ میں ترک وطن کر کے نیشاپور آ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے اپنے کو خراسانی کہا ہے۔ رومی یا روم کی نسبت قونیہ میں قیام کی وجہ سے ہوئی۔ آپ کے والد محمد بن حسین خطیبی معروف بہ بہاء الدین ولد اپنے وقت کے جید عالم تھے اور سلطان العلما

* پروفیسر، شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی

کے لقب سے مشہور تھے۔ بہ روایتے فخر الدین رازی کی مخالفت کی بناء پر بغداد و شام آق وار، زنجان وغیرہ غرض شہر شہر دیار دیار کی مسافرت کے بعد علاء الدین کیقباد کی دعوت پر قونیہ پہنچے۔ یہیں پر ۶۲۸ھ میں سلطان العلماء کا انتقال ہوا اور مولانا مرجع خلایق ہو گئے۔ محققین مولانا کی ہجرت کے اسباب فخر الدین رازی سے اختلاف کے بجائے تاتاریوں کے بلوائی حالات پر محول کرتے ہیں کیونکہ رازی کی وفات اور مولانا کی ہجرت کے درمیان چار سال کی مدت کا فاصلہ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ حالات کی ناساعدی رازی کے عہد میں شروع ہوئی ہو اور ان کا سفر چنگیزی حملہ کے بعد پیش آیا ہو کیونکہ چنگیز کا حملہ بلخ پر ۶۱۲ھ میں ہوا تھا۔

اولیاء اللہ اور بزرگان دین کے احوال زندگی میں داستان پردازی کا اتنا دخل ہو جاتا ہے کہ بہت سے واقعات حقیقت سے دور ہو جاتے ہیں۔ غرض روم میں مولانا کی نشست سید برہان الدین محقق ترمذی کے ساتھ رہی۔ ان کے انتقال کے بعد پانچ سال تک رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ چلتا رہا کہ ۶۴۲ھ میں مولانا کی ملاقات شمس الدین تبریزی سے ہوئی۔ چار برس تک مولانا کا ساتھ رہا اور اچانک ان کی زندگی سے شمس غائب ہو گئے اور انھیں قطعی پتہ نہ چلا کہ زمین کھا گئی یا آسمان۔ شمس کی ملاقات نے ان کی زندگی میں جو رنگ بھرا وہ عجیب و غریب تھا۔ ایک لحظہ کے لیے بھی انھیں سکون نہ تھا۔ شمس کی صحبت نے ان کے وجود میں عشق کی وہ گرمی عطا کی کہ مولانا فقیہ سے فقیر میں تبدیل ہو گئے۔ کبھی جذب و بے خودی کا عالم ہوتا تو کبھی سماع کی کیفیت غرض مولوی آتش عشق میں سوزاں پا بہ جولاں نظر آتے۔ شیخ صلاح الدین اور حسام الدین کو شمس کی صحبت کی لذت حاصل تھی وہ ان کے لیے وجد و سماع کی نشستوں کا اہتمام کرتے دھیرے دھیرے مولوی کو اپنے درد کا مداوا شیخ صلاح الدین زرکوب کی شخصیت میں نظر آنے لگا۔ شیخ مذکور ۶۶۲ھ میں فوت ہو گئے۔ ان کی وفات کے بعد مولوی حسام الدین چلپی ان کے مصاحب ہوئے۔ یہ اپنے وقت کے عارف کامل تھے۔ ان کی صحبت کا اثر اس قدر قوی تھا کہ مثنوی جیسی بے بہا کتاب معرفت وجود میں آئی:

ای حیات دل حسام الدین بسی   میل می جوشد بہ قسم سادسی[5]
پیش کش می آرمت ای معنوی   قسم سادس در تمام مثنوی

ای ضیاء الحق حسام الدین بیا   ای صقال روح و سلطان الہدی[6]
مثنوی را مسرح مشروح دہ   صورت امثال او را روح دہ[7]
تا حروفش جملہ عقل و جان شوند   سوی خلدستان جان پران شوند[8]

افکار مولانا مثنوی کی روشنی میں:

احوال سے یہ بات آشکار ہے کہ مولانا ایک موحد، ایک مسلمان، ایک عارف، ایک عاشق، ایک صاحب دل ہیں۔ ان کی روح حق کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ مولانا نے اپنی اس گردانی کی تمام داستان کو بانسری کے حوالے سے مثنوی میں پیش کیا ہے۔ اپنے مرکز سے جدائی کے یہ پرسوز نالے صدائی شکستہ نے بن کر بانسری کی سریلی معنوی لے میں تبدیل ہو گئے۔ اس حقیقت سے بھی آشنا ہیں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب مدارس میں اسلامی تعلیمات کا بول بالا تھا۔ مولوی کے شفیق باپ بھی عارف اور عرفاء کی صحبت بھی انھیں ملی۔ زمانہ کی مادی ضرورتیں محدود اور چنگیزی اقتدار کی سرکشی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ مولوی کی نگاہوں میں روح کے سکون کا سامان یہ پرفریب دنیا نہ تھی۔ سچ تو یہ ہے "اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا عشق" اپنے اس عاشقانہ سفر کی ضرورت، عشق کے اسرار اور حق کی تلاش کو مثنوی کے پیکر میں پیش کیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مولانا کے کلام میں حافظ و سعدی کی شیرینی تو نہیں لیکن مولانا جب عشق و فراق کی گفتگو کرتے ہیں تو بعض اوقات عجیب مزہ آتا ہے۔ مثلاً مثنوی کے ابتدائی اشعار 'نَے' کی تعریف اس کی کیفیت اور سحر کی چیرہ دستیاں قابل غور ہیں۔ نمونے کے طور پر یہاں صرف چند بیت پیش کی جاتی ہیں جس سے ان کی عرفانی کیفیت، قدرت کی کاریگری، آدمی کی خلقت کی تصویر نگاہوں میں پھر جاتی ہے۔ جس قدر فکر کی جاتی ہے لذت میں اضافہ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ تن و دیدہ ساکن ہو جاتے ہیں۔ شاید یہ بھی سر عشق کی ایک منزل ہے؟ جب صرف روح بولتی ہے وہی سنتی ہے اور وہی سمجھتی ہے اور جسم خاموش تماشائی ہوتا ہے۔ ساز بان پر تالے پڑ جاتے ہیں

سرّ من از نالۂ من دور نیست   لیک چشم و گوش را آن نور نیست[9]
تن ز جان و جان ز تن مستور نیست   لیک کس را دید جان دستور نیست[10]
آتش است این بانگ نای و نیست باد   ہر کہ این آتش ندارد نیست باد[11]

زمانہ قدیم سے حیات کی بنیاد چار خلطوں پر تھی سودا، صفرا، بلغم، خون ان میں سے کسی ایک کی کمی یا زیادتی عدم توازن یا ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔ احساسات میں اگر توازن نہ رہا تو سودائی کیفیت وجود میں آ جاتی ہے۔ یہ کیفیت اگر عشق الٰہی سے مربوط ہو تو مولانا اسے "عشق خوش سودا" کہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ جنون انسان کو خود بینی و خود پرستی سے قطع تعلق کے بناء پر حاصل ہوتا ہے اور جب انسان اپنے کو بھول جائے تو نہ خوشی کا احساس ہوگا اور نہ درد کا غم

شاد باش ای عشق خوش سودای ما   ای طبیب جملہ علت ہای ما[12]

سودا کے بعد اگر کوئی چیز عبد و معبود کے درمیانی رشتے کو استوار کرنے میں معاون ہے وہ 'ہوش' ہے

جو حقیقت الٰہیہ کا ادراک حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن اگر یہ ہوش صرف ظاہری علائم کو سمجھنے میں مشغول رہا تو ایسا انسان بے ہوش ہے۔ لیکن یہی 'ہوش' جب معرفت الٰہی اور اسرار ربانی کو حاصل کر لیتا ہے تو باہوش بے ہوش اور بے ہوش باہوش ہو جاتا ہے:

محرم این ہوش جز بی ہوش نیست   مر زبان را مشتری جز گوش نیست [۱۳]

نَے کی ایک صفت یہ ہے کہ نے نواز کے ہونٹوں سے ہٹتے ہی بے صدا ہو جاتی ہے۔ مولانا جو بات یہاں کہنا چاہتے ہیں اگر تفکر کی نگاہوں سے اسے دیکھیں تو دل منقلب ہو جاتا ہے اور ہستی بے مایہ نظر آتی ہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ یہ زندگی نہیں بلکہ موت ہے۔ مولانا کی مثنوی کا مرکزی خیال یہی ہے۔ بانسری میں نغمۂ حیات ارتعاش بس اسی وقت ہوتا ہے جب وہ نے نواز کے ہونٹوں سے لگی ہوئی ہو ورنہ نہ نالے ہیں نہ سوز نہ صدائیں ہیں نہ جادو اگر ہزار آوازیں نکل بھی جائیں تو یہ حقیقی نغمہ نہیں ہے۔

با لب دمساز خود گر جفتمی   ہمچو نی من گفتنی ہا گفتمی [۱۴]

ہر کہ او از ہم زبانی شد جدا   بی زبان شد گرچہ دارد صد نوا

شارحین نے اس شعر کو وحدت وجود پر محمول کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حیات مادی حجاب ہے۔ لیکن عشق واقعی ایک ایسا وسیلہ ہے جو خدا و بندہ کو ملا دیتا ہے۔

اصطلاح موسیقی میں پردہ نغمہ کی چند صورتوں اور آہنگوں کا نام ہے۔ ستار میں بھی پردہ کا استعمال Motes کے لیے ہوتا ہے۔ اگر 'نے' کو درمیان سے چیر کر دیکھیں تو اس میں بھی قدرتی پردے ہوتے ہیں۔ جب اس میں ہوا پھونکی جاتی ہے تو ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ ہر طرح کی نَے کو ذہن میں رکھیے تو اس ترکیب کا استعمال مولانا کی خیال انگیزی کی نمایاں تصویر پیش کرتا ہے جو بہ یک وقت احساس کی ترجمانی بھی ہے اور جمالیات کا جوہر بھی۔ اس شعر میں جو لطافت ہے وہ یہ ہے کہ گویا نَے میں روح کا واقعہ رونما ہوا تو گنگناتے ہوئے پٹکے میں نہ صرف یہ کہ حرکت پیدا ہوئی بلکہ جہاں کوئی لَے نہ تھی رحمت الٰہیہ سے رقیق لہو رگوں کے پردوں میں دوڑنے لگا۔ بقول مولانا وہ ہوا نہیں ہے وہ آگ ہے۔ وہ شعلہ رنگ خون اس میں حرارت ہوتی ہے اور وہی حیات کی ضمانت ہے۔ غرض جس قدر شرح کرتے جائیں معنی میں وسعت پیدا ہوگی بلکہ روح یہ وہ شعلۂ جوالہ ہے جو جسم میں دوڑ رہی ہے کبھی خود حجاب تو کبھی باعث حجاب میں، کبھی ہلکی سی عشق کی گرمی ملنے پر سیکڑوں حجابات کو اٹھا دیتی ہے۔ یہ عشق ہی ہے کہ علامت کی پردہ دری کرتا ہے اور پھر حجاب حقیقت سے آشنا پردہ کے استعمال میں مولانا کی چابکدستی قابل ستائش ہے:

نی حریف ہر کہ از یاری برید   پردہ ہایش پردہ ہای ما درید [۱۵]

خداوند عالم نے انسان کو مختلف قوتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ قوت شہوانیہ، غضبیہ، سبعیہ اور

واہمہ یہ مادی طاقتیں ہیں اور انسان ان کا مطیع ہے۔ مولانا ان تمام قوتوں کو عقل جزوی سے تعبیر کرتے ہیں:

عقل جزوی آفتش وہم ست و ظن   زانکہ در ظلمات شد او را وطن

لیکن مولانا کی نظر خدا کی ودیعت کردہ ایک اور قوت پر تھی جسے قوۂ عاقلہ کہتے ہیں:

عقل کامل را قرین کن با خرد   تا کہ باز آید خرد زان خوی بد [۱۶]

شادی اندر گردہ و غم در جگر   عقل چون شمعی درون مغز سر [۱۷]

مولانا جس معاشرہ اور سماج کے خواہش مند ہیں وہ وہی سماج ہے جو اسی نظام کا پابند ہے اس کے اصول و قواعد بھی وہی ہیں جو قرآنی ہیں۔ مثلاً عشق، نیت، عمل صالح، ہادی کی ضرورت، فکر، ذکر، ریاضت۔

نیت:

مولانا عاشق ہیں اور ان کی نگاہ عشق میں معشوق کے علاوہ کوئی اور نہیں، عاشق کی نیت معشوق کی فکر خوشی ہے اور اس خلوص کی بنا پر کوئی عمل رضائی محبوب کے خلاف سرزد نہ ہوگا۔ ابن عباس سے مروی ہے نیز رازی (فخرالدین) نے بھی اپنی تفسیر میں اس کا ذکر کیا ہے کہ جناب رسالت مآب نے فرمایا "لاہواک مولاک حیث نہاک۔ تمہارا رب تم کو وہاں پر نہ دیکھے جہاں سے روکا ہے۔ اس ضمن میں مولانا کا آئیڈیل امیرالمومنین حضرت علیؑ ہیں۔

از علی آموز اخلاص عمل [۱۸]   شیر حق را دان مطہر از دغل

یہی ایمان کی منزل ہے اور یہی تقوٰی کی معراج ہے۔

پیر:

راہ سلوک میں چلنے والوں کو ایک ہادی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ ہادی ہی جو اپنے پیروؤں کو آزادی و نجات دلا سکتا ہے۔

زین سبب پیغمبر با اجتہاد   نام خود و آن علی مولا نہاد [۱۹]

گفت ہر کاو را منم مولا و دوست   ابن عم من علی مولای اوست [۲۰]

کیست مولا آن کہ آزادت کند   بند رقیت ز پایت بر کند [۲۱]

اس روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ معیار کبھی بدلتا نہیں مادی زندگی کے لیے بھی ایسے رہنما کا انتخاب کریں جو خلوص نیت سے کام لے تبھی ملک ترقی کر سکتا ہے۔ آج روحانی اور مادی دونوں زندگیوں میں بحران اس لیے ہے کہ راہبر و راہگیر دونوں کی نیتوں میں خلوص نہیں ہے۔

آپ فرماتے ہیں ہر زمانے کے لیے لازم ہے کہ مرید پیر کو اپنا راہنما سمجھے اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلے۔ یہ عمل محض تسلیم و بندگی سے حاصل ہوتا ہے۔ اس میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہوتی اتنا ہی نہیں بلکہ فرماتے ہیں پیر کا سایہ ذکر حق سے افضل ہے:

سایہ رہبر بہ است از ذکر حق   یک قناعت بہ کہ صد موت و طبق[۲۲]
چو گرفتی پیر ہن تسلیم شد   ہمچو موسیٰ زیر حکم خضر رو
صبر کن برکار خضری بی نفاق   تا نگوید خضر رو ہذا فراق

مولوی اس حقیقت سے آشنا تھے کہ مرشد نما فرقہ پرور پیروں سے دنیا بھری ہے اور ایک ناواقف کے لیے اس کی شناخت مشکل ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ خدمت کرو اور پہچان لو کہ آیا وہ رضائی دوست کا طالب ہے یا رضائی نفس کا۔ اگر اسے دوست سے محبت ہے تو پیر ہے اگر اپنے آپ سے محبت ہے تو وہ نفس کا طالب ہے اور نفس کا خواہاں کبھی پیر نہیں ہوتا۔

آن یکی را روی شد آن سوی دوست   وآن یکی را روی او خود روی اوست

روی ہر یک می نگر می دار پاس   بوکہ گردی تو ز خدمت روشناس

مولانا نے اس کلیہ کو اپنی مثنوی میں پیش کرکے آنے والی نسلوں کو روشناس کرایا کہ ہر عہد میں مرشد کی شناخت یہی ہوگی۔

فکر و ذکر:

معرفت الٰہیہ کے حصول کے لیے انسان کو فکر کرنا چاہیے۔ تفکر یعنی "خضوع" غور و خوض کرو منزل تمہارا انتظار کر رہی ہے لیکن اگر فکر کام نہ کرے تو ذکر کرو کیونکہ ذکر سے فکر میں جلا پیدا ہوتی ہے۔ درحقیقت معرفت کے یہ مرحلے ہیں۔

این قدر گفتیم باقی فکر کن   فکر اگر جامد شود رو ذکر کن
ذکر آرد فکر را در اہتزاز   ذکر را خورشید این افسردہ ساز

ذکر کے مختلف معنی ہیں۔ قرآن میں آیا 'الا بہ **ذکر اللہ تطمئن القلوب، ورفعنا لک ذکرک** وغیرہ۔ اور رسول نے فرمایا ذکر سے مراد محمد و آل محمد ہیں غرض ذکر یاد پروردگار ہے ذکر یاد انبیا ہے ذکر یاد اولیا ہے۔ جس کی نظر ایسے شاہد پر ہوگی وہ معشوق مجازی کی تلاش کیوں کرے؟

عمل پیہم:

مولانا کی تعلیم عمل پیہم کا پیام ہے۔ سستی و کاہلی کا ان کے یہاں کوئی دخل نہیں منزل مقصود تک

پہنچنے کے لیے انسان کو فعال ہونا ہوگا اور حوصلہ ہونا چاہیے تب وہ بڑے سے بڑا کام کر سکتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اگر تھوڑی تھوڑی بھی مٹی کھودے گا تو کنواں کھد جائے گا:

کاری کن تو بگوش آن مباش   اندک اندک خاک چہ رامی تراش

ریاضت:

مولوی انسان کو اس مقام پر لے جانا چاہتے ہیں جو کمال انسانیت ہے اس ضمن میں کوشش اور مجاہدہ بہت ضروری ہے۔ مرشد یا پیر تو صرف ایک رابطہ ہے لازم نہیں کہ پیر تک پہنچنے کے بعد بھی منزل مقصود تک رسائی ہو۔

بر سر گنج از گدائی مردہ ام   زانکہ اندر غفلت و در پردہ ام

دنیا مجموعۂ اضداد ہے اس نے ہمیں اس دنیای حیرت میں بھیج دیا طرح طرح کے اشیا فراہم کیں کہیں ظاہری فوائد تو کہیں باطنی ایسے میں در مقصود حاصل کرنا کتنا مشکل تھا۔ ایسے میں اس کی نظر **ھو معکم اینما کنتم** پر ہونا چاہیے۔ لیکن اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ وہ برائیوں میں بھی ہمارے ساتھ ہے بلکہ اگر یہ نہ ہوتیں تو خیر و شر کی تمیز نہ ہوتی۔ اگر وہ نہ ہوتا تو ہماری حفاظت کرنے والا اور توفیق خیر عطا کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ اس نے گمراہیوں کے بیچ بیچ ایمان کا راستہ معین کیا ہے۔ بس انسان کی نظر مقصد حیات اور بازگشت پر ہونی چاہیے کیونکہ اس نے ہمیں عبث نہیں پیدا کیا۔ یہ اسی وقت حاصل ہوگا جب ریاضت نفس پر زور دیا جائے۔ نفاق، حسد، بخل، جھوٹ، غرور، حسد، شہوت یہ وہ چیزیں ہیں جو انسان کو نیکی کے راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ اس کی یہ حالت اس لیے ہے کہ اس نے مجاہدہ نہیں کیا یعنی برائیوں کو چھوڑنے اور نیکی کو اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی۔

خاصہ چند این شیر ہا را کوفتہ   گرد ہا از درگہ او ناروفتہ
اجتہاد گرم نا کردہ کہ تا   دل شود صاف و ببیند ماجرا[۲۳]

توبۃ النصوح پر بھی ان کی نظر ہے۔ یہ تمام تعلیمیں ہر مذہب میں موجود ہیں۔ مولانا کا کمال ان کا انداز نصیحت ہے۔ انھوں نے مثنوی میں جو چاشنی بھری ہے وہ ان کی داستان گوئی ہے۔ انھوں نے قرآنی فلسفہ اور عرفانی تعلیم کے لیے داستان کو ذریعۂ ابلاغ بنایا اور اپنا پیغام ہر کس و ناکس تک پہنچایا۔ یہاں نمونۃً اختصار کے ساتھ ایک داستان کا ذکر کرتی ہوں جس میں موصوف نفس کی طہارت، ظاہری پاکیزگی اور تزکیۂ قلب کا درس دیتے ہیں اور یہ پیغام انھیں پائیں ترین طبقہ تک پہنچاتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے جوڑے سے متعلق ہے جو ہم خواب تھے۔ شوہر فوراً اٹھ کر نماز پڑھنے لگا۔ زن و شوہر کے درمیان اس مکالمہ کا ذکر سوئے ادب ہے لیکن داستان گو کا کمال یہ ہے کہ اس نے درس طہارت کو اپنے معاشرہ کے ذہنوں میں بٹھا دیا ہوگا۔

موت:

مومن کے لیے یہ دنیا قید خانہ ہے۔ موت سامان رہائی ہے۔ مولانا نے اپنے کلام میں جا بجا اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ موت سے وہ ہراساں نہیں ہیں۔ یہ سچ ہے جسے وصال حق نصیب ہو وہ موت سے کیا ڈرے؟ انھیں معاد پر پورا یقین ہے۔ سزا و جزا کے قائل ہیں۔

تو مکن تہدیدم از کشتن کہ من تشنۂ زارم بہ خون خویشتن
آزمودم مرگ من در زندگی ست چون رہم زین زندگی پایندگی ست

جسے ہم موت کہتے ہیں وہ عرفا کے یہاں فنا فی اللہ، وصال، وفات (یعنی وعدہ کو پورا کرنا) اور رحلت ہے۔ مرگ ظاہری دار آخرت تک پہنچنے کا راستہ:

مرگ پیش از مرگ این است ای فتی این چنین فرمود ما را مصطفی
نی چنان مرگی کہ در گوری روی مرگ تبدیلی کہ در سوری روی

یہاں مولانا نے جوانوں کو خطاب کیا ہے۔ مولانا کی مثنوی کی شہرت کا راز یہی ہے کہ انھوں نے کسی دین کی تبلیغ نہیں کی ہے بلکہ زندگی کے رموز بتا دیے ہیں اور یہی اس کی آفاقیت ہے۔ فرق اتنا ہے کہ خود مولانا کی تعلیم اسلامی تھی۔

اصل مجاہدہ اور ریاضت نفس کشی ہے جب اس کی موت واقع ہوتی ہے تو یہ انسان قتیل راہ خدا ہوتا پھر وہ کلام ربانی کی تفسیر بنتا ہے۔ لاتقولو لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولا کن لا تشعرون۔

خلاصۂ کلام ان مراحل سے گزرنے کے بعد ہی انسان عارف کامل ہوتا ہے۔ قرآن میں تین طرح کے انسانوں کا ذکر ہے۔ چوپایہ، درندہ اور عارف چوپایہ دنیا میں آیا کھایا پیا بچے پیدا ہوئے، لوگوں کو اس کی ذات سے فائدہ ہوا، اور چلا گیا۔ درندہ خود زیستی و خود پرستی کا شکار رہا معاشرہ پر ستم کو روا رکھا اور چلا گیا۔ عارف حق نے عشق الٰہی میں نفس کشی کی اور سب بھولتا کر ملا یکہ سے آگے نکل گیا اور اتنا آگے گیا کہ قاب قوسین او ادنیٰ کی منزل پر پہنچ گیا:

جان شرع و جان تقوی عارفست معرفت محصول زہد سالف است
زہد اندر کاشتن کوشیدن است معرفت آن کشت را روئیدن است[۲۴]

انھوں نے تمام دنیا کے انسانوں کو رنگ و نسل مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر درس انسانیت دیا۔ ایک مقام پر ہندوؤں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں تم جنگل کے راہبہ ہو تم ایک چوپایہ کی دم سے اپنے آپ کو باندھے ہوئے ہو۔ وہ ایک مقام پر دعا کرتے ہیں پالنے والے مجھے ایسا مذہب عطا کر جس میں دس فرقے

نہ ہوں۔ ہندوستان میں مولانا ایک ایسے مفکر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں جس میں اشراقیہ و افرییہ کی کیفیت چھپی ہے۔ وہ خالق و مخلوق یا عاشق و معشوق کی وحدت کے قائل ہیں اس کے لیے انسان کو انسان بننا ہوگا۔ تبھی یہ وحدت ظہور پذیر ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ مولوی ایک ایسا مبلغ انسانیت ہے جسے اس دنیائی آب و گل میں انسان کامل نہ ملا اور وہ اس کی تلاش میں سرگرداں اپنی تی کے سر بلے نغموں میں اسی انسان کی آرزو کرتا ہے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر از دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

حواشی:

۱- فروزانفر، ص۳
۲- ایضاً، ص۴
۳- نفحات الانس، ص۴۶۱
۴- فروزانفر
۵- مثنوی معنوی ۱/۳۰۱
۶، ۷، ۸- ایضاً، ۶/۸۳، ۸۴، ۸۵
۹- ایضاً، ۱/۷
۱۰- ایضاً، ۱/۸
۱۱- ایضاً، ۱/۹
۱۲- ایضاً، ۱/۲۳
۱۳- ایضاً، ۱/۱۲
۱۵- ایضاً، ۱/۲۷-۲۸
۱۶- ایضاً، ۱/۱۱
۱۷- ایضاً
۱۸-
۱۹-
۲۰- ۶/۳۳۸
۲۱- ۲/۵۳۹
۲۲- ۶/۲۵۳۰
۲۳- ایضاً، ۶/۳۷۸۳
۲۴- ایضاً، ۳/۳۰۶۳-۳۰۶۵
۲۵- ۶/۲۰۹۱

☆☆☆

شمیم اختر*

بنارس میں فارسی ادب

شہر بنارس جسے کعبہ ہند بھی کہتے ہیں اپنی تاریخی قدامت کے ساتھ متمدن شہروں میں شمار کیا جاتا ہے جس کا ذکر ہم تاریخ بنارس کی کتابوں نیز بنارس گزیٹیر وغیرہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ ایک انگریز مؤرخ مارک ٹوائین لکھتا ہے۔

> Banaras is older than history, older than tradition , older than legend and looks twice as old as all of them put togather.

مولانا عبدالسلام نعمانی غفراللہ نے اپنی کتاب آثار بنارس میں اس شہر مقدس کے سلسلے میں تحریر کیا ہے کہ اسلامی ہندوستان سے پہلے کے دور میں ان علاقوں کو بڑی مرکزیت حاصل تھی۔ بنارس اور سارناتھ کے علاقے میں بدھ مت کی قدیم یادگاریں اور وہیار (یعنی تعلیمی خانقاہیں) تھیں۔

آگے ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "تقریباً ایک ہزار سال پہلے عہد اسلامی میں جب ابوریحان البیرونی مشہور سیاح نے ہندوستان میں قدم رکھا تو کاشی کی عظمت کے چرچے تھے اور اس نے یہاں سالہا سال قیام کرنے کے بعد مختلف علوم اور سنسکرت زبان کو سیکھا۔ البیرونی نے یہاں کی زبان کے متعلق لکھا ہے کہ ہندی خط بائیں طرف سے چلتا ہے" [1]

بنارس کی تعلیمی مرکزیت کی دلیل میں ایک چینی سیاح ہیون سانگ کے حوالے سے ہی موصوف نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں ۶۳۰ صدی عیسوی قبل مسیح سے ۶۴۳ قبل مسیح یعنی تقریباً چودہ سال ہندوستان میں قیام کیا جب بنارس پہنچا تو یہاں کی تہذیب وتمدن کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ یہاں کی علمی وادبی فضا

---

* پروفیسر، شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

کے بیان میں گزیٹیر کے الفاظ ہیں:

> He was stuck by the devotion to learning of the people of varansi.

مختصر یہ کہ بنارس اپنی قدیم تہذیب وتمدن اور مذہبی علوم کے ساتھ ساتھ سائنس ودیگر علوم مثلاً علم طب، نجوم، فلسفہ کے علاوہ سنسکرت زبان وادب کا بھی مرکز رہا ہے۔ ایک متمدن شہر ہونے کے سبب بیرونی ممالک سے تجارتی تعلقات بھی زمانہ قدیم سے رہے ہیں۔ لہٰذا قبل از اسلام بنارس کے تجارتی تعلقات عربوں کے ساتھ بھی قائم تھے جس کا تفصیلی جائزہ تاریخی کتب سے لیا جاسکتا ہے۔ تجارتی قافلوں کی آمد ورفت سے سنسکرت اور عربی زبانوں میں اختلاط پیدا ہوا اور سنسکرت کے متعدد الفاظ کم وبیش رد وبدل کے ساتھ عربی زبان میں داخل ہوگئے مثلاً قلفل، کافور، زنجبیل، صندل، نارجیل، قرنفل، جائفل وغیرہ۔ نیز سرزمین ہند کی نسبت سے متعدد الفاظ جیسے عود ہندی، تمر ہندی، قسط ہندی، وغیرہ اور یہی الفاظ فارسی زبان میں بھی داخل ہوئے۔ قبل از اسلام عربی اور ہندی زبانوں کے تعلق کے بعد ادبی لحاظ سے ہم دیکھیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبل از اسلام عرب تاجروں کے ذریعہ ادبی تعلقات بھی قائم ہوئے۔ عربوں کے ذریعہ ہی ہندوستان میں خط آرامی کا رواج بھی ہوا۔

بعد از اسلام دین اسلام کی اشاعت اور تبلیغ کے لئے فتوحات کا سلسلہ جاری ہوا۔ عرب وایران کی فتوحات کے بعد مسلمانوں نے ہندوستان کا رخ کیا۔ شام، فارس، وسط ایشیا، چین، مصر، اسپین وغیرہ ممالک خلفائے عرب کے زیر سلطنت ہونے کے بعد ہندوستان میں سندھ اور پنجاب ان کے زیر نگیں ہوگیا مگر یہ علاقے زیادہ عرصہ تک ان کے ماتحت نہ رہے اور آزاد ہوگئے۔ اور ہندوستان پر ان کے اثرات بھی دیر تک قائم نہ رہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد نے ایک نئے باب کا آغاز کیا اور ہندوستان ایک نئی تہذیب وتمدن سے آشنا ہوا۔ لنکا، مالدیپ، مالابار، کارومنڈل، گجرات، بمبئی اور سندھ کے ساحلی علاقوں پر مسلم آبادیاں قائم ہوگئیں۔ مولانا موصوف لکھتے ہیں:

> "گو اس زمانے کے ہندو آج کے مقابلہ میں بہت کٹر تھے، لیکن آپس میں میل جول سے ان میں بڑے خوشگوار تعلقات پیدا ہوئے ایک دوسرے کے قدیم تہذیب وتمدن اور علم وفن سے آگاہ ہونے کا موقع ملا۔ بلخ کے نو بہار (بدھ کی تعلیمی خانقاہ) کے پجاری برمک نے اسلام قبول کرلیا اور عباسی خلفاء کے دربار میں

۱۳۶ھ سے ۱۸۶ھ تک وزرات کے اہم عہدوں پر فائز رہے"۔ [۲]

انھیں کی تحریک سے سنسکرت سے عربی تراجم کا باقاعدہ آغاز ہوا اور سنسکرت میں موجود مختلف علوم کی کتابیں مثلاً مہابھارت، اصول شاستر، فلسفہ، نجوم ہیئت، جوتش، جفر، رمل، موسیقی، کیمیا، منطق اور اخلاقی قصے کہانیوں کی کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں کیا گیا۔ جو بعد میں فارسی زبان میں منتقل کی گئیں۔

سلاطین غزنویہ کے حملوں نے شمالی ہند میں ایک نئے باب کی شروعات کی۔ انھیں کے عہد سے شمالی ہند میں مسلم آبادیوں کا مستقل قیام ہوا اور ایک نئی تہذیب وتمدن اور زبان وادب نے جنم لیا۔ جس میں اہم ترین کارنامہ احمد نیالتگین کے اہم کار سید سالار مسعود غازی نے انجام دیا۔ سید سالار مسعود غازی کے رفیق کار ملک افضل علوی نے بنارس میں قیام کیا اور یہیں تبلیغی کاموں میں مصروف رہے۔ اس طرح بنارس جو شمالی ہند کا ایک بڑا حصہ ہے مسلمانوں کے زیر نگیں آ گیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ دہلی کے راجہ جے چند اور پرتھوی راج کے مابین نزاع پیدا ہوا اور جے چند نے ۱۱۹۴ء میں سلطان شہاب الدین غوری کو اپنی کمک کی دعوت دی۔ شہاب الدین غوری نے اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ہندوستان کے مختلف علاقوں کے ساتھ بنارس پر قابض ہونے کے بعد ہندوؤں کے اس مقدس مذہبی شہر کو مکمل طور پر مسلمانوں کے زیر حکومت کر لیا۔ غوری نے ۱۱۹۴ء میں سید جمال الدین کو بنارس کا صوبہ دار مقرر کیا۔

اس طرح بنارس کے صوبہ داروں کی تقرری مسلم حکمرانوں کے تحت آ گئی۔ شاہ غیاث الدین بلبن کے عہد میں حاجی محمد ادریس حاکم بنارس مقرر ہوئے۔ موصوف کا دور بنارس کی علمی وتہذیبی وتعمیری نظر اور خصوصاً فارسی زبان وادب کی ترویج وترقی کے لحاظ سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اسی زمانہ میں بنارس میں فارسی ادب کی مستقل بنیاد قائم ہوئی۔ مولانا مفتی عبدالسلام نعمانی آثار بنارس کے ص ۵۰ پر رقم طراز ہیں کہ حاجی محمد ادریس ایک زندہ دل اور علم دوست شخص تھے۔ موصوف نے اپنے فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد شیراز بغرض سیاحت گئے اور وہاں انھوں نے شیخ سعدی سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ حاجی ادریس شیخ سعدی کی شہرۂ آفاق کتاب گلستان و بوستان اور کریما کی نقل بنارس لے کر آئے اور یہیں اولین باران کتابوں کو پڑھنے اور پڑھانے کا رواج ہوا۔ موصوف لکھتے ہیں کہ یہ شرف بھی صرف بنارس ہی کو حاصل ہوا کہ بنارس کے اس علم دوست حاکم کی بدولت ہندوستان کے تمام مدرسوں میں یہ کتابیں داخل نصاب ہوئیں۔ مولانا مفتی عبدالسلام نے نسخۂ مذکور کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ گلستان کا یہ قلمی نسخہ سید مہدی حسن صاحب تحصیلدار بنارس نے تقریباً ۶۰۰ سال کے بعد ۱۸۴۸ء میں نواب علی ابراہیم خان بہادر جج سابق بنارس کے قلمی کتب خانہ میں ان کے نواسے نواب عنایت حسین کے ذریعہ سے دیکھا تھا۔ [۳]

۱۲۱۰ء میں سلطان التمش کے عہد تک ہندوستان میں فارسی پڑھنے پڑھانے کا رواج عام ہو گیا تھا

مگر یہ صدق ہے کہ موصوف نے یہ نسخہ خود دیکھا تھا نیز حاجی ادریس مرحوم کے عہد سے پہلے ہی فارسی زبان وادب کا رواج قائم ہو چکا تھا۔

سلاطین شرقی کے عہد میں شہر جونپور آباد ہوا نیز اپنے علمی وادبی کارناموں اور سرگرمیوں کے سبب شیراز ہند کے نام سے شہرت حاصل کی۔ مگر اس عہد میں بنارس کی علمی وادبی سرگرمیوں کے سلسلہ میں کوئی اہم اور خاص بات کا ذکر نہیں ملتا۔ تاہم قرین قیاس یہ ہے کہ اس وقت بھی علمی سرگرمیاں مفقود نہ رہی ہوں گی۔

عہد بعہد مسلم حکمرانوں کی تقرری اس بات کا بین ثبوت ہے کہ فارسی زبان وادب کا رواج برابر قائم رہا ہوگا حتی کہ عہد اکبری میں یعنی ۱۵۸۹ء میں مرزا عبدالرحیم خان خاناں جونپور اور بنارس کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ خان خاناں ایک علم دوست اور علم پرور شخص تھا۔ بنارس بھی اس کے فیض سے مستفیض رہا۔ اسی دور کی ایک شخصیت تمسی داس ہو جو نہ صرف ہندی وسنسکرت بلکہ فارسی کے بھی زبردست دانشور تھے۔

تمسی داس کے فارسی زبان وادب سے تعلق کی ایک بڑی مثال یہ ہے کہ ٹوڈرمل متوطین اکبر کے انتقال کے بعد ان کے بیٹوں اور پوتوں میں موروثی جائداد کو لے کر نزاع پیدا ہوا تو تمسی داس اس مقدمے کے فیصلے کے لئے حاکم مقرر کیے گئے۔ تمسی داس نے یہ فیصلہ فارسی زبان میں تحریر کیا۔ جس کی چند سطریں آثار بنارس کے حوالے سے ذیل میں نقل ہیں۔

اللہ اکبر

چون آنند رام بن ٹوڈرمل بن دیو رائے و کنڈھی بن رام بھدر بن
ٹوڈر در حضور آمدہ در موضع مترو کہ تفصیل آن در ہند مذکور است
بالمشافہ و بتراضی جانبین قرار دادیم یک صد و پنجاہ زمین زیادہ
.... در موضع بھدینی آنند رام مذکور و کنڈھی بن رام بھدر تجویز
نمودہ بدین معنی راضی گشتہ .... مہر کردہ

سعداللہ

اس عہد کے سرکاری دستاویز وفرامین فارسی زبان میں آج بھی جنگم باڑی مٹھ وغیرہ میں موجود ہیں بعض کاغذات راقم الحروف نے خود دیکھا ہے۔ ہمایوں بادشاہ اور دیگر شاہان مغلیہ کے فرامین تو فارسی زبان میں ہی لکھے جاتے تھے حتی کہ ہندو حکمرانوں نے بھی فارسی زبان کو ہی ذریعۂ خواندہ نوشت قرار دیا۔ اگر ان تمام دستاویزوں اور فرامین کو یکجا کر کے بالاستیعاب ان کا مطالعہ کیا جائے تو گمان غالب یہ ہے کہ بنارس کی تاریخ کچھ اور ہی موڑ لے سکتی ہے نیز یہاں کی گنگا جمنی تہذیب وتمدن کا نیا نقشہ سامنے آ سکتا ہے۔ علاوہ بریں قابل ذکر یہ ہے کہ مسلم شعرا وادبا نے جس قدر فارسی زبان وادب کی خدمات انجام دی

ہندوؤں نے بھی فارسی کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور سنسکرت کے مختلف علوم وفنون، افسانہ، طب، موسیقی، حساب، اور علم نجوم کی کتابوں کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ نیز اپنی مقدس کتابوں کے ترجمے بھی سنسکرت زبان سے فارسی زبان میں کئے۔ یہ ادبی فضا دارا شکوہ اور ابوالفضل کی بنارس میں آمد اور قیام سے بھی واضح ہے اور شیخ علی حزیں کی بنارس میں آمد اور قیام تک اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ جاری وساری تھی۔ بنارس کے فرمان رواؤں نے بھی فارسی ادب کی خدمت میں کوئی فروگزاشت نہیں رکھی چنانچہ حزیں کے دلدادگان میں ہر مذہب وملت کے لوگ شامل تھے، جن میں یہاں کے فرمان روا راجہ چیت سنگھ کی شخصیت امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔ خود راجہ بلونت سنگھ حزیں کے قدر دانوں میں تھے۔ اکثر ملنے حزیں کی قیام گاہ پر جاتے تھے۔ راجہ مذکور کی حزیں سے انتہائی عقیدت اور ارادت کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے بیٹے اور وارث چیت سنگھ کو صغر سنی سے ہی حزیں کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے۔

حزیں کے بنارس میں قیام کے دوران علم وادب کے شائقین خود ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ حزیں سے بنارس میں آکر ملنے والوں میں تذکرہ خوش گو کے مؤلف بندرابن داس خوش گو بھی تھے۔

خوشگو نے اپنی تالیف سفینۂ خوشگو میں حزیں کی ملاقات کا ذکر حسب ذیل الفاظ میں کیا۔

''چون فقیر بسعادت حضور سیرت فرشتہ دید بہ آب وگل رحمت سرشتہ وعشق الٰہی سراپایش یکدل دردآلود آفریدہ وخیلی مرد بزرگ دردمند گداختہ از خود ومیدہ بنظر آمدہ بتقریب این شعر خودی خواند۔

فریب زندگانی خوردہ ناکامیست می دانم

درین خواب آنچہ بتوان دید آرامیست می دانم

تذکرہ نویسی فارسی در ہند وپاکستان میں ڈاکٹر علی رضا نقوی نے اسپرنگر کے حوالے سے خوشگو کو بنارس کے بنیا اقوام سے ہونا لکھا ہے۔ اگرچہ موصوف نے دیگر حوالہ جات سے خوشگو کے اہل بنارس ہونے کی تردید بھی کی ہے۔ مگر یہ مصدقہ حقیقت ہے کہ خوشگو کا اکثر بنارس میں قیام رہا۔ خان آرزو نے اپنے تذکرے مجمع النفائس میں تحریر کیا ہے کہ: ''خوشگو در عظیم آباد وبنارس زندگی می کرد۔''

ڈاکٹر علی رضا نقوی کے الفاظ میں: ''خوشگو بعد از ترک دنیا اول در الہ آباد و بنارس و عظیم آباد بسر می برد۔''

مذکورہ اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ خوشگو نے بنارس آکر نہ صرف شیخ علی حزیں سے ملاقات کی بلکہ اکثر قیام پذیر بھی ہوتے تھے اور شعر وشاعری کے چرچے بھی ہوتے تھے نیز اپنے علمی مشاغل میں بھی مصروف رہتے تھے۔

حاکم لاہوری:

بنارس آکر حزیں سے ملاقات کرنے والوں میں ملا عبدالحکیم حاکم لاہوری بھی تھے۔ موصوف نے

دومرتبہ بنارس آکر شیخ علی حزیں سے ملاقات کی اور اپنے تذکرہ ''مردم دیدہ'' میں اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ:

''در بنارس فرو بخشی دارد ودر لباس فقیری امیرانہ می گذراند''

نورالعین واقف:

بٹالہ کے قاضی زادہ نورالعین واقف نے بھی بنارس آکر حزیں سے ملاقات کی، اکثر تذکرہ نویسوں نے ان کی ملاقات کا نہایت دلچسپ انداز میں ذکر کیا ہے۔ واقف جب حزیں کی ملاقات کو گئے تو اس وقت اتفاقاً دروازہ پر کوئی دربان نہ تھا اور واقف براہ راست اندر داخل ہوگئے۔ حزیں کو ناگوار خاطر گذرا انھوں نے دریافت کیا ''از کجا آمدی'' واقف نے جواب دیا ''از بٹالہ'' بٹالہ کا نام سن کر حزیں کا غصہ کچھ کم ہوا تو انھوں نے دریافت کیا ''از واقف واقف ہستی'' واقف نے جواب دیا ''واقفم'' حزیں جواب سنکر بہت محظوظ ہوئے اور کھڑے ہو کر بغل گیر ہوئے۔

راجہ جسونت سنگھ پروانہ:

راجہ جسونت سنگھ متخلص بہ پروانہ۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد میں منصب داری کے عہدہ پر فائز تھے۔ شعر وسخن کا اچھا سلیقہ تھا اکثر علماء وفضلا وشعراء کے ساتھ صحبت رہتی تھی۔ حزیں سے ملنے کا شوق ہوا جا کر حاضری کی اجازت چاہی۔ حزیں نے کہلا بھیجا۔ دراین بزم ہو نیست بیگانہ را پروانہ جو کاکا کے نام سے بھی شہرت رکھتے تھے برجستہ جواب میں کہلا بھیجا:

کہ پروانگی داد پروانہ را

حزیں کو ان کا برجستہ جواب بہت پسند آیا اور انھوں نے بلوالیا۔ اور نہایت خلوص سے پیش آئے۔

حزیں سے نواب شجاع الدولہ شاہ عالم اور مسٹر ریمونڈ وغیرہ نے بھی ملاقات کی جنکا تفصیلی ذکر نہ ممکن ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے نہ مقصد۔ فقط بنارس میں فارسی ادب کی وہ بہار دیکھنا مقصود ہے جس سے لطف اندوز ہونے کے لئے شائقین شعروادب بنارس آتے اور محظوظ ہوتے تھے۔

حزیں کے معاصرین میں ملا سابق بنارسی کا نام بہت اہم ہے۔

ملا محمد عمر سابق:

ملا محمد عمر متخلص بہ سابق بنارسی کی ولادت مرزا پور کے قصبہ کنتت میں ہوئی۔ ان کا ننہال ضلع بنارس میں تھا۔ شہر بنارس کے محلہ کتوا پورہ میں اپنے تعمیر کردہ مکان میں سکونت پذیر تھے۔ تکمیل علوم دہلی میں کی۔ دہلی میں پانچ سال تک رہ کر علم منطق، حکمت، ریاضی، فقہ تفسیر اور علم بیان اور معانی کی تعلیم

حاصل کی۔ دہلی میں ہی موصوف نے خان آرزو سے ملاقات کی اور ان کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ بنارس واپسی کے بعد شیخ علی حزیں سے ملاقات کی اور رفتہ رفتہ یہ ملاقات تعلق میں تبدیل ہو گئی۔ موصوف شعر و شاعری میں اچھا سلیقہ رکھتے تھے۔ حزیں سے باوجود ارتباط خاص کے ملا صاحب اپنی جودت طبع دکھانے میں پیچھے نہ تھے بلکہ وہ حزیں پر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اہل ہند ایرانی شعراء سے کسی طرح کم نہیں، چنانچہ حزیں جب اپنا کوئی کلام انکو سناتے تو ملا صاحب بھی برجستہ غزل کہہ کر سناتے۔ حزیں نے ایک مرتبہ اپنی غزل سنائی جسکا مطلع حسب ذیل ہے۔

ای وائی بر اسیری کز یاد رفتہ باشد
در دام اندی باشد صیاد رفتہ باشد

ملا صاحب نے حزیں کی زمین میں سات شعر پر مشتمل غزل کہہ کر سنائی جس کا مطلع ہے:

جانش چنان بہ حسرت ناشاد رفتہ باشد
کز ہجر بردل او بیداد رفتہ باشد

اور مقطع کا شعر ہے:

سابق بسوز آورد این مصرعہ حزینم
در دام جان سپارد صیاد رفتہ باشد

ملا موصوف کی غزل سن کر حزیں پھڑک اٹھے۔ افسوس کہ موصوف کا دیوان دستیاب نہیں ہے۔

مخلص بنارسی:

اسیر الحق نام، اسد اللہ لقب اور مخلص تخلص تھا۔ ایک بلند پایہ شاعر اور خدا رسیدہ صوفی شخص کا شمار شرفائے بنارس میں ہوتا تھا۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ ایسی قد آور ادبی اور مذہبی شخصیت کے سلسلے میں اکثر تذکرہ نویس خاموش ہیں۔ تلاش بسیار کے بعد جن تذکروں میں ان کا ذکر ملتا ہے وہ درج ذیل ہیں:

١۔ سمات الاخیار — مؤلفہ حضرت محبوب الحق
٢۔ سفینۂ خوشگو — مؤلفہ بندرابن خوشگو
٣۔ گل رعنا — مؤلفہ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی
٤۔ صحف ابراہیم — مؤلفہ ابراہیم خلیل

لیکن موصوف کے سنہ ولادت اور وفات کے سلسلے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ صحف ابراہیم میں ابراہیم خلیل نے فقط اس قدر لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ از فاروقی زادگان بنارس بود ___ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی اور بندرابن داس خوشگو کے بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مخلص ١١١٦ھ میں بنارس میں زندگی بسر کرتے تھے۔

خوشگو کے مطابق مخلص نے تین چار شعر خود اپنے دست مبارک سے بندرابن داس خوشگو کو ان کے تذکرے کے لئے عطا کئے تھے اگرچہ قطعی طور پر یہ تاریخ صحیح نہیں قرار دی جا سکتی کیوں کہ خود فاضل مؤلف کے مطابق تذکرے کی تالیف ١١٣٧ھ میں شروع ہو کر ١١٤٨ھ میں اختتام پذیر ہوئی۔ اور مخلص کا سفینۂ خوشگو کے لیے ٢١ سال قبل بالمشافہ اشعار دینا قابل فہم معلوم نہیں ہوتا۔ ممکن ہے مخلص نے خوشگو کو کسی ملاقات کے دوران اشعار دیے ہوں۔ جسے انھوں نے اپنے تذکرے میں شامل کر لیا ہو تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ١١١٦ھ تک مخلص بنارسی کو فن شعر گوئی میں شہرت حاصل ہو چکی ہو۔

صحف ابراہیم کے مؤلف ابراہیم خلیل نے لکھا ہے کہ "اسد بنارسی در زمان فردوس آرام گاہ می زیست"۔ اسد بنارسی سے مراد مخلص بنارسی ہے۔ (مخلص کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ جو دار المصنفین اعظم گڑھ میں موجود ہے اس کے آخری صفحہ پر اسد اللہ لکھا ہوا ہے) ان بیانات سے یہ ثابت نہیں کہ اس وقت مخلص کی عمر شریف کیا رہی ہوگی۔ مگر موصوف کے ایک شعر سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے تقریباً سو سال سے زائد اس جہان رنگ و بو میں زندگی بسر کی ہوگی۔ شعر حسب ذیل ہے۔

ای کہ ز طول اہل صد سالہ رہا می کنم
این بنای خشت برباد نفس بنیم ما

حضرت محبوب الحق نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ از عمدۂ آن دیار است و صاحب جوہر و اقتدار در علم تصوف صاحب تصانیف است۔ جملے کے آخر الذکر حصے سے یہ ظاہر ہے کہ مخلص نے علم تصوف میں بھی کئی کتابیں لکھی تھیں۔ نیز دیگر علوم پر بھی مہارت حاصل تھی خود موصوف نے ایک شعر میں کہا ہے۔

بہ علم و فضل مشو غرہ معرفت اندوز
ز بند ہستی موہوم خود رہا می باش

مخلص بنارسی کی حیات اور خانوادہ کے سلسلہ میں زیادہ معلومات فراہم نہ ہو سکیں۔ حضرت محبوب الحق نے اپنے تذکرے میں معیار الشعراء میں تحریر کیا ہے کہ "باوجود تاہل دلش مجرد و با ہمہ علائق منفرد" اس ضمن میں خود مخلص کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

از تجرد ہوسی است مرا بال و پر قفسی است مرا

حضرت قمر الحق خانقاہ رشیدیہ کے تیسرے سجادہ نشین تھے۔ مخلص بنارسی اور حضرت قمر الحق کے مابین پیری اور مرشدی کا رشتہ تھا دونوں حضرات کے مابین خاطر تعلق کی توضیح مختلف واقعات سے ہوتی ہے۔ مخلص بنارسی نے تقریباً ١٣٨ اشعار پر مشتمل ایک منظوم شجرہ بھی کہا ہے۔ شجرہ مذکور کا ایک شعر بطور نمونہ پیش خدمت ہے۔

صرف شد عمرم در این آوارگی
از تو خواہم چارۂ بیچارگی

خانوادۂ حضرت قمر الحق سے مخلص بناری کو والہانہ عشق تھا چنانچہ حضرت قمر الحق کے پوتے اور شاہ فصیح الدین کے بیٹے نور الحق جو بعد میں خانقاہ رشیدیہ جونپور کے چوتھے سجادہ نشین ہوئے کی شادی خانہ آبادی کے موقع پر تاریخ ازدواج کہی۔ یہ منظوم تاریخ نو اشعار پر مشتمل سمات الاخیار میں درج ہے جس کا ایک شعر ہے۔

عروس سال بہ نمود این جبین چہر
کہ تابان باشد از ہمین مہ و مہر

مخلص کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں اکثر تذکرہ نویسوں کی زبان خاموش ہے لیکن ان کے کلام کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ موصوف عربی اور فارسی زبانوں کے علاوہ دیگر مروجہ علوم میں مہارت رکھتے تھے نیز ان کے شاگردوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ خود محبوب الحق نے ایک جگہ پر اپنی شاگردی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ:

این فقیر است از انوار او و فیض بایان ونگاہ احسان او۔ منت اور اانبار است۔ ۱۱۷۶ھ میں حضرت قمر الحق کے وصال کے بعد محبوب الحق نے مخلص بناری کی شاگردی اختیار کی۔ ان کے ہی بیان سے یہ بھی واضح ہے کہ مخلص نے علاوہ بر علم تصوف دیگر علوم پر بھی رسالے لکھے جواب ناپید ہیں۔ لیکن ان کی شعر گوئی میں مہارت مسلم ہے۔ جس کا اعتراف نہ صرف تذکرہ نگاروں نے کیا ہے بلکہ راقم الحروف کو مخلص بناری کے ایک قلمی دیوان کا نسخہ دار المصنفین اعظم گڑھ کے کتب خانے میں دستیاب ہوا ہے۔

جس کی فوٹو کاپی میرے پاس موجود ہے۔ اگر چہ یہ دیوان کتاب خانہ مذکور کی فہرست میں شامل نہیں ہے۔

دیوان مخلص تقریباً چھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ جس میں غزلوں کی تعداد ۶۳۹ ہے نیز ۵ رباعیات بھی شامل ہیں۔ ایک منظوم شجرہ سلسلہ قادریہ چشتیہ نیز نو اشعار پر مشتمل ایک تاریخ بھی موجود ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ مخلص کا کوئی دوسرا دیوان بھی رہا ہوگا۔ کیوں کہ بعض اشعار جو دیگر جگہوں میں پائے جاتے ہیں ان کے دیوان میں شامل نہیں ہیں۔ مخلص اپنے دوسرے دیوان ترتیب دیگر حافظ شیرازی کی نذر کرنا چاہتے تھے جو ان کے درج ذیل شعر سے ظاہر ہے۔

رشتہ طول امل تافتہ آرم مخلص
کہ بہ شیراز کنم دفتر دیوان دیگر

لیکن ان کی یہ خواہش پایۂ تکمیل کو پہنچی یا نہیں معلوم نہ ہو سکا۔ مخلص نے حزیںؔ کے علاوہ حافظ اور دیگر اساتذہ کی زمین میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ جس کا ذکر کسی دوسرے موقع پر کیا جائے گا۔

لالہ متھن لال آفریں:

متھن لال نام آفریں تخلص قوم کایستھ سے تعلق رکھتے تھے۔ متھن لعل نے ایک طویل مثنوی کاشی استت کے نام سے فارسی زبان میں بنارس میں ہی لکھی۔ موصوف کی حیات کے سلسلہ میں بہت کم معلومات فراہم ہو سکیں۔ مثنوی کاشی استت کا ایک مطبوعہ نسخہ راقم الحروف کو بنارس ہندو یونیورسٹی میں واقع میوزیم کلا بھون کے کتب خانہ میں دستیاب ہوا۔ یہ مثنوی کتاب تحفۃ الاحباب کے حاشیہ پر موجود ہے۔ کتاب مذکور کے مصنف منشی چشیشر پرساد متخلص دارد متوطن بنارس ہیں۔ انھوں نے لالہ متھن لعل کی حیات کے بارے میں تفصیلی ذکر نہیں کیا وہ لکھتے ہیں کہ۔

''افصح الفصحا'' ، ابلغ البلغا مرکز کیاست ، معدن دانائی وفراست ، شاعر شیرین زبان ، ناظم فصاحت بیان موجد سخن بائی نوین۔ نیز لکھتے ہیں۔

اگر مجمل حال کاشی کا دیکھنا ہو تو مثنوی لاجواب سحر انتساب مجموعۂ فصاحت وبلاغت مسمی ''کاشی استت تصنیف شاعر بے مثال فخر شعرای ماضی وحال لالہ متھن لعل متوفی متخلص با آفریں جو اس کتاب کے حاشیہ پر ہے ملاحظہ فرمائیں۔

مثنوی کاشی استت در حقیقت یہاں کی تہذیب وتمدن ، مختلف ہندو مذاہب واقوام رسم ورواج مثلا رسم ستی ، سادھوؤں ، جوگیوں ، مندر وتالاب ہندوؤں کے تیوہار ہولی دیوالی ، باغ وبستان حتی کہ گلی کوچوں کا بھی نہایت عقیدت کے ساتھ دلکش انداز میں بیان ہے۔ مثنوی مذکور تقریباً ایک ہزار آٹھ ۱۰۰۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ دو چار اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

نگارستان کاشی سیر کردم
طواف ہر مقام و دیر کردم

آغاز مثنوی میں شہر بنارس کا وصف اس طرح کیا ہے:

بہ......... بتکدۂ لامکان آن کہ نمود این ہمہ نام و نشان
بانگ نخست جرس آن مقام کن فیکون پردہ کش خاص و عام

ذوالفقار علی مست

صاحب تذکرہ ریاض الوفاق ذوالفقار علی مست کا شمار بنارس کے شرفا اور ادبا میں کیا جاتا ہے

اگر چہ موصوف کے حالات زندگی کے سلسلہ میں عام طور پر ذکر نہیں ملتا تاہم ''قاموس الاعلام'' کے حوالہ سے ڈاکٹر عبدالرسول خیام پور نے لکھا ہے کہ:

''وی از شعرای متاخر ھندوستان بودومست تخلص می کرد''

ڈاکٹر علی رضا نقوی نے تذکرہ نویسی فارسی در ھندو پاکستان کے صفحہ ۵۱۴ پر تذکرہ مذکور کے مؤلف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ کتاب ۱۲۲۹ھ میں بنارس میں لکھی گئی۔ اس تذکرہ میں بنارس و کلکتہ کے تقریباً ایک سو بیالیس ۱۴۲ رشاعروں کا ذکر ہے جو فارسی اور اردو زبانوں میں اشعار کہتے تھے۔ مؤلف نے تذکرہ ریاض الوفاق میں تقریباً ۳۴ رایسے شاعروں کا ذکر کیا ہے جنکا تعلق بنارس سے تھا یا پھر بیرون شہر سے آکر بنارس میں قیام پذیر ہوکر فارسی ادب کی خدمات انجام دیتے رہے اور یہیں سپرد خاک ہو گئے۔ ان میں بعض صاحب دیوان بھی تھے۔

مست خود بھی فن شعر گوئی میں طبع سلیم رکھتے تھے۔ انھوں نے شعر گوئی کے علاوہ دیگر موضوعات پر کتابیں بھی لکھیں جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ دبستان حقوق، در اخلاق
۲۔ انتخاب نسخہ طیبہ ابواب جنان
۳۔ مجموعہ غزلیات از نام ''باغ و بہار'' بیاض نوطرز
۴۔ تحفۃ المبتدی۔ در فن انشاء
۵۔ نگارستان نظائر
۶۔ رسالہ در سبک شعرائے متقدمین و معاصرین
۷۔ بہارستان ضمائر۔ مجموعہ اشعار مؤلف
۸۔ لطف سخن۔ در شرح اقسام سخن۔ (شعر)
۹۔ نیرنگ ظہور۔ ہندؤں کے مختلف طبقات و اقوام

شعرائے مذکور کے علاوہ بنارس میں آکر مقیم شاعروں، نثر نگاروں، مؤرخوں اور تذکرہ نگاروں میں صحف ابراہیم کے مؤلف علی ابراہیم خان خلیل کا نام سرفہرست ہے۔

علی ابراہیم خان:

نام علی ابراہیم خان تخلص خلیل اور لقب نواب امین الدولہ خان بہادر ناصر جنگ ہے۔ بارھویں سلسلہ سے ان کا نسب شیخ شمس الدین فریادرس لودی سے ملتا ہے۔ انکے والد کا نام خواجہ عبدالحکیم تھا۔ صغرسنی میں شفقت پدری سے محروم ہو گئے۔ موصوف کی کفالت وتعلیم وتربیت داؤد علی خان عرف ذاکر حسین خان

نے کی۔ علی ابراہیم خان کی شاعرانہ طبیعت بچپن سے ہی ظاہر ہو چکی تھی اور کم سنی میں ہی نعت ومنقبت ومرثیے کے اشعار کہنے لگے تھے۔

۱۱۶۱ھ میں داؤد علی خان نے زیارت اور حج بیت اللہ شریف کے ارادہ سے سامان سفر کیا اور اپنے تخلص دوست ناظم بنگالہ علی وردی خان مہابت جنگ سے بغرض ملاقات کلکتہ گئے وہ ابراہیم خان کو بھی ہمراہ لے گئے، اور انھیں علی وردی خان کے سپرد کیا۔ اس طرح ابراہیم خان خلیل نے مرشد آباد میں اپنی تعلیم مکمل کی۔

۱۱۶۱ھ میں جب انگریزوں نے ناظم بنگال میر جعفر کو معزول کر کے مسند نظامت پر میر قاسم کو بٹھایا تو نواب میر قاسم نے ابراہیم خلیل کو اپنے دربار میں مختلف عہدوں پر مامور کیا اسطرح نواب میر قاسم علی خان کے مشیر کار رہے پھر بہار کی صوبہ داری بھی عطا ہوئی نیز نائب ناظم کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ نواب میر قاسم، نواب شجاع الدولہ، نواب مظفر جنگ۔ اور مبارک الدولہ وغیرہ کے ساتھ مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ اس عرصہ میں بھی موصوف اپنے علمی مشاغل میں مصروف رہے۔

۱۱۹۵ھ میں ابراہیم خلیل کے تخلص دوست گورنر جنرل لارڈ میکفرسن اپنے ہمراہ ابراہیم خلیل کو نواب آصف الدولہ بہادر کے حضور لے گئے اور موصوف کو نواب مذکور سے متعارف کرایا۔ نواب آصف الدولہ ایک جوہر شناس شخص تھے انھوں نے ابراہیم خلیل کی قدردانی میں خلعت فاخرہ عطا کیا۔ ۱۱۹۶ھ میں شاہ عالم نے موصوف کو ایک جاگیر عطا کی نیز امین الدولہ عزیز الملک نصیر جنگ کے لقب سے نوازا۔

۱۲۹۱ھ میں لارڈ ہسنگز کی پیش نہاد پر کمپنی مشرقی ہند کی طرف سے ضلع بنارس کی عہدہ عدلیہ کی خدمات پر مامور ہوئے۔ لارڈ کارنوالس کے عہد میں بنارس کے گورنر منتخب کیے گئے۔ سرزمین بنارس میں سرکاری عہدوں پر فائز رہنے کے عرصہ میں بھی ابراہیم خلیل تصنیف وتالیف میں مصروف رہے۔ موصوف نے بیش بہا گراں قدر تالیفات خلاصۃ الکلام، صحف ابراہیم اور گلزار ابراہیم لکھ کر بنارس کے فارسی ادب میں اضافہ کیا۔

صحف ابراہیم:

علی ابراہیم خلیل نے ۱۲۰۵ھ میں بنارس میں صحف ابراہیم کی تالیف کی۔ علی رضا نقوی صفحہ ۱۷۷ پر لکھتے ہیں کہ اس وقت موصوف کی عمر شریف ستر ہ سال کی تھی۔ علی ابراہیم خلیل نے صحف ابراہیم کے دیباچہ میں سبب تالیف تحریر کیا ہے۔ کتاب مذکور میں تقریباً دو ہزار دو سو اٹھتر شعراء علماء فضلاء وعرفا کا ذکر ہے نیز سلاطین ووزراء کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو تاریخی نقطہ نگاہ سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ تذکرے کا آغاز ابویزید بسطامی سے ہوکر ملا یگانہ بخی پر ختم ہوتا ہے۔ توضیح مطالب کے لیے اشعار بھی درج کیے گئے ہیں۔

تذکرہ گلزار ابراہیم:

اس تذکرے کی تالیف ۱۱۹۸ھ میں مکمل ہوئی مولف نے تقریباً تین سو اردو گو شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ تذکرہ فارسی زبان میں ہونے کے سبب بنارس کے فارسی ادب میں بیش بہا اضافہ ہے۔

تذکرہ خلاصۃ الکلام:

اس تذکرے کی تالیف علی ابراہیم خلیل نے عہد شاہ عالم یعنی ۱۱۸۷ھ میں شروع کی اور ۱۱۹۸ھ میں تذکرہ اختتام پذیر ہوا۔ تذکرہ خلاصۃ الکلام تقریباً ۸۷ شاعروں کے احوال و اشعار پر مشتمل ہے۔ تذکرے کی ترتیب الف بائے کی گئی ہے۔ تذکرہ اسدی طوسی کے احوال و اشعار سے شروع ہوکر "جمال الدین ضمیری" پر ختم ہوتا ہے۔ جلد دوم "ملا طغرائی مشہدی" سے شروع ہوکر یحییٰ کاشی پر تمام ہوتا ہے۔

علاوہ بر این موصوف کا ایک اردو دیوان بھی ہے ان کی دیگر تصانیف میں وقائع جنگ مرہٹہ ایک رسالہ حاکم بنارس راجہ چیت سنگھ کے احوال و شورشوں کے ضمن میں ہے۔

اس طرح بنارس میں فارسی شعر و ادب کا سلسلہ عہد بہ عہد جاری رہا۔ وقت نے کروٹ بدلی اور فارسی کی جگہ اردو زبان نے لے لی۔ تاہم یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوا اور بنارس میں غالب کی آمد تک اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ جاری رہا۔ یہی سبب ہے کہ غالب نے مثنوی "چراغ دیر" فارسی کہی۔

شعراء بنارس نے اشعار کہے، لغات اور تاریخی کتابیں لکھی گئیں (فرہنگ آنند راج اسی زمانے کی تصنیف ہے) خط و کتابت کا سلسلہ بھی فارسی میں جاری رہا۔ یہ تمام حقائق مستقل تحقیق کا موضوع ہیں۔ میں مرزا محمد حسن فائز کو صاحب دیوان شعراء کی آخری کڑی قرار دیتی ہوں۔

مرزا محمد حسن فائز:

مرزا محمد حسن فائز بنارسی کے مورث اعلیٰ مرزا میرک ولایتی اصفہان سے بسلسلہ ملازمت ہندوستان آئے۔ ان کے ہی سلسلے سے مرزا انوازش حسین محمد شاہ کے عہد میں بھاگل پور (صوبۂ بہار) آئے جہاں بادشاہ کی جانب سے انہیں جاگیرداری عطا ہوئی۔ موصوف ایک مشاق سپاہی تھے اور سپہ گرہ کے عہدے پر فائز تھے۔ مرزا انوازش حسین کا خانوادہ کسی سبب بھاگل پور سے بنارس منتقل ہوگیا۔ مولوی الطاف حسین راہا مرزا محمد حسن فائز کے والد اسی خانوادے سے تھے۔

مرزا محمد حسن فائز کی ولادت ۱۳رشعبان ۱۲۷۱ھ کو محلہ شوالہ میں ہوئی۔ ان کے تاریخی نام "مرزا ثابت علی" اور "آغا قایم حسن" تھے۔ مرزا محمد فائز کے والد جناب الطاف حسین راہا خود عربی اور فارسی زبانوں کے عالم تھے نیز فن شاعری کا بھی اچھا سلیقہ رکھتے تھے۔ انھیں ذاکر بنارسی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

فائز نے عربی و فارسی کی تعلیم اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں ہی حاصل کی۔ صغر سنی سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد فائز کو معاشی تنگی کا سامنا کرنا پڑا اور فکر معاش دامن گیر ہوئی۔ چنانچہ بنارس کے ہی مختلف اسکولوں میں تدریسی کی خدمات انجام دیتے رہے۔ مئوسس بنارس ہندو یونیورسٹی مدن مالوی جی کی نگاہ دوررس نے فارسی، عربی کی تعلیم کے لئے موصوف سے بہتر کسی کو نہیں پایا اس طرح ۱۹۱۸ء میں بنارس ہندو یونیورسٹی میں صدر شعبۂ فارسی، عربی اور اردو لیکچر کی حیثیت سے ان کو منتخب کیا اور ۱۹۲۹ء تک شعبہ کی صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ موصوف کو علمی مشاغل کے علاوہ دوسرا کوئی شغل پسند نہ تھا۔ یہ صرف عربی اور اردو فارسی کی درسی کتابوں کے استاد نہ تھے بلکہ اخلاقی درس میں بھی خاصی دلچسپی تھی۔ دوران درس فائز طلبا کو عمدہ اشعار حسب موقع سنا کر لیکچر کو دلچسپ بنا دیتے تھے۔ فارسی انگریزی یا انگریزی سے فارسی زبان کے ترجمے کے وقت اہل زبان کا دھوکہ ہوتا تھا۔

موصوف کی پہلودار شخصیت وضع قطع، خوراک، خوش مزاجی، وطن پرستی وغیرہ حالات کے دلچسپ قصے بیان کیے جاتے ہیں۔ آخری عمر میں کئی زبردست صدمات برداشت کرنے پڑے اور تقریباً چار روز سخت علالت میں مبتلا رہ کر ۱۳رمئی ۱۹۲۹ء کو جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

فائز بنارسی کی قدر و منزلت نہ صرف اہل بنارس کے دل میں تھی بلکہ انکی شاعری اور طرح دار شخصیت کے چرچے بیرون شہر بھی تھے۔ نوابین حیدر آباد و رام پور اور لکھنؤ نے انھیں اپنے یہاں بلانا چاہا مگر فائز حزیں کے وطن ثانی کو چھوڑ کر کیسے جاتے۔ بنارس سے ان کی محبت دامن گیر تھی چنانچہ کسی موقع پر فرمایا:

محروم سیاحت فلکم کرد بعالم
گنگی ز بنارس عرب ما عجم ما
فائز کو ملی روشنی طبع ازل سے
تا شمع بنارس میں جلے قبر حزیں پر

فائز بنارسی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ انکا اردو دیوان مطبوعہ از نام "تاب سخنور" اور غیر مطبوعہ فارسی کلام "چمنستان عجم" موجود ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ یہ دیوان انکے نواسے کے پاس موجود ہے۔ "چمنستان عجم" دراصل موصوف کے کلام کا انتخاب ہے۔ جس میں ۲۸ غزلیں ایک تضمین اور ایک مسدس کے چھ بند ہیں۔ غزلوں میں سب سے طویل غزل ۲۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مختصر دیوان میں اشعار کی کل تعداد تین سو باون ۳۵۲ ہے۔ فائز بنارسی کے کلام کے مطالعے سے یہ واضح ہے کہ وہ سبک ہندی کے دلدادہ تھے۔ امیر خسرو، مرزا قتیل، امیر مینائی، وغیرہ کی زمین میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ زبان میں سلاست، روانی، دلکشی بھی کچھ موجود ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار حسب ذیل ہیں:

دل خود گرفت و زلف دو تارا بہانہ ساخت
دست کرم چست حتارا بہانہ ساخت
فائز لب از لب تو نبرداشت تا سحر
در لطف بوسہ رسم وفارا بہانہ ساخت

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شہر بنارس دورِ وسطیٰ میں ہندوستان کا ایک ایسا شہر تھا جس نے فارسی کے فروغ اور نشر و اشاعت میں ایک انتہائی اہم رول ادا کیا ہے۔ حزین جیسے نازک دماغ اور تند خو شاعر کو اس شہر کی علمی اور ادبی فضا ایسی بھائی تھی کہ انھوں نے آخر عمر تک یہیں قیام کرنا پسند کیا اور آج بھی وہاں ان کا مزار فارسی دوستوں کا مرجع ہے۔

زبان دان محبت بودہ ام دیگر نمیدانم
ہمین دانم کہ گوش از دوست پیغام شنید اینجا

ماضی قریب میں بھی بنارس نے غالب جیسے شاعر کو ایسا مسحور کیا کہ ان کی مثنوی 'چراغِ دیر' فارسی شاعری کے دلکش نمونوں میں شمار کی جاتی ہے۔

☆☆☆

سید محمد عزیز حسین ہمدانی*

فارسی ادب اور ۱۸۵۷ء۔ ایک تاریخی جائزہ

میں تو عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کا طالب علم ہوں اور ۱۸۵۷ء جدید دور کے مورخین کا میدان ہے۔ لیکن میرے دوست اے جی نورانی سپریم کورٹ آف انڈیا میں وکیل ہیں اور جدید ہندوستان کی تاریخ کے ماہر ہیں، نے مجھے ۲۰۰۰ء میں مشورہ دیا کہ ۲۰۰۷ء میں ۱۸۵۷ء کی ۱۵۰ ویں سالگرہ ہوگی اور ۱۸۵۷ء سے متعلق اردو اور فارسی زبان میں کثیر تعداد میں دستاویزات نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی میں محفوظ ہیں، ان پر میں کام کروں۔ ان کے مشورہ کے مطابق میں آرکائیوز گیا اور وہاں

Imperial Record Department, Press List of Mutiny Pages of 1857, Being a collection of the correspondance of the mutineers at Delhi, reports of English offcials and other miscellaneous papers, Calcutta, 1921.

کا مطالعہ کیا تو حیرت میں رہ گیا کہ ۱۸۵۷ء پر اس قدر مواد فارسی اور اردو میں موجود ہے۔ تیرہویں صدی عیسوی سے ۱۸۴۱ء تک سرکاری زبان فارسی رہی۔ لیکن تعجب اس بات پر ہوا کہ ان فارسی دستاویزات کا مطالعہ کیے بغیر ۱۸۵۷ء پر کتابیں لکھ دی گئیں۔ ۱۸۵۷ء سے متعلق دستاویزات کا مطالعہ عہدِ وسطیٰ کے مورخین نے اس لیے نہیں کیا کہ یہ ان کا میدان نہ تھا اور جدید دور کے مورخین فارسی سے واقف نہ تھے اور یہ ایسے ہی پڑے رہے۔ بقول شاعر ان کے ساتھ بھی وہی ہوا :

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

ہم ان دستاویزات کا مطالعہ ۲۰۰۶ء تک نہ کر سکے جب کہ سر سید احمد خان نے ۱۸۵۷ء پر دو کتابیں سرکشی

* پروفیسر، شعبۂ تاریخ و ثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ضلع بجنور اور اسباب بغاوت ہند ۱۸۶۰ء میں ہی لکھ کر شائع کرا دیں۔ مسلم تہذیب وثقافت کی حفاظت کی ذمہ داری آزاد ہندوستان میں دو اداروں پر رہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ جہاں تاریخ، فارسی اور اسلامک اسٹڈیز کے شعبے بھی ہیں۔ ۱۹۵۷ء میں جب ہندوستان نے ۱۸۵۷ء کی سوویں سالگرہ منائی گئی تب ہم نے ایسا پروجیکٹ کیوں نہیں بنایا کہ ۱۸۵۷ء پر جو مواد فارسی زبان میں ہے اس پر کام ہوتا تا کہ جب ہم ۱۵۰ ویں سالگرہ منانے جا رہے ہیں تو ایک کام سامنے ہوتا۔

تاریخ سے متعلق فارسی ماخذ کی تدوین وتراجم کا کام بھی انگریزوں نے کیا۔ آزاد ہندوستان میں اس طرح کا کام بہت کم ہوا۔ اب ۱۸۵۷ء پر فارسی دستاویزات پر پہلا کام
William Dalrymple- The Last Mughal. The fall of a dynesty Delhi, 1857
میں شائع ہو کر سامنے آیا اور اس طرح کا کوئی کام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، سینٹرل یونیورسٹی حیدرآباد وغیرہ میں سے کسی استاد نے نہیں کیا۔ ویسے تو ہر شخص کو ہر جگہ کی تاریخ لکھنے کی آزادی ہے لیکن کیا آزاد ہندوستان میں بھی ہماری تاریخ پر پہل یوروپین مورخین ہی کرتے رہیں گے۔ اور ہم صرف ان کی کتابوں کا جائزہ ہی لیتے رہیں گے۔ یہ ہمارے لیے ایک بڑا چیلنج ہے۔ اسی کے ساتھ میں ولیم ڈالریمپل کو ان کو اس کارنامہ پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

میں ۱۸۵۷ء سے متعلق فارسی اور اردو دستاویزات پر کام کر رہا ہوں۔ اب معلوم ہوا کہ کس قدر مواد ہے، خود نیشنل آرکائیوز میں تیس ہزار دستاویزات ہیں۔ اتر پردیش آرکائیوز لکھنؤ اور الہ آباد میں ہزاروں دستاویزات ہیں۔ اسی طرح اسٹیٹ آرکائیوز، پٹنہ، بھوپال، راجستھان، ہریانہ، رضا لائبریری رامپور، نیشنل لائبریری کلکتہ، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، ہردیال لائبریری۔ حسن نظامی کلکشن اور اضلاع کے مال خانوں میں بہت دستاویزات موجود ہیں۔ ہم تو ۱۸۵۷ء کے ۱۵۰ سال گزرنے تک اس کا ایک Index یا lilst Press بھی تیار نہ کر سکے۔ اسی کے ساتھ روزنامچے، تذکرے، رقعات فارسی واردو شعراء کا کلام جنھوں نے اس دور میں ۱۸۵۷ء سے متعلق اپنے احساسات کو نثر ونظم کی صورت میں پیش کیا تھا۔ ان کو پڑھ کر احساس ہوا کہ

شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب ناز میں

بہادر لال برہمن نے ایک کتاب فارسی زبان میں ۱۸۵۷ کے غدر سے متعلق لکھی۔ اوضاع سیاسی ہند در ۱۸۵۷ء یہ ایک ضخیم کتاب ہے جس میں ۱۸۵۷ کے حالات کو قلم بند کیا ہے۔ اور بہت سی معلومات اس کتاب میں ایسی ملتی ہیں جس کا تذکرہ دوسری تاریخوں میں نہیں ملتا۔ لیکن بہادر لال برہمن کا جھکاؤ

انگریزوں کی طرف تھا اور وہ ان ہندوستانیوں کے خلاف نظر آتے ہیں کہ جنھوں نے انگریزوں کی مخالفت کی لہٰذا اس طرح اس فارسی ماخذ کی بڑی اہمیت ہے کہ یہ کچھ ہندوستانیوں کی ذہنیت کی عکاسی کر رہی ہے۔

اسی طرح منشی دیبی پرشاد بشاش کی کتاب تذکرہ شعرائے ہند میں بہت سے ایسے شعرا کا تذکرہ ہے جو اس دور میں تھے لیکن مجھے ان کے کلام کو پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ اسی طرح بہت سے ایسے شعراء ہیں جن کو ۱۸۵۷ کی شکست کے بعد انگریزوں نے شہید کر دیا۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے کچھ لکھا ہی ہوگا جس کی بنا پر انھیں شہید کر دیا گیا۔ جن میں مرزا آغا خان دہلوی، مرزا احمد بیگ دہلوی، نواب مظفر حسین خاں فرخ آبادی سعید، مولانا امام بخش صہبائی دہلوی، نواب شیر علی خاں مرادآبادی عاجز، منشی اکرام الدین دہلوی، میر مجنوں علی فیض آبادی، پیر جی شرف الحق دہلوی وغیرہ وغیرہ۔ ہمیں ان شعراء کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیے تب ہی ہم طے کر سکیں گے کہ انگریزوں نے انھیں کیوں شہید کر دیا۔ اس لیے کہ غازی محمد امین امروہوی نے ایک مثنوی ۱۸۵۷ کے حالات سے متعلق لکھی تھی ان کے خاندان کے لوگوں نے اس مثنوی کے اوراق کو اپنے مختلف رشتہ داروں میں اس لیے بانٹ دیا تھا کہ اگر یہ مثنوی انگریزوں کو مل جائے تو وہ اس سے اس کا مطلب نہ نکال سکیں۔ کیونکہ یہ مثنوی مجھے پڑھنے کو نہیں ملی اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ فارسی زبان میں تھی یا اردو میں۔ اسی طرح شاہ عبدالعزیز، مولوی لیاقت علی الہ آبادی، مولوی پیر علی خاں، عظیم آبادی، مولوی عبدالجلیل کولوی نے انگریزوں کے خلاف جہاد کے لیے فتوے جاری کیے ان میں زیادہ فتاوی فارسی زبان میں تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جاری اخبارات دہلی اردو اخبار، یہ دہلی کا پہلا اخبار تھا جو ۳۷-۱۸۳۶ء میں جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر مولانا محمد باقر، مولانا محمد حسین آزاد کے والد۔ مولانا محمد باقر کو بھی انگریزوں نے پھانسی دے دی۔ دوسرا صادق الاخبار تھا اس کے ایڈیٹر شیخ امداد حسین تھے تیسرا سراج الاخبار تھا جو فارسی زبان میں شائع ہوتا تھا اور بہادر شاہ کے روزنامچہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ انھیں اخباروں میں سید نعمت اللہ ولی کے قصیدے کے فارسی اشعار بھی شائع ہوتے تھے

قوم سکھاں چیرہ دستیہا کند بر مسلماں — تا چہل این جوروبدعت اندر آں پیدا شود
بعد از آں گیرد نصاری ملک ہندوستاں تمام — تا صدی ملکش میان ہندوستاں پیدا شود
پانصد و ہفتاد و ہجری بود تا این گفتہ شد — در ہزار و دوصد و ہفتاد آں پیدا شود

۱۲۷۰ھ

لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس میں تو ۱۲۷۰ سن لکھا ہے جو عیسوی میں ۱۸۵۳ لکھتا ہے۔ اور غدر ۱۸۵۷ میں ہوا تو پھر ان اشعار کا ۱۸۵۷ میں شائع کرنا کیا معنی رکھتا تھا۔ لیکن یہ اشعار ہندوستان کے علاوہ کسی اور ملک سے متعلق تھے۔ بہر حال یہ بات غور طلب ہے۔ ان اخبارات میں بھی فارسی ادب کا بڑا ذخیرہ ہے جو ۱۸۵۷ میں شائع ہوا اور اس دور کے حالات کی عکاسی ان سے ہوتی ہے۔

مورخین عہد وسطی اور فارسی کے دانشوروں کی توجہ ان فارسی دستاویزات، تواریخ، شعراء کا کلام جو ۱۸۵۷ سے متعلق فارسی زبان میں ہے ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ ان دستاویزات وغیرہ کو اب ڈیڑھ سو سال گذر چکے ہیں اور کس مپرسی کی حالت میں یہ کاغذات رکھے ہوئے ہیں۔ زیادہ تر آرکائیوز اور لائبریریوں میں مخطوطات اور دستاویزات کو رکھنے کے لیے ایرکنڈیشنڈ کمرے نہیں ہیں جس کے نتیجے میں ان مخطوطات دستاویزات کو موسم گرما میں ۴۵ ڈگری اور موسم سرما میں ۲ ڈگری میں رہنا پڑتا ہے جب کہ اصولاً ان کو ہر وقت ۲۲ ڈگری درجہ حرارت میں رہنا چاہیے اس طرف بھی ہمیں توجہ دینی چاہیے۔ آخر کب تک ہم طبقات ناصری، تاریخ فیروز شاہی، اکبر نامہ، آئین اکبری، کلیات بیدل، اخبار الاخیار اور کلیات غالب پر کام کرتے رہیں گے خود سرسید نے جب آئین اکبری کی تدوین کی تو غالب سے اس پر تقریظ لکھنے کو کہا تو اس پر انھوں نے سرسید کو لکھا اب کچھ نئے کام بھی کرنا چاہیں۔ میں بھی یہ نہیں کہتا کہ مندرجہ بالا ماخذوں پر ہم کام نہ کریں لیکن آخر ان ماخذوں کا کیا ہوگا جن پر آج تک آفتاب کی شعاعیں نہیں پڑیں اور جب کہ انگریز ان کو بکسوں میں بند کر کے چلے گئے وہ آج تک ویسے ہی پڑے ہوئے ہیں۔ ہم سب کا یہ فرض ہے اور خاص طور سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ تاریخ، فارسی اور اردو کے مورخین اور دانشوروں کا کہ اب ہم ان ماخذوں پر توجہ دیں جن پر کام بالکل نہیں ہوا یعنی سرسید نے تو اس ثقافت کی حفاظت تو اس حد تک کی کہ جب ۱۸۵۷ میں انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد شاہ جہاں آباد کی جامع مسجد کے سامنے میدان میں جس کو آج سبھاش پارک کے نام سے جانتے ہیں شاہجہاں کی زوجہ اکبری بیگم نے ایک مسجد تعمیر کی تھی اس کو انگریزوں نے مسمار کر دیا۔ سرسید نے کسی صورت اس مسجد کے کتبات کو حفاظت سے رکھ دیا اور جب انھوں نے ایم اے او کالج میں جامع مسجد تعمیر کی تو اس کی مرکزی محراب پر ان کتبات کو نصب کرا دیا۔ بالکل اسی طرح ہم فارسی دستاویزات پر کام کر کے محفوظ کر دیں تاکہ یہ امانت اگلی نسل کو منتقل ہو سکے ورنہ تو

جلا تھا جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

☆☆☆

عراق رضا زیدی*

فن تاریخ گوئی کا شاعر اول - حافظ شیرازی

فارسی ادب میں حافظ شیرازی کو غزل گوئی کی بنا پر وہی شہرت و مقام حاصل ہے جو اردو ادب میں مرزا غالب کے حصے میں آیا ہے۔ ہندوستان، پاکستان اور ایران میں حافظ شناسی پر برابر مقالے تحریر کیے جاتے رہے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک کڑی ایران میں "حافظ شناسی" کے اہم مرکز کا قیام ہے جو شیراز میں قائم کیا گیا ہے۔ جس میں سیکڑوں کی تعداد میں کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ افسوس کہ حافظ پر تحریر کردہ یہ تمام سرمایہ حافظ کی زندگی کے حالات اور اس کی غزل تک ہی محدود ہے۔ چند مقالات قصاید کی روشنی میں بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ لیکن ابھی حافظ کی شاعری کے کتنے ہی ایسے مخفی گوشے ہیں جن پر سے پردہ اٹھایا جا سکتا ہے اور جن پر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر حافظ کی رباعیات کو ہی لے لیجیے جو نہایت ہی توجہ کی طالب ہیں اور جن پر پہلی بار احقر نے قلم اٹھا کر اہل دانش کو اس نظریہ سے بھی کام کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس سلسلے کے مقالے کا ایک حصہ "قند پارسی" شمارہ ۱۶ میں شائع ہو چکا ہے۔ موجودہ مقالے میں حافظ کی تاریخ گوئی کا پہلی بار ناقدانہ جائزہ لیا جا رہا ہے جب کہ وہ تاریخ گوئی کا پہلا باقاعدہ شاعر ہے۔

فارسی میں اکثر "اصناف سخن" کا وجود عربی زبان و ادب کا مرہون منت ہے لیکن اصناف "مثنوی اور رباعی" اگرچہ الفاظ کے اعتبار سے عربی زبان سے ہی مستعار لیے گئے ہیں مگر صنف سخن کے اعتبار سے یہ فارسی زبان کا اپنا اثاثہ ہیں۔ اسی طرح "تاریخ گوئی" کے فن میں اصول "ابجد" عربی زبان کا ہوتے ہوئے بھی یہ فارسی زبان کی اپنی صنف سخن ہے۔ جس کے متعلق جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ عربی کے سابق صدر پروفیسر ضیاء الحسن ندوی مرحوم اور موجودہ صدر شعبہ عربی پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی ہم خیال ہیں۔ جن سے رجوع کرنے پر معلوم ہوا کہ عربی شاعری میں تاریخ گوئی کی کوئی روایت نہیں رہی ہے۔ جس کے

---

* پروفیسر، شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ثبوت میں موصوف نے ''تاریخ الشعر العربی الحدیث'' مصنف احمد قبش کا حوالہ دیا جس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اس کتاب میں پہلا باب ہی ''فن التاریخ الشعری'' ہے جو صرف تین صفحات پر مشتمل ہے۔ ان تین صفحات میں بھی ایک صفحہ مندرجہ ذیل کل دو تاریخوں کی وضاحت اور حساب کے لیے وقف ہو گیا ہے۔ ان دونوں تاریخی مصرعوں کے شاعر کا نام بھی تحریر نہیں ہے جن میں سے ایک مصرع تدخلے کے ذریعے مکمل ہوا ہے تو دوسرا صرف ایک لفظ ''ظلمہ'' کے گرد گھومتا ہے۔ پہلا مصرع اس طرح تحریر ہے:

"وذهب بعض الباحثين الى أن اقدم ما وقف عليه في
التاريخ الشعرى قول بعضهم في حادثة وقعت سنة ۸۲۲ھ
تاریخہ: خير بدامع كمال العفة[۱]

۸۲۲=۵+۷+۸۱۰

مندرجہ بالا مثال میں ''قول بعضهم'' اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ شاعر کا نام معلوم نہیں ہے۔ مصرع کا مفہوم ہے کہ ''خیر بدا'' = ۸۱۷ میں ''عفة کا آخری حرف ''ۃ'' جس کے پانچ عدد ہوتے ہیں۔ داخل کر دیے جائیں تو اس حادثے کی تاریخ ۸۲۲ھ نکل آتی ہے۔ اسی طرح دوسری اور آخری مثال مندرجہ ذیل ہے:

''وأرخ بعضهم وفاة (محمد) باشا والى مصر المقتول
سنة ۹۷۵ فقال قتله بالنار نور وهو في التاريخ ظلمه''[۲]

یہاں بھی شاعر کا نام معلوم نہیں ہے اور آگے اسی مصرع پر گفتگو کی گئی ہے جس کے آخری لفظ ''ظلمۃ'' کے ۹۷۵ عدد ہوتے ہیں جو والی مصر ''محمد'' کے قتل کی تاریخ ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ عربی شاعری میں بھی اتفاقاً ہی تاریخی مصرع کہے گئے ہیں یہ بھی عین ممکن ہے کہ یہ مصرع بھی کسی فارسی شاعر کے ہی ہوں کیونکہ فارسی کے اکثر تاریخ گویان نے عربی کے مصرع بھی نکالے ہیں اور فارسی شاعری میں بھی اکثر عربی مصرعوں کا استعمال کرتے رہے ہیں۔ خود حافظ شیرازی کے دیوان کا پہلا مصرعہ عربی کا ہی ہے:

الا یا ایها الساقی ادر کاسا وناولها
کہ عشق آسان نمود اول ولی افتاد مشکلہا[۳]

اسی طرح نظیری کے اکثر دیوان کا پہلا مصرع بھی عربی زبان کا ہی ہے۔

اذا ما شئت ان تحیی حیاة حلوة المحیا
برسوائی برآور سر ز مستوری برون نہ پا[۴]

اکثر شعراء نے کلام پاک کی آیتوں سے تاریخی مصرع نکالنے کی بھی سعادت حاصل کی ہے جو عربی زبان میں ہی ہے۔ مولانا جامی کی تاریخ وفات ''ومن دخله کان آمنا''[۵] سے ۸۹۸ھ نکالی گئی ہے۔ اسی طرح فارسی اور اردو کے مشہور صوفی شاعر شاہ نیاز بے نیاز بریلوی کی تاریخ وفات ۱۲۵۰ھ ''ان اولیاء الله لا خوف علیهم ولا هم یحزنون''[۶] سے استخراج کی گئی ہے۔ غرض کہ فارسی شعراء نے عربی مصرعوں کا عام استعمال کیا ہے۔ لہٰذا تاریخ گوئی کا فن اور صنف صرف فارسی زبان وادبیات کی اپنی اختراع ہے۔

تاریخ کے معنی ''وہ جملہ یا فقرہ یا مصرع جس کے اعداد نکالنے سے کسی واقعہ کی تاریخ نکل آئے۔''[۷] اس ذیل میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ گوئی کا تعلق غم اور خوشی دونوں سے ہے۔ کسی کی وفات، شادی، ولادت، سال جلوس، جنگ کی فتح، عمارت کی تعمیر وغیرہ کے موقع پر نظمیں کہہ کر تاریخی مصرعے نکالے جاتے ہیں۔ تاریخ گوئی کے لیے نظام ''ابجد'' ایک اہم نظام ہے جس کی رو سے حروف کے اعداد مقرر کیے گئے ہیں اور یہ نظام اکثر زبانوں میں موجود ہے۔ عربی، فارسی اور اردو وغیرہ زبانوں میں تاریخی نظام ابجد سے شروع ہو کر ضظغ پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں کل آٹھ الفاظ ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، ثخذ، ضظغ ہیں جن کو حضرت ادریس علیہ السلام سے منسوب کیا جاتا ہے۔[۸] اس حساب کو نظام ابجد اور حساب ''الجمل'' بھی کہتے ہیں جس کے لیے مختلف روایات منقول ہیں۔ کسی کا کہنا ہے کہ ابا جاد نامی بادشاہ کا مخفف ابجد ہوا اور باقی سات الفاظ اس کے بیٹوں کے نام پر ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں ان الفاظ کی تشریح مندرجہ ذیل تحریر کی گئی ہے۔

''ابجد، ع۔ اسم مذکر۔ الف، بے، تے، حروف تہجی، ابجد دو ہیں ایک آدم کی ترتیب دی ہوئی، دوسری حضرت ادریس علیہ السلام کی۔ چنانچہ آج کل ادریس ہی کی ابجد جاری ہے۔ الخ۔۔۔ ابجد ادریس کے آٹھ کلمے یہ ہیں ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، ثخذ، ضظغ (جن کے معنی بھی دیے گئے ہیں)۔۔۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ آبا جاد ایک بادشاہ کا نام تھا جس کا مخفف ابجد ہے اور باقی سات کلمے اس کے بیٹوں کے نام ہیں۔ چنانچہ صراح وغیرہ میں اس کی تشریح کی گئی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مرامر ایک شخص کا نام تھا لکھنے کا طریقہ اسی کی ایجاد ہے اور یہ آٹھوں کلمے اس کے بیٹوں کے نام ہیں۔''[۹]

رسالہ ضوابط عظیم میں ان آٹھوں کلمات کے معنی اس طرح درج ہیں۔ ابجد = شروع کیا، ہوز = مل

گیا، حطی = واقف ہوا، کلمن = متکلم ہوا، سعفص = اسی سے سیکھا، قرشت = ترتیب دیا، ثخذ = محفوظ رکھا، ضظغ = تمام کیا۔ ان الفاظ کے مطابق ہر حرف کے اعداد متعین کر دیے گئے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

ا	ب	ج	د	ہ	و	ز	ح	ط	ی	ک	ل	م	ن	س	ع	ف	ص
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰

ق	ر	ش	ت	ث	خ	ذ	ض	ظ	غ
۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

یہ کل اٹھائیس حروف ہوتے ہیں۔ فارسی میں پ، چ، ژ اور گ چار حروف مزید ہیں۔ جن کے اعداد انھیں کے قبیل کے حروف جو ان سے قبل موجود ہیں، سے اخذ کر لیے گئے ہیں جس کی رو سے پ کے ۲، چ کے ۳، ژ کے ۷ اور گ کے ۲۰ عدد مانے گئے ہیں۔

گروہ ابجد کی ترکیب انگریزی حروف (Alphabets) سے بھی کہیں کہیں ملتی جلتی ہے۔ مثلاً ابجد = A.B.C.D (ہلد) کلمن = K.L.M.N قرشت = Q.R.S.T انگریزی حروف کے آخری حرف Z کے اعداد ۸۰۰ ہوتے ہیں جب کہ فارسی میں غ کے سب سے زیادہ اعداد ۱۰۰۰ ہیں۔ انگریزی کے تعلیمی تاش میں بھی چار = D، دو = B، ایک = A جو الف، ب اور دال کے ہم مقام ہیں۔ اسی طرح K=20, L=30, M=40 اور N=50 جو کہ = ۲۰، ل = ۳۰، م = ۴۰ اور ن = ۵۰ کے ہم قیمت ہیں۔ رومن میں بھی v=5, x=10 اور L=50 کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ہندی میں بھی اسی نظام کو "کا ٹا پا یا" کہتے ہیں جو صرف ۱ سے ۹ تک رہتا ہے۔

فارسی تاریخ گوئی میں صوری اور معنوی دو صورتیں رائج ہیں۔ صوری سے مراد وہ طریقہ ہے جس میں سنہ کا بیان الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ جبکہ معنوی میں سال سنہ کا بیان الفاظ کے ذریعے نہ کر کے حروف کی اعداد کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسے مصرع بھی تحریر ہوتے ہیں جن میں صوری اور معنوی دونوں تاریخیں پائی جاتی ہیں۔ جیسے فیضی نے غزالی مشہدی کی تاریخ وفات ع "سنہ نہ صد و ہشتاد" نوشت سے حاصل کی ہے۔ جس کے پڑھنے سے ۹۸۰ھ معلوم ہو جاتی ہے لیکن جب اس مصرع کے حروف کے اعداد شمار کرتے ہیں تو یہ بھی سنہ = ۱۱۰ + نہ صد و = ۱۵۵ + ہشتاد + ۱۰ = ۹۸۰ ہوتے ہیں۔ شہاب الدین معمائی نے بابر بادشاہ کی رحلت کی تاریخ بھی اسی طرح صوری و معنوی میں دریافت کی تھی جو مندرجہ ذیل ہے ع "در نہ صد و سی و ہفت بودہ" جس کے اعداد، در = ۲۰۴ + نہ = ۵۵ + صد و = ۱۰۰ + سی و = ۷۶ + ہفت = ۴۸۵ + بودہ = ۱۷ کل ۹۳۷ اعداد ہوتے ہیں جو مصرع کے الفاظ سے بھی ظاہر ہیں۔ ایک قسم، وقت کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے خود راقم الحروف نے بھی ایجاد کی ہے جس کا نام "تعین صوری و معنوی"

رکھا ہے۔ جس کی رو سے مصرع صوری تو ہجری سنہ میں ہوگا لیکن معنوی میں اس کے اعداد عیسوی سنہ کے حساب سے برآمد ہوں گے۔ راقم نے جناب محمد صادق صفوی شمس آبادی مرحوم کی ایک تاریخ "مسطین صوری و معنوی" میں بھی موزوں کی ہے۔ "ہزار و بست وهفت و چار صد صادق جنان گیرآ" اس مصرع سے ۱۴۲۷ھ واضح ہے۔ لیکن معنوی طور پر بھی اس کے کل اعداد = ہزار و = ۲۱۹ + بست وهفت و = ۹۵۹ + چار صد = ۴۹۸ + صادق = ۱۹۵ + جنان گیرآ = ۳۳۵ = ۲۰۰۶ عیسوی کے برابر حاصل ہوتے ہیں۔

فارسی میں تاریخ گوئی کی روایت کا آغاز کب اور کس نے کیا یہ تو معلوم نہیں ہو سکا البتہ چوتھی صدی ہجری میں فارسی شاعری کے ابتدائی دور میں ہی اس کے نقوش مل جاتے ہیں۔ جب کہ ابو شکور بلخی نے اپنی مثنوی "آفرین نامہ" کی مندرجہ ذیل تاریخ رقم کی تھی۔

مر این داستان کش بگفتم از نیاں ابر سی صد و سی و سہ بود سال

اس کے بعد ۳۳۱ھ میں کسائی مروزی نے بھی اپنی ہی ولادت کی تاریخ موزوں کی۔

بہ سی صد و چہل و یک رسید نوبت سال چہار شنبہ وسہ روز ماندہ از شوال[۱۱]

۴۰۰ھ میں فردوسی نے "شاہ نامہ" مکمل کیا تو اس کی صوری تاریخ صنعت ضرب میں اس طرح حاصل کی۔

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار کہ گفتم من این نامہ شاہوار[۱۲]

پنج ہشتاد بار یعنی ۸۰×۵ = ۴۰۰ ہجری میں شاہ نامہ تحریر ہوا اس کے بعد صوری تاریخ کہنے کا رواج بڑھتا گیا اس کے باوجود حافظ کے زمانے تک کوئی ایسا شاعر دکھائی نہیں دیتا جس نے باقاعدہ تاریخ گوئی کی طرف اپنی توجہ مرکوز کی ہو۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ شعرا، امرام، وزرا اور بادشاہوں کی موت پر مرثیے نہ کہے گئے ہوں۔ فارسی ادب کے پہلے تذکرے "لباب الالباب" از محمد عوفی (۵۷۳ تا ۶۳۰) میں تاریخ گوئی کی طرف کوئی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔ جب کہ نظام الملک کا مرثیہ اور عطا بن یعقوب جیسے کتنے ہی امرا کی وفات پر تحریر کیے گئے مرثیے موجود ہیں۔ اسی طرح مسعود سعد سلمان نے بھی لوگوں کی وفات پر اشعار تحریر کیے ہیں مگر تاریخ وفات موزوں کرنے سے عاری ہے البتہ ایک قصیدے میں سنہ ضرور تحریر کی ہے۔ یہاں تک کہ محمد علوی کی وفات پر دل کے جذبات صرف دو اشعار میں سپرد قلم کیے ہیں۔

بر وفات محمد علوی خواستم زد بہ شعر یک دو نفس

باز گفتم کہ در جہان پس ازین زشت باشد کہ شعر گوید کس

خود حافظ کے پیش رو شیخ سعدی نے خلیفہ معتصم باللہ کا مرثیہ قلم کو خون دل میں ڈبو کر تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی چھ مرثیے رقم کیے ہیں لیکن تاریخ گوئی کی کوئی مثال نہیں ملتی سوائے اس کے کہ 'گلستان' اور 'بوستان' تصنیف کرنے کی صوری تاریخ ضرور موزوں کی گئی ہے۔ خود سعدی کی تاریخ وفات بھی لفظ "خاص" سے ۶۹۱ھ موزوں کی گئی ہے۔

مہ شوال بود و شام جمعہ ۔۔۔ کہ در دریای رحمت گشت غواص
یکی پرسید سال فوت، گفتم ۔۔۔ ز خاصان بود ازان تاریخ شد "خاص"

غالباً یہ تاریخ امیر دولت شاہ سمرقندی نے حاصل کی ہے کیونکہ تذکرۃ الشعرا صفحہ ۵۶ پر تحریر یہ تذکرہ ۸۹۶ھ میں مکمل ہوا تھا۔

"و عزیزی تاریخ وفات آن شیخ بزرگوار بدین نوع گوید"

ان تمام مثالوں سے ثابت ہو جاتا ہے کہ حافظ شیرازی سے قبل کسی شاعر نے تاریخ گوئی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی تھی۔ حافظ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اس فن تاریخ گوئی کی طرف متوجہ ہو کر اس فن کو ترقی عطا کی۔ دس سے زیادہ تاریخیں ان کے دیوان میں موجود ہیں۔ ابتدائی دور ہونے کے باوجود حافظ کے یہاں وہ تمام لوازمات موجود ہیں جنھیں دسویں، گیارہویں صدی ہجری میں ایسا عروج ملا کہ تاریخ گو شاعروں نے اس میں نئی نئی کاوشیں پیدا کیں۔ مکمل قصاید جن کے ہر مصرع سے تاریخ برآمد ہوتی ہے، تحریر کیے گئے۔ محتشم کاشانی کی چھ رباعیوں کے چوبیس مصارع سے ۱۱۲۸ تاریخیں جداگانہ طریقوں سے نکلتی ہیں[۱۲]۔ اسی طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ گویا حافظ کے بنائے گئے مکان کو برابر سنوارا اور سجایا جاتا رہا ہے۔

حافظ کے احوال و آثار 'تاریخ ادبیات ایران' سے متعلق ہر کتاب میں موجود ہیں۔ لہٰذا اتنا تحریر کر دینا کافی ہے کہ حافظ کی ولادت تقریباً ۷۲۶ھ کے آس پاس شیراز میں ہوئی اور ان کی وفات یقیناً ۷۹۱ھ میں شیراز میں ہی ہوئی اور خاک مصلیٰ میں سپرد خاک ہوئے اور اس سے ان کی تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کی عمر ۶۵-۶۴ سال سے زیادہ نہ ہوئی۔ حافظ نے جب آنکھ کھولی تو شیراز پر خاندان انجو کی حکومت تھی جو ۷۰۳ھ تا ۷۵۷ھ یا ۷۵۸ھ تک رہی۔ اسی خاندان کا آخری بادشاہ شاہ شیخ ابو اسحٰق حافظ کا پہلا ممدوح تھا جو بحالت قید ۷۵۷ یا ۷۵۸ھ میں قتل ہوا۔ حافظ شیرازی نے غالباً قید کے زمانے میں قتل کی اطلاع پا کر جوش عقیدت میں تاریخ وفات لکھ ڈالی لیکن جب ۷۵۸ھ میں دوبارہ قتل کی خبر آئی تو پھر ایک اور تاریخ تحریر کی۔ پہلی تاریخ معنوی اور دوسری تاریخ صوری تحریر کی گئی ہے۔ ابو اسحٰق کی وفات کے بارے میں بہاء الدین خرمشاہ اس طرح رقم طراز ہیں:

"در عنفوان جوانی در سی وشش یا سی و هفت سالگی در سال
۷۵۷ یا ۷۵۸ ق به دست یکی از اولیاءِ دم اعدام کرد"[۱۳]

اور ڈاکٹر قاسم غنی آثار و افکار و احوال حافظ میں فرماتے ہیں کہ

"امیر شیخ ابو اسحٰق بہ تنگ رفتہ در تحوری پنہان شد و او را بیرون آوردند و

از بیم بلوای مردم اصفہان با احتیاط لازم او را در قلعہ طبرک محبوس ساختند"[۱۴]

ایک دوسری جگہ قتل کی تاریخ مع دن اور مہینے کے اس طرح تحریر کرتے ہیں:

"واقعۂ قتل امیر جمال الدین شیخ ابو اسحٰق بن شاہ شرف الدین اینجو در عصر روز جمعہ بیست و یکم جمادی الاول سنہ هفتصد و پنجاہ و هشت در میدان سعادت شیراز کہ امیر شیخ کاخ سلطنتی با عظمتی در آن مشغول ساختن بود"

اس تحریر کے باوجود حافظ کی ایک تاریخ کے حوالے سے دوبارہ ابو اسحٰق کے قتل کی بحث کرتے ہیں:

"توجیہ حافظ را در تاریخ قتل شاہ ابو اسحٰق قطعہ ای است کہ
بموجب آن تاریخ وفاتش سال هفتصد و پنجاہ و هفت است
و این تاریخی بسیاری است کہ سال وفات شاہ شیخ ابو اسحٰق ہمین
سال هفتصد و پنجاہ و هفت بود نہ سال هفتصد و پنجاہ و هشت"[۱۵]

مذکورہ بالا بحث سے قطع نظر یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ شاہ ابو اسحٰق، حافظ شیرازی کے ممدوح خاص تھے جن کی مدح میں حافظ نے قصاید بھی تحریر کیے ہیں۔ ایک قصیدے کا مطلع مندرجہ ذیل ہے:

سپیدہ دم کہ ہوا بوی زلف جان گیرد
چمن ز لطف ہوا نکتہ بر جنان گیرد[۱۶]

حافظ کا پہلا قطعہ تاریخ وفات شاہ ابو اسحٰق درج ذیل ہے:

بلبل و سرو و سمن یاسمن و لالہ و گل ۔۔۔ ہست تاریخ وفات شہ مشکین کاکل
خسرو دارا زمین خوشہ زمان بو اسحٰق ۔۔۔ کہ بہ دان طلعت او تازہ و خندہ گل دل
جمعہ بیست و دوم ماہ ربیع الاول ۔۔۔ در ہیٔمن بود کہ پیوستہ شد از جزو بہ کل[۱۷]

مندرجہ بالا قطعہ تاریخ میں حافظ نے بطور جدت چند ایسے الفاظ کو جمع کر کے تاریخ وفات نکالی ہے جس کا تعلق استعاراتی و تشبیہاتی طور پر شاہ ابو اسحٰق سے میل کھاتا ہے۔ کیوں کہ وہ شراب و شباب کا دلدادہ تھا لہٰذا مستی و شباب میں اس حد تک چور رہتا تھا کہ جب مبارز الدین کی فوجیں قلعہ کو فتح کرنے پر آمادہ تھیں تو وہ نشے کی حالت میں لوگوں سے دریافت کر رہا تھا کہ یہ باجوں کا شور کیسا ہے۔ چنانچہ "حافظ شیریں سخن" میں درج ہے کہ:

"شاہ شیخ ابو اسحٰق در حب ترویج آبادانی و عمران بہ عیش و عشرت

"نیز گرائیش بی حساب داشت: وقتی در ایام بحرانی جنگ و محاصرہ
شیراز نیز دست از شادخواری و شراب مدام بر نمی داشت. و سر
انجام کہ لشکر امیر مبارز الدین وارد شیراز شد از آشوب و ہیاہوی
آنان، سر از بستر خمار برداشت و پرسید این ہنگام چیست؟ گفتند
بانگ نقارہ مبارز الدین است. گفت ہنوز این مردک ثقیل روی
گرانجان نرفتہ است"[22]

ان تمام کمیوں کے باوجود حافظ شیرازی کو اس کے جن افعال نے متاثر کیا وہ اس کی علم پروری اور دانشوری کے ساتھ ساتھ اہل ہنر کی پرورش کا خیال تھا جیسا کہ تاریخ عصر حافظ صفحہ ۱۲۲ پر درج ہے:

"شاہ شیخ ابو اسحٰق مردی با داد و دہش و فاضل و دانش دوست شاعر
و آزادمنش بودہ، اہل فضل و ہنر را رعایت می نمودہ و پرورش می
دادہ است"[23]

انہیں عوامل کی بنیاد پر حافظ نے اپنے قطعے میں بلبل+۹۴ + سرو+۲۶۶ + سمن = ۱۵۰ + یاسمن = ۱۶۱ + لالہ = ۶۶ + گل = ۵۰ = ۷۵۷ھ نکال کر بطور دلیل سنبل کا گل کی تشبیہ سے ابو اسحٰق کو یاد کیا۔ یاد رہے کہ سنبل وہ گھاس یا بیل ہے جس کی تشبیہ بالوں یعنی کاکل، گیسو اور زلفوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ شعر کی خوبی یہ بھی ہے کہ مراعاۃ النظیر کی اس سے عمدہ مثال کم ہی ملتی ہے۔ ایک ہی طرح آٹھ الفاظ کا با معنی اور تشبیہاتی استعمال اور ان میں بھی چھ (۶) الفاظ سے مادہ تاریخ نکالنا جہاں تاریخ نگاری کی معراج ہے وہیں شعر کی خوبصورتی میں چار چاند لگانے کا سبب بھی ہے۔ باقی دونوں اشعار بھی بطور تازہ تلمیح شاہ ابو اسحٰق کی زندگی کے عکاس ہیں۔ خسرو جو ایک بڑے بادشاہ کی علامت ہے اسے وہ شیراز ہی کا نہیں بلکہ تمام روی زمین کا بادشاہ قرار دے کر ایک طرف جہاں مبالغہ کا حق ادا کرتا ہے وہیں دوسری طرف استعارات و تشبیہات کا استعمال بھی بڑی چابکدستی اور خوبصورتی سے کرتا ہے۔ مثلاً اس کے چہرے کی چاند جیسی چمک، اس کے ہونٹ جیسے گلاب کی دو پنکھڑیاں وغیرہ۔ تاریخ کے قطعے میں ایسی ہنرمندی اس کے دور عروج میں بھی شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ خاص کر شاعری کا وہ فن جس میں مرنے والے کی مناسبت سے اتنی صنعتیں ایک ساتھ استعمال کی گئی ہوں قابل تحسین ہنر کے علاوہ ہو بھی کیا سکتا ہے۔ آخری شعر میں موت کے دن کا تعین کیا جا رہا ہے یعنی جمعہ کے دن، جمادی الاول کی اکیسویں تاریخ۔ بعض نسخوں میں یہ تاریخ "بست و دوم" بھی ملتی ہے۔ یہ تضاد قید میں اڑائی ہوئی موت کی خبر سے بعید از قیاس نہیں۔ یہ کاتب کے سہو کا جادو بھی ہو سکتا ہے۔ آخری مصرع میں دنیا اور موت کی تلخ حقیقت کو اجاگر کرتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ وہ قتل کر دیا گیا

یا وفات پا گیا یا شہید ہو گیا اس میں ایک انوکھا پہلو نکال کر کہہ دیا کہ "جز اپنے کل" میں سما گیا گویا وہ
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اسی ایک قطعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ حافظ نے کس طرح فن تاریخ گوئی کو بحیثیت فن کے پروان چڑھا کر اس کے دامن کو وسیع تر کر دیا۔ یہ تاریخ وفات جس کی تمام خوبیاں بیان کرنا کم سے کم اس مختصر مقالے میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ در اصل یہ تاثر ابو اسحٰق کی وفات کی پہلی خبر پر تھا لیکن کچھ ماہ بعد یکے بعد دیگرے دو خبریں حافظ کے کانوں تک پہنچتی ہیں۔ ایک اس کے زندہ رہنے اور پھر حقیقت میں قتل ہونے کی۔ لہٰذا ایک دوسری تاریخ معنوی ہی سرسری طور پر کہی جاتی ہے جو اکثر دیوانوں میں ملتی بھی نہیں ہے۔ نولکشور پریس سے شائع شدہ دیوان حافظ میں یہ تاریخ موجود ہے لیکن ہندوستان کی اکثر لائبریریوں کے جداگانہ "دیوان حافظ" میں یہ قطعہ تاریخ مفقود ہے۔ تمام اگر میں دو دیوان راقم الحروف کی نظر سے گزرے ہیں جن میں نولکشور کے علاوہ صرف ایک اور دیوان جو "بہ تصحیح مسعود فرزاد بہ کوشش علی حصوری انتشارات ہمکام سے شائع ہوا ہے" میں موجود ہے۔ "آثار و افکار و احوال حافظ" میں اس قطعے پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے اور جداگانہ مخطوطات کے حوالوں سے تاریخ کے مصرعے پر بحث کی گئی ہے۔

"قطعہ دیگری ہم در تاریخ وفات شاہ شیخ ابو اسحٰق بخواجہ حافظ
منسوب است کہ در بسیاری از دیوانہای خطی و چاپی دیدہ می شود و
بموجب آن قطعہ سال وفات شاہ شیخ ابو اسحٰق ہفتصد و پنجاہ و
ہشت است و آن قطعہ این است:

بروز کاف و الف از جمادی الاول	بسال ذال و دو گر نون و حاء علی الاطلاق
خدایگان سلاطین مشرق و مغرب	خدیو کشور عفو و کرم باستحقاق
سپہر حلم و ضیا آفتاب جاہ و جلال	جمال دنیی و دین شاہ شیخ ابو اسحاق
میان عرصہ میدان خود بہ تیغ عدو	نہاد بر دل احباب خویش داغ فراق

برای رفع اختلاف بین این دو قطعہ منسوب بخواجہ حافظ بعضی
بجای "حا" "زا" ضبط کردہ اند باین نحو کہ: بسال ذال و دو گر نون و
زای علی الاطلاق، از جملہ در حاشیہ نسخہ تاریخ جہان آرای غفاری"
نسخۂ متعلق بہ بریتش میوزیم" نوشتہ است: بسال ذال و دو گر نون
و زای علی الاطلاق"۔[24]

یہاں صرف قطعہ تاریخ وفات سے بحث کرنا مقصود ہے تا کہ تاریخ نگاری سے ممکن ہے "حا" کی

جگہ ''زا'' کا استعمال کیا گیا ہو ایسی حالت میں ایک ہی سال کی دو تاریخیں کہنا بعید از عقل نہیں ہے اور اگر ایسا ہے تو بھی یہ اسی روایت کا پیش خیمہ ہے جس میں مکمل قصاید یا کئی رباعیاں لکھ کر سیکڑوں مصرعوں سے ایک ہی تاریخ وفات نکالی گئی ہو۔

ان دونوں ہی تاریخوں میں ۲۱ رجمادی الاول ''بست و یکم ماہ جمادی الاول'' اور ''بروز کاف والف از جمادی الاول'' کی نسبت سے ۷۵۸ھ ہی زیادہ قرین قیاس ہے۔ جو بھی ہو اس قطعے سے تاریخ گوئی کی اب تک جو روایت چلی آرہی تھی اس پر قائم رہ کر حافظ نے حروف کا استعمال کیا، الفاظ کا استعمال نہیں کیا اور اس طرح ''بسال ذال و دو گر نون و حا علی الاطلاق'' کہہ کر معنوی و صوری دونوں طرح کی تاریخوں کے درمیان کا راستہ تلاش کیا ہے جو اب تک کی عام روش تھی۔ ذ=۷۰۰+ن=۵۰+ح=۸ یا ز=۷ یعنی ۷۵۸ھ باقی تمام مصرعوں میں مرنے والے کی تعریف اور عظمت کا بیان کیا گیا ہے اور یہ دونوں ہی قطعات تاریخ آغاز میں بھی انجام کی خبر دے رہے ہیں جن سے تاریخ گوئی کی مضبوط روایت کا ارتقا ہو رہا ہے۔

یہ تاریخ تو حافظ کے پہلے ممدوح کی تھی لیکن حافظ نے شائع شدہ قطعہ تاریخ کی مناسبت سے پہلی تاریخ وفات قوام الدین حسن متوفی ۷۵۴ھ کی نکالی ہے۔ جن کے بارے میں دہخدا نے اپنی لغت میں بحوالہ تاریخ گزیدہ چاپ لندن ص ۶۰۳، ۷۹۰ھ تحریر کیا ہے۔

> ''حسن معروف بہ حاجی قوام از وزرای شاہ شیخ ابو اسحٰق بود محمود گیتی
> در تاریخ خاندان آل مظفر وفات خواجہ قوام الدین حسن را بسال
> ۷۵۴ق درگذشت وی از اکابر روس فارس بود و بفضل او بہ کرم و
> خیرات و مبرات و خصایل پسندیدہ در فارسی کسی نشان نداوہ
> است''[۵۰]

شاہ ابو اسحٰق کی نسبت سے ہی حافظ نے قوام الدین حسن کی تاریخ وفات نکالی ہے اس کے علاوہ غزلیات حافظ میں بھی ان کی موت کا اثر حافظ کے دل پر دکھائی دیتا ہے:

> در کف غصہ دوران دل حافظ خون شد
> از فراق رخ آن خواجہ قوام الدین داد[۵۱]

غزل کے علاوہ بھی ایک قطعے میں حافظ نے خواجہ قوام الدین کی مدح سرائی کرتے ہوئے ان کی صحبت سے فیضیاب ہونے کا اعتراف کیا ہے:

> بہ حق صحبت خواجہ قوام الدین کہ قدر
> زبہر مصلحت ما بہ این رضا ندہد[۵۲]

قوام الدین کی تاریخ وفات سے غالباً حافظ کی تاریخ گوئی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

۳۳۳ھ سے شروع ہونے والے اس فن کی عمر ۷۵۴ھ تک ۴۲۱ سال کے سفر میں بہت زیادہ تاریخوں کا وجود نہیں ملتا۔ ان میں بھی کچھ وہ تاریخیں ہیں جو بعد میں کہی گئی ہیں۔ اور مکمل ''معنوی'' (یعنی مصرع کے الفاظ میں تاریخ کے اعداد نکالنا) تاریخیں تو اور بھی کم ہیں اور جو ہیں بھی تو وہ شکوک کے دائرے میں ہیں۔ جیسے نظام الدین اولیا کی تاریخ وفات ع نماداد ہاتف ''شہنشاہ دین'' ۷۲۵ھ یا ''طوطی شکر مقال'' ۷۲۵ھ (یہ تاریخ مولانا شہاب الدین معمائی نے دسویں صدی ہجری میں حاصل کی تھی) امیر خسرو کی تاریخ وفات وغیرہ چیدہ چیدہ ہی دکھائی دیتی ہیں ورنہ ''صوری'' یا حروف کے ذریعے سادہ تاریخ نکالنے کا رواج ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ کی کہی ہوئی یہ پہلی تاریخ بھی ''صوری'' روایت کی پاسدار ہے۔

بمرثیہ خواجہ حاجی قوام غفراللہ لہ

سرور اہل عمایم شمع جمع انجمن	صاحب صاحب قران حاجی قوام الدین حسن
ہفتصد و پنجاہ و چار از ہجرت خیر البشر	مہر را جوزہ مکان و ماہ را خوشہ وطن
سادس ماہ ربیع الآخر اندر نیم روز	روز آدینہ بہ حکم کردگار ذوالمنن
مرغ روحش کاو ہمای آشیان قدس بود	شد سوی باغ بہشت آزاد از زین دار محن[۴۸]

مندرجہ بالا قطعے کے تیسرے مصرع سے ۷۵۴ بہت واضح ہے لیکن باقی مصرعوں میں جو فنی مہارت موجود ہے وہ قابل دید ہے۔ ابو اسحٰق کے وزیروں میں انھیں ایک خاص عظمت حاصل تھی جس کے لیے ''اہل عمایم'' منصب داروں کے سردار، الفاظ میں ''صاحب قران'' کے اصل معنی بیان کرنے کے بعد امیر تیمور کو اس کا پہلا مصداق قرار دیا جاتا ہے جس کی شہرت کا سلسلہ ۷۷۱ھ کے بعد شروع ہوتا ہے لیکن حافظ نے ۷۵۴ھ میں ہی اس ترکیب سے فیض اٹھایا ہے اور صاحب کی تکرار کے ساتھ پہلا صاحب اس طرح استعمال کیا ہے کہ اس پر ہر طرح کے معنی کا اطلاق ممکن ہے لیکن اصل معنی ''وزیر'' کے لیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ صاحب قرآن، ''مہر را جوزہ مکان''، ماہ را خوشہ وطن' کی تراکیب کے ذریعے اپنے علم نجوم جاننے اور اس میں ماہر ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے، سال کے ساتھ وقت کا تعین بھی ہے یعنی چھ ربیع الآخر کو خدا کے حکم سے جمعہ کے دن دوپہر میں اس پاک جسم سے جس کے لیے ''ہمای آشیان قدس'' سے تشبیہ دی گئی ہے روح پرواز کر گئی اور یہ روح جسم کی قید سے آزاد ہو کر باغ بہشت کی جانب روانہ ہو گئی۔

دوسری تاریخ ۷۵۶ھ میں مولانا اعظم اسماعیل کی وفات پر کہی گئی ہے جن کے بارے میں ''فرہنگ رو دبزار واژہ'' میں صرف ایک جملہ ملتا ہے:

> ''امام قاضی شیخ مجد الدین اسماعیل بن محمد بن خداداد''[۴۹]

قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مولانا اس شاہی مسجد میں امام رہے ہوں گے جہاں خود حافظ نماز ادا

کرتے رہے تھے۔ ان کی تاریخ وفات ''رحمت حق'' سے ۷۵۶ھ نکلتی ہے۔

''مجد دین سرور و سلطان قضات اسماعیل — کہ زدی کلک زبان آورش از شرع نطق
ناف هفته بُد و از ماه رجب کی ح روز — کہ برون رفت ازین عالم بی وضع و نسق
کنف رحمت حق منزل او دان وانگه — سال تاریخ وفاتش طلب از ''رحمت حق''[۳۰]

کیوں کہ اسماعیل امام جمعہ والجماعت یا قاضی القضات ہیں لہٰذا بھی مصرعوں میں اسی طرح کے لوازمات برتے گئے ہیں۔ فقط سہ شنبہ کو ''ناف ہفتہ'' اور ۱۸ تاریخ کو ''ی ح'' سے نمایاں کیا گیا ہے۔ تیسرا تاریخی قطعہ ۷۵۸ھ کا شاہ ابواسحٰق کی وفات پر ہے جس کا بیان کیا جا چکا ہے۔ اس ذیل میں چوتھا قطعۂ تاریخ کس کی وفات پر کہا گیا ہے یہ نہیں معلوم ہو سکا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ قطعہ صرف نول کشور سے شائع شدہ دیوان میں ہے باقی کسی دیوان میں راقم کی نظر سے نہیں گزرا اس میں بھی ''صوری'' تاریخی کہی گئی ہے جو ۷۶۴ھ کی ہے۔

صباح جمعه بُد و سادس ربیع الاول — کہ گشت فرقت آن مہ بچشم عاجل
بسال هفصد و شصت و چار از هجرت — چو آب دل بجدم این دقیقه مشکل
دریغ و درد و تاسف کجا دید سودی — کنون کہ عمر بباز بچہ رفت و بی حاصل[۳۱]

پانچویں تاریخ ایسی دلسوز ہے کہ جس نے حافظ کی آنکھوں کا نور ہی چھین لیا یعنی جوان بیٹے کی موت ہو گئی جس کے غم میں حافظ نے جانسوز مرثیہ ایک قطعہ کی شکل میں تحریر کیا:

دلا دیدی کہ آن فرزانه فرزند — چه دید اندر خم این طاق نیلین (رنگین)
بجای لوح سیمین در کنارش — فلک بر سر نهادش لوح سنگین[۳۲]

یہ حادثہ ۷۷۸ھ میں پیش آیا تو حافظ نے اپنے بیٹے کی تاریخ ''میوۂ بہشتی'' سے نکالی جس کے لیے دیوان نول کشور کے حاشیہ میں درج ہے:

''میوۂ بہشتی عبارت از فرزندات''

علاوہ اس دیوان کے یہ شہادت کسی اور دیوان میں نہیں ملتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک دیوان جو بہ تصحیح دکتر رشید عیوضی اور دکتر اکبر بہروز، مؤسسہ انتشارات امیر کبیر تہران سے ۱۳۶۳ش ھ میں شائع ہوا ہے اور صرف اسی دیوان میں قطعہ تاریخ پر عنوان دیے گئے ہیں ورنہ کسی اور دیوان پر یہ عنوان دیکھنے کو نہیں ملتے لیکن اس قطعہ تاریخ کا کوئی عنوان نہیں ہے البتہ یہ قطعہ اس قطعے کے بعد تحریر لایا گیا ہے جو حافظ نے اپنے فرزند کے لیے کہا تھا:

آن میوۂ بہشتی کامد بدست ای جان — در دل چرا نکشتی از کف چرا بہشتی

تاریخ این حکایت گر از تو باز پرسند — بر جمله اش فرو خوان از ''میوۂ بہشتی''[۳۳]

اس قطعے کے الفاظ خود ایک ٹوٹے ہوئے دل کی صدائے بازگشت معلوم ہو رہے ہیں۔ اس میں جہاں ''میوۂ بہشتی'' سے ۷۷۸ھ تاریخ وفات نکلتی ہے وہیں ایک کمی یہ بھی موجود ہے کہ اس قطعے میں کسی قافیہ کا التزام نہیں لیا گیا ہے۔ ممکن ہے شدت غم نے یہ احساس ہی چھین لیا ہو۔ اس کے باوجود ''میوۂ بہشتی'' میں جو افادیت اور تاریخی و اتفاقی خوبی ہے اس کی مثال کمیاب ہے۔ ''میوۂ بہشتی'' سے مراد ''فرزند'' ہونے پر قافیہ درست سمجھا جا سکتا ہے۔

چھٹی تاریخ خواجہ فتح اللہ ابونصر کی وفات پر ۷۹۰ھ میں نکالی گئی ہے۔ ''فرہنگ وہ وزراء'' میں ان کا تعارف اس طرح ملتا ہے:

''ابونصر خواجہ فتح اللہ برہان الدین بن کمال الدین ابوالمعالی متوفی (۷۳۸) وزیر امیر مبارز الدین و قاضی القضات شیراز متوفی ۷۹۰ھ یا مقتول در این سال۔''[۳۴]

نولکشور ایڈیشن میں تاریخ کا مصرع ''بسال هفصد و ہشتاد از جہان ناگاہ'' تحریر ہے یعنی ۷۸۰ھ اسی وجہ سے یہ تاریخ یہاں تحریر کی گئی ہے لیکن فرہنگ اور باقی تمام نسخوں میں مندرجہ ذیل تاریخ درج ہے:

بروز شنبه سادس ز ماه ذی الحج — بسال هفصد و شصت از جهان بشد ناگاه
ز شاهراه سعادت بباغ رضوان رفت — وزیر کامل ابو نصر خواجه فتح الله[۳۵]

یہ تاریخ بھی صوری اور روایتی ہے۔ دوسرے مصرع میں تسامح ہے ''هفصد'' کی کتابت هفصد ہونا چاہیے۔ اکثر نسخوں میں یہ تاریخ تحریر نہیں ہے۔ برہان الدین ابونصر بوالمعالی کا نام حافظ کی غزلیات میں بھی ملتا ہے۔

مسند فروز دولت کان شکوه و شوکت — برهان ملک و ملت بو نصر بوالمعالی[۳۶]

ساتویں تاریخ بہاء الحق کی وفات ۷۸۲ھ میں تحریر کی گئی ہے جن کی نسبت ''فرہنگ وہ وزراء'' میں تحریر ہے۔

''بہاء الحق (لقب) اور بہاء الحق والدین کہ بہاء الدین عثمان کوہ
کیلوئی قاضی القضات عہد شاہ شجاع و از بزرگان علمای شافعی است
برای اطلاع بیشتر از شرح حال رجوع شود بہ تاریخ گزیدہ''[۳۷]

ابواسحٰق کے بعد شاہ شجاع حافظ کا دوسرا ممتاز ممدوح ہے لہٰذا اس کے بنائے ہوئے قاضی القضات کے انتقال پر تاریخ وفات کہنا فطری تقاضہ کی دلیل ہے۔ حافظ نے یہ تاریخ ان کی علمی شان، بزرگی اور عبادت گزاری کی بنا پر لفظ ''قرب طاعت'' سے نکالی ہے جو نہایت موزوں ہے۔

بہاء الحق والدین طاب مثواه — امام سنت و شیخ جماعت

چو معرفت از جہان این بیت بخواند　　بر اہل فضل و ارباب براعت
بطاعت قرب ایزد متوان یافت　　قدم درنہ گرت ہست استطاعت
بدین دستور تاریخ وفاتش　　بردن شد از حروف "قرب طاعت"[۹۰]

ظاہر ہے اس قطعہ میں عبادت گزاری کی شان اور اس کی برکتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے ساتھ ہی عبادت گزاری کے صلے میں خدا کی قربت ملنا بعید از قیاس نہیں ہے۔ "قرب طاعت" سے ۷۸۲ اعداد نکلتے ہیں۔

آٹھواں قطعہ تاریخ وفات حافظ نے اپنے ممدوح خاص شاہ شجاع کی وفات پر تحریر کیا ہے۔ شاہ شجاع کی طرز حکومت کو حافظ کا تو ٹی بھلے ہی مل گیا ہو لیکن اس کے دامن پر اورنگ زیب جیسے داغ موجود ہیں۔ اس نے اپنے باپ کو قید ہی نہیں کیا بلکہ نابینا بھی بنا دیا جیسا کہ بہاء الدین خرمشاہی نے تحریر کیا ہے:

"جلال الدین ابوالفوارس شاہ شجاع (۷۳۳-۷۸۶) فرزند
امیر مبارز الدین، فرصت نداد کہ پدرش در گذرد و سلطنت را بہ او
بسپارد.... پدر را گرفت و نابینا ساخت (کہ پنج - شش سال اخیر
عمرش در نابینائی و حبس گذشت)"[۹۱]

اس کے علاوہ شاہ شجاع کے دور حکومت کی تعریف اور اس کی خوبیوں کی وضاحت ہر تاریخ میں موجود ہے۔ اس کے دور کا ایک بڑا حصہ عوام کے لیے سکون کا باعث رہا۔ اس نے ۲۶ سال حکومت کی "آثار و افکار و احوال حافظ" سے پتہ چلتا ہے کہ:

"شاہ شجاع مدت بیست شش سال سلطنت کرد و حوادث مہم دورۂ
زندگی او شرحی است کہ در دو این تاریخ مذکور شد مورخین آن دورہ
ہمہ او را بہ نیکی یاد کردہ صفات پسندیدہ با و نسبت دادہ اند کہ
از مجموع متوان استنباط کرد کہ برای زمان خود پادشاہ خوبی بودہ
قدر مسلم این است کہ من حیث المجموع باید او را بہترین فرد
خانوادہ آل مظفر شمرد۔"[۹۲]

یہی وجہ تھی کہ حافظ بھی اس کے گرویدہ ہو گئے اور اپنی غزلوں میں بھی اس سے والہانہ محبت کا اظہار کیا۔ ایک غزل کے مطلع میں اس کے دور میں امن و آشتی کا بیان اس طرح کرتے ہیں:

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش
کہ دور شاہ شجاع است می دلیر بنوش[۹۳]

ایک اور غزل میں اس کی دین پروری کا احساس کراتے ہیں۔ وہ بھی خدا سے مخاطب ہو کر:

داور دین شاہ شجاع آنکہ ہست
روح قدس حلقہ امرش بہ گوش

اسی طرح ایک غزل کے آخری شعر میں اس کے عالم با عمل ہونے کی دلیل دیتے ہوئے صنعت تنسیق الصفات کا مظاہرہ کرتے ہیں:

مظہر لطف ازل روشنی چشم امل
جامع علم و عمل جان جہان شاہ شجاع[۹۴]

اگر شعر کی دیگر اور بھی خوبیاں بیان کی جائیں تو مقالے کے طویل ہونے کا خدشہ ہے۔ مختصر طور پر امل، عمل، علم، جان، جہان جیسے الفاظ میں کتنی ہی طرح کے صنعت جناس نظر آتی ہیں۔ غرض کہ حافظ کی غزلوں میں جگہ جگہ شاہ شجاع کا تذکرہ ملتا ہے۔ حافظ نے شاہ شجاع کی تاریخ "رحمان لایموت" سے موزوں کی ہے۔ اس ترکیب کے معنی پر جتنے بھی پہلوں سے غور کیا جائے اس کی وسعت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ جن دو الفاظ سے اس قطعے کا آغاز ہوا ہے انھیں پر اختتام بھی ہوتا ہے ساتھ ہی اس کے ذریعے کی گئی نیکیوں کے صلہ کی امید کا فیصلہ بھی کر دیا گیا ہے:

رحمان لایموت چو آن پادشاہ را　　کرد آن چنان کزو عمل خیر لایفوت
جانش غریق رحمت حق کرد تا کند　　تاریخ این معاملہ "رحمان لایموت"[۹۵]

اس تاریخ سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ۷۸۶ اعداد طے نہیں ہو سکے تھے ورنہ حافظ اس سے بھی فیض ضرور حاصل کرتے۔ شاہ شجاع کی وفات کا تذکرہ "آثار و افکار و احوال حافظ" میں مندرجہ ذیل ہے:

"ولادت شاہ شجاع در بیست و دویم جمادی الآخر سنہ ثلثین و
سبعمائۃ و وفات او در بیست و دویم شعبان ہشتاد و سہ سال و دو ماہ عمر
یافت۔"[۹۶]

شاہ شجاع کی ایک اور تاریخ حافظ سے منسوب ہے جو کسی دیوان میں نہیں ملتی کتاب مذکور میں کریم خاں زند کے حوالے سے مندرجہ ذیل تاریخ نقل کی گئی ہے۔

"حیف از شاہ شجاع"[۹۷] ۷۸۶ء۔ اس تاریخ میں غم واندوہ کی مکمل تصویر موجود ہے۔ نویں تاریخ حافظ نے اپنے بھائی خواجہ عادل کی دریافت کی ہے۔ نول کشور میں یہ نام خواجہ طالب ہے۔ ممکن ہے وہ دونوں ناموں سے اپنے بھائی کو پکارتے ہوں۔ لیکن کتابوں میں ان کا نام خواجہ خلیل عادل ملتا ہے۔ جیسا کہ "فرہنگ دو ہزار واژہ" میں ہے:

''خواجہ خلیل عادل برادر خواجہ حافظ است۔'' تاریخ مندرجہ ذیل ہے:

برادر خواجہ عادل طاب مثواہ ۔۔۔ پس از پنجاہ و نہ سال از حیاتش
سوی روضہ رضوان سفر کرد ۔۔۔ خدا راضی ز افعال و صفاتش
خلیل عادل پیوستہ برخوان ۔۔۔ وزانجا فہم کن سال ''وفاتش''[۴۸]

لفظ ''وفاتش'' سے ۷۸۷ھ اعداد نکلتے ہیں۔ حافظ کے اس قطعۂ تاریخ کے نقوش اتنے مضبوط ہیں کہ آج تک فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں قطعہ تاریخ لکھنے کے لیے اسی طرح کے مضامین رائج ہیں۔

دسویں تاریخ خواجہ قوام الدین صاحب عیار کی تحریر کی گئی ہے ان کی وفات بھی ۷۸۶ھ میں ہی ہوئی تھی۔ یہ خواجہ حافظ کے استاد تھے اور ان کی مجلس میں خود شاہ شجاع حاضری دیتا تھا۔ جیسا کہ ''فرہنگ دہخدا'' جلد ۲۶ میں تحریر ہے:

''قوام الدین: عبداللہ از قراء معروف و استاد خواجہ حافظ شیراز است۔
شاہ شجاع نیز بمجالس درس مولانا قوام الدین حاضری شد۔''[۴۹]

فی مرثیہ خواجہ قوام الدین صاحب عیار

اعظم قوام دولت و دین آنکہ بر درش ۔۔۔ از بہر خاک بوس نمودی فلک سجود
با آن وجود و آن عظمت زیر خاک رفت ۔۔۔ در نصف ماہ ذی قعد از عرصہ وجود
تا کس امید جود ندارد دگر ز کس ۔۔۔ آمد حروف سال وفاتش امید جود[۵۰]

حافظ کے دیوان کے تمام نسخوں میں ایک بہت بڑی کمی یہ ہے کہ کسی بھی تاریخ وفات کے ساتھ اعداد میں سنہ درج نہیں کی گئی ہے جس سے قاری و ناقد کو کافی زحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً مندرجہ بالا تاریخ میں ''اگر آمد حروف سال وفاتش'' پڑھا جائے تو ۷۸۶ عدد حاصل ہو جاتے ہیں لیکن محمود فرزاد کے تصحیح کردہ دیوان میں ''امید جود'' یعنی امید کی ''د'' پر ایک نقطہ لگا کر تاریخ وفات کی نشاندہی کر کے پہلے مصرع کے ''امید جود ندارد'' سے فائدہ اٹھا کر تاریخ کے اعداد ۶۴۲ بتائے گئے ہیں۔ حافظ کی غزلیات میں بھی حاجی قوام الدین کا ذکر مل جاتا ہے۔

گیارہویں شخص اور بارہویں تاریخ وفات توران شاہ کی ہے۔ جو شاہ شجاع کا پر اعتماد اور وفادار وزیر ہے۔ جس نے شاہ شجاع کے فراری دور میں بھی اس کی نیابت کی اور مکمل حمایت کرتا رہا۔ جب جب اس نے شاہ شجاع کو مصیبتوں اور مشکلوں سے نجات دلائی حافظ نے اپنی غزل میں اس کی مدح سرائی کی ہے۔ تورانشاہ کے بارے میں ''آثار و افکار و احوال حافظ'' میں مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے:

''در موقعیکہ شاہ شجاع بابرقوہ رسید خواجہ جلال الدین تورانشاہ کہ

از طرف شاہ شجاع حاکم آنجا بود بخدمت گزاری شاہ شجاع قیام نمودہ تا آخر حیات شاہ شجاع سلک وزرائی او بود و در زمان سلطان زین العابدین نیز روزی چند وزارت داشت این وزیر مذکور بخواجہ حافظ محبت داشتہ و در مدت طولانی وزارت خود ہمیشہ با وی نیکی نمودہ است''[۵۱]

توران شاہ حافظ کو خوب نوازتا تھا۔ اسی لیے حافظ نے اس کی مدح سرائی بھی کی اور تاریخ وفات بھی ''میل بہشت'' ۷۸۹ھ سے برآمد کی۔

بمرثیہ الصاحب السعید خواجہ توران شاہ

آصف عہد و زمان جان و جہان توران شاہ ۔۔۔ کہ در این مزرعہ جز دانۂ خیرات نکشت
ناف ہفتہ بد و از ماہ صفر کاف و الف ۔۔۔ کہ بہ گلشن شد و این گلخن پر دود بہشت
آن کہ میلش سوی حق بینی و حق گویی بود ۔۔۔ سال تاریخ وفاتش طلب از ''میل بہشت''[۵۲]

پہلا مصرع اکثر نسخوں میں ''آصف عہد زماں جان جہان تورانشاہ'' ملتا ہے۔ اور یہی زیادہ بہتر ہے۔ حافظ شیرازی کی برآمد کی ہوئی اس تاریخ پر دکتر قاسم نے جو تبصرہ کیا ہے وہ اس طرح ہے:

''بہترین شاہد علاقۂ محبت مخصوص خواجہ حافظ باین وزیر قطعہ ای است کہ در تاریخ وفات او سرودہ است و در آن صفات ممتازہ و مکارم اخلاق او را ستودہ و او را بصفت خیر خواہی و حق بینی و حق گوئی یاد کردہ است''۔[۵۳]

حافظ نے اپنی غزلوں میں بھی توران شاہ کو مختلف ناموں سے یاد کیا ہے جیسے آصف عہد، آصف دوران، آصف ثانی، خواجہ، وزیر، خواجہ جہان وغیرہ۔ مندرجہ بالا قطعے میں بھی آصف عہد زمان اور جان جہان جیسے القابات سے شروع کر کے دوسرے مصرع میں توران شاہ کی تشبیہ ایک ایسے کھیت یا چھوٹے سے گاؤں سے دی ہے کہ جہاں خیرات کے دانوں کے علاوہ کچھ اور اگتا ہی نہیں ہے۔ یہ مبالغہ سخاوت کا انداز بالکل انوکھا ہے۔ اور وہ سوائے حق کے نہ کچھ دیکھتا ہے اور نہ کچھ کہتا ہے۔ لہٰذا ان اعلیٰ صفات کی بنیاد پر جنت ہی اس کی منزل ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ حافظ نے اپنے ان بارہ تاریخی قطعات میں تاریخ گوئی کی دونوں قسموں ''صوری اور معنوی'' کا بخوبی استعمال کیا ہے۔ اس میں بھی پہلے سے رائج صوری تاریخ میں صرف تین مصرعے ہیں جب کہ معنوی میں دو مصرعے اپنی نوعیت سے جداگانہ فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ خصوصاً وہ

مصرع جس میں بلبل و سرو و سمن و یاسمن و لالہ و گل سے تاریخ نکالی گئی جو آنے والے تاریخ گویوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا ہے۔ اس طرح ہم حافظ شیرازی کو فن تاریخ گوئی کا پہلا باقاعدہ شاعر کہہ سکتے ہیں۔

حواشی:

۱- تاریخ الشعر العربی الحدیث از احمد قبش، ص ۱۵
۲- ایضاً، ص ۱۷
۳- دیوان حافظ (۱) نول کشور، ص ۹
۴- دیوان نظیری، مخطوطہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نمبر صفحات نہیں ہیں (دوسرا صفحہ)
۵- تذکرہ میخانہ، ملا عبدالنبی فخر الزمانی قزوینی باہتمام احمد گلچین، ص ۱۰۵ حاشیہ
۶- کرامات نظامیہ، ص ۹
۷- فرہنگ آصفیہ، جلد ۱، ص ۵۹۱
۸- ایضاً، ص ۹۱
۹- ایضاً، ص ۹۲
۱۰- ریاض الشعرا، علی قلی خان والہ داغستانی، رامپور، ص ۳۶۳
۱۱- تذکرہ نصرآبادی، مرزا محمد طاہر نصرآبادی، ص ۳۶۹
۱۲- انواع شعر، ڈاکٹر منصور رستگار فسائی، انتشارات نوید شیراز، ص ۳۳۲
۱۳- چکیدہ تاریخ ادبیات ایران، ڈاکٹر منظر امام، آکابستان، ص ۳۰
۱۴- دیوان مسعود سعد سلمان، ص ۳۹۳
۱۵- تذکرۃ الشعرا، مذکور، ص ۱۵۷-۱۵۶
۱۶- تذکرہ نصرآبادی، مرزا محمد طاہر نصرآبادی، ص ۳۶۹
۱۷- حافظ از بہاءالدین خرمشاہی، ص ۵
۱۸- بحث در آثار و افکار و احوال حافظ، ص ۱۱۷
۱۹- ایضاً، ص ۱۱۹
۲۰- دیوان حافظ (۲) تصحیح ڈاکٹر اکبر بہروز و رشید عیوضی، ص ۵۱۱
۲۱- دیوان حافظ (۱) مذکور، ص ۳۱۵

۲۲- حافظ شیریں سخن، ص ۱۸۲
۲۳- تاریخ عصر حاضر، ص ۱۲۲
۲۴- بحث در مذکور، ص ۱۲۱
۲۵- فرہنگ دہخدا، ج ۲۹، ص ۵۰۶
۲۶- دیوان حافظ (۲) مذکور، ص ۱۱۵
۲۷- ایضاً، ص ۵۳۵
۲۸- ایضاً، ص ۵۵۰
۲۹- فرہنگ روزبہار، دو ڈاکٹر ابوالفضل مصطفی، ص ۵۷
۳۰- دیوان حافظ (۲) مذکور، ص ۵۳۹
۳۱- دیوان حافظ (۱) مذکور، ص ۳۱۶
۳۲- ایضاً، ص ۳۱۷
۳۳- دیوان حافظ (۱) مذکور، ص ۳۱۶
۳۴- فرہنگ روزبہار، مذکور، ص ۵۲
۳۵- دیوان حافظ (۱) مذکور، ص ۳۱۴
۳۶- دیوان حافظ (۲) مذکور، ص ۵۳۸
۳۷- ایضاً، ۳۷۸
۳۸- فرہنگ روزبہار، مذکور، ص ۳۰۲
۳۹- دیوان حافظ (۱) مذکور، ص ۳۱۶
۴۰- حافظ مذکور، ص ۹
۴۱- بحث در آثار و افکار و احوال حافظ مذکور، ص ۳۲۳
۴۲- دیوان حافظ (۲) مذکور، ص ۳۲۹
۴۳- ایضاً، ص ۳۰۵
۴۴- دیوان حافظ (۱) مذکور، ص ۳۱۶
۴۵- بحث در مذکور، ص ۳۲۳
۴۶- ایضاً، ص ۳۲۳

۴۷- فرہنگ دو ہزار واژہ، ص ۵۷۱

۴۸- دیوان حافظ (۲) مذکور، ص ۵۳۹

۴۹- فرہنگ و تحقیقات ۲۶، ص ۵۰۶

۵۰- دیوان حافظ (۱) مذکور، ص ۴۱۵

۵۱- بحث در: مذکور، ص ۱۸-۴۱۷

۵۲- دیوان حافظ (۲) مذکور، ص ۵۴۷

۵۳- بحث در: مذکور، ص ۳۶۸

☆☆☆

محمد منور مسعودی*

کشمیر میں فارسی ادب
ایک بازگشت

تہذیب و تمدن اور فرہنگ و ثقافت میں اثر و نفوذ کا عمل ایک فطری عمل ہے۔ ہر بڑی تہذیب اپنی وسعت اور گہرائی کے بموجب دوسری تہذیبوں پر اپنے اثرات مرتسم کرتی ہے اور کبھی کبھی پوری قوم کی قلب ماہیت کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کی وہ تصویر جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے دکھائی دیتی ہے اس تصویر سے بالکل مختلف ہے جو وسط ایشیائی اثرات کے نتیجہ میں منتقل ہوئی۔ وسط ایشیا کے ساتھ کشمیر کے تعلقات بہت پہلے استوار ہو چکے تھے اور رفتہ رفتہ یہاں فارسی زبان اور وسط ایشیائی کلچر کا رواج ہوا۔ فارسی بولنے والے افراد و اشخاص کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب مسلمانوں کی ایک خاصی بڑی تعداد یہاں موجود تھی جو فارسی سے آشنا تھی۔ ان میں کچھ فارسی دان علما بھی موجود تھے۔ جن میں حضرت سید شرف الدین عبد الرحمٰن بلبل شاہ کے رفیق مولانا احمد علامہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ سلطان شہاب الدین کشمیری کے زمانے تک موجود تھے۔ ''فتاوائے شہابی'' ان کی مشہور فارسی تصنیف ہے۔ زین العابدین بڈشاہ کے دربار کے ملک الشعرا ملا احمد کشمیری ان ہی کے نواسے تھے۔ اسی زمانے میں فارسی زبان و ادب کا چلن کشمیر میں عام ہونے لگا تھا جب علما اور صوفیائے کرام تبلیغ دین کے جذبے کے تحت اس سرزمین میں آنے لگے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی عقائد کا دائرہ وسط ایشیا کے ممالک اور ترکستان تک پھیل چکا تھا۔ یہ ان ہی بزرگان دین کی تعلیم حق و صداقت کا فیض تھا کہ دیکھتے دیکھتے فارسی زبان و فرہنگ پوری وادی میں پھیل گئی۔ کشمیر برصغیر کا وہ واحد خطہ ہے جہاں مسلمان فاتح کی شکل میں نہیں بلکہ مبلغین کی حیثیت سے آئے اور جہاں اسلام تبلیغ کے ہی ذریعہ پھیلا۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ کشمیر میں اسلام عربوں کے ذریعہ سے نہیں بلکہ وسط ایشیائی مسلمان صوفیا کے ہاتھوں پروان چڑھا۔ تاریخ کے صفحات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر میں مسلمان مبلغین کی آمد سے قبل کشمیری معاشرہ

---

* پروفیسر و صدر شعبۂ فارسی، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر

طبقاتی نظام اور اس کے وحشتناک نتائج کا شکار ہو چکا تھا۔ چند با اقتدار اشخاص کو چھوڑ کر تقریباً ہر طبقہ زندگی بسر کرنے کے بنیادی وسائل سے محروم تھا۔ اسلامی نظام زندگی اور نظام معیشت ان حالات میں لوگوں کے لیے زبردست پناہ گاہ تھی جہاں وہ آزاد فضا میں کھل کر سانس لے سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی آمد کے ساتھ ہی کشمیری عوام کا ایک کثیر طبقہ اسلامی نظام کے زیر سایہ آ گیا اور اگرچہ اسلام کی آمد سے کشمیری معاشرہ کی قلب ماہیت ہوئی لیکن چودھویں صدی عیسوی کی نصف دہائی تک پرانی حکومت ہی قائم رہی۔ اس وقت تک امور سلطنت کے اہم عہدے برہمنوں کے ہی ہاتھوں میں تھے اور اس عہد حکومت کے زوال کے بعد بھی بہت عرصے تک سنسکرت یہاں کی سرکاری زبان رہی۔ اس کی ایک بین مثال حضرت خواجہ بہاؤ الدینؒ کے مقبرے کے صحن میں نصب سنسکرت کا ایک کتبہ ہے۔ یہ کشمیر پر سلطان محمد شاہ (۱۴۸۴ء کا زمانہ تھا (۱) اسٹائن نے اپنے "مقدمہ راج ترنگنی" میں ایسے بہت سے دوسرے کتبوں کی نشاندہی کی ہے جو سرینگر اور اس کے اطراف کے مقبروں پر ملتے ہیں۔ ان کتبوں کی صحیح تاریخ کا علم نہیں ہے۔ سلطان صدر الدین (۲) کشمیر کا پہلا مسلمان بادشاہ ہے۔ وہ لداخی تھا اور چودھویں صدی کے اوائل میں عارف باللہ حضرت بلبل شاہ کی تبلیغ دین سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا۔ سلطان صدر الدین کے قبول اسلام کے فوراً بعد اس کے اعزا اور دربار کے دوسرے بڑے حکام نے بھی اسلام قبول کیا۔ بلبل شاہؒ نے ۱۳۲۷ء مطابق ۷۲۷ھ میں وفات پائی اور محلہ بلبل لنگر میں مدفون ہوئے (۳) ان کی وفات کے بعد جن سادات کی جماعت نے سرزمین کشمیر کو مشرف بہ اسلام کیا ان میں سید جلال الدین معروف بہ مخدوم جہانیان، سید تاج الدین اور سید حسین سمنانی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ لیکن مقامی تذکروں میں ان مبلغین کے تبلیغی کام کا تفصیلی ذکر موجود نہیں۔

کشمیر میں دین اسلام کو وسعت دینے اور ایک مشن کی حیثیت میں اسے پروان چڑھانے کا کام حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کے ہاتھوں انجام پایا۔ جنہیں کشمیری احتراماً شاہ ہمدانؒ کے نام سے یاد کرتے ہیں (۴) شاہ ہمدان کے اس تبلیغی کام کو ان کے زمانے میں ان کے ہمراہ آئے ہوئے میر سید حیدر، سید جمال الدین، سید کمال، سید کمال ثانی، سید جمال الدین علائی، سید فیروز (جنہیں سید جلال بھی کہتے ہیں) سید محمد کاظم، سید رکن الدین، سید محمد قریشی اور سید عزیز اللہ جیسے مبلغین نے آگے بڑھایا اور کشمیر میں اسلام پوری آب و تاب کے ساتھ پھیلنے لگا۔ شاہ ہمدانؒ کے ساتھ سادات کی ایک بہت بڑی جماعت آئی تھی جن کی تعداد مقامی تاریخوں میں سات سو لکھی گئی ہے۔ ان میں زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل تھے جن میں سے بیشتر کشمیر کے مختلف گوشوں میں خدمت دین کی خاطر مستقل طور پر یہیں مقیم ہو گئے اور اس طرح خدمت دین کے ساتھ ساتھ فارسی زبان و ادب اور فرہنگ کی بھی بھرپور خدمت ہوتی رہی۔

یہاں تک کہ فارسی تہذیب و تمدن اور زبان نے عوام کے دلوں میں گھر کر لیا۔ یہ زبان رفتہ رفتہ شعر و ادب کی وساطت سے آگے بڑھ کر سرکاری کارناموں کے لیے بھی استعمال ہونے لگی اور یہاں کی سرکاری عدلیہ اور مراسلت کی زبان بن گئی۔ کشمیر کی سلطان زین العابدین بڈشاہ کے وقت تک اس زبان کو پوری طرح درباری سرپرستی اور حوصلہ افزائی حاصل ہو چکی تھی۔ گویا ایک نئی تہذیب کا اب مکمل نفاذ ہونے لگا تھا اور فن موسیقی سے لے کر یہاں کے رہن سہن اور آداب معاشرت پر اس تہذیب و تمدن کا غلبہ ہوا۔

کشمیر میں فارسی کی نشو و نما کے ضمن میں ہمارے سامنے تین اہم ادوار ہیں جو اس سلسلے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں بالترتیب پہلا عہد کشمیری عہد ہے جو تقریباً ۲۲۲ سال کے طویل عرصہ پر حاوی ہے۔ ۱۳۳۹ء مطابق ۷۴۳ھ سے شروع ہو کر ۱۵۵۴ء مطابق ۹۶۲ھ پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرا عہد سلاطین چک کا عہد ہے جو ۱۵۵۴ء مطابق ۹۶۲ھ سے شروع ہو کر ۱۵۸۵ء مطابق ۹۹۴ھ پر ختم ہوتا ہے۔ تیسرا عہد مغلوں کا عہد ہے جو اس موضوع سخن کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ مغلوں کا زمانہ کشمیر میں ۱۵۸۶ء مطابق ۹۹۴ھ سے شروع ہو کر ۱۷۵۲ء مطابق ۱۱۶۶ھ پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ ہم یہاں پر مختصر ان ادوار کے فارسی ادب کے اسلوب بیان پر نظر ڈالیں گے اور یہ کوشش کریں گے کہ فارسی ادبیات کے اسلوب نگارش کا ایک مبسوط نقش ابھر کر سامنے آئے جس سے اس بات کے تعین میں آسانی ہو سکے کہ اس عرصہ میں فارسی نثر و نظم کی نشو و نما کس طرح ہوئی اور کس قدر پیش رفت ہوئی۔

کشمیری دور:

کشمیری عہد میں سلطان قطب الدین کا عہد کشمیر میں فارسی زبان و ادب اور علم و فن کے ارتقا کے آغاز کا زمانہ ہے۔ قطب الدین ۱۳۵۴ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۳۷۳ء تک حکومت کی۔ اس خاندان کا پہلا بادشاہ شاہ میر شمس الدین ۱۳۳۹ء میں تخت نشین ہوا اسی زمانے میں ۱۳۴۰ء میں سید امیر کبیر پہلی کشمیر تشریف لائے اور دوسری بار سلطان قطب الدین کے زمانے میں ۷۸۱ھ میں سات سو سادات کے ساتھ وارد کشمیر ہوئے۔ امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کا تفصیلی ذکر راقم کی دوسری کتاب تاریخ کشمیر میں بہ تفصیل آ چکا ہے۔ راقم نے علاوہ ازیں شاہ ہمدان کی کشمیر میں فارسی خدمات کے سلسلے میں پروفیسر شمس الدین احمد صاحب کی نگرانی میں ایک مبسوط تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے تاہم یہاں پر ان کی دینی خدمات کے ساتھ ساتھ فارسی زبان ادب کی ترویج و اشاعت پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے۔

شاہ ہمدانؒ نہ صرف مبلغ دین اسلام تھے بلکہ فارسی زبان کے ایک اچھے شاعر اور مصنف بھی تھے شاہ ہمدان کی تصنیفات کی تعداد سو سے زائد بتائی جاتی ہے جن میں سے بیاسی (۸۲) کے قریب ان کی فارسی اور عربی تصانیف اور مراسلات آج بھی دستیاب ہیں۔ ان میں چالیس سے زائد رسالے اور

تصانیف فارسی زبان میں ہیں جن میں ذخیرۃ الملوک اور شاہ ہمدان کی غزلیات کا مجموعہ ''چہل اسرار'' خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ کشمیر میں فارسی زبان کا اہم دور سید علی ہمدانی کی آمد سے شروع ہوتا ہے اور ان ہی کی خدمات کے نتیجہ میں یہاں جو ملا جلا ایرانی کلچر ابھرا، اس کی وجہ سے کشمیر ایران صغیر کے نام سے موسوم ہوا۔ کشمیر میں فارسی کا عام چلن آپ ہی کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ ان کی باقی تصنیفات میں ''حکومت وعرفان علوم باطنیہ، اختیارات منطق در تصوف، رسالہ دہ قاعدہ، رسالہ در تحقیق ذات، رسالہ در اثبات تشیع اور رسالہ چہل مقام وعقبات وغیرہ شامل ہیں۔

نمونہ کلام:

ارباب ذوق درغم تو آرمیدہ اند   از شادی و نعیم دوعالم رمیدہ اند
حوران خلد راہ بہشتری نمی خرند   تا از صفات روی تو رمزی شنیدہ اند

تیر عشقش کز کمان ابروان گرد ورہا   عقل را صید وز دو قصد دل وجا میکند

قطب الدین خود بھی شاعر اور عالم تھا قطب الدین پورہ اسی نے آباد کروایا تھا جو بعد میں علم وادب کا مرکز بن گیا۔ خواجہ اعظم نے واقعات کشمیر میں لکھا ہے کہ ''باوجود شغل ملکی بمکمل کمالات علمی بسیار داشت'' شعر وسخن سے بھی اسے دلچسپی تھی اور قطب تخلص کرتا تھا۔ اس کی ایک غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

ای جگر و شمع روبیت عالمی پروانۂ   وزلب شیرین تو شوریست در ہر خانۂ
من بہ چندین آشنائی می خورم خون جگر   آشنا را حال اینست وای بر بیگانۂ

قطب کی اس غزل میں زبان کی شستگی۔ بندش کی چستی اور جذبات کی گداختگی ایک حکمران کی فکر کے لئے قابل تحسین تھے اپنے بسائے ہوئے شہر قطب الدین پورہ میں سلطان نے ایک دار العلوم بھی قائم کیا تھا جو بعد میں علم دین اسلام اور فارسی علم وادب کی تعلیم کا مرکز بن گیا۔ یہ دار العلوم سکھوں کے عہد تک قائم تھا چنانچہ اس دار العلوم نے فارسی علم وادب اور شاعری کا ذوق وشوق پیدا کرنے میں بنیادی خدمات انجام دیں۔ یہاں کے فارغ التحصیل علما میں شیخ رحمت اللہ تارہ بلی، غنی، نافع، خواجہ قاسم ترمزی اور ملا محمد کالوس کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسی دور میں ایک اور ادارہ ''عروۃ الوثقی'' کے نام سے جمال الدین محدث نے قائم کیا تھا۔ سید جمال الدین محدث حضرت امیر کبیرؒ کے ساتھ کشمیر آئے تھے۔ جو بعد میں سلطان قطب الدین کے اصرار پر یہیں رہ گئے۔ حضرت امیر کبیر کی آمد سے قبل بھی کشمیر میں فارسی کے اچھے شاعر موجود تھے چنانچہ سید محمد خاوری نے جو ایک مشہور عالم اور شاعر تھے امیر کبیر کی کشمیر میں تشریف آوری کے موقع پر قطعۂ تاریخ کہا تھا جو حسب ذیل ہے:

میر سید علی شہ ہمدان   سیر اقلیم سبعہ کردہ بجو
شد مشرف زمقدمش کشمیر   وزش آن شہزادہ ہدایت جو
سال تاریخ مقدم او را   گفتم از مقدم شریف بجو

واقعات کشمیر کے مصنف نے لکھا ہے کہ ''از رفقا وسادات وخدمہ قریب ہفتصد کس ہمراہ آنجناب بودند خاص وعام این ولایت را بارشاد وہدایت رہنمائی نمودند''

ان سات سو سادات میں سے امیر کبیر کے واپس لوٹنے کے بعد جو لوگ یہاں رہ گئے ان میں حاجی محمد قاری، سید جلال الدین محدث، مولانا احمد، سید عماد الدین، سید جمال الدین محمد شاہ، سید کمال الدین ثانی، سید فیروز، سید محمد کاظم، سید رکن الدین، سید فخر الدین، سید محمد قریشی، سید احمد قریشی، سید بہاؤ الدین اور سید کبیر بیہقی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

حاجی محمد قاری دار العلوم کے بانی ہونے کے ساتھ ساتھ صدر اور مہتمم بھی تھے۔ فارسی کا شعری ذوق بھی رکھتے تھے کلام کسی مجموعہ کی شکل میں موجود نہیں۔ البتہ بعض تذکروں میں ان کے مختلف اشعار ملتے ہیں مثلاً زندگی کے آخری وقت میں جب انہیں مرض شدید ہوا تھا یہ اشعار ان کی زبان پر تھے۔

زین جہان رنجیم و دل برداشتیم   این جہان را با جہان بگذاشتیم
انچہ بنشستیم از دست اجل   وادریغا ما غلط پنداشتیم

قطب الدین کے بعد سکندر کے عہد میں حضرت امیر کبیر کے فرزند سید میر محمد ہمدانی ۷۹۶ھ میں کشمیر آئے آپ کے ہمراہ بھی سادات علما اور فضلا کی خاصی تعداد کشمیر آئی۔ ان سے نہ صرف دین کو بلکہ فارسی زبان کو بھی خاصی ترویج وترقی ملی۔ سہہ بٹ آپ ہی کے ہاتھ پر ایمان لایا اور ملک سیف الدین کے نام سے مشہور ہوا۔ حضرت سید محمد ساری عمر کشمیر میں ہی رہے اور ان کے رفقا نے اسلامی تعلیمات کی ترویج واشاعت میں بڑی خدمت انجام دی اور قدرتی طور پر اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ فارسی بھی پھلتی پھولتی رہی۔ اس دور کے دوسرے فارسی علما میں سید تاج الدین بیہقی سکندر کا بیٹا حاجی خان، مولانا احمد وغیرہ قابل ذکر ہیں بدقسمتی سے ان کی تخلیقات دستیاب نہیں۔ ان کے بعد سلطان زین العابدین کا دور شروع ہوتا ہے۔ سلطان زین العابدین کے آتے آتے فارسی نے کشمیر میں اپنی دنیا خاصی وسیع کر لی تھی۔ لیکن فارسی ادب، شاعری اور دیگر علوم وفنون کے لحاظ سے زین العابدین کا زمانہ زیادہ درخشان ہے۔ اس زمانے میں ملک کشمیر کے دیگر ممالک سے روابط خاصے استوار تھے اور زین العابدین کی علم پروری اور انسان دوستی بیرونی اشخاص کے لیے بھی باعث کشش تھی۔ ان کے دربار میں علما اور شعرا کا ہجوم رہتا تھا۔ ان میں سربرآوردہ شعرا اور علما حسب ذیل ہیں۔ ملا احمد کشمیری، مولوی کبیر، ملا پارسا، ملا ندیمی،

ملا فصیحی، ملا جمیل، ملا احمد رومی، ملا محمد رومی، ملا نور الدین، ملا علی شیرازی، مولانا حسین غزنوی، مولانا سید محمد منطقی، ملا حافظ بغدادی، مولانا جمال الدین، قاضی میر علی، سید ناصر الدین بیہقی، حضرت سید نصیر الدین زینہ کدلی، اور مولانا سید محمد قادری کی 'شرح لمحات' اور ان کے "خاور نامہ" کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

اسی زمانے میں سلطان زین العابدین نے ایک "دار الترجمہ" بھی قائم کیا جس میں علما ترجمہ کا کام انجام دیتے تھے جن میں دار العلوم کے بیشتر اساتذہ بھی شامل تھے۔ دار العلوم کا ذریعہ تعلیم فارسی تھا۔ زین العابدین کی درباری اور نظم و نسق کی زبان فارسی ہی تھی۔ دار الترجمہ میں عربی اور سنسکرت کی اہم کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ سنسکرت سے ترجموں کے لیے سوبرا، سوم پنڈت اور بودھی بٹ کی خدمات بھی دار الترجمہ کو حاصل رہیں۔ یہ پنڈت فارسی اور عربی کے عالم تھے ملا احمد کشمیری نے ان کی مدد سے "مہابھارت" اور پنڈت کلہن کی مشہور تاریخ راج ترنگنی کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔ ویدوں اور شاستروں کے بھی فارسی میں ترجمے ہوئے۔ "کتھا سرت ساگر" کا ترجمہ بھی ملا احمد کشمیری نے "بحر الاسمار" کے نام سے فارسی میں کیا تھا۔ محمد اعظم دیدہ مری نے واقعات کشمیر میں لکھا ہے کہ:

"در عہد سلطان زین العابدین فضلا و شعرای بسیار در کشمیر بودند،
چہ از مولد ولایت و چہ از متولدان این شہر تمام لطافت، چو کس ضبط
نہ کرد، حالات شان مستور ماند۔"

فارسی زبان کی ترویج کا سلطان کو اس قدر شوق تھا کہ وہ پنڈت لڑکوں کو وظیفہ دیکر مدرسوں میں شریک کرواتا تھا اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہیں اعلیٰ عہدوں پر مقرر کرتا تھا۔ پنڈتوں میں فارسی کے رواج پانے اور ان میں اونچے درجے کے شاعر اور انشا پرداز پیدا ہونے کا بڑا سبب بڈشاہ کی ہی ہمت افزائی اور سرپرستی تھی۔

بیہقی خاندان نے بھی اس زمانے میں فارسی کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے سید حسین بیہقی کی "ہدایت الاعمیٰ" جو اسلامی عقاید اور مسائل پر مبنی ہونے کے علاوہ فارسی زبان و ادب کا ایک بہترین شاہکار بھی ہے۔ جب حسن شاہ تخت سلطنت پر بیٹھا تو اس کے عہد کا ایک اہم واقعہ میر شمس عراقی کی کشمیر میں آمد ہے شمس عراقی سے متعلق تواریخ اور تذکروں میں تفصیلی بحث ملتی ہے۔ پیرزادہ حسن کھویہامی اپنی کتاب تاریخ کشمیر میں لکھتے ہیں کہ:

"در سنہ ۸۹۲ میر شمس عراقی از جانب سلطان حسین میرزا والی
خراسان بطور سفارت بکشمیر آمدہ، مراسلہ شاہی معہ یک پوستین
کیشی از پوشش خاص سلطان بہ حسن شاہ ارمغان آوردہ پیغام

فرستادن بعضی تحائف و نفائس کشمیر کہ خواہش خاطر سلطان
خراسان بود ظاہر ساخت"۔ ص ۲۱۱

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد حسن شاہ کا انتقال ہو گیا اٹھ سال تک میر شمس عراقی کشمیر میں رہے اور بقول تاریخ حسن:

"ظاہر اور سلک مریدان بابا اسمٰعیل در آمدہ در باطن بابا علی نجار را
مذہب شیعہ مرغوب ساختہ خود بجانب خراسان رجعت نمود، و در
عہد فتح شاہ باز بکشمیر آمدہ مذہب شیعہ را رواج کلی داد۔" ص ۲۱۱۔

شمس عراقی نے شیعہ عقاید پر فارسی میں "احوط" نام کی ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی شیعہ عقاید کی تبلیغ و اشاعت بعد میں کشمیر کے امرا اور عوام کے اختلافات اور زبردست مخاصمت کی ایک وجہ بن گئی اور آخر کار شمیریوں کے پروردہ چک خاندان کے ہاتھوں جنھوں نے شیعہ عقاید قبول کر لیے تھے، شمیری خاندان کا خاتمہ ہوا۔ اس سارے دور میں میرزا حیدر دوغلت کے اقتدار میں آنے تک کئی تاریخی کتابیں فارسی میں لکھی گئیں جن میں قاضی ابراہیم کی تاریخ "قلمرو کشمیر" جو ۱۵۱۴ء (۹۲۰ھ) کی تصنیف ہے اور سید محمد علی کی "تاریخ کشمیر" اہمیت رکھتی ہے میرزا حیدر حکمران ہونے کے علاوہ اچھا اہل قلم بھی تھا اس کی تصنیف "تاریخ رشیدی" اس عہد کے حالات سے متعلق مستند تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے اس کے علاوہ میرزا حیدر کو شعر گوئی سے بھی لگاؤ تھا کشمیر سے متعلق اس کی ایک رباعی بہت مشہور ہے:

رباعی:

یک لالہ رخی کہ مہر افزاید نیست   در مہر و وفا چنانچہ او باید نیست
در گلشن کشمیر بسی جوش گل است   آن گل کہ از و بوی وفا آید نیست

اس دور میں ایک اور تاریخ بھی لکھی گئی تھی جو "تاریخ کشمیر" کے نام سے موسوم ہے اور اس کے مصنف ملا حسین قاری ہیں۔ شمیری دور کے شعرا میں میر علی، محمد امین مستغنی، میرزا علی خان اور ملا نامی اول کو خاص مقام حاصل ہے۔ ملا نامی کو صرف و نحو پر عبور حاصل تھا اور اس دور کے اہم شاعروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ درج ذیل اشعار ملا نامی کی طبع زاد ہیں:

بخاموشی چہرہ زبانی دہد   بفرقوت زور جوانی دہد
ہرگز دلم بغیر تو مائل نمی شود   وز دیدہ نقش روی تو زایل نمی شود
از دوریت چہ باک کہ از بعد ظاہری   اصلا میان ما و تو مایل نمی شود
دستم بریدہ بازچہ کار آیدم بگور   در گردن بتان چون حمایل نمی شود

علاوہ بر این انہوں نے حسین شاہ کی مدح میں قصائد اور ایک مثنوی میں در مدح کشمیر بھی لکھی افسوس ہے کہ ان کا کلام مدون صورت میں نہیں ملتا تذکروں میں البتہ اکا دکا اشعار نظر سے گزرتے ہیں۔

چک دور ۱۵۵۴ء تا ۱۵۸۵ء:

چک سلاطین کے عہد میں فارسی علم و ادب اور شاعری کو پھر سے نئی تحریک نصیب ہوئی اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ چک سلاطین شیعہ مسلک کے حامی تھے اس لیے اس زمانے میں ایران سے بیشتر شیعہ علما کشمیر آئے۔ دوسری اہم وجہ یہ رہی کہ بیشتر چک حکمران عالم و فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے قدردان بھی تھے اور انہوں نے اس کی سرپرستی بھی کی حسین شاہ اور یوسف شاہ خود شاعر تھے ملا نامی ثانی اس کا درباری شاعر تھا۔ حسین شاہ کی سرپرستی کا شہرہ سن کر بہت سارے شعرا بھی ایران سے کشمیر چلے آئے۔ ان میں ملا نامی ثانی اور بابا طالب اصفہانی کے علاوہ مولانا مہدی بھی قابل ذکر ہیں۔ ملا مہدی کو علی شاہ سے خاصا تقرب حاصل تھا۔ اس نے حضرت علی کی منقبت میں عمدہ تخمیس لکھی ہیں۔ چک سلاطین میں یوسف شاہ کا شمار بڑے ذہین اور سخن گو سلاطین میں ہوتا ہے محمد اعظم نے ''واقعات کشمیر'' میں ''اس کا ذکر بڑے خلوص کے ساتھ کیا ہے پیرزادہ حسن نے لکھا ہے کہ ''طبعی موزون داشت اشعار فارسی و ہندی و کشمیری بدیہہ می گفت:

یوسف شاہ کا ایک منظوم خط بھی ملتا ہے لوہر چک کی بغاوت کے موقع پر ابدال بٹ کے بھائی علی بٹ نے غلط مشورہ دے کر مطلب براری کی کوشش کی تھی۔ یوسف شاہ نے اسے بھانپ لیا اور اس خط کے جواب میں یہ منظوم نامہ لکھ کر اس کے پاس بھجوایا۔

چہ میگویلی ای گرگ ابدال رنگ   بترسانی از آب دریا نہنگ
غضنفر بصد فر بر آوردہ سر   حذر کن ز روباہ بازی گزر
تو بودی کشاورز آبای من   کشاورز را کی سزد جای من
بہ شمشیر و خنجر ترا نیست کار   کشاورز را با دلیری چہ کار
پی حرب من لشکر آراستی   شبخون کنان سوی من تاختی
من آنگہ عنان باز پیچم ز راہ   کہ یا سر دہم یا ستانم کلاہ
ترا آنچہ بایست گفتم تمام   تو دانی نہ گر بعد ازین والسلام

یوسف کے درباری شعراء میں بابا طالب کو بھی بادشاہ اور امراء میں خاصی اہمیت حاصل تھی اسی طرح یوسف شاہ کے دوسرے درباری شعراء میں مولانا احمد کو بڑا درجہ حاصل تھا وہ اچھا شاعر اور عالم تھا اس نے یوسف سے متعلق ایک مثنوی بھی لکھی تھی جس کا انداز بالکل شاہنامہ فردوسی جیسا ہے مثلاً کہتا ہے:

چنان خون روان شد ز دشت ربود   کہ چون سیل رفتہ ز جاپای مود
چکا چاک شمشیر برندہ فرق   زمین راہ دریای خون کردہ غرق

ان کے علاوہ محمد امین مستغنی بھی یوسف شاہ کے مصاحبوں میں تھا چک سلاطین کے عہد میں حضرت مخدوم شیخ حمزہ کی بابرکت ذات کا فیضان جاری ہوا۔ آپ کشمیری سلطنت کے آخری زمانے میں پیدا ہوئے تھے اور کشمیر کے مشہور ریشہ خاندان سے آپ کا تعلق تھا۔ آپ کا انتقال ۹۸۹ھ مطابق ۱۵۸۱ء میں ہوا۔ آپ کے بھائی بابا علی ریشہ اور آپ کے مرید بابا داؤد خاکی آپ ہی کی فیض صحبت کے پروردہ ہیں۔ بابا علی ریشہ نے زاہدوں اور عارفوں سے متعلق ایک کتاب بھی فارسی میں لکھی تھی جو ''تذکرۃ العارفین'' کے نام سے موسوم ہے۔

بابا داؤد خاکی جتنے بڑے عالم تھے اتنے بلند پایہ شاعر بھی تھے لیکن انہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو مذہب و تصوف کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کے قصائد معرکۃ الآرا ہیں قصاید کے علاوہ ''ورد المریدین'' اور ''رسالہ ضروریہ'' ان کی دو مقبول ترین تصانیف ہیں۔ ان دونوں تصانیف کی شرح انہوں نے ''دستور السالکین'' اور ''مجموعۃ الفوائد'' کے نام سے لکھی۔ حضرت بابا داؤد خاکی کی غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

کہ بہ مسجد روم و گاہ بہ میخانہ شوم
من بی چارہ ترا ای طلبم از ہر سو
تو انم کہ شمارم کرم و نعمت تو
گر زبانم شود اندر تن من ہر سو

بابا داؤد خاکی کا انتقال ۹۹۴ھ مطابق ۱۵۸۸ء ہوا۔ شیخ یعقوب صرفی اس عہد کے ایک اور چیدہ عالم، روحانی پیشوا اور شاعر ہیں جن کا فیض کشمیر کے علاوہ عرب و عجم تک پہنچا۔ آپ کی پیدائش کا سال ۹۲۸ھ مطابق ۱۵۲۱ء ہے۔ صرفی کا تعلق بھی گنائی خاندان سے تھا ''گنائی'' نسبت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ آپ نے مولانا جامی اور مولانا آفی جیسے علما سے تلمذ حاصل کیا تھا آپ نے علم و عمل کی تلاش میں سیالکوٹ، لاہور، کابل، سمرقند، مشہد، اور دوسرے بڑے علمی مراکز کا سفر بھی کیا تھا۔ حضرت صرفی نے بچپن میں ہی قرآن حفظ کر لیا تھا حج کی غرض سے جب آپ مکہ گئے تو وہاں جا کر آپ نے ابن حجر مکی سے حدیث میں سند بھی حاصل کی تھی۔ ترکستان میں آپ کو شیخ حسین خوارزمی کی مسند طریقت پر بٹھایا گیا۔ آگرہ میں قیام کے دوران شیخ سلیم چشتی سے بھی ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ شیخ سلیم چشتی کے آخری سفر حج میں صرفی بھی ان کے ساتھ تھے۔ نیز یہ بات بھی بڑی اہمیت کی ہے کہ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے بھی ان

سے حدیث کا درس لیا تھا ان کی تصانیف میں "حاشیہ رباعیات"، "حاشیہ رواجع" "شرح صحیفہ بخاری"، "حاشیہ توضیح التواریخ"، "مناسک حج و رسالہ اذکار" "کنز الجواہر، چہار رسالہ اور دیوان اشعار اور خمسہ بھی شامل ہے آپ نے قرآن کریم کی تفسیر بھی لکھنا شروع کی تھی جو مکمل نہ ہو سکی۔ یہ مطالب الطالبین کے نام سے مشہور ہے صرفیؔ کے دیوان میں غزل قصیدہ، نعت، منقبت اور رباعیات ملتی ہیں ذیل میں ان کی غزل کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

در صد ہزار آئینہ یک اوست جلوہ گر
در ہر چہ ہم آن رخ نیکوست جلوہ گر
خلقی بہر طرف شدہ سرگشتہ بہر دوست
وین طرفہ تر کہ دوست بہر سوست جلوہ گر

حضرت صرفیؔ کا خمسہ جو ان کی پانچ مثنویوں "مسلک الاخیار"، "وامق و عذرا"، "مغازی النبی"، "لیلیٰ مجنوں" اور "مقامات مرشد" پر مشتمل ہے، ان کا معرکتہ الآرا کارنامہ ہے اس خمسہ کی تصنیف پر انہیں جامی ثانی کا لقب ملا تھا فیضی اور عبد القادر بدایونی سے بھی ان کے مراسم تھے۔

چک دور میں فارسی میں بہت سی تاریخیں بھی لکھی گئیں ان میں سے سید علی ماگرے بن سید محمد ماگرے کی "مختصر تاریخ کشمیر" ہے۔ یہ تاریخ حضرت امیر کبیرؒ کے کشمیر میں ورود مبارک سے شروع ہو کر حضرت شیخ نور الدین ولی اور ان کے خلفاء کے حالات پر ختم ہوتی ہے اس کا قلمی نسخہ ریسرچ لائبریری کشمیر یونیورسٹی میں بھی موجود ہے۔ "بہارستان شاہی" اس دور کی دوسری اہم تاریخ ہے جس کے مصنف کا نام سید محمد مہدی بتایا جاتا ہے۔ یہ تاریخ ۱۰۳۲ھ میں مکمل ہوئی تھی۔ انداز بیان کے لحاظ سے رواں اور شستہ فارسی میں لکھی گئی ہے میر حیدر کی تصنیف ہدایت المخلصین بھی اس دور کی یادگار ہے جو تصوف کی ایک مشہور کتاب ہے۔ حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کے حالات اس میں درج ہیں شیخ احمد چاگی کا مرازی کی تصنیف "رسالہ سلطانیہ" خواجہ میر بزاز کی تصنیف تذکرۃ المرشد اور ان کی "سی غزل" بھی اسی دور کی فارسی تخلیقات ہیں۔ خواجہ حسن کی تصنیف "راحتہ الطالبین" اور خواجہ اسحٰق کی تصنیف "چلچلتہ العارفین" بھی اس دور کی دو اور کتابیں ہیں جو عرفان و تصوف سے بحث کرتی ہیں۔

سلاطین چک کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ فارسی ادب اور شاعری کا مذہبی اور متصوفانہ کردار تبدیل ہونا شروع ہوا۔ مغلوں کے عہد میں نئے شاعر جو ایران سے ہندوستان اور کشمیر آنے لگے ان کے ساتھ شعر و ادب کی کچھ نئی روایات بھی کشمیر پہنچیں ادبی اظہار خیال اور حسن و عشق کی شاعری کا جو انداز ان کے ساتھ یہاں پہنچا اس نے کشمیر کے فارسی ادب کو بھی متاثر کیا اور ادب کی روایت تبدیل ہونا شروع ہوئی۔

چک دور کے ان شعراء میں جیسا کہ ذکر ہوا بابا طالب اصفہانی خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ طالب چکوں کے عہد میں کشمیر آیا اور دربار میں تقرب حاصل کر کے اکبر کے آنے تک اس دربار سے منسلک رہا۔ نمونہ کلام:

ازسر کوئی تو دل با دیدۂ تر می رود
شعلہ درد دل نالہ برلب خاک برسری رود

یا اس کی ایک اور غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

در حلقۂ ما زمزمۂ سور نباشد
ما غمزدہ گان را دل مسرور نباشد
ویرانۂ دل چون سر تعمیر ندارد
بگذار کہ این میکدہ معمور نباشد

علی شاہ چک کے عہد کا ایک اور شاعر ملا مہدی ہے اس کی درج ذیل بیت حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی شان میں ملتی ہے:

مرتضیٰ پادشہ کشور عالی نسبی است
آفتابی است کہ اوج شرفش دوش نبی است

اس کے علاوہ محمد امین مستغنی جس کا ذکر شمیری کی عہد کے اواخر میں بھی آیا ہے۔ یوسف شاہ چک کا زمانہ مستغنی کا آخری زمانہ تھا درج ذیل ابیات اس کی یادگار کے طور پر باقی ہیں۔

جہان زغم شدۂ من اگر بہ تیرہ است
سرو دلی کہ بگیرم از و سراغ کجاست
سیاہی شب ما را بود بہ تو مہر
رخی کہ دردہ ماہی نہد چراغ کجاست

مستغنی فتح کدل کے قریب محلہ اروت میں سید جمال الدین کے مقبرہ کے آستانہ کے باہر مدفون ہے۔ اس زمانے میں خطاطی کے فن کو بھی کافی ترقی ملی۔ میر حسن خطاط نے اسی زمانے میں اپنے فن خطاطی کو کمال تک پہنچایا۔ میر حسن کشمیر تھا اور دینی علوم حاصل کئے تھے۔ خط نستعلیق لکھنے میں وہ اپنی مثال آپ تھا اس فن کو سیکھنے کے لیے اس نے اپنی عمر کے کئی سال میر علی (جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے) کی خدمت میں گزارے۔ میر علی (شاعر) سے یہ فن میر حسن کو پہنچا اور بہت تھوڑی مدت میں میر حسن نے اتنا کمال حاصل کر لیا کہ ایرانی فخر سے اس کی تحریروں کو لے جاتے تھے اور ان سے کتابیں لکھوائی جاتی تھیں۔ محمد مراد زرین قلم انہی کے شاگردوں میں سے ایک ہے۔

مغل دور:

فارسی زبان و ادب کو کشمیر پر مغلوں کے تسلط کے بعد پہلے سے زیادہ سرپرستی ملی اور یہ زبان اس دور میں قابل لحاظ حد تک پھولی پھلی۔ اس دور میں فارسی مذہب و تصوف کے اثر سے باہر آ کر ایک نئے انداز فکر کی حامل بنی۔ جس کا اثر فطری طور پر کشمیر کے فارسی ادیبوں اور شاعروں پر بھی پڑا اس عہد کے آغاز میں ہی حسن بیگ کی "منتخب التواریخ" اور حیدر ملک چاڈورہ کی "تاریخ کشمیر" تکمیل کو پہنچی اکبر کے عہد میں کئی اچھے شعرا کشمیر میں موجود تھے ان میں ظاہر ہی اہمیت رکھتے ہیں۔ مظہری، جہانگیری عہد کے

مشہور شاعر ہیں ملا محمد امین گانی، ملا عبدالرشید بیتو، ملا فطرتی، مولانا میر کمال الدین (موسوم بہ ملا کمال) علامہ عبدالحکیم، مہدی مشہدی، ملا جوہر ناتھ، حیدر خواجہ فیروز اور خواجہ حبیب اللہ حبی نوشہری نے "راحت القلوب" اور صحیفۃ القلوب" کے علاوہ ایک دیوان بھی چھوڑا ہے۔ "واقعات کشمیر" میں اس کا تفصیلی ذکر ملتا ہے مذکورہ شعراء کا کلام بھی جا بجا ملتا ہے۔

ان کے علاوہ بابا نصیب الدین غازی، مشتری، ملا محمد صالح ندیم جہنی، اوجی کشمیری، روشنی گلشن، خورم کشمیری اور خواجہ محمد پارسا شاہ جہاں کے آتے آتے فن شاعری میں کمال حاصل کر چکے تھے اور ان کا کلام زبان زد عام تھا۔ سلیم، کلیم اور دوسرے شعراء اس ضمن میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شاہ جہاں کے تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی (۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۸ھ مطابق ۱۶۳۸ء، ۱۶۵۸ء) پورے برصغیر میں زندگی کے ہر شعبہ میں رنگینی اور شادابی پیدا ہوئی فارسی ادب بھی پھولا پھلا اور نکھرا۔ خارجی اور ملکی شعراء کے اجتماع میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ شاہ جہاں کا زمانہ پوری تاریخ میں ترقی اور خوشحالی کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ کشمیر میں بھی شاہ جہاں کا دور علمی، تہذیبی و تمدنی اور خاص طور پر ادبی نقطۂ نظر سے بہت درخشاں رہا ہے اس دور کے نامور اور مشہور شاعر ملا احسن سلیم اور کلیم ہیں جو اگرچہ کشمیری نسل نہیں تھے لیکن انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ کشمیر میں بسر کیا اس ضمن میں صائب اور میر الٰہی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ یہ تینوں شاعر ایک لحاظ سے ہم رتبہ تھے ملا محسن فانی صاحب دیوان اور استاد غزل تھے۔ فانی کے علاوہ اس دور میں فارسی کے تین اہم اور خوش گو شاعر پیدا ہوئے جن کو ہم ملا طاہر غنی کشمیری، ملا محمد زمان نافع اور حاجی محمد اسلم سالم کے ناموں سے جانتے ہیں۔

غنی کشمیری کشمیر کے مشہور عشائی گھرانے کا چشم و چراغ تھا اور نافع اس کا بھائی تھا۔ محمد زمان نافع بھی اپنے بھائی غنی کی طرح اچھا شاعر تھا لیکن غنی کا معیار اس کے بس کی بات نہ تھی۔ غنی کے معاصرین میں مرزا داراب جویا اور مرزا کویا دونوں بھائی بھی شاعر تھے۔ غنی کے بعد فن شعر میں مرزا جویا کی خاص اہمیت ہے اس زمانے میں فروغی منظر عام پر آیا ملا تخلص، عبدالرسول استغنا اور ملا شاہ سعد الدین کے علاوہ مشہور خطاط ملا مراد اور ملا محمد محسن وغیرہ اس دور کے ناقابل فراموش اشخاص ہیں جنہوں نے فارسی ادب کی نشو و نما میں خاص رول ادا کیا ہے۔ اس طرح اورنگ زیب کے زمانے میں بھی فارسی شعر و ادب کی ترقی کی رفتار بتدریج ترقی پذیر تھی یہاں تک کہ اس کے زمانے میں کشمیر کو علمی اور ادبی مرکزیت حاصل ہو چکی تھی اس عہد کے سربرآوردہ شعراء میں عبدالغنی بیگ قبول، لالہ ملک شہید، عنایت خاں آشنا، ملا محمد رضا مشتاق اور ملا بینش وغیرہ نے اپنی سخن سنجیوں کی بدولت کشمیر میں شعر و شاعری کی محفلوں کو گرم رکھا تھا۔

انشاء پردازوں میں محمد رفیع منشی نے بہت شہرت حاصل کی اور علماء میں شیخ داؤد معروف بہ

بہ بابو صاحب اور بابا داؤد مشکواتی (مصنف اسرار الابرار) مرجع خاص و عام رہے۔ لالہ ملک شہید تاجر کشمیر ابراہیم خان کے زمانے کے مشہور شاعر ہیں انہیں تاریخ نویسی پر بھی دسترس حاصل تھا، عبدالحکیم ساطع فرحت، محمد رفیع اور خواجہ جوہر یکتا کے علاوہ ملا احمد ابن عبدالصبور کشمیری خواجہ ہاشم کشمیری کے مرید تھے انہوں نے ۱۱۰۸ھ میں اولیا کے حالات "فوارق السالکین" لکھی جس کا متبادل نام "تاریخ بادی" بھی ہے۔

ان کے علاوہ دوسرے بزرگ علماء مثلاً محمد محسن کھوتو، ملا محمد اشرف بنو، ملا عنایت اللہ خان شال بھی موجود تھے جنہوں نے فارسی کی اہم تصانیف اپنی یادگار میں چھوڑی ہیں۔ مرزا اکمل شیخ عبدالوہاب نوری، "مخزن العرفان" کے مصنف حاجی عبدالسلام شیخ محمد مراد، رفیقی، خواجہ اسحٰق، محمد عاقل، حکیم رحمت اللہ باغ سے میر نورالدین شارق، خواجہ علی اکبر رفیع اللہ غافل، ملا عزیز قانع، رانا اور اس کا بیٹا محمد یحییٰ حیا اور ملا میرک فانی وغیرہ سینکڑوں شعراء ہیں جن کا تفصیلی ذکر مختلف تواریخ اور تذکروں میں ہوا ہے۔ اس دور میں فنون لطیفہ فن مصوری، نقاشی اور خطاطی و خوش نویسی میں بھی قابل لحاظ حد تک ترقی ہوئی تاریخ نویسی اور دوسری تخلیقات بھی وجود میں آئیں ان میں سے بیشتر آثار اب تک موجود ہیں۔ تاریخوں میں رفیع الدین احمد غافل کی تاریخ "نوادر الاخبار" محمد اعظم دیدہ مری کی تاریخ ۱۱۵۸ھ "واقعات کشمیر" کے علاوہ ان کی دوسری تصانیف میں تجرید الطالبین ۱۱۲۹ھ "رسالہ فوائد الرضا" ۱۱۳۵ھ قواعد المشائخ ۱۱۳۶ اشجار الخلد ۱۱۳۰ھ ثمرات الاشجار ۱۱۳۰ھ رسائل الاعظم ۱۱۳۹ھ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ "تاریخ اعظمی" یا "واقعات کشمیر" کی تکمیل ۱۱۵۸ھ میں ہوئی ہے یہ مختصر تاریخ مصنف کے زمانے تک بھی ادوار پر حاوی ہے۔ خواجہ محمد اعظم کے فرزند خواجہ محمد اسلم منعمی بھی شاعر اور مورخ تھے یہاں پر یہ بات لکھ دینا ضروری ہے کہ منعمی نے "گوہر عالم" کے نام سے ایک مبسوط تاریخ کشمیر لکھی ہے "واقعات کشمیر" کے مقابلہ میں منعمی نے اس میں بہت کچھ اضافے کئے ہیں۔

جب مغلیہ حکومت کے آخری زمانے میں دہلی کے دربار میں کش مکش، بے اطمینانی اور انتشار رونما ہونا شروع ہوا اور دہلی کی مرکزیت ایک لحاظ سے ختم ہونے لگی تو اس کا اثر کشمیر پر بھی پڑا۔ اقتدار کی دوڑ میں علم و ادب کی بلا معرض خطر میں تھی کشمیر جس کی گود میں سال ہا سال سے فارسی علوم و فنون پرورش پا رہے تھے، اطراف و جوانب کی بے اطمینانیوں سے متاثر ہوا۔ تردد اور انتشار کے اس زمانے میں اسد اللہ فقیون اور میر عنایت اللہ نے شعر و سخن کی روایات کو قائم رکھا۔ ملا محمود والا، خواجہ امان اللہ، حکیم رحمت اللہ، محمد فاروق، محمد حیات ہادی، میرزا قرباد بیگ وغیرہ اس دور کے اواخر کے شعراء ہیں جنہوں نے بعد میں چل کر افغان دور بھی دیکھا۔ ابوالقاسم خان جو کشمیر میں مغلوں کے عہد کا آخری حکمران تھا جب افغان سردار عبداللہ خان ایشک اقاسی نے کشمیر پر حملہ کیا تو ابوالقاسم خان کی فوج کا سپہ سالار عبداللہ خان سے مل گیا ابو

القاسم خان مغلوب ہوا جسے بھاگتے ہوئے گرفتار کر کے کابل بھیج دیا گیا۔ اس طرح کشمیر میں مغل حکومت ختم ہوئی۔ ابوالقاسم خان (مغل ناظم) خود بھی فارسی میں شعر کہتا تھا اور صافی تخلص کرتا تھا۔ ان کی رباعی کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

بر دور عارضت خط ریحان نوشتہ اند
یا بوستان بگرد گلستان نوشتہ اند
خوشت بجو مہن کسی اوصاف زلف تو
جمعی نوشتہ لیک پریشان نوشتہ اند

اب تک کے مذکورہ شعرا میں مظہری کشمیری کا مقام فارسی شاعری میں قابل تحسین ہے۔ مظہری نے ایران، خراسان اور پورے ہندوستان کی سیر کی تھی اور وہاں کے مشہور شعراء سے ملاقات کا شرف بھی اسے حاصل ہوا تھا۔ جہانگیر کے عہد میں مظہری کشمیری کو کشمیر کا میر بحر مقرر کیا گیا درج ذیل اشعار نمونہ کلام کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں:

فدائی آئینہ گردم کہ دلستان مرا
درون خانہ بگلگشت گلستان مرا

میری چنانکہ ابر نیارد برو گزشت
عزمی چناں کہ باد نیارد بدرو رسید

لطفی کمر وہ دہر ز دیوانہ پر شدہ است
حرفی گلنہ شہر ز افسانہ پر شدہ است
یک قطرہ از قرابۂ ساقی گزو چکید
چندین ہزار ساغرو پیانہ پر شدہ است
در خون خویش دست ز داز غصہ مظہری
کز شاخ سنبل تو کف شانہ پر شدہ است

مظہری کا دیوان چھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ۱۰۲۶ھ میں ان کا انتقال ہوا اور ملکاماء میں مدفون ہوا۔

ملا ذہنی کشمیری:

ملا ذہنی عالم و فاضل تھے اور خاص طور پر دینی علوم پر ان کو پوری دسترس حاصل تھی ذہنی نے "چہار یار با صفا" کے عنوان سے خلفائے کرام کی شان میں چار قصیدہ لکھے ہیں چنانچہ قصیدہ کی ابتداء میں کہتا ہے۔

یار پیغمبر نشاید برگزیدن جز چہار
مجت آن بشنواز ذہنی کہ باشد یادگار

پھر آگے چل کر ایک اور قصیدہ میں کہتا ہے۔

گویا تو کنم آرزوی دیدن گل
آمادہ نگاہ بر پرستیدان گل
آگر کند از جنون من بلبل را
چشمک زدن نرگس و خندیدن گل

ملا طاہر غنی:

طاہر غنی کا تعلق اشائی خاندان سے ہے جو ایران سے آ کر یہاں آباد ہو گیا تھا۔ غنی ملا محسن فانی کا شاگرد تھا کے بارے میں اب تک بہ کچھ لکھا جا چکا ہے۔ پیر حسام الدین راشدی نے تقریباً چالیس صفحات پر مشتمل غنی کشمیری پر اپنی کتاب تذکرہ شعرائے کشمیر کی دوسری جلد میں ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے غنی کی وفات کے بارے میں مختلف روایات ملتی ہیں صحیح ۱۰۷۹ھ ہے تاریخ حسن میں یہ دو شعر غنی کی تاریخ وفات کے طور آئے ہیں

از فوت غنی گشتہ کہ دمہ غمگین
ہر کس شدہ در ماتم او خانہ نشین
تاریخ وفاتش از پرسند بگو
پنہاں شدہ گنج ہنری زیر زمین

غنی کے چند اشعار یہاں پر نمونے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں:

ای لالہ دل برابر بہاران چہ میدہی
داغی کہ در دولت بشستن نمی رود
کند در ہر قدم فریاد خلخال
کہ حسن کم خان پا در رکاب است

اور یہ شعر جس پر صائب اپنا پورا دیوان قربان کرنے کو تیار ہو گیا تھا

حسن سبزی بخط سبز مرا کرد اسیر
دام ہمرنگ زمین بود گرفتار شدم

یہ شعر غالباً ان ایام کا ہے جب غنی گوشہ گمنامی میں تھے لیکن بعد میں ان کی حیات میں ہی ان کی سخن دانی اور سخن سرائی کے چرچے نہ صرف پورے ہندوستان میں ہوئے بلکہ ایران تک پہنچے۔

محمد زمان نافع:

نافع طاہر غنی کا بھائی اور محسن فانی کا شاگرد تھا اس نے اپنے بھائی طاہر سے بھی کسب فیض کیا تھا فارسی شاعری میں نافع خاصی اہمیت کا حامل ہے اس کے کلام میں روانی سادگی اور سلاست کے علاوہ الفاظ کی بندش اور مترادفات کا استعمال جا بجا ملتا ہے۔ ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

می کشی وبازی پری شہید کیستی
این غلط اندازی و بازی بہا می زیبدت
بگوی از پردہ زنبوری جام بلور
چہرہ سازی ہائی رنگین از حنا می زیبدت

مشتاق کشمیری:

محمد رضا مشتاق کا شمار اس دور کے نامور شعرا میں ہوتا ہے۔ مشتاق نوشہرہ کا رہنے والا تھا خطاطی اور کتابت اس کا پیشہ تھا مثنوی معنوی کی کشمیر میں مشتاق کے ہاتھوں پہلی بار کتابت ہوئی۔ محمد رضا مشتاق پر پروفیسر شمس الدین احمد صاحب نے تہران یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے اور ان کے

افکار و آثار اور حیات و کارناموں پر ان کا تحقیقی کام رضا مشتاق کی اہمیت کا ایک ثبوت ہے مشتاق کا انتقال ۱۱۵۱ھ میں ہوا۔

ان کے علاوہ دوسرے بہت سے شعرا مغل دور کے اس طویل عرصہ میں کشمیر میں فارسی زبان و ادب کی سیرابی اور شادابی میں مصروف تھے جن کو ایک جانب ذاتی تشویق اور دوسری جانب شاہی سرپرستی اور حوصلہ افزائی بھی حاصل تھی ان میں خاص طور پر شرف الدین فرحت، خواجہ امان اللہ، محمد عاقل، محمد احسن اللہ، عرف فصاحت خان راضی، محمد علی خان متین، ملا میرک فانی، لطف اللہ بیگ صہبا، اشرف یکتا، شاہ و رضا چشم، ملا عبدالغفور نامی، میر محمد معروف، محمد امین دارا، عبدالغنی بیگ قبول، عبدالحکیم ساطع، خواجہ علی اکبر، خواجہ نوراللہ دیوانی، نورالدین شارق، آذری، قلندر بیگ، ملا ثابت، ملا بہش، ملا فائق، حاجی حیدر، بابا حاجی مغنی، ضیاء الدین دیوانی، لالہ ملک شہید، کامران بیگ گویا، قاضی محمد عارف، ہاشم دیوانی، محسن شیریں قلم، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سارے تذکرہ نگار، خوشنویس اور مورخین بھی گزرے ہیں جن کے کارہائے نمایاں نے کشمیر کے فارسی ادب کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

کشمیر میں فارسی زبان و ادب کی تاریخ کا آغاز وسط ایشیائی اثرات کے تحت ہوا اور شمیریوں، چکوں اور مغلوں کے دور حکومت میں اس کی خاطر خواہ نشو و نما ہوئی، یہاں تک کہ اس پورے دور کو کشمیر میں فارسی زبان و ادب کا ایک زریں دور قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن تہذیبی، لسانی، فرہنگی اور سیاسی روابط، ثقافتی طور طریقے اور دوسرے فنی اور علمی امور، جو نظریاتی اور اصولی طور پر شمیریوں کے عہد سلطنت سے لے کے مغلوں کی بادشاہت کے اواخر تک سرزمین کشمیر کے مکینوں کا جزو لاینفک بن چکے تھے، اس وقت بے توجہی یا کم توجہی کا شکار ہوئے جب مغلوں کے زوال کے بعد یہاں افغانوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ بنیادی طور پر افغان اچھے فوجی اور جنگجو تھے، اپنی قوت بازو اور جرأت خداداد کے ذریعہ وہ ایک طویل عرصے تک، خراسان سے لے کر کابل تک پورے وسطی ایشیا پر قابض رہے۔ انہوں نے ایران اور ہندوستان کی بڑی بڑی طاقتوں کا سر نیچا کیا۔ سلطنت ایران ان کے جوش و جذبہ قومیت اور ان کی بہادری سے لرزنے لگی اور ان کے طوفانی حملوں سے ہندوستان کی سلطنت مغلیہ متزلزل ہوئی، مرہٹوں اور سکھوں کو جس وقت ایک آندھی اور سیلاب کی طرح لپیٹ میں لے کر سلطنت دہلی کو مطیع کیا تو اسی کے ساتھ کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ کشمیر میں ایک نئی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ کشمیری عوام نے افغانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور افغانستان کی وسیع سلطنت کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ سوچا تھا کہ شاید ان کی آمد سے متزلزل مغل نظامت ہمارے سیاسی استحکام کا موجب بن سکے گی، لیکن افغان قوم نے اپنی بہادری اور جرأت سے ایران جیسی مضبوط سلطنت کے مراکز کو اپنے حملوں سے تہس نہس کر رکھا تھا اور نادر شاہ افشار نے ان ہی افغان ابدال سپاہیوں کے بل بوتے پر

بغداد سے لے کر کابل اور پورے ہندوستان کو اپنی زد میں لے رکھا تھا، ان کی پوری قومی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بڑے قبائل میں ہمیشہ اقتدار کی جنگ رہی اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ پر حاوی ہونے کے درپے رہا۔ جنگ و جدل کی طرف اس حد سے زیادہ توجہ نے افغانوں کو اس بات کی فرصت نہ دی کہ وہ تمدنی اور تعلیمی امور پر قابل لحاظ توجہ دے سکیں۔

اکتوبر ۱۷۵۱ء مطابق ۱۱۶۵ھ میں جب افغان سپہ سالار عبداللہ خان اشک آقاسی معروف بہ ایشیک آقاسی نے مغل ناظم ابوالقاسم خان صافی کی سرکوبی کر کے کشمیر پر تسلط حاصل کیا تو اکتوبر ۱۷۵۱ء سے ۱۸۱۹ء تک کشمیر میں ان کی گرفت کا بے دردانہ سلسلہ جاری رہا اور یہاں پر جہاں کہیں کوئی پر ارزش چیز تھی، ان کی نذر ہو گئی۔ غیر کشمیری تاجر، سفرا اور علمی نمایندے ان کی بدسلوکی اور سخت گیری سے تنگ آ کر یہاں سے واپس چلے گئے جس کے نتیجے میں یہاں کی بین الملکی تجارت کو سخت دھکا لگا۔ علما، فضلا، شعراء اور ادبا میں کچھ تو ترک وطن کر گئے اور کچھ گوشہ گمنامی میں کھو گئے۔ افغان حاکموں کی بے راہ روی اور ظلم و تشدد کی وجہ سے یہاں کے عوام کا قافیہ تنگ ہو چکا تھا۔ آئے دن ہڑتالوں اور لڑائیوں کی وجہ سے کشت و خون کا سلسلہ جاری تھا اور عوام کی زندگی سے امن و سکون اور استحکام چھن چکا تھا۔ چنانچہ اس استبدادی دور نے زندگی کا ہر شعبہ تباہ کر دیا۔ لیکن کشمیر میں وسط ایشیائی تہذیب و تمدن اور فارسی زبان کی ترویج و ترقی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ تاہم فارسی ادبیات نے ایک طویل سفر طے کر کے جو ترقی حاصل کی تھی اس میں ایک طرح کا جمود سا پیدا ہوا۔ مغلیہ عہد کی شان و شوکت، ادب نوازی اور علم پروری باقی رہی لیکن فارسی زبان و ادب کی بنیادیں کشمیر میں اس قدر مضبوط، استوار اور گہری ہو چکی تھی کہ افغانوں کے تسلط سے یہ بنیادیں ہل نہ سکیں۔ اس زبان و ادب کا ذوق و شوق رکھنے والے اس کی ترویج و ترقی کا کام جاری رکھے رہے جس کی وجہ سے فارسی زبان و ادب "عوامی زندگی کے دوسرے شعبوں کے برعکس کسی حد تک آگے بڑھتا رہا۔ اس عہد کے اوائل میں "انجمن شعراء" کا قیام عمل میں آیا اور مولوی محمد توفیق کی سرپرستی میں شاہنامہ کشمیر کی ابتداء ہوئی اور اس کے لیے شعراء کا انتخاب کیا گیا اور یوں علمی و ادبی حلقہ پھر سے سرگرم عمل ہوا۔ فارسی کے کئی شعراء، ادیب، مورخین، تذکرہ نگار اور انشاء پرداز پیدا ہوئے جن میں سے بعض نامور ہوئے۔ شاہنامہ کشمیر سے متعلق مجلس شعراء کا تعین اور شاہنامہ کی معاصر دور تک کی تکمیل اس عہد کی ایک قابل لحاظ ادبی یادگار ہے جو اس سے پہلے کے ادوار میں تمام ادبی و سیاسی شان و شوکت کے باوجود عمل میں نہ آ سکی تھی۔

☆☆☆

شاہ محمد وسیم*

جلال الدین رومی: ایک عرفانی شاعر و مفکر

ذہن انسانی اپنی پرواز میں مکان و زمان کی بندشوں سے آزاد ہے۔ تعلیم و تربیت اسے طاقت و توانائی عطا کرتے ہیں، اور پھر علم عقل کو اور عقل علم کو جلا بخشتے ہیں۔ اس طرح ذہن انسانی علاقائے مقصود کی تلاش میں نئے زاویوں اور نئی سمتوں کا رخ کرتا ہے۔ تفکر اس کی رہبری کرتا ہے۔ مگر یہ خیال دامن گیر رہنا چاہیے کہ عقل، عقل سلیم ہے کہ نہیں؟ دل جذبات و احساسات سے لبریز ہے کہ نہیں؟ انسان تلاش انسان اور انسانیت میں سرگرداں ہے کہ نہیں؟ حرص اور ہوا و ہوس کا غلبہ تو نہیں ہے؟ کیونکہ اگر اس ضمن میں انسان بندشوں سے آزاد ہے تو حریت ضمیر انسانی کا علمبردار بن کر کثافتوں کے اندھیروں میں معرفت کے چراغ روشن کرتا ہے تا کہ حقیقت شناس آگے بڑھیں اور صدق و صفا کی راہوں پر گامزن ہوں۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہر فرد میدان عقل و خرد میں تگ و دو کرتے ہوئے کسب علم کے مختلف مراحل طے کرنے کے ساتھ ساتھ مقتدر شخصیتوں اور صاحبان علم و فن سے مختلف النوع حالات اور کیفیات کے تحت اثرات قبول کرتا ہے۔

میدان فکر و معرفت اور روابط انسانی میں کامیاب مشائخ میں مولانا جلال الدین رومیؒ کا نام نامی شامل ہے جنھیں ۳۸ سال کی عمر میں اسلامی قوانین کا مشہور زمانہ عالم ہونے کا شرف حاصل ہو چکا تھا، ان کا شمار دنیا کے عظیم اور پراز پیغام شعراء اور عارفین میں ہوتا ہے۔ ان کے استاد مولانا برہان الدین ترمذی تھے۔ اس کے علاوہ حلب میں اپنے قیام کے دوران انھوں نے کمال الدین ابن عدیم سے بھی اکتساب علم کیا تھا۔ رومی دمشق (سیریا) میں قیام پذیر رہے۔ شیخ محی الدین ابن عربی، شیخ سعد الدین حموی، شیخ اوحد الدین کرمانی اور شیخ صدر الدین قونوی سے صحبتیں رہیں اور حقائق و معارف پر گفتگو ہوتی رہی۔ بعض مولفین کہتے ہیں کہ شمس الدین تبریزی سے مولانا رومی کی ملاقات سب سے پہلے دمشق میں ہی ہوئی تھی۔[۲]

ساتویں صدی ہجری کا ایک حصہ مولانا رومی کا عہد ہے، جسے مسلمانوں کی تاریخ کا پرآشوب اور

* سابق پروفیسر و صدر، شعبۂ کامرس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

'ہولناک' دور کہا جاتا ہے، یعنی مصیبتوں اور بے چینی کا زمانہ۔ خوف و ہراس کے دبیز کالے سائے تھے، بے یقینی، بے چارگی اور جنگ و جدال کی وجہ سے طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ اقتدار ہتھیا لینے کی کشمکش تھی، بے گناہوں کا خون بہہ رہا تھا، پھر قحط کے مہیب سائے نے آن گھیرا تھا، زندگیاں گم گشتہ راہ تھیں۔ ایسے میں اقتدار کی کشمکش بے معنی تھی، مگر تھی، اہل علم و کمال کی عزت و آبرو داؤ پر تھی۔ یہ وہ دور تھا جب صلیبی حملوں اور منگولوں کی فوج کشی کا ڈر دلوں میں سمایا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ملت اسلامیہ میں عشریہ معتزلہ اور صوفی معتقدین کے مابین بھی ٹھنی ہوئی تھی جس پر سیاست کا سایہ بھی تھا۔ "اسی ساتویں صدی کے تصوف میں مولانا نے آنکھ کھولی، اسی صوفیانہ ماحول میں ان کی نشو و نما ہوئی۔ "سلوک کے منازل طے کیے" وقت کے مشہور مشائخ کی صحبتوں میں شریک ہوئے اور ان سے ظاہری اور باطنی فیض حاصل کیے اور آخر میں مسند ارشاد و تلقین کو مجتہدانہ حیثیت میں زندگی بخشی، امام فن اور مرشد کامل کی صورت میں مریدین کی تربیت کی"۔[۳]

مولانا نے اچھا خاصا وقت مذہبیات اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے عربی زبان پر بھی عبور حاصل کیا۔ اسلامی دانشور و شاعر تھے مگر ہندوستان میں ہندو دھرم اور بودھ دھرم اور ہندوستانی ثقافت کا خاطر خواہ علم بھی رکھتے تھے۔

مولانا رومی کے اشعار میں عارف کی تڑپ، اور اس کی کھٹک، نالۂ فراق اور آرزوئے وصال کی دعائیہ آواز سنائی دیتی ہے، معرفت و عشق الٰہی میں سرشار۔ جس میں جب اللہ کی گرمی نہ ہو اس کی حیات بے معنی مترادف یہ بے حرکت و بے حس ذہن اور منتشی بدن کی ہوتی ہے۔ رومی اس جذبۂ عشق کو حرارت زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہستی کی سر و صدا اور اصل آتش ہستی ہے اور ہر وہ کہ جس میں یہ آتش (یہ گرمی، یہ تڑپ) کارگر نہ ہو، اصل وجود انسانی کا حامل نہیں ہے:

آتش است ایں بانگ نائی و نیست باد
ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد

اور یہ عشق حقیقی ہی ہے جس کا منتہا ذات باری تعالیٰ ہے، جو انسان کے لیے بلند ترین مقامات تک پرواز کا محرک اور باعث ہے:

پر و بال ما کمند عشق اوست
مو کشانش می کشد تا کوئے دوست

(ہمارے بال و پر اسکے عشق کی کمند ہیں کہ کھینچ کر اور اڑا کر کوئے دوست تک پہنچا دیتے ہیں)

اور عشق بھی ایسا ہو کہ زبان جیسے بیان کرے تو تفسیر روشن کہلائے، لیکن جو مزہ، جو کیف، جو لذت درد عشق میں پنہاں ہے، وہ اور بھی زیادہ مفصل اور بھی زیادہ روشن ہوتا ہے۔ رومی کہتے ہیں:

گرچہ تفسیر زباں روشنگر است
لیک عشق بے زباں روشن تر است

عشق ذات واجب ہے تو قالب بندگان خاکی میں گل عقیدت بن کر جا بستا ہے، روح و جاں میں پنہاں پوری سرایت کے ساتھ۔ پھر اس میں کسی اور چیز کے لیے جگہ باقی نہیں رہتی، جیسا کہ آیت اللہ خمینی نے بیان کیا ہے:

جز عشق تو ہیچ نیست اندر دل ما
عشق تو سرشتہ گشتہ اند گل ما

سالک منزل عرفان میں آن پہنچتا ہے تو اصل بندگی، پاکیزگی نفس اور عجز و نیاز کا سایہ درکار ہوتا ہے۔ نے کی تڑپ اور درد فراق اسے وصال کی آرزو اور تمنا کے دروازوں پر دستک دلواتے ہیں۔ بقول رومی فراق اور شرح درد اشتیاق میں اس کا سینہ شرحہ شرحہ (پارہ پارہ) ہو جاتا ہے تب بیان ہوتی حدیث دل عارف:

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا بگویم شرح درد اشتیاق

رومی کے اس شعر کی تشریح کے طور پر آیت اللہ خمینی کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہو:

عمری گذشت در غم ہجران روی دوست
مرغم درون آتش و ماہی برون آب

(طول غم ہجراں دوست میں میری عمر گزر گئی، اس طرح کہ جیسے مرغ درون آتش ہو اور مچھلی پانی سے باہر)

اس ذات واجب کے عشق کی راہ میں حجاب کسی طرح کا ہو، مانع ہے، یہاں تک کہ "**العلم هو الحجاب الاكبر** علم سب سے بڑا حجاب ہے اور اگر حق کی جستجو اور اس سے عشق کی آرزو ہے، جو بہت ہی نادر ہے تو یہی (علم) چراغ راہ اور نور ہدایت ہے۔ **العلم نور يقذفه الله في قلب من يشاء**۔ اس کے ایک گوشہ تک پہنچنے کے لیے تہذیب، تطہیر اور تزکیہ لازم ہے، نیز جہاں تک ممکن ہو مستجاب کا پابندی، وہ بھی اس حد تک کہ انسان کو تکبر و خود نمائی میں مبتلا نہ کرے۔"

"تکبر و خود پسندی اپنی مایگی اور خالق کی عظمت سے انتہائی درجہ جہالت و لاعلمی کی دلیل ہے۔ اگر عالم حقیقت کی عظمت پر ذرا غور کر لیا جائے، کم از کم اسی قدر جتنا آج تک انسان علم کی تمام تر ترقی کے ذریعہ اس سے آگاہ ہوا ہے، تو انسان اپنی اور تمام شمسی منظوموں اور کہکشاؤں کی حقارت اور کم مایگی کو محسوس کرتے ہوئے ان کے خالق کی عظمت کو ایک حد تک درک کرے گا اور اپنے تکبر و خود بینی اور

خود پسندی سے ثبات کا اظہار کرتے ہوئے جہالت کا احساس کرے گا۔ انسان خود کو ساری خلقت کا محور سمجھتا ہے، ہر چند کہ انسان کامل کی یہی شان ہے۔ تمام موجودات کی نظر میں معلوم نہیں کہ ایسا ہی ہو، اور رشد و ارتقاء سے عاری انسان (یقیناً) ایسا نہیں ہے۔"[12]

رومی اس حقیقت عرفان کو زنگ و آلائش سے پاک آئینے سے تشبیہ دے کر یوں بیان کرتے ہیں:

آئینہ کز زنگ و آلایش جداست   پر شعاع نور خورشید خداست
رو تو زنگار از رخ او پاک کن   بعد از ان آن نور را ادراک کن

اگر آئینہ (دل) زنگ و آلائش سے پاک ہو تو پر شعاع نور خورشید خدا ہوتی ہے۔ (لہٰذا) تو اپنے چہرہ (دل) کو جو زنگ آلود ہے، اس کے چہرہ (عشق) سے پاک کرلے، بعد ازاں اس نور کا ادراک کر، اور حقیقت بھی یہی ہے۔ عرفان محض معلومات کو یکجا کر لینے اور فیض صحبت مشائخ سے اور علمی طور پر علم حاصل کر لینے سے تعبیر نہیں ہے، بلکہ وہ تصفیہ قلب اور اکتساب علم حقیقی کا طالب ہے۔ کیونکہ "جس نے اپنے نفس کا جائزہ لیا وہ نفع میں رہا، جس نے غفلت کی، اسے گھاٹا ہوا۔ اور جو (خدا سے) ڈرا وہ بے خوف ہو گیا (غیر اللہ اور عذاب سے) اور جس نے عبرت حاصل کی، اس نے (حقیقت کو) دیکھ لیا اور سمجھ گیا، اور جو سمجھ گیا اسے علم (یقین) ہو گیا۔" مقصود اس طرح وہ ہر طرح کی آلائشوں سے اپنے دامن کو سمیٹ لیتا ہے، اسی کے عشق میں، اسی کی مرضی کا تابع ہو کر، اس طرح کہ جیسے مولانا رومی نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے:

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد
او ز حرص و عیب کلی پاک شد
شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما
اے کہ تو افلاطون و جالینوس ما

(ہر وہ جس کا لباس اس کے عشق میں پارہ پارہ ہوا (تو) وہ لالچ و تمام (دوسرے) عیوب سے پاک ہوا۔ شاد باش اے خود میرے اپنے پسندیدہ سودے، میرے عشق، اے میری تمام علتوں کے میرے طبیب! اے میرے غرور و خود پسندی اور 'ناموس' کی دوا! اے تو کہ میرا افلاطون اور میرا جالینوس ہے)[13]

حرص و حب جاہ و منصب، جو حب دنیا کے ذیل میں آتے ہیں، سبب کوتاہی پرواز روح ہوتے ہیں، ملتجائے منزل سے ہٹا کر پستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ مولانا نے اس بات کو آب زیر کشتی اور آب اندر کشتی، کی مثال دے کر سمجھایا ہے۔ مادی دنیا میں ہیں تو روحانی سفر کے لیے بھی وسائل درکار ہیں کہ

پیغمبر اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ الدنیا مزرعة الآخرة (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) اور یہ کہ انما الاعمال بالنیات (اعمال نیتوں پر ہی ہے)۔ امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا ہے کہ وہ مال جو دین کی راہ میں خرچ ہو اس کا کمانا احسن ہے ان حوالوں کی روشنی میں رومی کے مندرجہ اشعار کے معنی و مطالب ہمیں حب مال و بے جا جاہ و منصب سے دامن بچا کر نکل جانے کا پیغام دیتے ہیں:

مال را کز بہر دین باشی حمول نعم مال صالح گفتا رسولؐ

اور یہ کہ:

آب در کشتی ہلاک کشتی است زیر کشتی بہر کشتی پشتی است

بیشک! کشتی کو چلانے کے لیے زیر کشتی آب چاہیے لیکن اگر حب آب دنیا میں کشتی ہی کو آب سے بھر لیا تو نتیجہ صرف غرقاب ہونا اور تباہی ہے۔ پھر حب دنیا و حب مال حریص کو کہیں کا نہیں رکھتے۔ صاحب نہج البلاغہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ من اطال الامل اساء العمل[4] (جو طولانی امیدیں رکھے گا، اپنا کردار (اس) بے عملی کی وجہ سے تباہ کر دے گا) اور یہ کہ الطمع رق مؤبد[5] (لالچ دائمی غلامی ہے) دنیا کی اور دنیا والوں کی۔ اور یہ کہ الطامع فی وثاق الذل (لالچ کرنے والا ذلت کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے)[6] راہ صدق و صفا اور عشق حقیقی بہ صفت موجودی ذات عالیہ حرص و ہوا اور ہوس آید حب دنیا سے بچاتی ہے۔ عارف تو گرفتار عشق خدا اور رسولؐ و اہلبیتؑ ہوتا ہے۔ بقول آیت اللہ شمینی

عاشقم عاشقم مریض توام
زین مرض من شفا نمیخواہم

یہی عشق بلند پرواز کی مہمیز کرتا ہے کہ بلندی پرواز سرشت انسان خاکی میں ہے۔ بقول رومی:

بین کہ اندر خاک تخمے کاشتم
گرد خاکی و منش افراشتم

لیکن منزل صدق صفا میں صوفی و عارف کو باعمل ہونا چاہیے۔ مولانا رومی کو کاہل ناپسند تھے۔ ان کا قول ہے کہ حق تعالیٰ مردم کاہل و عاطل و اہل کسل کو دوست نہیں رکھتا۔ صدقہ و ہدیہ بھی ناپسند تھا۔ مؤلفین نے ان کے اس قول کو رقم کیا ہے کہ "اکثر اولیاء اللہ نے سوال کو ذلت نفس کے لیے جائز رکھا تھا مگر میں نے اس در کو بند کر دیا ہے تا میرے مرید اپنی محنت سے کمائیں یا تجارت میں مشغول ہوں (ہر کہ از یاران ما این طریقہ را نورزد، بوئے را نیرزد، و فرجان روز قیامت روئے ما را نخواہد دیدن و اگر چنانکہ یکے دست دراز کند من روئے برایشان فراز نخواہم کرد۔ بحوالہ مناقب ص ۱۳۵)

جھوٹے صوفی سے یہ کہہ کر آگاہ کیا کہ:

دست بستہ گیر ہمچوں گربہ خستہ کردہ خلق او بے حربہ

امام آیت اللہ شمینی نے بھی کہا ہے کہ:

صوفی از وصل دوست بی خبر است صوفی بی صفا نمیخواہم

سچ ہے کہ دست بستہ کو فرش گربہ جو بغیر حربہ خلق خدا کو برباد کرے اور وہ جو بے صفا ہو اسے کون پسند کرے گا؟

لیکن عرفانی شخصیتوں کا کیا کہنا کہ ان کے لیے امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "بیشک اللہ سبحانہٗ نے اپنی یاد کو دلوں کی صیقل قرار دیا ہے، جس کے باعث وہ (امر و نواہی سے) بہرہ ہونے کے بعد سننے لگے اور اندھے پن کے بعد دیکھنے لگے اور دشمنی و عناد کے بعد فرماں بردار ہو گئے۔ یکے بعد دیگرے ہر عہد اور ہر انبیا سے خالی دور میں حضرت رب العزت کے کچھ مخصوص بندے ہمیشہ موجود رہے ہیں کہ جن کی فکروں میں سرگوشیوں کی صورت میں وہ (حقائق و معارف کا) القا کرتا ہے اور ان کی عقلوں سے (الہامی آوازوں کے ساتھ) کلام کرتا ہے، چنانچہ انھوں نے اپنی آنکھوں، کانوں اور دلوں سے بیداری کے نور سے (ہدایت و) بصیرت کے چراغ روشن کیے۔ وہ مخصوص یادر کھنے کے (قابل) دنوں کی یاد دلاتے ہیں اور اس کی جلالت و بزرگی سے ڈراتے ہیں۔ وہ لق و دق صحراؤں میں دلیل راہ ہیں[۱۰۱]

پیر کا دن تھا اور ۵ جمادی الاول ۶۷۲ھ کہ محمد بلقب جلال الدین خداوندگار ولد محمد بہاء الدین ولد (متوفی ۶۲۸ھ قونیہ ترکی) اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ مولانا نے مندرجہ ذیل وصیت چھوڑی۔[۱۱]

اوصیکم بتقوی اللہ فی السر والعلانیة و بقلة الطعام و قلة المنام و قلة الکلام و هجرة المعاصی والآثام و مواظبة الصیام و دوام القیام و ترک الشهوات علی الدوام واحتمال الجفاء من جمیع الانام و ترک المجالسة السفهاء و العوام و مصاحبة الصالحین الکرام فان خیر الناس من ینفع الناس و خیر الکلام ما قل و دل والحمد لله وحده (بحوالہ مناقب صفحہ ۱۴)

[میں تم کو باطن اور ظاہر (دونوں) میں اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں اور کم کھانے کی اور کم سونے کی اور کم بولنے کی اور گناہ نہ کرنے کی اور گناہوں سے دور رہنے کی، اور متواتر روزے رکھنے کی اور نماز کی پابندی کرنے کی اور بے شعوروں اور عام لوگوں کے ساتھ نہ اٹھنے بیٹھنے کی اور صالحین کرام کے ساتھ مصاحبت کی۔ بیشک لوگوں میں بہترین وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے اور خیر الکلام وہ ہے جو کلام کرے اور (لوگوں کو) دلالت کے ساتھ قائل کرے۔ پس ساری حمد و ثنا اللہ واحد کے لیے ہے]

جلال الدین رومی نے شیریں کلامی کی بھی تلقین یہ کہہ کر کی ہے کہ:

تلخ از شیریں لباں خوش می شود
خار از گلزار دلکش می شود

پند و نصائح کا اخذ کر لینا اور اس پر عمل کر لینا، خود اپنی طبیعت اور لگن پر بھی منحصر ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو مولانا نے اس طرح واضح کیا ہے کہ ایک بار مغلوں کے کارندہ معین الدین پروانہ نے ان سے پند و نصیحت کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا کہ میں نے سنا ہے کہ تم نے قرآن شریف یاد کیا ہے؟ اس نے کہا 'ہاں'۔ پھر مولانا نے کہا کہ تم نے شیخ صدر الدین سے کل احادیث سنی ہیں۔ اس نے کہا 'ہاں'۔ مولانا نے یہ سب سنا اور کہا کہ جب ان کے کلمات سے تم کو پند و نصیحت نہ حاصل ہوئی تو میرے کلمات سے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟ اس طرح رومی پند و نصیحت کے بیان کے ساتھ ساتھ سامع کی آمادگی اور کسب فیض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن اور حدیث کی معنویت اور ان کے سرچشمہ ہدایت ہونے کی بات کرتے ہیں۔

رومی کی حیات، ان کے طرز بیان، کسب علم اور میدان علم و تفکر میں ان کی عرفانی پرواز، دلنشیں تشبیہات کے میدان میں ان کا پراثر انداز اور بلاغت کلام یعنی ایک پُر معنی زندگی کا ما حاصل اور عرفانی تفکر کے سبب مثنوی معنوی میں کارفرما ہیں۔ مثنوی کا اپنا انداز ہے کہ جس کی بہار بدون خزاں چمنستان ادب و شاعری کو مہکاتے کے ساتھ ساتھ دلوں کو موہ رہی ہے اور آئندہ بھی موہتی رہے گی۔

حوالے:

-۱ رومی کے والد سلطان العلماء محمد بہاء الدین ولد بروز شنبہ اواخر ۶۱۰ھ یا اوائل ۶۱۱ھ میں اور بعض کے نزدیک ۶۱۷ھ سے کچھ پہلے بلخ چھوڑ کر نیشاپور آ گئے تھے جہاں ان کی ملاقات فرید الدین عطار سے ہوئی پھر آپ بغداد اور وہاں سے بغرض حج حجاز پہنچے اور واپسی پر دمشق آئے، پھر ملاطیہ اور ملاطیہ سے آق (آذربایجان) آئے اور یہاں چار سال مقیم رہے۔ پھر وہ اور ان کا قافلہ لارندہ آ گیا۔ لارندہ میں کم و بیش سات سال قیام رہا۔ آغاز سفر میں مولانا رومی جو چھ سال کے تھے، اب اٹھارہ سال کے ہو چکے تھے۔ ۶۲۱ یا ۶۲۲ھ میں خواجہ شرف الدین سمرقندی کی صاحبزادی گوہر خان سے عقد ہوا، جن سے مولانا کے بڑے صاحبزادہ، سلطان ولد کی ۶۲۳ھ میں ولادت ہوئی۔ دوسرے فرزند علاء الدین بھی یہیں متولد ہوئے۔ ۶۲۶ھ میں سلطان العلماء وارد قونیہ (ترکی) ہوئے اور تا حیات یہیں قیام کیا یعنی ۶۲۸ھ تک جب آپ کا انتقال ہوا۔ اس طرح مولانا رومی نے تقریباً ۱۵ سال سفر میں گزارے۔ چوبیس سال کی عمر میں (۶۲۸ھ) میں آپ باپ کے جانشین ہوئے۔

-۲ شمس تبریز کے اثر سے اور مولانا کا علم قال سے تعلق کم ہوا۔ بعض مؤلفین کہتے ہیں کہ درس و تدریس، وعظ و تذکرے

سب ترک ہو گئے، عالمانہ لباس کو بھی چھوڑ دیا۔ سماع اور قوالی سے رغبت پیدا ہو گئی۔ لیکن ان کا مذاق شاعری ان کی غزلوں، رباعیوں اور عالمی شہرت کی حامل ان کی مثنوی میں نمایاں ہو گیا۔

-۳ [illegible] خان، افکار رومی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۸۱ء، ص ۱۷۱

-۴ آیت اللہ خمینی، چھوٹی بہو فاطمہ طباطبائی کے نام مکتوب

-۵ نہج البلاغہ، کلمات قصار حضرت علی ابن ابی طالب، شمار ۲۰۰

-۶ الفاظوں و بیانوں کو ذکر صرف معنی طبیب لینا چاہیے۔ روحانی بیماریوں کے لیے بہترین طبیبوں کا نام رومی نے لکھے ہیں۔

-۷ نہج البلاغہ، کلمات قصار حضرت علی ابن ابی طالب، شمار ۳۶۱

-۸ ایضاً کلمات قصار حضرت علی ابن ابی طالب، شمار ۲۱۲، اور یہ کہ اکثر مصارع العقول تحت بروق المطامع (عقل کی بیشتر ٹھوکریں لالچ کے چمکنے کی جگہ ہے) کلمات قصار، شمار ۲۱۱

-۹ ایضاً کلمات قصار حضرت علی ابن ابی طالب، شمار ۲۱۸

-۱۰ ایضاً خطبہ نمبر ۲۱۹، امامیہ پبلشرز، لکھنؤ ۱۹۸۲ء

-۱۱ یہ اہمیت تعلیمات اسلامی کا اعادہ کر رہی ہے۔

-۱۲ آیت اللہ خمینی کے اشعار 'بادہ عشق' سے ماخوذ ہیں۔

امیر خسروؒ — روحانیت اور تصوف کے علم بردار

سلسلہ عالیہ چشتیہ کے مشائخ اور انکے حاشیہ نشینوں نے تصوف کے عملی پہلوؤں پر خاص توجہ دی اور اس کی افادیت و اہمیت اور معنویت کی بنا پر اسے ایک عوامی شکل دی کیونکہ ان کے دستور عمل میں سوز و گداز، عشق الٰہی، اپنے شیخ اور مرشد کے تئیں غیر معمولی عقیدت و محبت، اس کی اہمیت، انسان دوستی، مخلوق خدا کی خدمت، دلداری و دلدہی اور دوسرے اہل مذاہب کے ساتھ شفقت و محبت، رواداری ارباب حکومت اور صاحبان اقتدار سے دوری وغیرہ کے عناصر غالب رہے۔ اسی لیے مشائخ چشت کی فرمانروائی اور سلطانی کا دائرہ عوام و خواص کے قلوب اور ذہنوں پر محیط رہا۔

یوں تو تمام مشائخ چشت کی مقبولیت و محبوبیت ہر دور میں اپنی اپنی جگہ مسلم رہی مگر اللہ تعالیٰ نے جو مرجعیت و محبوبیت حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی قدس سرہ السامی کو ارزانی فرمائی وہ دوسرے مشائخ میں کم نظر آتی ہے جو کوئی انوکھی بات نہیں والله يختص برحمة من يشاء۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے مخصوص فرماتا ہے۔

ہندوستان کے پورے منظر نامہ پر حضرت محبوب الٰہی جیسی دلآویز اور نابغہ روزگار ہستی جس طرح منفرد ہے اسی طرح ان کے دامن فیض سے وابستہ یار وفادار، محرم اسرار اور ان کی تمام عنایات و نوازشات کے مورد حضرت امیر خسروؒ جیسی غیر معمولی، ہمہ جہت شخصیت بھی دور دور تک کہیں نظر نہ آئی۔ عظمت و عبقریت ان کی شخصیت کے ہر پہلو کے لازم و ملزوم ہیں۔ وہ ان ہندوستانی فارسی شعرا میں ہیں جن کے تذکرہ کے بغیر اہل زبان (ایرانی) آگے ہی نہیں بڑھتے:

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست | ملکیت ملک سخن از خسرو ماست
این خسرو ما ناصر خسرو نیست | زیرا کہ خدا ناصر خسرو ماست

* پروفیسر و صدر، شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(خسرو جیسا شاعری و ادب میں [illegible] ملک سخن کی بادشاہی ہی ہمارے خسرو سے ہے۔ ہمارا یہ خسرو [illegible] ناصر خسرو نہیں۔ اس لیے کہ ہمارے خسرو کا [illegible] اللہ ہے)

حضرت محبوب الٰہی کی جس محبت و عنایت اور شفقت خسرو کے حال پر تھی اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی:

[illegible] | دست ترک اللہ بگیر و هم بالینش سپار
[illegible] | شیخ من [illegible] مهربان [illegible] آمرزگار

([illegible] ترک اللہ (اللہ کا ترک) ہوگیا ہے۔ اس ترک اللہ (خسرو) کا [illegible] میرے شیخ بہت مہربان [illegible])

[illegible]

([illegible] جہاں تک آپ سے وفاداری کا تعلق [illegible])

[illegible] | [illegible] جگر سوز [illegible]

([illegible] سوختگی میری وجہ جگر سوز ہے)

[illegible] | جہان چون او سخن گوے نہ دارد

([illegible] آج دنیا میں اس جیسا سخن گو ہے ہی نہیں)

ان کے [illegible] کلام کے علاوہ ان کی غزلیات و قصائد اور مثنویوں میں بھی حقائق و معارف اور

حیات انسانی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے جو اصول ذخیرے ہیں ان کی مثال نہیں۔ ان سے ذرا پہلے فارسی کے عظیم صوفی و عارف شاعر مولانا جلال الدین رومی (۶۷۲ھ) نے جس امر کی طرف اشارہ فرمایا کہ:

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں　　گفتہ آید در حدیث دیگراں

(معشوقوں کے اسرار و رموز جب دوسری زبان میں ادا کیے جائیں تو بات ہی کچھ اور ہو جاتی ہے) پوری صوفیانہ شاعری کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

امیر خسرو کے کلام میں بھی یہی تمام عناصر ہیں خواہ وہ ان کی مدحیہ شاعری ہو یا غزلیں، مثنویات ہوں یا رباعیات مجازی شاعری کی تہوں میں وہ اسرار و رموز ہیں جن کی تفصیل و تشریح کے لیے دفتر درکار ہیں۔ ان کی شاعری کی اہمیت و معنویت اور پیغام کی آفاقیت اس دور میں نہ صرف ناگزیر ہے بلکہ بیمار انسانیت کے لیے نسخہ کیمیا ہے۔ ان کی وقیع اور عظیم تصنیف "اعجاز خسروی" کی حیثیت سے ایک ایسی تخلیقی تجربہ گاہ کی ہے جس میں ان کی فنکارانہ طبیعت کے لاتعداد منظوم و منثور نمونے موجود ہیں۔

ارباب تصوف نے اخلاقی تعلیمات کو اپنے یہاں غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ قرآن مجید اخلاقیات کا ایک مکمل دستور ہے۔ امیر خسرو نے ان تعلیمات کو اس انداز اور لب ولہجہ میں اپنی شاعری کے ذریعہ پیش کیا کہ وہ معاشرے کے لیے ایک اہم اور لاینفک جزو بن گئیں وہ امراو سلاطین سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

"اگر تم طاقت ور بننا چاہتے ہو تو تمھیں رعایات کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ باغیوں سے سختی کے ساتھ آنا جائز و روا ہے مگر دوسروں کے ساتھ رحم دلی اور نرمی کا برتاؤ بھی بہت ضروری ہے اپنی فکر کو بیدار رکھو اور تلوار کو سونے دو۔۔۔ قوت و طاقت کی بنیاد انصاف اور ایمانداری پر ہونی چاہیے۔"

تصوف کی بنیاد تعلیم مخلوق خدا ہے، بلاتفریق مذہب و ملت محبت و ہمدردی ہے۔ اس کی تکلیف و رنج کو اپنی تکلیف گردانتا اور اس کے لیے صحیح راستہ متعین کرنا ہے۔ حدیث شریف ہے کہ لایومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ (تم میں سے کوئی ایمان والا ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ دوسروں کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے)۔

حضرت خسرو کہتے ہیں:

نزدیک اہل بینش کورست دکور وینک　　عاشق کہ پیش چشمش زنگی صنم نہ باشد

(صاحبان نظر کے نزدیک وہ شخص قطعی نابینا ہے کہ عاشق تو بیمار ہو لیکن سیاہ فام شخص کے حسن کی پرستش نہ کر سکے)

نیک و بد سب ہیں تو اب اس کے ظہور اسما　　مجھ کو یک رنگ نظر چاہیے ہر فرد کے ساتھ

وہ معشوق حقیقی کو اپنی جان کی طرح ہمہ وقت اپنے جسم میں دیکھتے ہیں:

عاشقی ام کہ گر آواز دہی جان مرا　　دوست از سینہ ام آواز برآرد کہ من

(میں وہ عاشق ہوں کہ اگر تم میری جان کو پکارو گے تو اندر سے دوست کی آواز لبیک کہے گی)

مشہور حدیث قدسی ہے کہ **کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق لکی اعرف** (میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا میں نے چاہا کہ مجھے پہچانا جائے تو مخلوق کو پیدا کیا تا کہ میری شناخت و معرفت ہو)۔

اللہ تعالیٰ نے جب اپنے حسن کا مشاہدہ کرنا چاہا تو کائنات کی تخلیق کی اور اس کا اپنا آئینہ بنایا غیر جسمانی حسن نے جب جلوہ نمائی چاہی تو اپنے یکتائی کے رنگ کو صد ہا رنگوں کے سانچے میں ڈھال دیا:

جمال مطلق آمد جلوہ آہنگ　　مقید گشت یک رنگی بصد رنگ

صوفی نیرنگیوں میں بھی یک رنگی کے متلاشی رہتے ہیں کیوں کہ ہر رنگ میں ایک وہی رنگ ہے:

نیرنگیوں میں یار کے گھبرا نہ جائیو　　ہر رنگ میں اسی کو نمودار دیکھنا

خسرو بھی اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ حق بیں وحق شناس نگاہ مجازی جلووں کی قید میں گرفتار نہیں رہ سکتی:

چو تو نمودی جمال نقش ہمہ نیکواں　　رفت بروں از دلم نقش تو از جاں نہ رفت

(جب تو نے اپنا جمال دکھایا سب حسینوں کے نقش دل سے محو ہو گئے اور تیرا نقش جان سے نہ گیا)

حسن مطلق کبھی عاشق صادق کو جلوہ ہائے بے محابا سے شاد کام کرتا ہے اور کبھی حجابات میں چھپ کر اس پر ایک انقباضی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ عاشق کی بیقراری ملاحظہ ہو:

رخ چہ پوشی چوں حدیث حسن تو پنہاں نماند　　گل ہمہ پردہ درد از بوئے خود مستور نیست

(جب تیرے حسن کا چرچا ہو ہی گیا تو منہ چھپانے سے کیا حاصل۔ پھول سو پردوں میں رہے مگر اپنی خوشبو کی وجہ سے چھپ نہیں سکتا)

انہوں نے ہستی سے نیستی کی جانب سفر کیا تو اس حقیقت کا برملا اظہار بھی فرمایا:

نے گلم نے بلبلم نے شمع نے پروانہ ام　　عاشق حسن خودم بر حسن خود دیوانہ ام

(میں نہ پھول، نہ بلبل، نہ شمع، نہ پروانہ، اپنے حسن کا عاشق اور اسی کا دیوانہ ہوں یعنی میرا پورا وجود اسی وجود کل کے حسن کا حصہ ہے)

ہستی من رفت و خیالش نماند　　ایں کہ تو بینی نہ منم بلکہ اوست

(میری ہستی نابود ہو گئی اس کا تصور بھی نہ رہا تم جو یہ ایک ہیولیٰ دیکھ رہے ہو وہ میں نہیں بلکہ وہ (محبوب) ہے)

تصوف کی راہ میں اصل چیز اپنے نفس امارہ کو مارنا ہے کیوں کہ اس راہ میں تو نفس کشی بت شکنی ہے اور بغیر اس کے کامیابی وم نقد ہوہی نہیں سکتی:

نفس کی اصلاح کر پہلے ریاضت سے تراب　　　　بے شکست نفس امارہ ظفر ملتی نہیں

(شاہ تراب علی قلندر کاکوروی)

امیر خسروؒ فرماتے ہیں:

نیست آں مردانگی کاندر غزا کافر کشی　　　　در صف عشاق خود را کشتن از مردانگی ست

(جہاد میں کافر کو مار گرانا مردانگی نہیں۔ ہم عاشقانِ الٰہی کے یہاں تو مردانگی یہ ہے کہ اپنے نفس کو جو سب سے بڑا دشمن ہے مار گرائے)

خودی و پندار سے چھٹکارہ پانا بے حد ضروری ہے کہ پندار کی سوئی سے سیاہ ہوا لباس فقیر کے دھوکے و تزویر کے لباس سے کہیں بدتر ہے:

خرقۂ تزویر کہ پوشد فقیر　　　　دوختہ از سوزن پندار بہ

خود بینی و غرور کے بارے میں کہتے ہیں کہ جواں مردوں کا یہ کام نہیں آنکھ کی پتلی کو دیکھو کہ وہ بذات خود بینائی کے باوجود خود کو نہیں دیکھتی اسی لیے اسے بلندی حاصل ہے:

رسم مردم نیست خود بینی بہ بیں مردم چشم　　　　عین بینائی و در خود ننگرد زاں سرور است

وہ نفس امارہ پر قابو پانے والوں اور اس سے پورے طور پر آزاد ہو جانے والوں کو خراج دیتے ہیں:

اے من غلام ہمت آں پاک بندہ ام　　　　کز بندگی نفس بد آزاد می رود

(میں تو اس پاک بندہ کی ہمت کا غلام ہوں جو نفس امارہ کی غلامی سے آزاد زندگی بسر کرتا ہے)

حضرات صوفیہ کے یہاں قناعت و توکل یا فقر ترک دنیا اور رہبانیت ہے جس کے الزامات ان پر لگتے رہتے ہیں کہ وہ قرآن و حدیث کے صریحی احکام سے اس باب میں بھی روگردانی کرتے ہیں۔ مولانا رومؒ نے تو صاف فرمایا کہ:

چیست دنیا از خدا غافل بدن　　　　نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

(دنیا حقیقۃً اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جانے کا نام ہے نہ دنیاوی زیب و زینت اور اہل و عیال کو اختیار کرنا)

صوفیا نے انسان کو قناعت و توکل اختیار کرنے کی بڑی دل پذیر تعلیم دی ہے کیوں کہ یہ وہ صفت ہے جو اس کو بے فکری اور سکون کی دلازوال دولت بخشتی ہے۔ مولانا نے بڑی اچھی مثال دی ہے:

کوزۂ چشم حریصاں پر نہ شد　　　　تا صدف قانع نہ شد پر دُر نہ شد

(لالچی لوگوں کی آنکھ کا پیالہ کبھی بھرتا ہی نہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ جب تک سیپ قناعت پسند نہیں ہوتی اس میں موتی نہیں بنتا)

امیر خسروؒ فرماتے ہیں:

کوس شہ خالی و بانگ غلغلش درد سر است　　　　ہر کہ قانع شد بہ خشک و تر شہ بحر و بر است

(بادشاہ کا ڈھول اندر سے پول ہوتا ہے مگر شور اتنا مچاتا ہے کہ سر میں درد ہو جاتا ہے۔ جو پانی کے گھونٹ اور روکھی سوکھی پر قناعت کر جائے وہی بر و بحر کا بادشاہ ہوتا ہے)

ہر کہ بہ ہیچے ز جہاں شاد گشت　　　　ہم چو من از بندگی آزاد گشت

(جو شخص تھوڑے میں ہی خوش ہو جاتا ہے وہ میری طرح ہر غلامی سے آزاد ہے)

ز حاجت بیش در دنیا مجو چیز　　　　وگر نا جستہ یابی رد مکن نیز

(ضرورت سے زیادہ کی تلاش مت کرو لیکن اگر بغیر تلاش کچھ مل جائے تو اسے رد بھی مت کرو)

صوفیا نے انسان کو بیکار رہنے سے منع کیا کہ مرد بیکار بدتر از گنہ گار۔ خسروؒ کہتے ہیں کہ انسان جہاں ہو مصروف کار رہے کیوں کہ بیکار و معطل شخص شرمندہ و ذلیل ہوتا ہے۔ مقصود بھی حاصل ہوتا ہے جب اس کے لیے رنج و کلفت اٹھائے جو کاہل و بیکار ہے اس کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ دنیاوی جنگ میں الجھا رہے:

مرد ہمہ جا ہمہ کار بہ　　　　شخص معطل خجل و خوار بہ

بہرۂ مقصود چو بے رنج نیست　　　　کاہل بیکار بہ پیکار بہ

صوفیا نے ہمیشہ رضائے حق کے لیے عبادت و اطاعت کی نہ کہ جہنم کے خوف اور جنت کے لالچ میں۔ ان کی نگاہ میں سب سے بڑی دولت معرفت حق ہے:

طاعت اگر از پے مال و زر ست　　　　کاسہ کہ خاکیست نگو سار بہ

اگر مال و زر کمانے کے لیے عبادت کی جائے تو مٹی کا وہ معمولی سا پیالہ تک اس سے کہیں بہتر ہے جو اوندھا بیکار پڑا ہو:

عاشق زر عاشق درگاہ نیست　　　　زاں کہ دوئی در خور ایں راہ نیست

(جو مال و دولت پر مرتا ہے وہ درگاہ عالی کا عاشق نہیں ہوتا کیوں کہ اس کی راہ میں دوئی نہیں چلتی)

اسی طرح رضا بالقضا بھی اہم ہے جہاں اپنی مرضی و خوشی اپنی نہیں ہوتی۔ کردہ و ناکردہ گناہوں پر شرمندگی و پشیمانی ہی بندگی شعار ہے:

عاشق اور بہ قید شرط کفر ہے عاشق نہیں　　　　اس کی خوشی پہ جان دے اپنی خوشی خوشی نہیں

فرماتے ہیں "دوست اللہ کے حکم پر راضی برضا ہو جا اور حق کی اطاعت کر کے اپنے دین کو مضبوط کر۔ اگر تیری آنکھ بھی بے حجابی و بے حیائی کی مرتکب ہو تو شرمندگی کے آنسوؤں سے اسے پاک کرے۔"

اے دوست رضا بہ حکم یزدانی دہ وز طاعت حق، داد مسلمانی دہ
چشمت چو زنا کند گرش خواہی پاک غسلش تو ز گریۂ پشیمانی دہ

وہ دنیا کی بے ثباتی، کم حیثیتی و بے مائگی کا بڑے دل نشیں انداز میں ذکر فرماتے ہیں اور انسان کو تواضع و فروتنی اور خاکساری کی تعلیم دیتے ہیں جو ارباب تصوف کا طرۂ امتیاز ہے:

آں سروراں کہ تاج سر خلق بودہ اند اکنوں نظارہ کن کہ ہمہ خاک پا شدند
اے گل چو آمدی ز زمیں گو، چگونہ اند آں رو بہا کہ در تہ گرد فنا شدند
خورشید بودہ اند کہ رفتند زیر خاک آں ذرہ ہا کہ بر ہمہ اندر ہوا شدند

(وہ تمام لوگ جو مخلوق کے سر کا تاج بنے ہوئے تھے آج دیکھو! تو سب کے سب پیروں کی دھول ہو گئے ہیں۔ اے پھول تو زمین کے اندر سے آ رہا ہے بتا کہ وہ چہرے کیسے ہیں جو فنا کی گرد تلے دب گئے۔ وہ ذرے جو ہوا میں منتشر ہیں کبھی سورج جیسے تھے مٹی کے تلے دب گئے اور یہ انجام ہوا)

سیلی باد ہیں کہ چساں افگند بخاک غنچہ کہ می نہد دو سہ روزے کلاہ کج

(زمانہ کی مار! تو بہ توبہ۔ وہ تین روز جو کسی کلی نے کج کلہی (ناز) دکھائی تو ہوا نے زور کا طمانچہ رسید کیا اور زمین پر دے مارا)

سرے کہ زیر زمیں شد نہفتہ شاہاں را ہماں سراست کہ بر آسماں فراختہ اند

(جن جن کے سر جہاں بانی کے نشہ میں چور آسمان پر رہا کرتے تھے اب زمین کی تہوں میں نہ جانے کہاں غائب ہو گئے)

بیا تا بے گل و صہبا نہ باشیم کہ گل باشد بسے و ما نباشیم
ز گل نازک تریم و چند گاہے بجز زیر گل و خارا نباشیم
چو زیر پائے می باید شدن خاک چرا چوں خاک زیر پا نباشیم
چو بودن نیست خسرو جز دو روزے دو روزے نیز بگور تا نباشیم

(بہت پھول کھلیں گے مگر (اس وقت) ہم نہ ہوں گے جب تک شراب و پھول کی لذت و صحبت میسر ہے آؤ دل بھر لیں۔ ہم نازکی میں ہر چند پھول سے بھی سوا ہیں مگر وہ وقت آنے والا ہے کہ بجز پتھر کے نیچے پڑے ہوں گے۔ جب سب کو پاؤں تلے کی خاک (ایک دن) ہونا ہی ہے تو کیوں نہ ہم خاکسار بن کر رہیں۔ خسرو! جب زندگی دو روزہ ہی ٹھہری تو موت سے پیشتر کے ان دونوں کو بھی سلام کر، ان سے بھی کیا لینا دینا ہے)

عشق و محبت فطرت انسانی کا خاصہ، قسام ازل کا عطیہ بے بہا اور عنایت الٰہی ہے اسی لیے حضرات صوفیا کے یہاں عشق و محبت کو غیر معمولی اہمیت و فضیلت حاصل ہے کیوں کہ وہ تمام ظاہری و باطنی

بیماریوں کی دوا ہے بغیر اس کے باطنی کمالات کی تکمیل ہو ہی نہیں سکتی۔ اس میں مکمل فنائیت کے بعد اور وجود و عدم سے گزر کر ہی بقائے بندگی میسر آتی ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں:

دین من از عشق زندہ بودن ست زندگی زیں جان و سر ننگ منست
از وجود و از عدم گر بگذری از حیات جاودانی برخوری

(میرا دین و ایمان بھی عشق میں ڈوب ڈوب کر جینا ہے اس ظاہری زندگی سے جو جان و سر سے ہے زندہ رہنا میرے لیے باعث شرم ہے۔ اگر وجود و عدم سے گزر جاؤ تو ابدی زندگی تمہارے دم نقد ہو جائے گی)

بلکہ یہ بھی فرماتے ہیں:

آں روح را کہ عشق حقیقی شعار نیست نابودہ بہ کہ بودن او غیر عار نیست
در عشق باش مست کہ عشقست ہر چہ ہست بے کار و بار عشق بر دوست بار نیست
گویند عشق چیست؟ بگو ترک اختیار ہر کو ز اختیار نرست اختیار نیست
عشق ست و عاشقست کہ باقیست تا ابد دل بر جز ایں منہ کہ بجز مستعار نیست

(وہ روح جس کا شعار کبھی عشق حقیقی نہ رہا اور اس کا نہ ہونا ہی بہتر ہے کیونکہ اس کا وجود عار و ننگ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ عشق میں مست و بیخود ہو جاؤ کیوں کہ جو کچھ ہے عشق ہے دوست کے لیے اگر کچھ کرنا چاہتے ہو تو صرف عشق کرو کیوں کہ کاروبار عشق اس پر بار نہیں۔ لوگ پوچھتے ہیں عشق کیا ہے ان سے کہہ دو اپنے اختیار کا مکمل ترک کر دینا جو اختیار سے آزاد نہ ہو اس کا کوئی اختیار نہیں۔ عشق و عاشق ابد تک باقی رہنے والے ہیں اس کے علاوہ دل کسی چیز میں نہ لگاؤ کہ اس کے سوا ہر چیز فانی ہے)

امیر خسرو کے کلام میں جا بجا اسی عشق کی اہمیت و ضرورت اور اس کی غرض و غایت کی بازگشت ہے اس لیے بھی کہ وہ جس مقدس ذات کے دامن فیض سے وابستہ تھے اس کی پوری شخصیت اسی عشق کی تفسیر تھی

آنی کہ از نام تو می بارد عشق وز نامہ و پیغام تو می بارد عشق
عاشق شود آنکس کہ بکویت گزرد آرے ز در و بام تو می بارد عشق

(آپ ہی تو ہیں جن کے نام سے عشق برس رہا ہے آپ کے نامہ و پیغام سے عشق و محبت ٹپک رہا جو بھی آپ کے کوچے سے گزر جائے ناممکن ہے عاشق نہ ہو جائے کیوں کہ بام و در سے عشق کا مینہ برس رہا ہے)

حضرت خسرو اسی عشق کی اہمیت و ضرورت کو بیان کرتے ہیں کہ صاحبان عقل و ہوش اور ارباب دل کے لیے یہ مستی و خوشی ناگزیر ہے جس کسی کو یہ نہ ملی وہ تمام عمر بے خبر رہا:

بگو کہ چند شوی بے خبر ز مستی عشق کسے کہ مستیش از عشق نیست بے خبر است

وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ بغیر عشق حقیقی کے زندہ دلوں کا ایک لمحہ فضول و بیکار ہوتا ہے۔ مستوں پر ہوشیاری کا جو دن بھی گزرے وہ بڑا نامبارک و نحس ہوتا ہے۔

ضائع آں وقتے کہ بر زندہ دلاں بے عشق رفت　　　ناخوش آں روزے کہ بر مستاں بہ ہشیاری گزشت

اسی عشق کے سلسلہ میں برملا فرماتے ہیں:

کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست　　　ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

(میں عشق کا مارا کافر مجھے اسلام کی ضرورت کیوں ہو۔ میری ہر رگ تار بن چکی اس لیے مجھے زنار کی (بھی کوئی) ضرورت نہیں)

وہ ایک مقام پر یہ بھی فرماتے ہیں کہ مرادوں کا محل بہت بلند ہے جہاں حرص و ہوس کی حالت میں پہنچا ہی نہیں جا سکتا کیوں کہ عاشقی کے اس شربت کو بغیر جگر خون کیے چکھنا ہی ناممکن ہے:

ایوان مراد بس بلند ست　　　کانجا بہوس رسیدہ نتواں
کیں شربت عاشقی ست خسرو　　　بے خون جگر چشیدہ نتواں

عشق کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ماسوا سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اگر ملائکہ اور ہزار عالم بھی اس پر پیش کیے جائیں تو وہ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے:

حدیث جنت و دوزخ دگر مگو خسرو　　　وصال یار طلب کن گذر ازیں وسواس

(خسرو جنت دوزخ کی باتوں میں کیا رکھا ہے اصل بات تو یار سے ملنا ہے اس کی تدبیر کرو اور ان وسوسوں سے گزر جاؤ)

عشق اور خود پرستی دو متضاد شے ہیں۔ عشق میں خود رائی اور خود بینی کا کوئی گذر نہیں:

نہ بس زیباست لاف عشق بازی خود پرستاں را　　　چو با عشق آشنا گشتم ز خود بیگانہ خواہم شد

خود پرستوں کے لیے عشق بازی کا دعوی غیر مناسب ہے جب عشق سے آشنا (ہو کر اس کے کوچہ میں) داخل ہوا تو اپنے آپ سے بیگانہ ہو گیا (ہو جاؤں گا)

خود سے گزرنے اور خدا تک پہنچنے کے طریقے حضرات صوفیہ صافیہ نے اپنے اپنے انداز میں بیان فرمائے ہیں کیوں کہ خودی کے ساتھ خدا تک رسائی مشکل ہے:

جب تک خودی ہے تب ہی تک ہے خدا جدا　　　غیبت گر آپ سے ہو تو حق کا ظہور ہے

(شاہ تراب علی قلندرؒ)

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست　　　تو خود حجاب خودی حافظؔ از میاں برخیز

(عاشق و معشوق کے درمیان تو کوئی پردہ ہے ہی نہیں۔ حافظ حجاب خودی اٹھا دو اور بس)

خسروؔ بھی اپنے آپ سے گزر جانے اور حق تک رسائی کو بیان کرتے ہیں:

یک قدم بر جان خود نہ یک قدم در کوئے دوست　　　زیں نکوتر رہروان عشق را رفتار نیست

(ایک ساتھ دو دست قدم بڑھاؤ ایک اپنی جان پر دوسرا محبوب کے کوچہ میں۔ عشق کے راہی کے لیے اس سے بہتر کوئی رفتار نہیں ہے)

عاشقے را کہ غم دوست بہ از جاں نبود　　　عاشق خود بود و عاشق جاناں نبود

(جس عاشق کو اپنی جان سے زیادہ دوست کا غم نہ ہو وہ اپنا عاشق تو ہوگا محبوب کا عاشق نہیں ہو سکتا)

وہ اہل دل کو یہی نصیحت کرتے ہیں کہ محبوب کا دیدار اس وقت تک میسر نہیں جب تک سر کاندھوں پر ہے:

اے اہل دل نخست ز جاں ترک جاں کنید　　　و آنگہ نظارہ در رخ آں دلستاں کنید

الحذر! حریم عشق میں ہستی ہی جرم ہے　　　رکھنا یہاں نہ پاؤں کبھی سر لیے ہوئے

غلام عشق شو خسرو و بزیر تیغ گردن نہ

یہی نہیں بلکہ عاشقان الٰہی کا مذاق اڑانے والوں سے فرماتے ہیں:

ہر کہ بر حال عاشقاں خندید　　　گریہ ای واجب است بر حالش

(جو عاشقوں کے حال پر ہنستے ہیں ان کے حال پر رونا چاہیے)

وہ ایک جگہ راہ عشق میں ثابت قدمی اور مقام قلندری میں اپنے مرتبہ کا بیان بھی فرماتے ہیں:

در ملک قلندر کہ جہاں بانی ماست　　　دیوان بہ پریشاں سلیمانی ماست
مسند چو بہ آسمان خمار کنم　　　ہر قطرۂ مے نگین سلطانی ماست

(قلندر کے ملک میں جہاں ہماری حکومت ہے وہاں پری وشوں کے ساتھ ہمارا نظر آنا ہی بادشاہت ہے۔ جب سے فروش کے یہاں ہمارا مسکن ہو گیا تو شراب معرفت کا ہر قطرہ ہماری بادشاہت کی مہر ہے۔ یہ لفظی ترجمہ ان اشعار میں مضمر حقائق و مقامات کی تشریح نہیں کر سکتا)

انھوں نے اپنی شاعری میں روحانیت و تصوف کے علاوہ ایسے ایسے حکیمانہ موتی پروئے ہیں کہ انسان سر بگریباں رہ جاتا ہے۔ حکمت و دانائی کے یہ بیش بہا نکات بغیر عرفان و روحانیت کے زبان سے ادا ہی نہیں ہو سکتے:

باشہاں ہر چہ بر خلاف ہواست　　　نتواں گفت گرچہ باشد راست
ہر کہ شد راست گوئی داور خویش　　　زد بہ تیغ زبان خود سر خویش

(بادشاہوں کے خلاف مزاج کوئی بات بھی نہ کہنا چاہیے جس نے سچائی (سچ بولنے) کو شعار بنا لیا اس نے

گویا اپنی ہی زبان سے اپنا سر کاٹ لیا)

نغز گفت آں حکیم دانشمند — کہ ہنر بیش، دشمن بیش

(ایک دوراندیش، عقل مند نے کیا اچھی بات کہی ہے کہ جس کے پاس ہنر جتنا زیادہ ہو اس کے دشمن اتنے ہی زیادہ)

قطرۂ آبے کہ تن مردم ست — در دل آں قطرہ جہانے گم است

(جس قطرہ سے پیکر آدم بنا اس کے دل میں ایک دنیا پوشیدہ ہے)

باکہ ومہ صحبت از انساں گزیں — کز تو خرد مند شود ہم نشیں

(ہر چھوٹے بڑے، کس و ناکس کی صحبت میں اس طرح سے رہو کہ تمہارا ہم نشیں تم سے دانائی حاصل کرے)

نیست ہمہ نسل کریماں عزیز — تخم خیارست بے تلخ نیز

(بڑوں، بزرگوں کی بھی اولاد بڑی بزرگ نہیں ہوتی ککڑی کا کوئی کوئی بیج کڑوا بھی نکلتا ہے)

چناں بر عیب خویشم دیدہ کن باز — کہ از عیب کساں بر نارم آواز

(خدایا مجھ پر میرا عیب اس قدر ظاہر کر دے کہ لوگوں کی عیب جوئی کے لیے منہ نہ کھول سکوں)

نعمت بکشور سہل چیزیست — ہر گہ کہ ز دست شد عزیز ست

(جب نعمت ہاتھ سے چلی جاتی ہے تبھی وہ عزیز ہوتی ہے۔ یعنی اس کی اہمیت بعد کو معلوم ہوتی ہے)

چو طاؤس شو پیکر آرائے خویش — و لیکن فراموش مکن پائے خویش

(مور کی طرح اپنی خوبیوں پر پھولنے والے ذرا اپنے پیروں پر بھی نظر ڈالو۔ یعنی خوبیوں پر ناز کرنے والے اپنی خامیوں و کوتاہیوں کو بھی دیکھا کرو)

گرامی کن گوہر آدمی — گرامی ترین جوہر آدمی

(آدمی کا قیمتی سرمایہ اور آبرو بڑھانے والی چیز "کلام" ہے)

کار ایں جاکن کہ تشویش ست در محشر بسے — آب ازیں جا بر کہ در دریا بسے شور و شر است

(محشر میں تو عجب اتھل پتھل ہوگی کچھ کر نہ پاؤ گے۔ جو کرنا ہے یہیں کر لو۔ یہیں سے پانی بھر کر لے چلو۔ دریا پر شور شرابا بہت ہے)

غرض کہ امیر خسرو نہ صرف اپنے دور کے Genious تھے بلکہ ان کے بعد بھی ان کا جیسا ذہین او رماہر فن نہ پیدا ہوا۔ ان کی پیدائش پٹیالی میں ہوئی۔ ان کا پورا وجود محبت کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ چاہے وہ بیٹے کی حیثیت ہو یا باپ کی، مرید و عاشق کی ہو یا محبوب کی، وہ عظیم ماہر موسیقی، بہترین نثر نگار، غیر

معمولی ذہین، باکمال شاعر سب کچھ تھے۔ علم و ادب، فن سب سے ان کو غیر معمولی محبت تھی۔ ان کی شاعری اور نثر ہندوستانیوں اور یہاں کی ہر چیز سے محبت و شیفتگی سے بھری ہے ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ دہلی میں گزرا تھا انھوں نے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ ان کو اس شہر کے ذرہ ذرہ سے جو والہانہ لگاؤ تھا اس کی مثال نہیں ملتی۔ وہ یہاں کی جامع مسجد کو فیض الٰہی کی جامع بتاتے ہیں۔ قطب مینار کے بارے میں جب ان کا قلم چلتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس کی عظمت و بلندی اور رعنائی کو دیکھ کر چاند نے بھی اپنی ٹوپی اتار پھینکی۔ حوض شمسی کے پانی کی خوبی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں اگر خضر بھی ان کا پانی پی لیتے تو اپنے چشمہ کو بھول جاتے۔ دہلی کے چمن کی بہار کا کیا کہنا اس کی سرزمین میں پھولوں و شگوفوں کی وجہ سے سونے چاندی سے پُر نظر آتی ہے۔ یہاں تو جنت کی طرح ہریالی ہے۔ یہاں کے لوگ جنتیوں کی طرح فرشتہ سیرت اور خوش اطوار و عادات ہوتے ہیں۔ بادشاہ کے دربار کی زیب و زینت اور رنگ ڈھنگ کا مقابلہ تو ایران، خراسان، توران کے دربار نہیں کر سکتے۔ ہاں البتہ جنت سے تو کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے لیے تو یہ تک کہا کہ چونکہ یہ ایسا گرم محبت ملک ہے اس لیے سورج کو بھی اس سے عشق ہے۔ اس کے عشق کی یہ گرمی ایسی ہے کہ اسے یہاں کی آب و ہوا کو نہ صرف گرم کیا بلکہ دنیا بھر میں پھیلا دی۔

انھوں نے ہندوستان کے حسینوں اور نازنینوں کی بھی تعریف کی ہے وہ صرف ان ہی کا حصہ ہے انھوں نے دنیا جہان کے حسینوں کی خوبصورتی میں عیب گنائے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ہندوستانی حسن میں عاجزی و انکساری، ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ، چہرہ پر نمک، مٹھاس، ادا میں چستی و چالاکی ہے۔ وہ گیہواں رنگ کی اثر انگیزی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ جنت میں حضرت آدم نے گیہوں کو ہی باوجود منع کرنے کے چکھا تو پھر سارے فتنے اسی سے پیدا ہوئے۔ گیہویں رنگ کے ساتھ اگر نمک ہو تو گورے رنگ سے کہیں زیادہ کھلتا ہے۔ مثال یہ دیتے ہیں کہ اگر گیہوں کے آٹے میں نمک ملا دیا جائے تو بلا نمک کی نہ جانے کتنی گیہوں سے بہتر ہو جاتا ہے۔

خسرو یہاں کے پھل، پھول کی تعریف کرنے پر جب آتے ہیں تو کمال کر دیتے ہیں۔ وہ سوسن، بیلا، گل لالہ، دھاک، چمپا، سیوتی، گلاب، گیندا، جوہی کی تعریف میں جو زور بیان دکھاتے ہیں وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ چمپا کو پھولوں کا بادشاہ کہتے ہیں۔ سیوتی کے لیے کہتے ہیں کہ بھونرا اس پر ایسا عاشق ہے کہ جان دے دیتا ہے اور مرنے کے بعد بھی اس سے لپٹا رہتا ہے۔ ہندوستان میں جب یہ پھول کھلتے ہیں، کالی گھٹائیں گھر گھر کر آتی ہیں یا ہلکی پھوار پڑتی ہے تو جنت کا باغ معلوم ہوتا ہے بلکہ شاید وہاں بھی ایسا منظر نہ ہوتا ہوگا۔

وہ آم، خربوزہ، حتیٰ کہ پان کی صفت بیان کرنے میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہتے کہتے ہیں کہ پان دیکھنے میں تو ایک گھاس ہے مگر اس سے اچھا خون پیدا ہوتا ہے، کمزور دانتوں کو مضبوط بناتا، منھ کی بدبو کو دور کرتا، پیٹ بھر کھانے والوں کی بھوک بڑھاتا اور بھوکوں کی بھوک کم کرتا ہے۔

انھوں نے اپنی مشہور مثنوی نہ سپہر میں تو حب الوطنی کے جذبہ اظہار کو کمال پر پہنچا دیا۔ وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہندوستان ان کا وطن ہے مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ وطن کی محبت ایمان کی نشانی یعنی اس کا ایک حصہ ہے۔ جس کو جتنی اپنے ملک سے محبت ہوگی وہ اتنا ہی سچا اور پکا ہوگا۔ انھوں نے اپنے بھائیوں ہندوؤں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بہت اہم اور قابل غور ہے۔ تمام صوفیوں اور خسرو کی شخصیت کو سمجھنے میں یہ باب بھی بڑی خصوصیت کا حامل ہے۔ لکھتے ہیں کہ ہمارے ہندو بھائیوں کی عقل و فراست اور دانشمندی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ فلسفہ و منطق یونان و روم سے پہلے ضرور ہیں مگر یہ لوگ بھی ان علوم و فنون میں کسی سے پیچھے نہیں بلکہ اکثر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ افلاطون و ارسطو کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ ہندو ہمارے مذہب کے عقیدت مند ہیں ان کے بہت سے عقیدے ہمارے جیسے ہیں۔ وہ اللہ کی ہستی، اس کا اکیلا ہونا اور ہمیشہ سے ہمیشہ تک ہونے و رہنے کا اقرار کرتے ہیں۔ وہی کچھ نہ ہونے سے ہونے کی حالت میں اس دنیا کو لایا، وہی مارتا، جلاتا، روٹی روزی دیتا، نیکی و برائی پیدا کرتا اور ہر چیز کا مالک و مختار ہے۔ ہندو خدا کو ایک مانتے ہیں اس کو بڑا کہہ جانتے ہیں وہ پتھر، جانور، پیڑ، سورج کو پوجنے کے باوجود اس کے قائل ہیں کہ یہ سب ایک ہی پیدا کرنے والے کی مخلوق ہیں۔ اصل میں یہ پوجا اسی ایک بڑا کاری کی ہے۔

ان کا مشہور شعر ہے:

اے کہ ز بُت طعنہ بہ ہندو بری ہم زوے آموز پرستش گری

کہتے ہیں کہ ایک آگ کی پوجا کرنے والے ہندو سے پوچھا گیا کہ تم آگ کی پوجا کیوں کرتے ہو اور اس کے لیے جان دیے دیتے ہو۔ اس نے کہا کہ اصل میں آگ کو دیکھ کر "اس" سے ملنے کی امید جاگتی اور بھڑکتی ہے اور آگ میں جل کر فنا ہو کر بقا (ہمیشہ والی زندگی) ملتی ہے۔ اس کو بیان کرتے ہوئے اس جذبے کے احترام اور تعظیم کی تلقین کرتے ہیں۔

مثنوی نہ سپہر میں انھوں نے اپنے اس جذبے کے اظہار میں کہا ہے اسلام اپنی جان کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں ڈالنے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ ہندو عورت کی ستی کی عادت سے بہت متاثر ہیں جو اپنے مجازی خدا (شوہر) کی خاطر اپنے وجود کو آگ لگا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ اور اپنی وفاداری و فنائیت کا اس کی ذات میں فنا ہو کر بے دریغ مظاہرہ کرتی ہے۔ اور مرد اپنے بُت اور آقا کی خاطر اپنے وجود کی نفی کرتے

ہوئے جان دے دینا اپنے لیے سرمایہ سعادت سمجھتے ہیں۔ اگر شریعت اسلامیہ میں یہ چیز جائز ہوتی تو وہ وفاداری کے اس طرح کے اظہار کی تلقین کرتے۔ وہ یہاں کی مروجہ زبان سنسکرت کی فضیلت و بڑائی کے اعتراف میں بھی سب سے آگے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی الہامی کتاب قرآن چوں کہ عربی میں نازل ہوا ہے اس لیے وہ سب سے افضل زبان ہے اور اس کے بعد سنسکرت ہے (دول رانی خضر خان)

وہ یہاں کے جانوروں تک کی تعریف و توصیف کرنے سے نہیں تھکتے کہ ہندوستانی طوطے و مینا انسانوں کی طرح باتیں کرتے، کوے آئندہ ہونے والے واقعات کی خبر دیتے، موروں میں ہندوستانی دلہنوں جیسا حسن اور رعنائی و زیبائی ہے۔ بلکے جیسے بھولے پرندے ذرا سی تربیت اور سکھانے کے بعد حیران کر دینے والے کرتب دکھاتے ہیں۔ یہاں ہاتھی جیسے جیم جانور بھی انسانوں جیسے کام کر لیتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ بکری ایک پتلی رسی یا لکڑی پر اپنے چاروں پیروں سے کھڑی ہو جاتی ہے۔ بندر عجیب و غریب کرتب دکھاتے ہیں۔

غرضیکہ خسرو جیسے غیر معمولی ذہین اور باریک بین انسان کی نظر سے ہندوستان کی چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی چیز کی حسن و جمال اور خوبی بھی پوشیدہ نہیں رہی۔ ان کی پوری زندگی اسی محبت کے مرکز کے گرد گردش کرتی نظر آتی ہے۔ ان کے سوز قلبی سے جو نغمے پھوٹتے تھے وہ ہر طرح کے مذہبی و نسلی تعصبات، ذاتی مفادات اور سیاسی مصلحتوں سے بالکل پاک و صاف ہوتے۔ انھوں نے اپنے ہندو، مسلمان اور سکھ بھائیوں کو ہمیشہ یہی پیغام دیا کہ ہندوستان ان کا ملک ہے سب کو ساتھ جینا و مرنا ہے اس لیے وہ یہاں کے ذرہ ذرہ سے ٹوٹ کر محبت کریں۔ ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارہ کا برتاؤ کریں، سب سے محبت و آشتی کا رویہ اپنائیں، ایک دوسرے کے مذہبی جذبات و احساسات کو عزت و احترام اور وقعت کی نگاہ سے دیکھیں۔ امیر خسرو کی ان آفاقی تعلیمات کی اہمیت اسی بنا پر ہر دور بلکہ اکیسویں صدی کے ہندوستان کے لیے بہت ہی ضروری و ناگزیر ہو چکی ہے۔

☆☆☆

عمر کمال الدین کاکوروی*

نکات بیدل کے دو اردو تراجم: ایک تقابلی مطالعہ

بوصول مقصد عافیت نہ دلیل جو نہ عصا طلب — تو ز اشک آبلہ گم نہ ای قدمے ز آبلہ پا طلب
ز مراد عالم آب و گل بہ در جنون زن و وا گسل — اثر از اجابت منفعل ز شکست دست دعا طلب
ز سپہر گر ہمہ بگذری تو ہماں بہ سایہ برابری — بہ علاج شعلہ خودسری نمی از جبین حیا طلب
کف پائے قبلہ نشین ما بخیال کردہ کمین ما — پے آرزوئے جبین ما بہ سراغ رنگ حنا طلب
چہ خوش آنکہ ترک سبب کنی بہ یقین رسی و طرب کنی — ز حقیقت آنچہ طلب کنی بطریق بیدل ما طلب

ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدلؔ (۱۰۵۴-۱۱۳۳ھ) مطابق ۱۶۴۴-۱۷۲۱ء، کا شمار عہد مغلیہ کے زوال کے وقت ممتاز شاعر و ادیب میں ہوتا ہے۔ جب ہندوستان میں فارسی ادب روبہ انحطاط تھا، اپنی فنی و فکری کاوشوں کو بروئے کار لا کر بیدلؔ نے فارسی ادب خصوصاً فارسی شاعری کو نیا رنگ و آہنگ دینے کے ساتھ ساتھ سبک ہندی کو بھی اعتبار بخشا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی نثری تصانیف میں بھی فلسفہ و تصوف کے گوناگوں مضامین بیان کیے ہیں اور وسیع المشربی، خودداری، علوئے ہمت، انسان دوستی جیسے اعلیٰ اقدار کی تعلیم دی ہے۔ بیدلؔ نے نثر و نظم دونوں میدانوں میں اپنی مشکل پسندی، دقیقہ رسی، نکتہ سنجی، جدت پسندی اور پیچیدگی کا مظاہرہ کیا ہے اور برجستہ تشبیہات و استعارات نادر تعبیرات اور انوکھے طرز ادا کو اپنے جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ رمز و ایما، تصویر کشی اور تمثیل نگاری اس پر مستزاد ہیں۔ یہی وجہ رہی کہ وہ عوام کے بجائے خواص کے شاعر و ادیب کے طور پر متعارف ہوئے تفصیل سے قطع نظر اس موضوع کی طرف رخ کرتے ہوئے ''نکات بیدل'' اور اس کے دو اردو ترجموں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ ''نکات بیدل'' بیدلؔ کی شاہکار تصنیف ہے جس میں اس نے اپنے افکار و خیالات، تجربات و مشاہدات اور تاثرات و واردات کو مقولوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اپنے مافی الضمیر کی تشریح و توضیح کے لیے اس

* پروفیسر و صدر شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

نے حکایات و اشارات کا سہارا لیا ہے اور اس حسین قوس قزح کی آرائش و زیبائش کے لیے رباعیات، قطعات اور غزل سے رنگ مستعار لیے ہیں۔ مجموعی طور پر اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ بیدلؔ کی شخصیت، فن، فلسفہ اور تصوف کی تفہیم اور ترجمانی سے متعلق یہ ایک اہم ماخذ ہے۔ ان نکات کی بڑی تعداد اس کی دوسری تصنیف ''چہار عنصر'' سے ماخوذ ہے اور ان کی تعداد بھی مختلف اشاعتوں میں کم و بیش ہے۔ افغانی بیدل شناس غلام حسین مجددی کے لفظوں میں: ''نکات بیدلؔ یعنی افکار حکیمانہ و عبارت از اقوال موجزی است بہ معنی کہ غالباً از چار عنصر انتخاب گردیدہ تعداد ہم چنان موضوعات آنہا در طبع مختلف اختلاف دارد۔'' معروف بیدل شناس ڈاکٹر احسن الظفر کا خیال ہے:

چہار عنصر سے نکات کا موازنہ کرنے پر راقم سطور اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ نولکشوری ایڈیشن میں پائے جانے والے پچہتر (۷۵) میں سے صرف اکیس (۲۱) نکات مستقل حیثیت رکھتے ہیں بقیہ چون (۵۴) ہو بہو چہار عنصر سے ماخوذ ہیں۔ پھر ان میں بھی بارہ نکات درحقیقت بیدل کے روحانی اساتذہ مثلاً شاہ ملوک، شاہ فاضل، مرزا قلندر، شاہ قاسم ترمذی، شاہ ابوالفیض معانی اور شاہ کابلی کے ملفوظات ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے دعوی کے ثبوت میں ''نکات'' اور ''چہار عنصر'' کے اقتباسات اور موضوعات پر دونوں کتابوں کے نولکشوری ایڈیشن سے موازنہ و مقابلہ کرتے ہوئے نیز صفحات کے نمبرات کی نشان دہی پر مبنی ایک جدول ترتیب دی ہے جو بیدلیات خصوصاً نکات بیدلؔ پر تحقیق کرنے والوں کے لیے نہایت ممد و معاون ثابت ہوگی۔

اس بحث سے قطع نظر کہ ''نکات'' کو بیدل کی ایک مستقل اور جداگانہ تصنیف قرار دیا جائے یا اس کو ''چہار عنصر'' کی تکرار یا اعادہ تسلیم کیا جائے صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ مختلف روحانی اساتذہ سے استفادہ نیز اپنے ذاتی مشاہدات و تجربہ سے اسرار و رموز کے جو علم نما اور عقل کشا در بچے اس کی طبع رسا پر وا ہوئے نیز جن علوم و معارف سے اس کو آگاہی ہوئی ان سب کو اس نے نکات میں جمع کر دیا ہے۔

نکات بیدل کے بے شمار خطی نسخے مختلف لائبریریوں اور ذاتی ذخیروں میں پائے جاتے ہیں۔ راقم السطور کی محدود اطلاع کے مطابق کلیات بیدل کی پہلی اشاعت مطبع احمدی دہلی سے ۱۲۷۸ھ میں ہوئی۔ نکات بھی اسی دو جلدی کلیات میں شامل ہیں۔ نول کشور پریس سے یہ ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی۔ ایسا لگتا ہے کہ نول کشور کے پیش نظر مطبع احمدی کا نسخہ تھا۔ کیونکہ کتابت کی بعض فاش غلطیاں جو مطبع احمدی کے نسخے میں تھیں وہ نول کشوری نسخے کی طباعت میں بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مطبع صفدری بمبئی کو ۱۲۹۹ھ میں کلیات بیدل چھاپنے کا شرف حاصل ہوا۔ کلیات بیدل کی مکمل، ضخیم اور بڑی حد تک درست اشاعت ۱۳۴۱ھ میں کابل سے ہوئی جو ٹائپ کے حروف میں چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ ماضی قریب

میں ایران کے علاوہ فارسی کے دیگر مراکز سے بھی کلیات کے علاوہ بیدل کی متعدد تصانیف منظر عام پر آئیں۔ جن کی تفصیل کا یہ مختصر مقالہ متحمل نہیں ہو سکتا ہے۔

راقم السطور کو اب تک ہندوستان میں نکات کے دو اردو ترجموں کی اطلاع ملی ہے۔ ان میں پہلا ترجمہ 'حل نکات بیدل' کے نام سے احمد حسن شوکت نے کیا جو ۱۹۰۵ء میں شوکت المطابع میرٹھ سے شائع ہوا۔ یہ ترجمہ ۲۵ سطری ۱۸۴ صفحات پر مشتمل ہے اور کمیاب ہے۔ شوکت صاحب کے ترجمے میں نکات کی تعداد مطبع احمدی و نول کشوری ایڈیشنوں سے مختلف ہے۔ اور اس میں حکایات و اشارات شامل نہیں ہیں لیکن قطعات، غزلیات اور رباعیات کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ میری ناقص رائے میں اس کو مکمل ترجمہ کی صف میں نہیں رکھا جا سکتا۔ ترجمہ کے آخر میں مولانا محمد شفیع متخلص بہ ناصر رامپوری کی عربی زبان میں تقریظ، نواب اشارت علی خاں متخلص بہ صدق میرٹھی کی عربی زبان میں تقریظ نیز فارسی میں قطعہ تاریخ اشاعت اور حافظ محمد محمود متخلص بہ گراؔتی میرٹھی کے اردو میں سن ہجری اور فارسی میں سن عیسوی کے قطعات تاریخ اشاعت شامل ہیں۔ فاضل مترجم نے مقدمہ وغیرہ کا کوئی التزام نہیں کیا ہے۔

دوسرا ترجمہ اردو فارسی کی معروف شخصیت اور متعدد کتابوں کے مترجم سید عطاء الرحمن عطاؔ کاکوی کا ہے جو بغیر کسی مقدمہ اور تمہید کے خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ کے شمارہ نمبر ۱۱۰ مطبوعہ ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا اور مجلّہ کے ابتدائی ۹۶ صفحات پر محیط ہے۔ بعد ازاں خدا بخش لائبریری نے ۱۹۹۸ء میں اس ترجمہ کو علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا اور بیدل پر ان کے ایک مقالہ کو شامل اشاعت کر کے مقدمہ کے خلا کو پُر کیا۔ کاکوی صاحب کے مقالہ سے اطلاع ملتی ہے کہ انھوں نے ترجمہ کے سلسلہ میں مطبع احمدی کے مطبوعہ نسخہ سے استفادہ کیا تھا۔ اس ترجمہ میں بھی بعض اشعار کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے اسے بھی مکمل ترجمہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔

سطور ذیل میں نکات بیدل کے ان دونوں ترجموں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فن ترجمہ نگاری کا مختصر تعارف کرا دیا جائے۔

کسی معنی یا مفہوم کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کے عمل کو ترجمہ کہا جاتا ہے یہ عمل جتنا اہم ہے اتنا مشکل بھی۔ اس لیے ایک مثالی مترجم میں یہ خوبی ہونی چاہیے کہ وہ دونوں زبانوں پر مہارت رکھتا ہو۔ جس مضمون کا ترجمہ کرنا چاہتا ہو اس سے گہری واقفیت ہو۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ تخلیقی صلاحیت کا مالک بھی ہو۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ترجمہ کے مختلف طریقوں پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

"ترجمے کے تین طریقے ہو سکتے ہیں ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اصل متن کا صرف لفظی ترجمہ کر دیا جائے (اسے ترجمہ کرنا نہیں بلکہ مکھی پر مکھی مارنا کہتے ہیں) دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ مفہوم لے کر آزادی کے ساتھ اپنی زبان کے روایتی و مقبول انداز بیان کو سامنے رکھتے ہوئے ترجمہ کر دیا جائے۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ترجمہ اس طور پر کیا جائے کہ اس میں مصنف کے لہجے کی کھنک بھی باقی رہے۔ اپنی زبان کا مزاج بھی باقی رہے اور ترجمہ اصل متن کے بالکل مطابق ہو۔ ترجمہ کی یہ شکل سب سے مشکل ہے ایسے ترجموں سے زبان و بیان کو ایک فائدہ تو یہ پہنچتا ہے کہ زبان کے ساتھ بیان کا ایک نیا سانچہ آ جاتا ہے دوسرے جملوں کی ساخت ایک نئی شکل اختیار کر کے اپنی زبان کے سانچوں کو وسیع تر کر دیتی ہے۔"[7]

دلشاد کلانچوی نے ترجمہ کے عمل پر یوں خامہ فرسائی کی ہے:

"ترجمہ کا عمل ایک علمی و ادبی پیکر کو ایک دوسرے پیکر میں ڈھالتا ہے وہ بھی اس احتیاط و خوبی سے کہ اس کا ڈیل ڈول، شکل و شباہت، ناز و انداز، جزئیات و خیالات پورے طور پر منتقل ہو جائیں۔"[8]

شمس الرحمن فاروقی ایک مثالی ترجمہ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"کامیاب ترجمہ وہ ہے جو اصل کے مطابق ہو (یا بڑی حد تک اصل کے مطابق ہو) اور خلاقانہ شان رکھتا ہو۔ کامیاب ترجمہ اس معنی میں خلاقانہ نہیں ہوتا کہ مترجم اصل کی جگہ اس کے برابر کوئی ناول یا نظم رکھ دیتا ہے۔ بلکہ مترجم اصلی فن پارے کو اپنی زبان میں دوبارہ خلق کرتا ہے اور اس طرح نہیں کہ پہلے وہ اصل فن پارہ کو مار ڈالے۔ پھر اس کو اپنی زبان میں دوبارہ زندہ کرے۔"[9]

ترجمہ نگاری کی مندرجہ بالا تعریفات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترجمہ اصل متن کا مکمل ترجمان ہو اصل متن سے مطابقت رکھتا ہو اور اس میں اصل متن جیسی روانی بھی ہو۔

ترجمہ کی اس مختصر تعریف کے بعد 'نکات بیدل' کے دونوں ترجموں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

بیدل پہلے نکتہ میں یوں گویا ہیں: ''اگر منکر نبوت نہ ای، باخطرات جز بہ تعظیم پیش میا و اگر بہ تجلی ایمان داری بہ ہیچ جانب چشم بے ادب مکشا۔''۱۱

عطا کاکوی صاحب نے اس عبارت کا یوں ترجمہ کیا ہے: ''اگر تو نبوت کا منکر نہیں تو بغیر تعظیم کے خطرات کے سامنے مت آ اور اگر تجلی پر ایمان رکھتا ہے تو کسی جانب بے ادبانہ نگاہ نہ کر۔''۱۱

احمد حسن شوکت صاحب کی ترجمانی ملاحظہ ہو: ''اگر تو نبوت کا منکر نہیں تو خطرات کی بھی تعظیم کر (اور) اگر تو تجلی پر ایمان رکھتا ہے تو ہر طرف ادب سے نظر کر۔''۱۲

کاکوی صاحب کی مترجمہ عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ تحت اللفظ ترجمہ سے عبارت کی روانی مجروح ہوگئی ہے۔ جب کہ شوکت صاحب نے مختصر الفاظ میں عبارت کا مفہوم واضح کر دیا ہے۔

ایک دوسرے مقام پر بیدلؔ لکھتے ہیں: ''کسب موقوف بر جمالی و گلکاری نیست بے تلاشی نیز تلاش است و بے دست و پائی نیز معاشے اما تقلید موجب تصدیع است و بے موضعی دیگر باعث تشنیع۔''۱۳

عطا کاکوی صاحب نے اس عبارت کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''کچھ حاصل کرنے کے لیے محنت کرنا صرف فنون جمالیات اور
گل کاری پر موقوف نہیں ہے بے تلاشی بھی تلاش ہے اور بے
دست پا ہونا بھی معاش ہے مگر تقلید دردسری ہے اور بیجا موقع پر
لعنت و ملامت کا سبب۔''۱۴

شوکت صاحب کی ترجمانی ملاحظہ ہو: کسب رزق بوجھ اٹھانے یا مکان لیپنے پر منحصر نہیں، بے تلاشی (صبر) بھی تلاش ہے اور بے دست و پائی یعنی توکل بھی معاش ہے مگر تقلید (اندھا دھند بے دلیل کام کرنا) باعث طعنہ زنی یعنی صرف صبر اور توکل چاہیے۔''۱۵

اس نکتہ کے متن میں مطبع احمدی اور شاید اسی کی تقلید میں مطبع نول کشور کے نسخے میں حمالی کی ح میں نقطہ لگا ہے اور کاکوی صاحب نے اسے جمالی پڑھ کر اس کا ترجمہ فنون جمالیات اور گلکاری کا ترجمہ اسی کی رعایت سے گل کاری کر دیا ہے اور اگر گل کاری بھی کیا ہے تو اس کی کوئی وضاحت نہیں کی۔ جب کہ شوکت صاحب نے بے تلاشی کے لیے قوسین میں صبر، بے دست و پائی کے لیے توکل اور تقلید کے لیے اندھا دھند بے دلیل کام کرنا لکھ کر مفہوم کو واضح کر دیا ہے۔ کاکوی صاحب جیسے عالم سے ترجمے میں ایسی سہل انگاری تعجب خیز ہے۔

'نکات' کے ایک منثور نکتہ کی عبارت اس طرح ہے:

''فضل حق نعمتے است بے حساب کجا امتیاز تا قیمتش شمارند و فیض
ازلی حسنے است بے نقاب کو چشم تا مژہ بردارند۔''۱۶

کاکوی صاحب کی ترجمانی ملاحظہ ہو: ''فضل خداوندی ایک بے حساب نعمت ہے۔ امتیاز کہاں کہ اس کی قدر و قیمت کو شمار کریں اور فیض ازل ایک بے نقاب حسن ہے مگر آنکھ کہاں کہ پلک اٹھا کر دیکھیں؟''۱۷

شوکت صاحب نے اس کا یوں ترجمہ کیا ہے:

''خدائے تعالیٰ کا فضل ایک بے حساب نعمت ہے ہم کو اتنی بھی تمیز
نہیں کہ اس قیمت (لوٹ) کو گن سکیں کیوں کہ لوٹ کی بھی آخر
ایک انتہا ہے اور فیض ازل ایک بے نقاب حسن ہے۔ مگر آنکھ
کہاں کہ پلک اٹھا کر دیکھیں۔''۱۸

مندرجہ بالا ترجمے کے پہلے حصے میں اگر کاکوی صاحب 'امتیاز' کا ترجمہ 'تمیز' کر دیتے تو اس کی سلاست اور روانی میں اور اضافہ ہو جاتا اور بڑی حد تک منشاء مصنف کے مطابق ہو جاتا۔ شوکت صاحب کے ترجمہ میں 'کیوں کہ لوٹ کی بھی آخر ایک انتہا ہے' زائد ہے۔ دوسرے حصے کا ترجمہ دونوں مترجموں نے یکساں کیا ہے۔

۲۱ویں نکتہ میں بیدل یوں فریاد کناں ہیں:

''ساز حقیقت از دست مجاز پرستان بے اصول کمینگاہ صد محشر
فریاد است و حسن معنی از نگاہ نا آشنایان بے ادراک، غبار آلود
یک عالم بے داد۔''۱۹

کاکوی صاحب کا ترجمہ ان الفاظ میں ہے: ''حقیقت کا ساز بے اصول مجاز پرستوں کے ہاتھوں سے سیکڑوں محشر فریاد کی کمین گاہ ہے اور حسن معنی بے ادراک لفظ آشناؤں سے ایک غبار آلود دنیا ہے۔''۲۰

شوکت صاحب کی ترجمانی اس طرح ہے: ''حقیقت کا ساز مجاز پرستوں کے ہاتھ جو بالکل بے اصول ہیں فریاد کے سو محشر کا کمین گاہ بنا ہوا ہے (یعنی وہ چیختا چلاتا ہے کہ میں کن نااہل ہاتھوں میں جا پڑا) اور معنی کا حسن ان لوگوں کی نگاہ کی بدولت جو محض لفظ آشنا ہیں اور مطلق ادراک نہیں رکھتے ایک عالم بیداد (کثرت بیداد) سے غبار آلود یعنی دھندلا ہو رہا ہے کہ کن نالائقوں نے مجھے دیکھا۔''۲۱

اس عبارت کے ترجمہ میں پہلے مترجم نے فارسی تراکیب مثلاً 'مجاز پرستان بے اصول'، 'کمین گاہ صد محشر فریاد' اور 'عالم بیداد' کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے اور اصل عبارت کے مفہوم کو ترجمہ کی زبان کا رنگ و آہنگ دے دیا ہے، جب کہ دوسرے ترجمہ میں سلاست کے ساتھ خلاقانہ شان بھی نظر آتی ہے اور مترجم

نے ترجمہ کی زبان والے قارئین کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔

نکات بیدل کے ۴۹ویں نکتہ کی عبارت اس طرح ہے:

"تا کمر بر شکست خود نہ بستہ ای راہ جنگ عالمی بروبت کشادہ است و تا پنجۂ طاقت در آستین نہ شکستہ ای خراش ہزار ناخن بہ پرسش جگر آمادہ ضعف اختیاری سپریست در دفع بلیات اضطرار و شکنجۂ ہوشیاری از سنگ باران آفت خمار۔" [۴۳]

کاکوی صاحب اس کا ترجمہ یوں بیان کرتے ہیں:

"جب تک اپنی پسپائی پر کمربستہ نہ ہو جاؤ گے تو ساری دنیا کے لوگ تم پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار ہو جائیں گے اور جب تک اپنی قوت کا مظاہرہ نہیں کرو گے تو ہزاروں انسان تم کو نوچ کھائیں گے۔ اضطراری بلاؤں کو دفع کرنے کے لیے ضعف اختیاری ایک ڈھال ہے، خمار کی مصیبت سے بچنے کے لیے ہوشیاری کا شکنجہ ایک حصار ہے۔" [۴۴]

شوکت صاحب کی مترجمہ عبارت اس طرح ہے:

"جب تک تو اپنی شکست (کسرِ نفس) پر کمر نہ باندھے گا دنیا کی لڑائی کا دروازہ تجھ پر کھلا رہے گا اور جب تک تو طاقت کا پنجہ اپنی آستین ہی میں نہ توڑے گا زخم جگر کے چھلنے کو ہزار ناخنوں کی خراش آمادہ رہے گی۔ ضعف اختیاری بلیات اضطراری کے لیے ایک ڈھال ہے یعنی تو ضعیف بننے کا اختیار رکھتا ہے اور نزول حوادث میں مضطر ہے۔ یعنی وہ تیرے اختیار میں نہیں ہے اور ہوشیار رہنے کا شکنجہ آفت خمار (مستی) کے سنگ باراں سے بچنے کا ایک قلعہ ہے۔" [۴۵]

اس متن کے ترجمہ میں کاکوی صاحب نے نہایت مختصر الفاظ میں مفہوم کی وضاحت اس طرح کردی ہے کہ روانی اور سلاست بھی برقرار رہی ہے جب کہ دوسرے مترجم نے ترجمہ کے ساتھ فارسی اصطلاحات کی وضاحت کر کے اس کو منشائے مصنف سے قریب تر کر دیا ہے۔

پینتالیسویں نکتہ میں بیدل رقم طراز ہیں:

"چشم پوشیدہ ہر چند فردوس در قفس دارد آئینہ دار کوری است و مژگان خوابیدہ اگر ہمہ اقبالش چراغ زیر دامن باشد دلیل بے نوری است اگر بخیہ ہای مژگاں از ہم نتواں گسیخت نمک گریہ بریں زخمہا باید ریخت و اگر بہ ایں پیہ افسردہ شمع نگاہ نتواں افروخت بطعمۂ زاغ و زغن باید فروخت۔" [۴۶]

کاکوی صاحب کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

"آنکھ بند کر کے ہر چند جنت کا قفس میں نظارہ کرنا بینائی کا مظہر ہے اگر اس کی خوش نصیبی زیر دامن چراغ رہنے پر بھی ہو تو نور سے محرومی ہے اور اگر مژگان کی قسمت آپس میں جدا نہ ہو سکے تو اس کی مثال زخم پر آنسو کا نمک چھڑکنا ہے اگر اس افسردہ چربی سے آنکھ کے لیے شمع نہ جلائی جائے تو وہ کوے کی غذا ہے اور اسے چیل کوے کے ہاتھوں بیچ دینا چاہیے۔" [۴۷]

شوکت صاحب نے اس عبارت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"جو شخص مراقب ہے اس کی آنکھ اگرچہ فردوس کو اپنے قفس میں رکھتی ہو اندھے پن کی آئینہ دار ہے (یعنی اندھی، کیونکہ اعیان ثابتہ اور وحدت فی الکثرت کے نظارے سے محروم ہے) اور سوئی ہوئی (غافل) مژگان اگر تمام اقبال اس کا چراغ زیر دامن ہو (یعنی مراقبہ کے نور سے روشن ہو) بے نوری کی دلیل ہے۔ اگر پلکوں کا بخیہ ادھڑ نہیں سکتا یعنی پلکیں خواب غفلت کے باعث کھل نہیں سکتیں تو یہ زخم ہیں ان پر آنسوؤں کا نمک بکھیرنا چاہیے تاکہ کھل جائیں (ورنہ بند زخم اندر ہی اندر بڑھ کر ہلاکت کا موجب ہوگا) اور اگر بجھی ہوئی شمع کی چربی سے آنکھ روشن نہیں ہو سکتی تو چیلوں اور کوؤں کے طعمہ کے ہاتھ اس کو فروخت کر دینا چاہیے۔" [۴۸]

مندرجہ بالا عبارت کے پہلے مترجم 'آئینہ دار کوریست' اور 'اگر بخیہ ہای مژگان از ہم نمی تواں گسیخت' کا صحیح ترجمہ کرنے سے نہ جانے کیوں قاصر رہے ہیں اور آخری جملہ کا ترجمہ اگر اس بجھی ہوئی شمع کی چربی سے کوئی نگاہ نہیں روشن ہو سکتی ہے تو اس کو چیل کوؤں کی غذا کے لیے فروخت کر دینا چاہیے، تو شاید بڑی حد تک اصل کے مطابق ہوتا۔

شوکت صاحب کے ترجمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ترجمہ کی زبان کے قارئین کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ترجمہ کیا ہے لیکن عبارت کی طوالت کھٹکتی ہے۔ کیونکہ مختصر لفظوں میں بھی عام فہم اور سلیس ترجمہ ہوسکتا تھا۔ اس کے علاوہ بخیلوں اور کوؤں کے طعمہ کے ہاتھ اس کو فروخت کر دینا چاہیے' سے اعتدال اور منشاء مصنف کی روح مجروح ہوتی ہے لیکن بہرحال مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

نکتہ نمبر پینسٹھ (٦٥) میں بیدل یوں گویا ہیں:

'تاثیر در طبائع ارباب کرم چون موج بر آب پیچیدہ است، طینت اہل خست چون ملائمت از سنگ رمیدہ طبع کریم از فرط نزاکت زبان سائل را نشتری داند تغافل نہ شرط تاب رحم آوردن است و مزاج لئیم از جوش خشونت پروای مساس ندارد و توجہ مانع رنگ اثرے بردن۔''۲۹

کاکوی صاحب اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

''کریموں کی طبیعت میں تاثیر موج کی طرح پانی میں پیچیدہ ہے اور بخیلوں کی فطرت ایسی جیسے پتھر سے نرمی کا نہ ہونا، اور سخی کی طبیعت اپنی نزاکت کی زیادتی سے سائل کی زبان اس کے دل پر نشتر کا کام کرتی ہے اور اس کا رحم و کرم غفلت کی تاب نہیں لا سکتا اور بخیل کی فطرت اپنی سختی کی زیادتی کی وجہ سے اس طرف توجہ نہیں کرتی ہے۔ توجہ بہانہ سازی کی رکاوٹ ہے۔''۳۰

شوکت صاحب کی ترجمانی ان الفاظ میں ہے:

'اہل کرم کی طبیعتوں میں کرم کی تاثیر موج کی طرح دریا پر لپٹی ہوئی ہے اور اہل خست کی طینت سے کرم اس طرح بھاگا ہوا ہے جیسے پتھر سے نرمی، کریم کی طبیعت نزاکت کے باعث سائل کی زبان کو نشتر جانتی ہے یعنی وہ سوال کرنے کو برا سمجھتا ہے اور خود دیتا ہے۔ تغافل رحم لانے کی شرط نہیں یعنی رحم میں تغافل نہ چاہیے اور بخیل کا مزاج سختی کے جوش سے مس کرنے کی پرواہ نہیں رکھتا یعنی بے حس ہے۔ توجہ خود کسی رنگ کے قبول کرنے کے مانع ہے۔''۳۱

دونوں ترجموں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کاکوی صاحب نے عام فہم انداز اختیار کر کے اعتدال کے ساتھ عبارت کا سیدھا سادہ ترجمہ کر دیا ہے۔ لیکن ایک آدھ لفظوں کا ترجمہ چھوٹ جانے سے روانی متاثر ہوئی ہے۔ جب کہ شوکت صاحب کے ترجمہ میں روانی کے ساتھ منشاء مصنف بھی کارفرما نظر آتا ہے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کاکوی صاحب نے نکات کا ترجمہ آسان زبان میں کر کے اسے معمولی اردو خواں کی دسترس تک پہنچایا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اگر وہ فارسی تراکیب و اصطلاحات کی وضاحت کر دیتے تو ترجمہ کا لطف اور بڑھ جاتا علاوہ ازیں بعض مقامات پر کچھ الفاظ کے ترجمے سے صرف نظر ہو جانے کی وجہ سے ترجمہ کی چاشنی متاثر ہوئی ہے۔ شوکت صاحب نے اپنی پوری توجہ اس بات پر مبذول کی ہے کہ ترجمہ کی زبان کا قاری اسے بآسانی سمجھ لے۔ اس کے لیے انھوں نے ترجمے سے پہلے لغت کے عنوان سے مشکل الفاظ و اصطلاحات کی شرح بھی تحریر کر دیا ہے اور ترجمہ میں بھی آیات قرآنی، احادیث نبویؐ اور اصطلاحات تصوف وغیرہ کے ذریعہ بات سمجھانے کی پوری کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بیدل کے رنگ و آہنگ کو بھی محفوظ رکھا ہے۔ لیکن کہیں کہیں پر انھوں نے جادۂ اختصار و اعتدال سے بھٹک کر وادی طوالت و اطناب میں قدم رکھ دیا ہے۔ بہرحال اہل علم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ نکات بیدل کے ترجمہ کا ہفت خوان سر کرنا انتہائی دشوار کام ہے کیونکہ بیدل کی نثر جو استعارات و کنایات کے استعمال، تکلف، پیچیدگی، ابہام، زور بیان، اور قافیہ پیمائی سے عبارت ہے اس کی قرأت اور تفہیم ہی ایک دقت طلب امر ہے چہ جائیکہ اس کی ترجمانی پر کمر ہمت باندھنا۔ ان مترجمین نے اس آگ کے دریا کو پار کرنے کا جو حوصلہ دکھایا ہے اس نے بیدل شناسی کو نئی جہتوں سے روشناس کیا ہے۔

حواشی:

۱- مجددی، غلام حسین، بیدل شناسی ۲/ ۵۳۵

۲- احسن الظفر سید (ڈاکٹر) مرزا عبدالقادر بیدل حیات اور کارنامے ۲/ ۲۳

۳- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حوالہ سابق از ص ۶۲ تا ۶۶

۴- نکات بیدل میں شامل سید عطاء الرحمٰن عطا کاکوی کی تحریر سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ بیدل کے انتقال کے ۱۳۵ سال بعد مطبع احمدی سے کلیات بیدلؔ کی اشاعت ہوئی لیکن انھوں نے سنہ اشاعت کا حتمی تعین نہیں کیا بیدل کے سال وفات ۱۱۳۳ھ میں ۱۳۵ جوڑنے کے بعد ۱۲۶۸ھ کا عدد برآمد ہوتا ہے اب جب تک کوئی دوسری معتبر سند نہیں ملتی ہے ان کے بیان کے مطابق ۱۲۶۸ھ کو ہی مطبع احمدی میں چھپے کلیات کا سال اشاعت مانا جا رہا ہے۔

۵- نکات بیدل صفحہ ۲۷ (مقالہ پروفیسر عطا کاکوی) ترجمہ نکات بیدل۔
۶- حسن اتفاق سے راقم السطور نے اس مقالہ کی تیاری کے لیے شبلی کتابخانہ ندوۃ العلما، لکھنؤ میں 'نکات بیدل' کے مطبع احمدی کے جس ایڈیشن سے استفادہ کیا اسے پٹنہ شہر کی ایک شخصیت جناب سکندر نواز جنگ بہادر نے کتابخانہ کو عطا کیا تھا۔
۷- جالبی، جمیل ترجمے کے مسائل ترجمہ کا فن، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، ص ۸۸-۸۷
۸- کلانچوی، دلشاد، ادب میں تراجم کی افادیت (بحوالہ 'ترجمے کا فن' ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ص ۹۵)
۹- انجم خلیق (مرتب) فن ترجمہ نگاری، ص ۱۳۱
۱۰- نکات بیدل مطبع نول کشور، ص ۲، مطبع احمدی ص ۲
۱۱- ترجمہ نکات بیدل (عطا کاکوی) ص ۱
۱۲- حل نکات بیدل (احمد حسن شوکت) ص ۲-۱
۱۳- نول کشور، ص ۹، احمدی ص ۱۲-۱۳
۱۴- ترجمہ نکات بیدل، ص ۷
۱۵- حل نکات بیدل، ص ۱۵
۱۶- نول کشور، ص ۲۰، احمدی ص ۵۱
۱۷- ترجمہ نکات بیدل، ص ۲۹
۱۸- حل نکات بیدل، ص ۳۵
۱۹- نول کشور، ص ۲۲، احمدی ص ۵۹
۲۰- ترجمہ نکات بیدل، ص ۲۹
۲۱- حل نکات بیدل، ص ۵۲
۲۲- نول کشوری ایڈیشن میں بلیات کو بلیاب لکھا ہے۔
۲۳- نول کشور ص ۳۰، احمدی ص ۸۰-۹۷
۲۴- ترجمہ نکات بیدل، ص ۴۰
۲۵- حل نکات بیدل، ص ۴۷
۲۶- نول کشور ص ۴۹، احمدی ص ۱۳۷
۲۷- ترجمہ نکات بیدل، ص ۹۷
۲۸- حل نکات بیدل، ص ۱۴۳

۲۹- نول کشور ص ۹۲، احمدی ص ۸۰
۳۰- ترجمہ نکات بیدل ص ۸۷
۳۱- حل نکات بیدل ۱۹۰

ماخذ و مصادر:

۱- ترجمہ کا فن، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، کتابی دنیا دہلی ۲۰۰۵ء
۲- حل نکات بیدل، احمد حسن شوکت، مطبع اخبار شحنۂ ہند شوکت المطابع میرٹھ ۱۹۰۵ء
۳- فن ترجمہ نگاری، مرتب ڈاکٹر خلیق انجم، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ۱۹۹۶ء
۴- مرزا عبدالقادر بیدل حیات اور کارنامے، ڈاکٹر سید احسن الظفر، رام پور رضا لائبریری ۲۰۰۹ء
۵- نکات بیدل، مطبع احمدی دہلی ۱۲۸۰ھ
۶- نکات بیدل مرزا عبدالقادر بیدل، مطبع نول کشور ۱۲۹۲ھ
۷- نکات بیدل (ترجمہ) عطاء الرحمن عطا کاکوی، خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ ۱۹۹۹ء

☆☆☆

۲۹- نول کشور، ص ۹۲، احمدی، ص ۱۰۹
۳۰- ترجمہ نکات بیدل، ص ۹۸
۳۱- حل نکات بیدل، ۱۹۰

ماخذ و مصادر:

۱- ترجمہ کاؤش، ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، کتابی دنیا دہلی، ۲۰۰۵ء
۲- حل نکات بیدل، از [illegible]، مطبع [illegible] شوکت الاسلام میرٹھ، ۱۹۰۵ء
۳- فن ترجمہ نگاری، مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۹۶ء
۴- مرزا عبدالقادر بیدل حیات اور کارنامے، ڈاکٹر سید احسن الظفر، رام پور رضا لائبریری، ۲۰۰۹ء
۵- نکات بیدل، مطبع احمدی دہلی، ۱۲۹۰ھ
۶- نکات بیدل، مرزا عبدالقادر بیدل، مطبع نول کشور، ۱۲۹۲ھ
۷- نکات بیدل (ترجمہ) مولانا عطاء الرحمن عطا کاکوی، خدا بخش لائبریری پٹنہ، ۱۹۹۸ء

٭٭٭

زہرہ عرشی٭

فرہنگ جہانگیری اور اس کا مصنف — ایک تعارف

نام و نسب:

فرہنگ جہانگیری کا مصنف میر جمال الدین حسین بن فخر الدین شاہ حسن انجوی شیرازی عہد اکبری و جہانگیری کا بلند پایہ عالم ہے۔

میرزا حسن لطفیر شیرازی کے مطابق انجو یا انجو لفظ مغولی ہے جس کے معنی املاک خالصہ کے ہیں۔ املاک خالصہ سے مراد وہ جائداد ہوتی ہے جو بادشاہ وقت کی ذاتی ملکیت ہو اور "انجوی کسی را گویند کہ مباشر و عامل املاک انجو یعنی خالصہ دیوانی باشد۔" نیز "انجوی بمعنی عامل خالصہ جات دیوانی است"

مولوی محمد شفیع نے مطلع السعدین کے آخر میں انجو کے معنی تحریر کیے ہیں "غلام وغلامی کہ بہ جاگیر شاہزادہ علاقہ دارد"۔ اور اسٹائن گاس ڈکشنری میں انجو کے معنی "A Royal Domain" بتائے گئے ہیں۔

خاندان:

انجوی خاندان کا تعلق شیراز کے سادات سے ہے۔ اس خاندان کا نسب قاسم الراس بن حسن بن ابراہیم طباطبائی حسنی تک پہنچتا ہے۔ یہ لوگ مکہ معظمہ سے شیراز پہنچے تھے۔ وقف نامۂ املاک انجو سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہنشاہ فنا خسرو عضد الدولہ دیلمی فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے مکہ معظمہ گیا، تو وہاں ابوقاسم جو زید اسود کے نام سے زیادہ معروف ہے، اس کی ملاقات ہوئی۔ زید اسود نے عضد الدولہ کو بتایا کہ انھوں نے خواب میں دیکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے ایک لڑکی تجویز فرمائی ہے جو ایسی شکل وصورت کی ہے۔ عضد الدولہ نے غور کیا تو یہ سب صفات اس کی بہن کی تھیں۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ سفر حج سے پہلے اس کی بہن نے بھی اسی طرح کا خواب بیان کیا تھا۔ چنانچہ زید اسود کے ساتھ اس نے اپنی بہن فاطمہ خاتون کا عقد کر دیا۔ ۳۵۲ھ/۹۶۳ء میں فاطمہ خاتون کا انتقال ہو گیا۔ اس کا مزار امام زادہ

٭ ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، ویمنس کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

فرہنگ جہانگیری اور اس کا مصنف — ایک تعارف

نام و نسب:

فرہنگ جہانگیری کا مصنف میر جمال الدین حسین بن فخر الدین شاہ حسن انجوی شیرازی عہد اکبری و جہانگیری کا بلند پایہ عالم ہے۔

میرزا حسن الشیرازی کے مطابق انجو یا انجو لفت مغولی ہے جس کے معنی املاک خالصہ کے ہیں۔ املاک خالصہ سے مراد وہ جائداد ہوتی ہے جو بادشاہ وقت کی ذاتی ملکیت ہو اور ''انجوی کسی را گویند کہ مباشر و عامل املاک انجو یعنی خالصہ دیوانی باشد۔'' نیز ''انجوی یعنی عامل خالصہ جات دیوانی است''

مولوی محمد شفیع نے مطلع السعدین کے آخر میں انجو کے معنی تحریر کیے ہیں ''غلام وغلامی کہ بہ جاگیر شاہزادہ علاقہ دارد''۔ اور اسٹائن گاس نے انجو کے معنی "A Royal Domain" بتائے گئے ہیں۔

خاندان:

انجوی خاندان کا تعلق شیراز کے سادات سے ہے۔ اس خاندان کا نسب قاسم الرأس بن حسن بن ابراہیم طباطبائی حسنی تک پہنچتا ہے۔ یہ لوگ مکہ معظمہ سے شیراز پہنچے تھے۔ وقف نامہ املاک انجو سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہنشاہ وقت خسرو عضد الدولہ دیلمی فریضۂ حج کی ادائگی کے لیے مکہ معظمہ گیا، تو وہاں ابو قتادہ جو زید اسود کے نام سے زیادہ معروف ہے، اس کی ملاقات ہوئی۔ زید اسود نے عضد الدولہ کو بتایا کہ انھوں نے خواب میں دیکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے ایک لڑکی تجویز فرمائی ہے جو ایسی ایسی شکل و صورت کی ہے۔ عضد الدولہ نے غور کیا تو یہ سب صفات اس کی بہن کی تھیں۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ سفرِ حج سے پہلے اس کی بہن نے بھی اسی طرح کا خواب بیان کیا تھا۔ چنانچہ زید اسود کے ساتھ اس نے اپنی بہن فاطمہ خاتون کا عقد کر دیا۔ ۳۵۲ھ/۹۶۳ء میں فاطمہ خاتون کا انتقال ہو گیا۔ اس کا مزار امام زادہ

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، ویمنس کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

علی بن حمزہ بن امام موسیٰ کاظم کے مزار کے پاس تعمیر کر دیا گیا۔ فاطمہ خاتون کے انتقال کے بعد عضد الدولہ نے اپنی بیٹی شاہان وقت کا عقد زید اسود کے ساتھ کر دیا اور مملکت فارس کی کچھ جائداد شاہان وقت اور اس کی اولاد کے نام منتقل کر دی۔ مغلوں نے فارس پر قبضہ کرنے کے بعد یہ جائداد چھین کر ''انجو'' قرار دے دی۔ لیکن کچھ عرصے بعد ابو الیامن حسن طباطبائی حسنی اپنی اور اپنے خاندان کی جائداد واپس لینے کے لیے شیراز سے اباقاخان کے دربار میں پہنچا۔ بادشاہ اس کے ساتھ بکمال احترام سے پیش آیا اور جائداد کی واپسی کا حکم صادر کر دیا مگر اس پر قبضہ دلانے کی کارروائی عمل میں نہ آئی۔ ۶۷۹ھ/۱۲۸۰ء میں ابو الیامن نے ان املاک میں سے نصف شاہزادہ ارغون خان اور بقیہ نصف اپنے بیٹے سید قطب الدین احمد کے نام منتقل کر دی۔

اباقاخان کے انتقال کے بعد بھی تمام املاک سادات طباطبائی شیراز خالصۂ شاہی رہی۔ جب سلطنت کی باگ ڈور ارغون خان کے ہاتھ میں آئی تو اس نے ۶۸۶ھ/۱۲۸۷ء میں آدھی جائداد انجو رکھی اور دوسری آدھی سید قطب الدین احمد طباطبائی کو عطا کر دی۔ ابو الیامن حسن کی وفات پر ارغون خان نے حکم دیا کہ املاک سادات طباطبائی شیراز سید قطب الدین احمد کو بخش دی جائے اور دوسری آدھی کو جو ابو الیامن حسن نے ارغون خان کو پیش کر دی تھی، بعنوان انجو سید قطب الدین احمد اور ان کی اولاد کے تصرف میں دے دی جائے۔ اسی لیے قطب الدین احمد کی اولاد ''انجو'' کہلائی۔

شیراز نامہ میں ان کے بارے میں لکھا ہے: ''سید قطب الدین احمد مرکز دائرۂ سیادت و غصن شجرۂ نبوت صاحب امارت و ایالت مملکت فارس گردید۔ و بی اذن او ہیچ امری متمشی نمی گشت و در سال ششصد و نود و شش ۶۹۶ھ/۱۲۹۶ء در گذشت۔''

مشاہیر انجو:

مختلف روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں مغلوں نے شیراز کو تاخت و تاراج کیا، انجو خاندان کے کچھ لوگ ہندوستان آ گئے۔ اس سلسلے کی پہلی شخصیت میر فضل اللہ شیرازی کی جو سلطان محمود شاہ بہمنی (۷۹۹-۷۸۱ھ/۱۳۹۷-۱۳۷۹ء) کے دور میں مسند صدارت پر متمکن تھے۔ وہ سمندری راستے سے ہندوستان پہنچے اور گجرات میں مقیم ہوئے۔ گجرات سے انھیں دکن طلب کر لیا گیا۔

میر فضل اللہ شمس الدین تفتازانی کے شاگرد اور صاحب علم و فضل بزرگ تھے۔ سلطان محمود شاہ نے انھیں فیروز خان اور احمد خان کا اتالیق مقرر کیا تھا جو سلطان داؤد شاہ بہمنی (مقتول ۷۸۰ھ/۱۳۷۸ء) کے بیٹے تھے۔ لیکن محمود شاہ نے انھیں اپنے فرزندوں کی طرح پالا تھا۔ سلطان شمس الدین بن سلطان محمود شاہ

۷۹۹ھ/ ۱۳۹۶ء میں تخت نشین ہوا تو فیروز خاں اور احمد خاں نے بغاوت کر دی اور میر فضل اللہ کو منصب[9] وکالت تفویض کیا۔ فرشتہ[10] نے میر غیاث الدین (ولد میر فضل اللہ) کو بھی انھیں بھائیوں کا ساتھی لکھا ہے۔

فرشتہ ہماری یہ بھی رہنمائی کرتا ہے کہ خاندان انجو کا مصاہرتی رشتہ فیروز شاہ بہمنی سے شروع ہوتا ہے۔ اس نے اپنے بیٹے حسن خاں کا عقد میر فضل اللہ کی بیٹی سے کیا اور اپنی بیٹی جو سلطان محمود شاہ بہمنی کی نواسی تھی میر فضل اللہ کے پوتے صدر جہان میر شمس الدین محمد انجو کے عقد میں دی۔ یہ صدر جہاں کے علم و فضل کا نتیجہ تھا کہ اسے "وکیل سلطنت" اور "ملک نائب" کا خطاب عطا کیا گیا۔

میر فضل اللہ[11] نے فیروز شاہ کی جنگی خدمات بھی انجام دیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ صاحب سیف بھی تھا۔ فارس نامۂ ناصری[12] میں فضل اللہ کا سنۂ وفات ۸۲۰ھ/ ۱۴۱۷ء لکھا گیا ہے لیکن فرشتہ[13] کے مطابق ۸۲۰ھ/ ۱۴۱۷ء میں فیروز شاہ حملہ آور ہوا، دو سال محاصرہ میں گئے اور پھر جنگ چھڑی لہٰذا اس حساب سے فضل اللہ کی وفات ۸۲۲ھ/ ۱۴۱۹ء یا ۸۲۳ھ/ ۱۴۲۰ء میں ہونا چاہیے۔

عقائد کے اعتبار سے فضل اللہ اہل تشیع سے منسلک تھا اس لیے کہ اس نے سلطان فیروز شاہ کو متعہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ فضل اللہ کی اولاد میں اس کے بیٹے غیاث الدین اور ایک بیٹی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اس سلسلے کے ایک اور عالم سید[14] شاہ فتح اللہ انجوی شیرازی بھی ہندوستان آئے۔ شاہ فتح اللہ کا شمار اپنے دور کے بڑے عالموں اور فاضلوں میں ہوتا تھا۔ وہ اکبر کے دور میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز اور مخاطب بہ عضد الدولہ تھے۔ تاریخ[15] محمدی کے مطابق ۹۹۷ھ/ ۱۵۸۸ء میں کشمیر میں انتقال ہوا۔ فارس نامہ میں ان کا سال وفات درج نہیں مصنف نے یہ لکھا ہے کہ وہ ۹۸۸ھ/ ۱۵۸۰ء میں بقید حیات تھے۔

انجوی خاندان کا ایک اور فرد خواجہ شمس الدین خافی انجو کا تذکرہ طبقات اکبری[16] میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے "خواجہ شمس الدین خافی انجو کہ الآن بہ منصب دیوانی سرفراز است بہ دیانت و شجاعت و کار دانی اشتہار دارد۔"

فرشتہ[17] نے شاہ ابوالقاسم انجو اور شاہ محمد شاہ انجو کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

انجوی خاندان کی ایک اور شخصیت جسے "فارس[18] نامۂ ناصری" نے علام فہام" لکھا ہے، امیر ابوالوالی انجو شیرازی کی ہے جو شاہ عباس ثانی صفوی کے عہد میں منصب صدارت پر مامور تھا۔

اس خاندان کے اور کئی اصحاب کا تذکرہ "فارس نامۂ ناصری" میں ملتا ہے اور دیگر ذرائع سے پتا چلتا ہے کہ یہ خاندان ایران میں ابھی تک موجود ہے۔ ہم ان سے صرف نظر کر کے اپنے مصنف کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

فخر الدین شاہ حسن:

"فارس[20] نامۂ ناصری" کے مطابق "فرہنگ جہانگیری" کے والد فخر الدین شاہ حسن انجوی شیرازی تحصیلات کمال علم کے بعد ہندوستان آئے اور گجرات میں مقیم ہوئے۔ ۹۲۸ھ/ ۱۵۲۱ء میں برہان نظام شاہ بحری نے انھیں گجرات۔ احمد نگر طلب کیا اور ان سے مذہب اثنا عشریہ کی تعلیم حاصل کی۔

لیکن یہ روایت اس لیے غلط معلوم ہوتی ہے کہ فرشتہ کے مطابق شاہ[21] طاہر ۹۲۸ھ/ ۱۵۲۱ء میں برہان نظام شاہ کے دربار سے منسلک ہوا تھا۔ اور برہان نظام شاہ کے شیعہ ہو جانے کے بعد شاہ حسن کو بارہ ہزار ہون (سکہ) بھیج کر گجرات کے راستے سے احمد نگر بلایا اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر کیا۔ جس کے بعد وہ دربار سے وابستہ[22] ہو گیا۔

اس صورت میں شاہ حسن کی آمد احمد نگر ۹۲۸ھ/ ۱۵۲۱ء اور ۹۳۸ھ/ ۱۵۳۱ء کے درمیان کا واقعہ ہونا چاہیے۔

شاہ حسن میں سپاہی اور سیاست داں دونوں کے اوصاف نظر آتے ہیں۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ علی عادل شاہ نے یہ طے کیا کہ قلعہ شولاپور و کلیان کا انتقام لیا جائے۔ حسین نظام شاہ نے قاسم بیگ اور شاہ حسین انجو کو جو رخصت پر مکہ جانے کے لیے بندر چیول گئے ہوئے تھے احمد نگر طلب کیا۔ اور ان سے مشورہ کیا۔ ان دونوں نے کہا کہ ان سے مقابلے کی طاقت نہیں اس لیے حکومت کی فلاح اس میں ہے کہ قلعہ کلیان دے کر مصالحت کر لی جائے۔ لیکن برہان نظام شاہ اس پر راضی نہ ہوا۔ آخر کار شکست کھا کر حسین نظام شاہ نے قلعہ کلیان کی کنجیاں رام راج کے سپرد کر دیں۔ اس نے وہ کنجیاں عادل شاہ کو بھیج دیں۔ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۹۶۷ھ/ ۱۵۵۹ء اور ۹۶۹ھ/ ۱۵۶۱ء کے درمیان کا واقعہ ہے۔ مگر اسی کتاب کی جلد دوم کے صفحہ ۳۶ کے مطابق ۹۷۶ھ/ ۱۵۶۸ء میں شکست کھا کر حسین نظام شاہ نے شاہ حسن انجو کے مشورے کے بعد قلعہ کلیان علی عادل شاہ کے حوالے کر دیا۔

بہر حال اس سال کے بعد شاہ حسن کا ذکر کسی تاریخ میں نہیں ملتا۔ بظاہر سنہ مذکورہ کے آس پاس اس کا انتقال ہو گیا۔

میر جمال الدین حسین:

میر جمال الدین حسین کے سال پیدائش کا تذکرہ کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں محض قیاس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اس بارے میں فرشتہ[23] اس حد تک ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ حسین نظام شاہ نے ۹۶۹ھ/ ۱۵۶۱ء کے اوائل میں اپنی بیٹی بی بی خدیجہ (جو خونزہ ہمایوں کے بطن سے تھی) کا نکاح

جمال الدین حسین کے ساتھ کیا تھا۔ اگر شادی کے وقت جمال الدین حسین کی عمر بیس سال فرض کی جائے تو اس کا سال پیدائش ۹۲۹ھ/۱۵۲۲ء ہونا چاہیے۔ اس طرح انتقال کے وقت اس کی عمر ۸۶ سال رہی ہوگی۔ تزک سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ بہت ضعیف اور بوڑھا ہو گیا تھا اس لیے جہانگیر نے اسے ملازمت سے سبکدوش کیا۔

دکن میں سیاسی خدمات:

اپنے خاندان کے دیگر افراد کی طرح جمال الدین حسین بھی صاحب سیف وقلم تھا۔ یہ سب سے پہلے حسین نظام شاہ والی بیجاپور کے دربار سے منسلک ہوا اور متعدد جنگوں میں اس کے دوش بدوش رہا۔

جمال الدین حسین مرتضیٰ نظام شاہ کے مصاحبین میں شامل رہا تھا اور اس کی ہمدردی میں ایک بار قید کی سختیاں بھی جھیلی تھیں۔ فرشتہ[۲۷] نے لکھا ہے کہ مرتضیٰ نظام شاہ کی والدہ خونزہ ہمایوں نے اپنے بھائیوں اور عزیزوں کو جاگیریں دے کر اپنا اقتدار جما لیا تھا۔ جمال الدین حسین انجو، قاسم بیگ اور شاہ احمد مرتضیٰ خاں نے مرتضیٰ نظام شاہ سے اس کی شکایت کی۔ مرتضیٰ نظام شاہ نے جواب دیا کہ رعایا کا رجحان ان کی جانب ہے، میں ان کے تسلط کو کس طرح ختم کر سکتا ہوں۔ ان لوگوں نے کہا کہ اگر حکم ہو تو ہم فرہاد خاں، اخلاص خاں اور حبشی خاں کو اپنے ساتھ ملا کر اس کے غلبے کا علاج کریں۔ نظام شاہ نے قبول کر لیا۔ یہ تمام امرا کورنش و سلام کے بہانے سے قلعے میں داخل ہوئے اور نظام شاہ سے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو عورتوں اور خواجہ سراؤں کے ذریعہ خونزہ ہمایوں کو قید کر لیا جائے۔ مرتضیٰ نظام شاہ اس پر راضی ہو گیا۔ مرتضیٰ خاں اور جمال الدین حسین اس مہم کے سرانجام کے لیے مجلس سے اٹھے ہی تھے کہ خونزہ ہمایوں نے مرتضیٰ شاہ کو طلب کیا۔ مرتضیٰ نظام شاہ سمجھا کہ خونزہ ہمایوں کو اس سازش کا پتا چل گیا ہے اور وہ اسے معزول کر دے گی۔ اس نے جا کر خونزہ ہمایوں سے کہہ دیا کہ فلاں فلاں اشخاص نے آپ کو معزول کرنے اور گرفتار کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ خونزہ ہمایوں کو اس سازش کا علم ہوا تو اس نے جمال الدین حسین کو گرفتار کر لیا۔

مرتضیٰ[۲۸] نظام شاہ نے برسر اقتدار آنے کے بعد جمال الدین حسین کو خلعت ومنصب وکالت عطا کیا۔

لیکن ۹۷۷ھ/۱۵۶۹ء میں مرتضیٰ شاہ نے جمال الدین حسین، شاہ احمد مرتضیٰ خاں اور دوسرے سادات انجو کے کہنے سے قلعۂ ریکندہ پر حملہ کیا جو بندر چھول کے جوار میں واقع ہے۔ چونکہ جمال الدین کا جوانی کا زمانہ تھا اس لیے وہ ملکی وملی تقاضوں کو پورا نہ کر سکا اور عیش وعشرت میں محو ہو گیا۔ مرتضیٰ نظام شاہ طول محاصرہ اور محنت سفر سے تنگ آ کر جمال الدین کی لاپروائی کی شکایت وقتاً فوقتاً خواجہ میرک سے کرتا رہا۔ انجو کو جب اس کا علم ہوا تو وہ بے اجازت احمد نگر چلا گیا۔

مرتضیٰ[۲۹] نظام شاہ جب احمد نگر پہنچا تو اس نے جمال الدین حسین کو مع اس کی بیوی کے برہان پور روانہ کر دیا اور منصب وکالت خواجہ میرک کو تفویض کر کے چنگیز خاں کے خطاب سے سرفراز کیا۔

دربار اکبری میں ورود:

معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کے بعد مرتضیٰ نظام شاہ سے جمال الدین حسین کے تعلقات استوار نہ ہو سکے، اور وہ مغل دربار کی پناہ ڈھونڈنے پر مجبور ہوا۔ جمال الدین حسین کا ورود دربار اکبری میں کب ہوا اس کی واقعی تاریخ کا علم نہیں ابوالفضل[۳۰] نے اکبر نامہ میں میر جمال الدین حسین انجو کا تذکرہ ۱۷ جلوس مطابق ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں ۱۸ رمضان سے قبل کیا ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ جمال الدین اسی تاریخ کے آس پاس دربار اکبری میں پہنچا۔

۹۸۷ھ/۱۵۷۹ء[۳۱] میں مظفر خاں کے ساتھ انجو کو بنگالہ بھیجا گیا اور خلعت فاخرہ واسپ خاصہ انعام میں ملا۔

۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء[۳۲] میں مظفر خاں معتوب ومعزول ہوا اور جمال الدین حسین کو جلیسر کی حکومت عطا کی گئی۔

۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء[۳۳] میں برہان الملک دکن سے دربار میں آیا تو جمال الدین حسین نے اس کا استقبال کیا اور اکبر سے اس کی سفارشیں کیں۔ اس سے اکبر سے اس کے نزدیکی تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔

۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء[۳۴] میں حسین انجو کو اکبر نے منصب ششصدی عطا کیا اور اسی سال اس کو خان اعظم کے ساتھ جنوبی دیار[۳۵] بھیجا گیا۔

۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱ء[۳۶] میں راجہ علی خاں والی خاندیس نے برہان الملک سے علیحدہ ہو کر مالوہ میں شورش پھیلائی تو خواجہ محب علی دیوان نے اس کو دبانے کے لیے انجو کی خدمات کو ضروری سمجھا اور صوبے کے دوسرے اقطاع داران کے ساتھ اسے بھی شامل کیا۔

۱۰۰۹ھ/۱۶۰۰ء[۳۷] میں جمال الدین علی عادل شاہ کی بیٹی کی منگنی شاہزادہ دانیال کے ساتھ کرنے کے لیے منگنی کا سامان لے کر بیجاپور بھیجا گیا۔

فرشتہ[۳۸] لکھتا ہے کہ ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۴ء میں جمال الدین کو بیجاپور بھیجا گیا تھا جہاں اس نے گوداوری کے کنارے مونگی پٹن کے قریب ایک بڑے جشن کے بعد عروس کو شاہزادہ دانیال کے سپرد کیا اور خود آگرہ واپس آ گیا۔

غالباً یہ بیجاپور کا دوسرا سفر تھا جو رخصتی کے سلسلے میں کیا گیا تھا۔ چنانچہ اکبر نامہ[۳۹] میں لکھا ہے کہ میر جمال الدین حسین دکن سے ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۴ء میں واپس آیا اور بادشاہ[۴۰] کے حضور میں دکن کا کچھ سامان اور جواہرات پیش کیے جسے قبول کر لیا گیا۔

ابوالفضل [38] نے اکبرنامہ میں اسے شش صدی منصب دار لکھا ہے اور آئین اکبری [39] میں نہ صدی امرا کے ذیل میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آئین اکبری کی ترتیب کے زمانے میں میر جمال الدین کو نہ صدی منصب عطا کر دیا گیا تھا۔

مآثرالامرا [40] میں ہے کہ جلوس اکبری کے چالیسویں سال منصب ہزاری اور آخر زمانے میں منصب سہ ہزاری عطا کیا گیا۔ اس کی تائید باغ [41] مان نے بھی کی ہے لیکن اکبرنامہ سے اس کی تصدیق نہیں ہوئی۔ مآثرالامرا میں یہ بھی لکھا ہے کہ جہانگیر نے جلوس کے بعد منصب چہار ہزاری سے سرفراز کیا، لیکن تزک جہانگیری سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء میں میر جمال الدین حسین انجو کو منصب سہ ہزاری سے سرفراز کیا گیا تھا۔

دربار جہانگیری میں ورود:

شاہنشاہ اکبر کے انتقال کے بعد جمال الدین حسین انجو نورالدین جہانگیر کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ تزک جہانگیری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہانگیر نے بھی اسے نہ صرف عزیز رکھا بلکہ اس پر وقتاً فوقتاً مہربانیاں کرتا رہا۔ چنانچہ تخت نشینی کے بعد عید [42] رمضان کے موقع پر منصب سہ ہزاری سے سربلند کیا اور جب جہانگیر [43] عید گاہ گیا تو جمال الدین، میران صدر جہان اور میر محمد رضا سبزواری اس کے ساتھ تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو جہانگیر نے ایک ایک لاکھ روپے خیرات کرنے کے لیے دیے۔

مآثرالامرا [44] اور باغ مان [45] دونوں کے مطابق جہانگیر نے اسے نقارہ اور علم بھی مرحمت فرمایا تھا لیکن جہانگیر نے تزک میں اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

دکن میں عادل خاں بیجاپوری کے خلاف شورش کا آغاز ہوا تو عادل خاں نے جہانگیر کی خدمت میں التماس کیا کہ چونکہ اہل دکن جمال الدین حسین کے قول و فعل پر اعتماد کرتے ہیں اس لیے اسے کچھ دن کے لیے بیجاپور بھیج دیا جائے تاکہ یہ فتنہ با سانی فرو ہو سکے۔ جہانگیر [46] نے ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء میں حسین انجو کو برہان پور سے طلب کیا اور اس مقصد کے حصول کے لیے ۱۶ ماہ صفر ۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء کو بیجاپور روانہ کر دیا۔ ساتھ ہی اسے دس ہزار روپے بطور انعام عطا کیے۔ میر جمال الدین [47] ۲۲ رشعبان ۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء کو بیجاپور پہنچا۔ عادل خاں کے وکیل نے بیس کوس آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور خود عادل خاں نے منزل سے تین کوس آگے آ کر اس کا خیر مقدم کیا۔

بیجاپور [48] میں اس کا قیام تقریباً پانچ سال رہا اور وہ بیجاپور کی شورش فرو ہو جانے کے بعد ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء میں واپس آ گیا اور بادشاہ کے حضور میں تین انگوٹھیاں پیش کیں جس میں سے ایک میں عقیق یمنی جڑا ہوا تھا۔ جہانگیر نے لکھا ہے کہ اس میں اتنی لطافت و سیرابی تھی کہ جتنی عام طور پر عقیق یمنی میں نہیں ہوتی۔

جہانگیر [49] نے رمضان ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء میں جمال الدین کو منصب چہار ہزاری سے سرفراز کیا اور اس کی تحویل میں دو ہزار سوار دیے۔

اسی ماہ [50] کی ۱۲ تاریخ کو اس کے منصب میں ترقی کر کے اسے پنج ہزاری بنا دیا گیا اور ڈھائی ہزار سوار سے سرفراز کیا۔

۷ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء کو جمال الدین حسین انجو نے جہانگیر کی خدمت میں ایک مرصع خنجر پیش کیا۔ جس کا دستہ زرد یاقوت کا تھا۔ یہ یاقوت نصف بیضۂ مرغ کے برابر تھا۔ جہانگیر نے اس کی بہت تعریف لکھی ہے۔

۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں جہانگیر نے اس کے ہزار سوار اور بڑھا دیے۔ اس طرح پنج ہزاری ذات اور تین ہزار پانچ سو سوار اس کے لیے مقرر کر دیے گئے۔

۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء انھیں ہی جہانگیر نے اس کی خدمات کا اعتراف اور اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے عضد الدولہ کا خطاب عطا کیا۔

صاحب مآثرالامرا نے اس کے بہار کا گورنر مقرر کیے جانے کا بھی تذکرہ کیا ہے لیکن تزک سے اس کی شہادت نہیں ملتی۔ جب [51] کہ جہانگیر نے لکھا ہے کہ ۲۶ شہریور ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء کو عضد الدولہ جو صوبہ مالوہ کا جاگیردار تھا رخصت ہوا تو اسے اسپ و خلعت سے سرفراز کیا گیا۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انجو اس زمانے میں مالوے کی جاگیرداری پر فائز تھا۔

۱۰۳۰ھ/۱۶۲۰ء [52] میں عضد الدولہ کو اس لیے حکومت سے سبکدوش کر دیا گیا کہ وہ بہت ضعیف و کمزور ہو چکا تھا اور منصب و جاگیر کے فرائض انجام نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے بادشاہ کے حکم کے مطابق اسے ہر ماہ چار ہزار روپے نقد خزانۂ عامرہ سے دیے جانے لگے۔ یہی نہیں جہانگیر نے اسے اجازت دے دی کہ لاہور اور آگرے میں سے جو جگہ پسند ہو وہاں قیام کرے اور بادشاہ کی درازی عمر کے لیے دعا کرتا رہے۔

مآثرالامرا [53] سے معلوم ہوتا ہے کہ سبکدوشی کے زمانے میں انجو بہرائچ کا جاگیردار تھا۔ بہر حال جمال الدین [54] آگرہ میں قیام پذیر ہوا اور اس نے اپنی معروف تصنیف جو جلال الدین محمد اکبر کی فرمائش پر ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۶ء میں لکھنا شروع کی تھی ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ء میں "فرہنگ جہانگیری" کے نام سے شہنشاہ جہانگیر کی خدمت میں پیش کی۔ تزک میں جہانگیر نے اس کتاب کی تعریف کرتے ہوئے اسے فن لغت نویسی کا شاہکار اور بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔

وفات:

تاریخ محمدی[۶۷] کے مطابق میر جمال الدین حسین نے ۱۰۳۵ھ/ ۱۶۲۵ء میں آگرے میں انتقال کیا۔

جمال الدین حسین انجو کی اولادیں:

میر جمال الدین حسین کے دو بیٹے میر امین الدین اور میر حسام الدین مرتضٰی خاں تھے۔ میر امین الدین کو عبد الرحیم خان خاناں کی بیٹی منسوب تھی۔ یہ جمال الدین کا بڑا بیٹا تھا اور مآثر الامرا[۶۸] کے مطابق دکن میں اپنے والد کے ساتھ تعینات تھا۔ جوانی ہی میں اس کا انتقال ہو گیا۔

میر حسام الدین[۶۸] مرتضٰی خاں کا عقد احمد بیگ خاں کی بہن سے ہوا تھا جو ابراہیم خاں فتح جنگ کی بھتیجی تھی۔ اسی کے وسیلے سے اسے فضیلت و بزرگی حاصل ہوئی۔ وہ قلعۂ آسیر کی حفاظت پر مامور تھا یہ قلعہ جیسا کہ معلوم ہے مخروطی قلعوں میں اپنی بلندی اور پختگی کی وجہ سے مشہور ہے۔ جہانگیر کے ۱۷ ویں سال جلوس میں جب شاہزادہ خرم (شاہجہاں) نے علم بغاوت بلند کیا تو حسام الدین نے شاہزادے کا ساتھ دیا۔ اس خدمت کے صلے میں شاہ جہاں نے اپنی تخت نشینی کے بعد اسے ہزاری ذات اور تین ہزار سوار کا منصب عطا کیا، اور مآثر الامراء کے مطابق اسی سال مرتضٰی خاں کا خطاب اور پچاس ہزار روپے نقد کے ساتھ ٹھٹھہ کی صوبے داری بھی تفویض ہوئی۔ ابھی حسام الدین اپنے مقاصد میں پوری طرح کامیاب بھی نہیں ہوا تھا کہ آخر سنہ ۱۰۳۹ھ/ ۱۶۲۹ء (مطابق[۶۹] سال دوم شاہ جہانی) میں اس کا انتقال ہو گیا۔

میر حسام الدین کا بیٹا میر صمصام الدولہ بھی صاحب لیاقت و سعادت نکلا اور ۲۱ جلوس شاہ جہانی میں شاہزادہ شجاع کا دیوان مقرر ہوا تھا۔

"اٹھائیسویں جلوس تک وہ منصب ڈیڑھ ہزاری (مع پانچ سو سوار) پر فائز ہو چکا تھا اور اسی سال اس کا انتقال ہوا۔"[۷۰]

تصنیف:

جمال الدین حسین اپنے عہد کا متبحر عالم تھا اور اپنے زمانے کے صاحبان علم و فضل کے نزدیک قابل تعظیم اور لائق احترام ہستی سمجھا جاتا تھا۔ اس کی تصانیف میں "فرہنگ جہانگیری" کے علاوہ اور کوئی کتاب نظر نہیں آتی لیکن اس کے باوجود اس کی علمی قابلیت کا اعتراف ہر دور میں کیا جاتا رہا ہے۔ ضیاء الدین حدائق ابن یوسف شیرازی کے نزدیک اس کی تشریحات اہل فن کے نزدیک "برہان قاطع" اور "قاطع برہان" کی حیثیت رکھتی ہیں۔

فرہنگ کی ترتیب کے سلسلے میں جمال الدین حسین انجو نے لکھا ہے کہ اسے عنفوان شباب سے ہی قدیم شاعروں کا کلام پڑھنے کا رجحان و میلان رہا۔ اور مطالعہ کے بعد دوستوں کی محفل میں اکثر و بیشتر وقت گزارتا تھا اور ان کے معنی پر غور و فکر کیا جاتا تھا۔ چونکہ قدما کے کلام میں پارسی، پہلوی اور دری لغات نیز اصطلاحات کا استعمال بھی ہوتا تھا اس لیے مختلف فرہنگوں سے استفادہ کرنے کے باوجود بہت سی لغات کی رہنمائی نہیں ہوتی تھی یا ہوتی بھی تو ان میں اختلاف و اختلال پایا جاتا تھا۔ بایں سبب وہ نظم اور نثر دونوں سے غیر مشہور الفاظ لکھنے اور ان پر تحقیق کرنے لگا۔

نتیجتاً فن لغت نویسی میں اس کو اس درجہ مہارت حاصل ہو گئی کہ اس دور کے علما و فضلا اس سے رجوع کرنے لگے اور اس کی رائے کو ثقہ سمجھ کر ترجیح دینے لگے۔ خود اسے بھی اپنی اس حیثیت کا احساس تھا۔ فرہنگ کے مقدمے میں اس نے اس کا اظہار ان اشعار کے ذریعے کیا ہے۔

چو قوارع زبوری بفصاحت اندر آرم — ہمہ ہزار دل را نہ لشید زند خوانی
متقاخرم بدیں فن بخدا، و چوں نیاشم — نجنی بدین لطیفی کمی بدین روانی
سرایں جریدہ برند، درایں قصیدہ بکشا — کہ برند رقعہ رقعہ فضلا بارمغانی

جمال الدین حسین کے علم و فضل اور دوق ترتیب لغت کی شہرت شاہنشاہ جلال الدین محمد اکبر تک پہنچی تو اس نے جمال الدین کو دربار میں طلب کیا اور خالص فارسی الفاظ کی لغت مرتب کرنے کا حکم دیا۔ ذیقعدہ ۱۰۰۵ھ میں جمال الدین حسین نے شاہنشاہ اکبر کے حکم کے مطابق اس کی ترتیب کا آغاز کیا اور ۱۰۱۷ھ میں شاہنشاہ جہانگیر کے دور میں مکمل کیا۔ اس کا قطعۂ تاریخ درج ذیل ہے۔

مرتب گشت ایں فرہنگ نامی — بنام شاہ نجاہ جہانگیر
چو جستم سال تاریخش خرد گفت — زہے فرہنگ نور الدین جہانگیر

تمام تاریخوں کے مطابق اس نے یہ تصنیف جہانگیر کی خدمت میں ۱۰۳۲ھ میں پیش کی۔ تزک[۷۱] میں جہانگیر نے اس کی بڑی تعریف و توصیف کی ہے اور اسے بے مثل لغت قرار دیا ہے۔

یہ فرہنگ خالص فارسی الفاظ پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اکثر و بیشتر معانی کے ثبوت میں اشعار بھی لکھے ہیں۔ اس کی ترتیب میں جمال الدین حسین نے جس محنت و جانفشانی سے کام لیا ہے اس کی مثال فرہنگ جہانگیری سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔ وہ الفاظ کی تحقیق و معانی میں اتنا کوشاں اور محتاط رہا ہے کہ جس علاقے سے متعلق کوئی لفظ ہوتا ہے اس کے معنی وہیں کے لوگوں سے دریافت کرتا ہے اور اسی علاقے کے شاعروں کے اشعار شہادت میں پیش کرتا ہے، تاکہ اسے سند تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہ ہو۔ مثلاً اگر وہ دیوان حکیم سنائی یا حدیقۂ سنائی میں سے معانی سمجھنے سے قاصر رہا ہے تو اس نے غزنی اور کابل کے لوگوں

سے دریافت کیا ہے اور اگر یہ لغات دیوان حکیم ناصر خسرو یا اس کے سفرنامے سے تھے تو اہل خراسان و بدخشاں سے رجوع کیا ہے۔ اس لحاظ سے اس نے تحقیق کا کماحقہ حق ادا کر دیا ہے۔ اس کی اس صفت کا اعتراف کرتے ہوئے آقای داعی الاسلام سید محمد علی نے دیباچہ فرہنگ[۴۲] نظام میں لکھا ہے:

''مولف فرہنگ جہانگیری (کہ بہترین فرہنگ شعر فارسی است)
تحقیق معنی الفاظ شعر ہر شاعری را از اہل وطن آن شاعر کردی۔''

اس کی اس انتھک کوشش و محنت کا نتیجہ ہے کہ اس لغت کی اہمیت و افادیت کے درجے پر کوئی اور لغت نہ پہنچ سکی۔ بقول علی اصغر حکمت شیرازی[۴۳]

''این کتاب از بہترین و جامع ترین و دقیق ترین فرہنگ ہای
زبان فارسی می باشد''

انجو کی یہ تصنیف اس لحاظ سے بھی یہ قابل ستائش ہے کہ یہ پہلی لغت ہے جس میں اصول لغت نویسی کو برتا گیا ہے۔ چنانچہ اس نے محض چند کتابوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے جتنی فنی کتابیں دستیاب ہو سکی ہیں ان سب سے استفادہ کیا ہے۔ کتابوں کی طویل فہرست جو اس نے اپنے مقدمے میں دی ہے اس کی قدر و قیمت میں نمایاں اضافہ کرتی ہے۔ انجو کی تحقیقی کاوش اور بے انتہا محنت اس امر کی آئینہ دار ہے کہ وہ محض مقلد نہیں بلکہ نقادِ فن ہے۔ اہل علم جو اس فرہنگ سے استفادہ کرتے رہے ہیں، بخوبی واقف ہیں کہ اس نے اپنے منابع کو محض بنیاد بنا کر تقلید نہیں کی بلکہ لغات کی کماحقہ تحقیق اور تجزیے کے بعد اپنی فرہنگ میں جگہ دی ہے۔

اس کا مطالعہ کثیر اور اس کا علم عمیق ہے۔ وہ نہ صرف فارسی کا جید عالم ہے بلکہ عربی پر بھی اسے پورا عبور حاصل ہے۔ اس نے اپنے مقدمے میں قرآن و حدیث سے استناد کیا ہے اور الفاظ کی تشریح میں گاہ گاہ عربی معنی بتائے ہیں نیز خالص عربی لغات کتاب کے آخر میں شامل کیے ہیں۔ ان کے علاوہ کنایات، اصطلاحات، استعارات اور فارسی و عربی سے مرکب لغات بھی کتاب کے خاتمے میں تحریر کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں خود مصنف کے الفاظ میں:

''...... و پارسی زبانان و شعرا و شعر پسنداں و شعر فہماں را از دانستن
آں چارہ نبود در آئین متعدد مذکور ساز م و خاتمہ با خرش ملحق
ساختم و کنایات و اصطلاحات و استعارات و لغات مرکبہ از پارسی
و عربی و لغاتی کہ یکی از حروف مشتکانہ در آن یافتہ شدہ و لغات
زند و پا زند و لغات غریبہ کہ دانستن آں ضروری بود و از اں گریزی

نبود و داخل اصل کتاب کہ مشتمل بر فرس قدیم است، کردن
مناسب نہ نمود، ہر کدام را در ذیل علیحدہ درج نمودم و ہر دری را بر
چند جلوہ مرتب گردانیدم بدانکہ در خاتمہ در بجای ''باب'' واقع
شدہ و جلوہ بمنزلہ فصل چنانکہ معلوم خواہد شد۔''

منابع:

جمال الدین حسین انجو نے اس کتاب کی ترتیب کے دوران ۵۳ کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ جس میں چوالیس کتابوں اور ان کے مصنفین کے نام اس نے اپنے مقدمے میں لکھے ہیں۔ بقیہ نو کتابوں کے نام اور مصنفین سے وہ خود بھی واقف نہیں۔ منابع کی یہ فہرست انتہائی جامع ہے اور کسی بھی تصنیف کے وقیع ہونے کی ضامن ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک کی تحریر شدہ، شاید ہی کوئی قدیم و جدید فرہنگ اور فن لغت پر لکھا گیا کوئی رسالہ رہا ہو جس سے جمال الدین انجو نے استفادہ نہ کرلیا ہو۔ کتنی ہی فرہنگیں ایسی ہیں جن کا علم فرہنگ جہانگیری سے ہوتا ہے اور کتنے شاعر اور مصنفین ایسے ہیں جن کے ناموں سے روشناس اس نے ہی کرایا ہے۔ اس کی اس خصوصیت کا اعتراف آقای علی اصغر حکمت اور بلاخ مان نے انتہائی عزت و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ ان موقر لغات کے نام درج ذیل ہیں:

۱- فرہنگ ابو الحفص سعدی
۲- فرہنگ ابو المنصور علی بن احمد بن منصور اسدی الطوسی
۳- فرہنگ ابراہیمی
۴- فرہنگ اداۃ الفضلا، تصنیف قاضی خان بن محمد دہلوی المعروف بدھاروال
۵- فرہنگ استاد عبد اللہ نیشاپوری
۶- فرہنگ اسکندری
۷- فرہنگ تحفۃ الاحباب تصنیف حافظ اوبہی
۸- فرہنگ جامع اللغات منظوم نیاز حجازی
۹- فرہنگ حسین وفائی
۱۰- فرہنگ خلجیتی
۱۱- فرہنگ حکیم قطران
۱۲- فرہنگ دستور
۱۳- فرہنگ دستور الافاضل
۱۴- فرہنگ دستور الفضلا
۱۵- فرہنگ رسالۃ النصیر
۱۶- فرہنگ زفان گویا و جہان پویا مشہور بہ ہفت بخشی تصنیف بدر الدین
۱۷- فرہنگ سروری کاشی
۱۸- فرہنگ سعد بن نصیر بن طاہر بن تمیم الغزنوی کہ بنام خواجہ نظام الملک نوشتہ و آن یک ہزار و

دو بیست و پنج لغت است و مسمیٰ بہ سخن نامۂ نظامی

۱۹- فرہنگ شرفنامۂ احمد منیری مشہور بہ ابراہیم فاروقی
۲۰- فرہنگ شیخ زادہ عاشق
۲۱- فرہنگ شیخ عبدالرحیم بہاری
۲۲- فرہنگ ضمیر [۴۳]
۲۳- فرہنگ عاصی [۴۴]
۲۴- فرہنگ عجایب
۲۵- فرہنگ علی بیگ بلی
۲۶- فرہنگ فوائد برہانی
۲۷- فرہنگ عالمی
۲۸- فرہنگ قاضی ظہیر
۲۹- فرہنگ قنیۃ الطبیان
۳۰- فرہنگ لسان الشعرا
۳۱- فرہنگ لغات شاہنامہ
۳۲- فرہنگ قنیۃ الطالبین [۴۵]
۳۳- فرہنگ محمد بن قیس
۳۴- فرہنگ محمد بن ہندو شاہ نخشی کہ بنام خواجہ غیاث الدین رشید تصنیف کردہ
۳۵- فرہنگ مختصر
۳۶- فرہنگ مرزا ابراہیم بن مرزا شاہ حسین اصفہانی
۳۷- فرہنگ معیار جمالی
۳۸- فرہنگ مولانا اللہ داد سرہندی
۳۹- فرہنگ منصور شیرازی
۴۰- فرہنگ مولانا مبارک شاہ غزنوی مشہور بہ فخر قواس
۴۱- فرہنگ موید الفضلا تصنیف محمد لاڈ
۴۲- فرہنگ موید الفوائد
۴۳- فرہنگ لغات دیوان خاقانی
۴۴- فرہنگ شیخ محمود بہاری

ترتیب:

فرہنگ جہانگیری کا آغاز درج ذیل اشعار سے کیا گیا ہے۔

آنکہ بر لوح زباں ہا حرف اول نام اوست آں ہمی گوید الہ ایں ایزد و آں تنگری

دیباچۂ فرہنگ خود از حمد تو سازم تا ہر ورق گیرد ازو قیمت دیباج

یہ فرہنگ ۲۴ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کا مقدمہ انتہائی مفصل اور زبان و دستور کے مطابق ہے اور اس میں مفید مطالب ادا کیے گئے ہیں۔ لیکن اس معاملے میں وہ منفرد نہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس نے موید الفضلا کا تتبع کیا ہے۔ موید کے آخر میں محمد لاڈ نے زبان سے متعلق کچھ مسائل پیش کیے تھے۔ جمال الدین حسین نے ان ابواب میں ایسے مسائل کا اضافہ کیا جو نہ موید الفضلا میں اور نہ کسی دوسری فرہنگ میں تحریر کیے گئے تھے۔

ہر باب علیحدہ "در" میں درج ہے اور ہر "در" چند "جلووں" پر ترتیب دیا گیا ہے۔ خاتمہ میں "در" کو بجائے "باب" اور "جلوہ" کو بجائے "فصل" استعمال کیا ہے۔

مقدمہ مندرجہ ذیل ۱۲ ابواب پر محیط ہے۔

آئین اول: دربیان اطلاق اسم پارس بر ملک ایران و آن کہ در زمان قدیم و عہد باستان از کجا تا کجا را پارس می نامیدہ اند، و تعداد زبان پارسی را کہ چند است و ذکر فصاحت و تفصیل آن بر دیگر زبان ہا۔

آئین دوم: دربیان چگونگی زبان پارسی

آئین سوم: در تعداد حروف تہجی کہ نزد پارسی زبانان متداول است، و بیان تفرقہ میان حرف دال و ذال منقوطہ و تعیین صیغ آن کہ چند است۔

آئین چہارم: در ذکر ترتیب این کتاب کہ بر چہ سان و چند باب است۔ چونکہ صاحب جہانگیری نے لغت کی تنظیم کے سلسلے میں سب سے علیحدہ روش اختیار کی ہے اور اسی باب میں اس کی صراحت کی ہے اس لیے بے جا نہ ہوگا کہ اس کی مثال یہاں پیش کر دی جائے۔ اس نے حرف دوم کو "باب" اور حرف اول کو "فصل" قرار دیا ہے مثلاً "تجنہ" میں "ت" فصل ہے اور "ج" باب ہے، اس لیے اس لفظ کے معنی دیکھنے کے لیے ہمیں حرف "ج" کا باب دیکھنا ہوگا بعد ازاں "ت" (یعنی ج سے پہلے ت تلاش کرنا ہوگی)

آئین پنجم: در ذکر تفرقہ میان حروف و علامت ہر حرفی۔

آئین ششم: دربیان تجویز تبدیل ہر یک از حروف بیست و چہارگانہ بحرف دیگر، در بعضی از لغات در بعضی از مواقع بجہت سہولت و آسانی منشیان و شعرا۔

آئین ہفتم: دربیان ضمائر

آئین ہشتم: در ذکر حروف و کلماتی کہ بجہت حسن و زینت کلام بیاورند، و آن را در معنی مدخلی نباشد۔

آئین نہم: دربیان حروف و کلماتی کہ باواخر اسما و افعال بجہت حصول معانی گوناگوں در آورند، بدون ترکیب افادۂ معنی نکند۔

آئین دہم: دربیان حروف مقررہ کہ در اوائل و اواخر کلمات بیارند بجہت دریافت معانی مختلفہ۔

آئین یازدہم: در املا

آئین دوازدہم: دربیان عقد انامل

لغت نویسی کا کام فرد واحد کا نہیں ایک جماعت کے کرنے کا کام ہے۔ اس لیے کہ اس میں اتنے متنوع الفاظ اور معانی کا اجتماع ہوتا ہے کہ کسی ایک شخص کے لیے اس کے تقاضوں اور ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں۔ جمال الدین حسین نے اتنی جامع اور وسیع لغت خود ہی مرتب کی ہے اور انتہائی محنت اور

دقت نظر سے کام لے کر تیس سال تک اس پر غور و فکر کرتا رہا۔ جس کا اظہار اس نے اپنے مقدمے میں درج ذیل اشعار سے کیا ہے۔

بسی رنج بردم دریں سال سی　　عجم زندہ کردم بدیں پارسی
زمن گشت دست فصاحت قوی　　پرداختم دفتری پہلوی

لیکن اس کے باوجود اس میں کچھ غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ جس کے دور رس نتائج نکلے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس نے بعض ایسے لغات کو جو معیاری نہ تھے معیاری قرار دے دیا۔ مثلاً فرہنگ معیار جمالی میں شاعر نے الفاظ کی سند میں خود اپنے اشعار فرہنگ میں بطور سند تسلیم کر لیے ہیں۔ جو اصول کے خلاف ہے۔ اصولاً الفاظ پہلے ہوتے ہیں اور انھیں اشعار میں استعمال بعد کو کیا جاتا ہے۔

دوسرے لغت نویسوں کی طرح قدیم ایرانی زبانوں سے ناواقفیت کا شکار ہمارا مصنف بھی رہا ہے۔ وہ ہزوارش سے واقف نہیں ہے اس لیے بہت سے ہزوارش کے الفاظ ژند و پاژند کے الفاظ سمجھ کر اس نے اپنی فرہنگ کے خاتمے میں شامل کر لیے ہیں۔ اس کے نتیجے میں بعد کے فرہنگ نویسوں اور خصوصیت سے خلف تبریزی نے برہان قاطع میں اصل فرہنگ میں ان کو جگہ دے دی۔ نتیجتاً ان کے بعد سراج الدین علی خاں آرزو نے بھی بغیر تحقیق کیے ''نظریہ توافق لسانین'' پیش کر کے تحقیق کا ایک نیا باب وا کر دیا۔ اگرچہ بعد کے محققین نے بڑی ژرف نگاہی کا ثبوت دیتے ہوئے اس مسئلے کو حل کر لیا لیکن اس غلط فہمی کی بنیاد ہمارے مصنف نے ڈالی ہے۔

ایک اور بڑی غلطی جو صاحب جہانگیری سے ہوئی وہ دساتیری الفاظ ہیں۔ دساتیر جیسا کہ معلوم ہے ایک فرضی کتاب ہے۔ اس کتاب میں عربی یا کسی دوسری زبان کا کوئی لفظ شامل نہیں صرف کتابی زبان ہے جو اس جعلی کتاب کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔ جمال الدین حسین انجو نے اسے بھی صحیح زبان سمجھ کر اپنی فرہنگ میں ان لغات کو شامل کر لیا ہے جس سے بہر حال غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں۔

حواشی:

۱- فارسی نامہ ناصری گفتار دوم ص ۴۱
۲- ایضاً
۳- ایضاً، گفتار اول، ص ۴۹
۴- مطلع السعدین، ج ۲/ ۴۹، مولوی محمد شفیع بحوالہ اللغات النوائیہ تالیف پاوہ دکورتی

۵- Persian-English Dictionary, by F. Steingass
۶- فارسی نامہ ناصری گفتار دوم ص ۴۲
۷- فرہنگ ۳/ ۱/ ۳۰۲
۸- ایضاً، ۳/ ۱/ ۳۰۸
۹- ایضاً، ۳/ ۱/ ۳۰۵
۱۰- ایضاً، ۳/ ۱/ ۳۰۶
۱۱- ایضاً، ۳/ ۱/ ۳۰۹، ۳۱۷
۱۲- فارسی نامہ ناصری گفتار دوم ص ۴۲
۱۳- فرہنگ ۳/ ۱/ ۳۰۹- ۳۱۷
۱۴- فارسی نامہ ۲/ ۳۰
۱۵- تاریخ محمدی تحت سنہ ۹۹۹ھ از میرزا محمد بن رستم مخاطب بہ معتمد خاں بن قباد مخاطب بہ دیانت خاں حارثی بدخشی دہلوی
۱۶- طبقات اکبری، ۲/ ۳۵۳، نظام الدین احمد ہروی
۱۷- فرہنگ ۱۲۹
۱۸- فرہنگ ص ۱۳۰
۱۹- فارسی نامہ ناصری ۲/ ۴۲
۲۰- فارسی نامہ ناصری ۲/ ۴۲
۲۱- فرہنگ ۳/ ۳/ ۲۰، ۳/ ۳/ ۱۱۲
۲۲- ایضاً ۳/ ۳/ ۱۱۸
۲۳- فرہنگ ۳/ ۳/ ۱۱۹
۲۴- فرہنگ ۳/ ۳/ ۱۲۰-۱۲۲
۲۵- ایضاً ۳/ ۳/ ۱۳۳
۲۶- فرہنگ ۳/ ۳/ ۱۳۵
۲۷- اکبر نامہ ۳/ ۴۲
۲۸- ایضاً ۳/ ۴۹۲
۲۹- ایضاً ۳/ ۴۹۲
۳۰- ایضاً ۳/ ۴۰۸

۳۱- اکبر نامہ: ۳/ ۴۵۷
۳۲- ایضاً: ۳/ ۳۹۳
۳۳- ایضاً: ۳/ ۶۰۰
۳۴- ایضاً: ۳/ ۸۷۷
۳۵- فرشتہ: ۳/ ۲۷۱
۳۶- اکبر نامہ: ۳/ ۸۳۶
۳۷- ایضاً: ۳/ ۸۳۷
۳۸- اکبر نامہ: ۳/ ۴۵۷
۳۹- آئینِ اکبری تالیف ابوالفضل تصحیح سر سید احمد خاں، ص ۱۸۳
۴۰- مآثر الامرا، ۳/ ۳۵۸، از صمصام الدولہ شاہنواز خاں
۴۱- آئینِ اکبری ترجمہ انگریزی از بلاخ مان، ص ۵۱، ۳۵۰
۴۲- تزک جہانگیری، ص ۲۱
۴۳- ایضاً، ص ۴۷
۴۴- مآثر الامرا/ ۳/ ۳۵۸
۴۵- آئینِ اکبری، ترجمہ انگریزی از بلاخ مان، ص ۳۵۰
۴۶- تزک جہانگیری، ص ۸۲
۴۷- ایضاً، ص ۸۸
۴۸- ایضاً، ص ۱۳۶
۴۹- ایضاً، ص ۱۴۷
۵۰- ایضاً، ص ۱۵۵
۵۱- تزک جہانگیری: ۱۵۷
۵۲- ایضاً، ص ۱۹۳
۵۳- ایضاً، ص ۳۲۷
۵۴- مآثر الامرا: ۳/ ۳۶۰
۵۵- تزک جہانگیری، ص ۳۵۹
۵۶- تاریخ محمدی از میرزا محمد بن رستم مخاطب بہ معتمد خاں بن قباد مخاطب بہ دیانت خاں حارثی بدخشی دہلوی تحت ۱۰۳۵ھ

۵۷- مآثر الامرا ۳/ ۳۹۰
۵۸- ایضاً ۳/ ۳۸۴
۵۹- مآثر الامرا ۳۸۳، و تاریخ محمدی تحت ۱۰۳۹ھ
۶۰- ایضاً ۳۸۳
۶۱- تزک جہانگیری، ص ۳۵۹
۶۲- فرہنگ نظام، ج ۱/ ۹
۶۳- از مقالہ آقای علی اصغر حکمت، دیباچہ فرہنگ برہان قاطع مرتبہ ڈاکٹر معین ص ۸۱-۸۳
۶۴- تالیف حسین بن احمد معاصر عالمگیر، سعید نفیسی مقدمہ لغت نامہ، ص ۱۸۳
۶۵- فرہنگ جہانگیری: سعید نفیسی
۶۶- فرہنگ عاصمی: سعید نفیسی مقدمہ لغت نامہ دہخدا

☆☆☆

محمد منصور عالم*

ایران سوسائٹی کا مجلّہ

انڈو ایرانیکا

بنگال میں فارسی صحافت کا ایک سنگِ میل

کسی بھی زبان کی ترقی، توسیع اور تشہیر میں تعلیمی اداروں اور اس زبان کے شعرا و ادبا کا خاص حصہ ہوتا ہے۔ لیکن علمی و ادبی انجمنوں کی طرف سے شائع ہونے والے رسالوں اور مجلّوں کا کردار بھی کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں ہوتا۔ اگر ایماندارانہ طور پر جائزہ لیا جائے تو پتا چلے گا کہ تعلیمی درس گاہوں میں صرف درس و تدریس کا سلسلہ رہتا ہے، اساتذۂ کرام صرف ایک مقررہ نصاب کے تحت طلبا کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتے ہیں، جن سے صرف طلبا ہی مستفید ہوتے ہیں۔ عام لوگوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملتا۔ جب کہ اس کے برعکس انجمنوں کا دائرۂ عمل وسیع تر ہوتا ہے۔ یہ درس و تدریس کے علاوہ زبان و ادب کی اشاعت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔ ان کی نگرانی میں شائع ہونے والے جرائد و رسائل کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ زبان و ادب کی ترقی و ترویج اور اس کی تشہیر میں رسائل و جرائد نے کافی اہم رول انجام دیے ہیں۔

آزادی کے بعد فارسی زبان و ادب کی جو ناگفتہ بہ حالت ہوئی ہے، وہ اربابِ علم و ہنر سے پوشیدہ نہیں۔ یہ زبان نئے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے باوجود تنزلی کا شکار ہو کر تعلیمی درسگاہوں تک سمٹ کر رہ گئی ہے۔ زبان کی بقا اور ترقی و ترویج کے لیے حکومت کی سرپرستی کے ساتھ اس کے بولنے، چاہنے اور سمجھنے والے اور اس سے عقیدت رکھنے والے یکساں طور پر شریک ہوتے ہیں۔ بدقسمتی تو یہ ہے کہ فارسی زبان و ادب کو نہ تو حکومت کی مناسب سرپرستی میسر ہے اور نہ ہی اس کا رشتہ معاشرے سے جڑا ہوا ہے۔ ایسی صورت میں اپنی اس میراث کو بچانے اور اس کی ساکھ بحال کرنے میں انجمنیں تگ و دو میں لگی ہوئی ہیں۔ یوں تو ہندوستان میں فارسی انجمنوں کی کمی نہیں بلکہ ہر سال کہیں نہ کہیں

* ممبر، پبلک سروس کمیشن، مغربی بنگال، اسسٹنٹ جنرل سکریٹری، ایران سوسائٹی، کولکتہ

کسی نہ کسی انجمن کا قیام عمل میں آتا رہتا ہے، لیکن ایسی انجمنیں بہت جلد گمنامی میں چلی جاتی ہیں، جن کے پاس نہ کوئی مقصد ہوتا ہے اور نہ ہی وسائل۔ لہٰذا موسمی انجمن اپنی اپنی دوکان چمکا کر خود مستفید ہو کر اس طرح غائب ہو جاتے ہیں کہ اس انجمن کا جنازہ بھی اٹھانے نہیں آتے۔ ایسی حالت میں پورے ہندوستان میں دو انجمنیں ہی ایسی رہ گئی ہیں جو اعلیٰ مقصد کے تحت نہایت ایمانداری اور تندہی سے فارسی زبان و ادب کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔ ایک ایران سوسائٹی اور دوسری انجمن استادان فارسی ہند۔ اول الذکر ۶۲ برسالوں سے اور آخر الذکر ۲۵ برسالوں سے اس زبان کو باد مخالف سے بچانے اور اس کی ترقی کے لیے کوشاں ہے۔ انجمن استادان فارسی کی نگرانی میں مجلّہ "بیاض" (سہ ماہی) شائع ہوتا ہے، جب کہ ایران سوسائٹی کا ترجمان سہ ماہی "انڈو ایرانیکا" ہے جو ذولسانی ہے یعنی فارسی اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں "انڈو ایرانیکا" کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیا جائے گا۔ ("انڈو ایرانیکا" کی تفصیلی خدمات کے لیے میری کتاب "ایران سوسائٹی کی علمی و ادبی خدمات" ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔)

انڈو ایرانیکا کی ابتدا:

ذولسانی مجلّہ "انڈو ایرانیکا" ایران سوسائٹی کا علمی و ادبی، تحقیقی اور ثقافتی سہ ماہی مجلّہ ہے، جس نے اپنی اشاعت کے چند سالوں کے اندر ہی عالمی شہرت اختیار کر لی۔ اس کی اشاعت ایران سوسائٹی کے قیام (۱۹۴۴ء) کے دو سال کے بعد یعنی ۱۹۴۶ء میں شروع ہوئی۔ یہ وہ دور تھا، جب آزادی کی جد و جہد نہایت شد و مد کے ساتھ جاری تھی۔ ایسے افراتفری کے ماحول میں کسی سوسائٹی کا قیام اور کسی بڑے مجلّے کی اشاعت کا خیال ایک خواب سے کم نہ تھا۔ لیکن آفریں ہے ڈاکٹر محمد اسحٰق پر جنھوں نے اس غیر یقینی دور میں اپنے اس خواب کو حقیقت میں بدل دیا اور یکے بعد دیگرے سوسائٹی کے قیام اور اس کے مجلّے کی اشاعت کا انتظام کر دیا۔ سوسائٹی کے بنیادی مقاصد میں فارسی زبان و ادب کی ترقی اور ہند و ایران کے درمیان روابط شامل تھے۔ ان ہی مقاصد کی تکمیل سے وہ خاص روایت قائم ہوئی جس کی بنیاد مشرقی علوم سے گہری وابستگی، فارسی زبان و ادب سے واقفیت اور ہند و ایران کے درمیان روابط میں استحکام کی کوشش کا احساس جو سوسائٹی کی سرگرمیوں میں ہمیشہ روح کی طرح موجود رہا اور ہر تغیر کے باوجود اس کو قائم رکھنے میں ممد ہوتا رہا۔ ان ہی مشن کی تکمیل اور اس کی تشہیر کے لیے ڈاکٹر محمد اسحٰق نے مجلّہ "انڈو ایرانیکا" کو ایران سوسائٹی کا ترجمان بنایا۔ سوسائٹی کے قیام کے بعد ان کا یہ دوسرا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس نیک کام میں ان کے برادرِ بزرگ مرحوم عبدالحلیم اور ڈاکٹر بی سی لاء نے ان کی سرپرستی فرمائی۔ انھوں نے نہ صرف مالی تعاون دیا بلکہ جب تک بقید حیات رہے، اس کی سرپرستی فرماتے رہے۔

"انڈو ایرانیکا" کا پہلا شمارہ مدیرِ اعلیٰ ڈاکٹر بی سی لاء اور ناظم مدیر ڈاکٹر محمد اسحٰق کی ادارت میں

نہایت طمطراق کے ساتھ ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ مجلس ادارت میں دوسرے اراکین جیسے سنیتی کمار چیٹرجی، پروفیسر برواہ، مہدی حسین، مینورسکی، پروفیسر محمد نظام الدین، تاراپوروالا جیسی شخصیتیں شامل تھیں۔ پہلے شمارے سے ہی اس مجلّے نے اپنے اغراض ومقاصد کا تعین کرلیا تھا اور اس کے لیے ڈاکٹر محمد اسحٰق نے جو راہ متعین کی تھی، اس پر بڑے اعتماد سے آگے بڑھتا رہا۔ اپنے پہلے شمارے میں ادارہ نے اس کی اشاعت کا مقصد واضح کردیا تھا:

"The Indo-Iranica is to afford fair opportunities for the publication of the ripe fruits of scholarly labours and anti quirian research without any bais or prejudice."

ڈاکٹر محمد اسحٰق نے اپنے دور ادارت میں "انڈو ایرانیکا" کے معیار کو اتنا بلند کیا کہ اس کے قارئین دنیا کے مختلف ممالک میں پائے جانے لگے۔ اس کے شمارے جرمنی، انگلینڈ، فرانس، روس اور ایران کی بڑی بڑی لائبریریوں میں پہنچنے لگے۔ دانشوران اس میں اپنے مقالے کی اشاعت کو باعث فخر سمجھتے تھے۔ اس طرح یہ رسالہ دن بہ دن ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا۔ ڈاکٹر اسحٰق نے "انڈو ایرانیکا" کے کئی شاہکار نمبر بھی شائع کیے جس کی پذیرائی دنیا کے کونے کونے میں ہوئی۔ لیکن اچانک ۱۹۶۹ء میں فارسی زبان وادب کا یہ پاسبان اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس انجمن اور رسالے کی ساری ذمہ داری خواجہ محمد یوسف اور مجید صاحب کے کندھوں پر آ گئی، جسے ان دونوں نے بخوبی نبھایا۔ تقریباً بیس سالوں تک "انڈو ایرانیکا" کی ادارت کی ذمہ داری جسٹس محمد یوسف کے سر رہی۔ خواجہ صاحب کی بے پناہ مشغولیت کے پیش نظر مجلّے کی ادارت مجید صاحب کو سونپ دی گئی، جنھوں نے اپنے پیش رووں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، اپنے ادبی شعور کی پختگی اور روشن خیالی سے اس مجلّے کو شہرۂ آفاق بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

بیسویں صدی میں فارسی کے چند گراں قدر اور منفرد رسالوں میں ایران سوسائٹی کے اس مجلّے کا نام سرفہرست ہے۔ یوں تو ہندوپاک کے فارسی رسالوں میں "انڈو ایران"، "ایران لیگ"، "بیاض"، "دانش" اور "عبارت" جیسے رسالے شائع ہوئے لیکن ان میں زیادہ تر ایک مخصوص مدت تک اپنی روشنی بکھیر کر دنیائے ادب سے غائب ہوگئے لیکن ادب وتحقیق کی جو جوت ڈاکٹر محمد اسحٰق نے اس رسالے کے ذریعہ جلائی تھی، وہ آج بھی فروزاں اور تابناک ہے اور اپنی منزل کی جانب نہایت کامیابی کے ساتھ رواں دواں ہے۔

"انڈو ایرانیکا" کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ رہی کہ اس کی مجلس ادارت میں انگریزی، فارسی،

سنسکرت، عربی، لسانیات، عمرانیات اور تاریخ کے اعلیٰ پائے کے ادیب، شاعر، ماہر لسانیات اور مؤرخ شامل رہے ہیں۔ اس کے ۶۲ سالہ علمی وادبی سفر میں جو لوگ اس کے کارواں میں شریک رہے ہیں، انھوں نے اپنی علمیت اور قابلیت سے اس رسالے کو بین الاقوامی شہرت کا حامل بنا دیا ہے۔ اس طویل مدت کے مختلف وقفوں میں بلا امتیاز مذہب وملت، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور پارسی مدیران کی ادارت میں مجلّہ شائع ہوتا رہا ہے۔ مدیراعلیٰ میں ڈاکٹر بی سی لا، فریڈی کورنیس، کالی داس ناگ، ڈاکٹر این ویا، ڈاکٹر محمد اسحٰق، ڈاکٹر جگدیش نارائن اور ڈاکٹر پی سی چندر جیسی شخصیتیں شامل رہی ہیں۔ مجالس ادارت وقتاً فوقتاً جن درخشندہ ستاروں سے سجی رہی ہیں ان میں مینورسکی، پروفیسر محمد اقبال، تاراپوروالا، سید حسن برنی، پروفیسر ہادی حسن، آقا محیط طباطبائی، ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا، ڈاکٹر علی اصغر حکمت، ڈاکٹر تارا چند، ڈاکٹر نصر، ڈاکٹر کے جی سیدین، پروفیسر نظیر احمد، پروفیسر ریچرڈ این فرائی، مولانا صباح الدین عبدالرحمن، پروفیسر مجتبیٰ مینوی، پرویز ناتل خانلری، حبیب یغمائی، ڈاکٹر زرین کوب، پروفیسر سید حسن عسکری، ڈاکٹر کے اے نظامی، پروفیسر امیر حسن عابدی، ڈاکٹر نور الحسن، پروفیسر عبدالودود اظہر، ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی، پروفیسر براؤن، عطا کریم برق، جسٹس خواجہ محمد یوسف، جے ایس فرید، علامہ شبلی اور مولانا معصومی جیسی برگزیدہ ہستیاں شامل رہی ہیں۔

"انڈو ایرانیکا" کی مقبولیت، معیار اور کامیابی پر جب نظر جاتی ہے، تو اس کے بنیادی اسباب کا اندازہ ہوتا ہے۔ یعنی قابل ترین اور تجربہ کار لوگوں کی قلمی شمولیت اس کو جن حضرات کا قلمی تعاون حاصل رہا ہے، ان میں ڈاکٹر بی سی لا، امیر حسن عابدی، پروفیسر نظیر احمد، سید احمد اکبرآبادی، پروفیسر عبدالودود اظہر، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی، پروفیسر ہادی، پروفیسر ہادی حسن، ہمایوں کبیر، خلیق احمد نظامی، محمد قمر الدین، جگدیش نارائن سرکار، رابندر ناتھ ٹیگور، سید صباح الدین عبدالرحمن، ہیرالال چوپڑا، اسلوب احمد انصاری جیسے نامور دانشوران شامل رہے ہیں۔ یہ حضرات "انڈو ایرانیکا" کی مقبولیت کی ضمانت رہے ہیں۔

ایرانی دانشوروں میں جن ادیبوں اور شاعروں نے اس رسالے کے فارسی سیکشن کو اپنے گراں قدر مقالوں اور حمد ومنظومات سے مزین کیا ہے ان میں ذبیح اللہ صفا، سعید نفیسی، ایرج افشار، ملک الشعراء بہار، محمد کامکار پارسی، مقدم علوی، اصغر علی حکمت، عبدالعظیم قریب، محیط طباطبائی، حبیب یغمائی، ناتل خانلری اور علی محمد مؤذنی جیسے نابغۂ روزگار شخصیتیں شامل رہی ہیں۔

اس سے قبل کہ "انڈو ایرانیکا" کی علمی، ادبی، ثقافتی اور لسانی خدمات کا جائزہ لیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق چند ارباب علم وہنر کی آراء پیش کر دی جائیں۔ وزیر تعلیم ہند مولانا

ابوالکلام آزاد اور ان کے بعد ہمایوں کبیر اس رسالے کے اتنے مداح تھے کہ انھوں نے اپنے دورِ وزارت میں اس کی بھرپور مالی اعانت فرمائی۔ ان کے علاوہ وزیر اعظم جواہر لال نہرو اور سر تیج بہادر سپرو، مختلف ریاستوں کے گورنر حضرات نے بھی اس رسالے کی سرپرستی فرمائی۔

ایرانیوں کی نظر میں اس مجلّے کی اہمیت کا اندازہ ان کے خیالات سے لگایا جاسکتا ہے۔

شہنشاہ ایران کے زمانے میں ایران کلچر ہاؤس کے کاؤنسلر مجید طباطبائی جو ایران سوسائٹی کے اہم رکن بھی رہ چکے ہیں، فرماتے ہیں:

''مجلّہ انڈو ایرانیکا چند سال است در این راہ بذل خدمت کردہ است و در نتیجۂ مساعی خستگی ناپذیر استاد فاضل دکتر محمد اسحاق راہ حل را پیمودہ است ـــــ مسرت این است کہ انجمن در سال ہفتم دست یکار انتشار مجلّہ زبان حال خود شد۔ امیدی رود آن بہتر گواہ قدم ورسوخ در پیشرفت آمال منظور ہای اساسنامہ انجمن باشد۔''

شہنشاہ رضا پہلوی کے دفتر سے یہ خط آتا ہے:

''مجلّہ مذبور از شرف لحاظ انور شاہانہ گذشت۔ با امتثال فرمان مطاع مبارک مراتب امتنان وتقدیر خامہ مطاہرہ را از زحمتی کہ جناب عالی را و اولیای درتہیہ و انتشار این مجلّہ متحمل شدہ اید ابلاغ می نمایم۔''

ہندوستان میں مقیم تقریباً تمام سفرای ایران نے ''انڈو ایرانیکا'' کی ستائش کی ہے اور اس کی اہمیت کا مکمل کر اعتراف کیا ہے اور اسے دنیا کے بہترین مجلوں میں شمار کیا ہے۔ چند کے خیالات ملاحظہ ہوں:

سفیر کبیر ایران محمد گودرزی کے مطابق:

"The journal has, indeed, been instrumental to quite a great extent in acquinting its readers with the richers of Persian literature and promoting good will and undrstanding among the people of Iran and India and other countries."

دربار شاہی کے وزیر اسد اللہ عالم کے مطابق:

"The Indo-Iranica magazine which is known in all Iranologists circles of the world as one of the best of its kinds and which is welcomed everywhere with interest of zeal."

ہندوستان میں مقیم سفرای ایران مثلاً آقای معتمدی، نوری اسفندیاری، اصغر علی حکمت، فریدون آدمیات، امیر تیمور، وحید مازندرانی، غلام رضا بخش تاج، دہ کوردی، ابراہیم بہنام، شیخ عطار اور موجودہ سفیر کبیر ایران سیاوش زرگر یعقوبی نے ''انڈو ایرانیکا'' کی نہ صرف تعریف وتوصیف کی ہے بلکہ اس کے شماروں کی خریداری کرکے علم دوستی کا ثبوت بھی دیا ہے۔

اپنے ۶۲ سالہ ادبی وتحقیقی سفر میں ''انڈو ایرانیکا'' نے تقریباً ۵۹ شمارے شائع کیے جو مجلوں کی دنیا میں ایک ریکارڈ ہے۔ اس رسالے کے اب تک ۳۶ خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ ہر نمبر کی ایک الگ اہمیت ہے جن میں البیرونی نمبر، ابن سینا نمبر، پہلوی نمبر، ٹیگور نمبر، ملا صدرہ نمبر، جادو ناتھ سرکار نمبر، ڈاکٹر اسحٰق نمبر، سلور جوبلی نمبر، امیر خسرو نمبر، سعدی نمبر، حافظ نمبر، عمر خیام نمبر، اقبال نمبر، ولیم جونس نمبر، گولڈن جوبلی نمبر، مطلیم نمبر، انڈو ایران کلچر نمبر اور صوفی فتح علی ویسی نمبر خاص ہیں۔ ان کے علاوہ سوسائٹی سے منسلک چند ارباب علم وہنر کی ادبی وعلمی خدمات کے لیے یادگاری نمبر بھی شائع کیے گئے ہیں۔ ''انڈو ایرانیکا'' کے یہ نمبر پوری دنیا کے ادبی وعلمی حلقوں میں دھوم مچا رہے ہیں۔

''انڈو ایرانیکا'' نے اپنے ۵۹ شماروں میں فارسی کے ۲۹۲ مقالات شائع کیے ہیں جو فارسی زبان وادب، تاریخ، جغرافیہ، اداریے، رپورتاژ، سمینار اور جلسوں کی روداد پر محیط ہیں۔ اردو میں ۱۱ اور عربی میں ایک مقالہ اس رسالے کی زینت بڑھا رہے ہیں۔ انگریزی میں شائع شدہ مقالات کی تعداد ۸۹ تک پہنچتی ہے۔ ان میں مقالات کے علاوہ ایران سوسائٹی نیوز، صدارتی خطبے، مہمانوں کی تقاریر، یوم تاسیس کے پروگرام شامل ہیں۔ اس مجلّے کے صفحات ہندوستان میں مقیم ایرانی سفراء، کلچر ہاؤس کے کاؤنسلرز اور دانشوران کی سوانح حیات اور خدمات مع تصاویر شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس قسم کی معلومات خود کلچرل ہاؤس اور سفارت خانہ، ایران وہند میں بھی موجود نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے ایرانی سیاست دانوں کی نظر میں بھی اس مجلّے کی کافی وقعت ہے۔

''انڈو ایرانیکا'' کے مستقل فیچرز میں پرشین سین، آدر بلوز اور ایران سوسائٹی نیوز شامل رہے ہیں۔ ان عنوانات کے تحت ایرانی زبان وادب، ایران کے تاریخی اور سیاسی حالات اور سوسائٹی میں منعقد

ہونے والے تمام جلسوں کی خبریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان کے علاوہ ''انڈو ایرانیکا'' ایرانی دانشوروں، سیاست دانوں، صحافیوں، موسیقاروں، فلم کے ہدایت کاروں کی آمد پر ان کے استقبالیہ کی مکمل روداد کا آئینہ ہے۔

''انڈو ایرانیکا'' کا ایک اور عظیم کارنامہ مختلف موضوعات کی کتابوں پر تبصرہ ہے۔ شمارہ ۵۶ تک ۱۸۸ کتابوں پر غیر جانبدارانہ تبصرے شائع کر کے اس رسالے نے کتابوں پر تبصروں کی دنیا میں کمال کر دکھایا ہے۔ تبصرہ نگاروں میں جسٹس خواجہ محمد یوسف، ہیرالعل چوپڑہ، عبدالمجید، علامہ وحشت، مسعود حسن، عطا کریم برق اور طاہر رضوی جیسے بلند پایہ ادیبوں، محققوں اور دانشوروں کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ مبصروں نے مجلّہ کے معیار و وقار کا لحاظ رکھتے ہوئے جن کتابوں پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ ادب کی اس شاخ میں شاہکار تسلیم کیے جاتے ہیں۔

''انڈو ایرانیکا'' کی دوسری خصوصیت اس میں شائع شدہ ''وفیات'' (Obituaries) ہے۔ اب تک ایران سوسائٹی نے جن حضرات کے انتقال پُر ملال پر انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے تعزیتی جلسے کیے اور وفیات کے عنوان سے ان کے حیات و کارناموں کو تفصیل کے ساتھ اپنے جریدے ''انڈو ایرانیکا'' میں شائع کیا، ان کی تعداد ۵۰ سے زیادہ ہے۔ وفیات لکھنے کے ماہرین میں جسٹس خواجہ محمد یوسف، ایم اے۔ مجید اور ہیرالعل چوپڑہ نے اس فن کا حق ادا کر دیا ہے۔ اب تک جن مشہور شخصیتوں پر تعزیتی نوٹ لکھے گئے ہیں ان میں ڈاکٹر بی سی۔ رائے، فضل الرحمٰن باقی، مسعود حسن، محمد اسماعیل، عباس علی خاں، بیخود، طاہر رضوی، علامہ وحشت، سنیتی کمار چٹرجی، ہیرالعل چوپڑہ، روبی بی گھی، عبدالحلیم، محمد اسحٰق، کالی داس ناگ، جگدیش نارائن سرکار، صباح الدین عبدالرحمٰن، ہارون خان رشید، تاراپور والا وغیرہ شامل ہیں۔ سوسائٹی کے ایک اہم ستون اور سرپرست جسٹس خواجہ محمد یوسف کی وفات پر ایم اے۔ مجید نے دل کو چھو لینے والا جو تعزیتی نوٹ لکھا ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے۔

انڈو ایرانیکا کا فارسی سیکشن:

یہ مجلّہ ذولسانی ہے۔ یعنی انگریزی اور فارسی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اس کا فارسی سیکشن بھی کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ اس میں فارسی کے نامور اور ممتاز عالموں کے ایسے معرکۃ الآراء مقالے شائع ہوئے ہیں، جو دنیا کے بہت کم رسالوں میں پائے جاتے ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں ہندوایران کے روابط سے متعلق جو مقالے شائع ہوئے ہیں، وہ مستند ماخذ اور حوالوں کا کام دیتے ہیں۔ ڈاکٹر عطا کریم برق کے لکھے ہوئے اداریے وہ آئینہ ہیں جن میں ایران سوسائٹی کے تمام کارناموں کی جھلک ملتی ہے۔ سوسائٹی کے تحت ہونے والے سیمناروں، تمام جشن ملی و سمپوزیم کے علاوہ جشن فرخندہ

شاہنشاہی ایران، جشن ہزارہ و مریوط بہ ولادت ابن سینا، جشن فرخندہ دو ہزار پانصد مین سال بنیاد گذاری شاہنشاہی ایران کی روداد جس تفصیل سے پیش کی گئی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ عطا کریم برق کے قلم سے نکلے ہوئے ۲۵ اداریے ان کی ادارتی صلاحیت، زبان و بیان اور طرز تحریر ان کی صلاحیتوں کے غماز ہیں۔ پاکستان سے شائع ہونے والے رسالے دانش ہو یا انجمن استادان فارسی کا بیاض، دہلی کا انڈو ایران ہو یا ممبئی کا ایران لیگ کوئی رسالہ بھی ''انڈو ایرانیکا'' کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔

المختصر ''انڈو ایرانیکا'' نے ہندوستان اور ایران کے درمیان تہذیبی اور ثقافتی تعلقات میں استحکام پیدا کرنے، فارسی زبان و ادب اور تہذیب کو فروغ دینے اور ہندوستان میں سیکولرزم کو بحال رکھنے میں جو خدمات انجام دی ہیں اور جو کام کر دکھایا ہے، وہ سیاست دانوں نے بھی نہیں کیا۔ ایران سے یا دنیا کے کسی بھی گوشے سے آنے والا وہ ہر شخص جس کو فارسی سے ذرا بھی لگاؤ ہے، ایک بار ایران سوسائٹی کی زیارت کرنے کی خواہش ضرور رکھتا ہے۔ اس طرح ''انڈو ایرانیکا'' کی مقبولیت اور شہرت کا یہی سب سے بڑا راز ہے۔

☆☆☆

تحریر: محمد شہری برآبادی
ترجمہ: سید حسن عباس*

ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد فارسی شاعری میں رونما ہونے والی تبدیلیاں

ادب کا سماج سے دو جانبہ رشتہ ہے۔ ایک طرف ادب سماج یا معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے تو دوسری طرف وہ خود بھی اس سے متاثر ہوتا ہے لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ سیاسی اور سماجی حادثات و واقعات کا ادب سے ناگزیر ربط ہوتا ہے۔ ایران کی ادبی تاریخ کی ابتدا سے ہی سیاسی اور سماجی واقعات و حادثات اور تبدیلیاں مختلف ادبی طرز و ادا کے وجود میں آنے کا باعث بنی ہیں۔ اسی وجہ سے اور اکثر صاحبان نظر کے خیال میں: وہ ادب جس کا معاشرے سے بنیادی رابطہ نہ ہو، نہ ہی وہ اپنے معاشرے کا مکمل آئینہ دار ہو، وہ ادب نہ تو معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے اور نہ خود معاشرے کے اثرات قبول کرتا ہے۔ ساتھ ہی نہ تو وہ بنیادی اور دیرپا ہوتا ہے اور نہ ہی اس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلامی انقلاب کا شمار، موجودہ صدی میں ایران میں رونما ہونے والے سیاسی واقعات میں سب سے اہم ترین واقعے میں ہوتا ہے۔ خدا اور دین اسلامی پر ملت ایران کو مکمل اور بھرپور ایمان کی وجہ سے جو رہبر اور مرد مومن کے احکام کی پیروی کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ ایسا انقلاب رونما ہوا جس نے ڈھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کا تختہ الٹ دیا اور ملت ایران بلکہ دنیا کے لیے ایک ایسی نئی راہ کھولی جس کے ذریعے خود کو ان طاغوتی یا شیطانی طاقتوں کے چنگل سے رہائی دلائی جا سکتی ہے جو عہد حاضر کے انسانوں کو اب بھی اپنے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہے۔ اس انقلاب کی وجہ سے ملت ایران نے اپنی صدیوں پرانی فکری اور سیاسی قید سے آزادی حاصل کی۔ اپنا سیاسی تشخص دوبارہ بحال کیا، اسلام کے تناور درخت کے چودہ سو سالہ اقدار کو حیات نو ملی، اور اسلامی معاشرے کے تمام پہلوؤں یعنی سیاسی، ادبی، فنی، سماجی اور ثقافتی اقدار کو نئی زندگی حاصل ہوئی۔ اسلامی انقلاب کی برکت سے اب بہت سے

* صدر شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

اور فراموش شدہ اسلامی اقدار کا احیا ہو چکا ہے اور در حقیقت معاشرے کے نیم مردہ قالب میں ایک تازہ روح پھونکی گئی جس کے نتیجے میں اس عہد کے شعر و ادب نے بھی ایک نئی زندگی پائی۔ اگرچہ اسلامی انقلاب نے ابھی آٹھ بہاریں ہی دیکھی ہیں اور اس مختصر زمانے کے پیش نظر کوئی حتمی رائے تو قائم نہیں کی جا سکتی ہے لیکن جہاں تک ان آٹھ برسوں کے دوران معاشرے میں جو اہم واقعات رونما ہوئے ہیں وہ سب کے سب جداگانہ اور عمیق مطالعے کے متقاضی ہیں۔ ان کے نتیجے میں مختلف میدان میں ردعمل اور تبدیلیاں دیکھنے میں آئی ہیں مثلاً جنگ، شہادت طلبی، دشمنان دین کے مقابلے میں غازیان اسلام کی رزم آرائیاں وغیرہ وایسے موضوعات ہیں جن میں سے ہر ایک، اسلامی انقلاب کے بعد کی شاعری میں جلوہ گر ہوئے اور نئے مضامین کے حامل نئے اشعار کی تخلیق کا باعث بنے۔ بہر حال یہ سماجی تبدیلیاں اب بھی فارسی شاعری میں دیکھی جا سکتی ہیں جنھوں نے اسے ایک خاص رنگ اور انداز و اسلوب عطا کیا ہے۔ سب سے اہم یہ ہے کہ آج کے شاعر کی شاعری، نفس امارہ کا بیان نہیں ہے جو وہ ہم آغوشوں کے مابین زندگی کو سگریٹ جلانے کے مترادف سمجھتا ہو بلکہ شاعر انقلاب کی شاعری تجسیم رحمانی اور صور ربانی ہے۔ آج کا شاعر ایسے بہادروں کا ذکر کرتا ہے جو خوف و خواب کے دشمن ہیں۔ یہ ایسے رزم آفریں لوگ ہیں جو ایک انقلابی قوم کے آتش فشاں کا پگھلا ہوا لاوا ہیں اور جو قید و بند سے آزاد ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اگرچہ انقلاب اسلامی کے بعد کی شاعری مختصر ہے لیکن ابھی سے یہ قابل قدر شاعری، نقد و تجزیے کی مستحق ہے۔ قارئین کو اس شاعری کی اعلا و ارفع قدروں کو سمجھنا چاہیے اور جاننا چاہیے کہ مکتب اسلام میں ہر چیز بشمول شاعری، انسانی عظمتوں اور رفعتوں تک رسائی کا ایک وسیلہ ہے۔

شاعری کی گونا گوں عناصر سے تشکیل پاتی ہے۔ جنھیں دو حصوں صوری اور معنوی میں تقسیم کیا جاتا ہے اور دونوں ہی اپنی جگہ پر کلام کو اہمیت بخشتے ہیں اور اس کی تاثیر میں اضافہ کرتے ہیں نیز ہر ایک دوسرے کو مکمل کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر، یہ عناصر ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ جس طرح قرآن کریم کا تابناک جلوہ، معانی اور مفاہیم عالی کے اعتبار سے ایک مسلم موضوع ہے لیکن عرب کے تمام کلام میں قرآن کی سب سے نمایاں صفت، ترکیب سخن کی فضیلت ہے کیونکہ قرآنی الفاظ کو مفردات کے اعتبار سے عرب اور ان لوگوں کے لیے جو بعد میں آئے ہیں استعمال کیا گیا ہے[1]۔ لیکن جب کہ اشارہ کیا گیا کہ عرب کے تمام کلام پر کلام باری کی فضیلت کا سبب، کلام کی بافت میں الفاظ کی اعلا ترکیب و ترتیب ہے[2]۔

اس بات کے پیش نظر کہ لفظ و معنی ایک دوسرے سے جدا نہیں اور الفاظ سخن گو کے لیے وسیلۂ اظہار ہیں۔ اس لیے نقد سخن کی بحث، صوری اور معنوی دو مباحث میں تقسیم ہوتی ہے لہٰذا فارسی شاعری میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا اسلامی انقلاب کی شاعری کے پیش نظر ان ہی دو پہلوؤں سے جائزہ لینا چاہیے اگر

ایسا نہیں کیا گیا تو ہر قسم کا جائزہ جس میں ان دو پہلوؤں پر کافی توجہ نہ دی گئی ہو، حصول مقصد میں معاون نہیں ہو سکے گا۔ اس مقالے میں ممکنہ حد تک اسلامی انقلاب کے بعد کی شاعری میں رونما ہونے والی صوری تبدیلیوں کا جائزہ لیا جا رہا ہے اور معنوی تبدیلیوں کا جائزہ دوسرے مقالے میں لیا جائے گا ان شاء اللہ۔

فارسی شاعری، اسلامی انقلاب کے بعد صوری اعتبار سے تین میدانوں میں یعنی وزن، قافیہ اور موسیقی کے لحاظ سے الفاظ میں حیرت انگیز تبدیلیوں کی شاہد ہے جو قبل از انقلاب کی شاعری سے بالکل مختلف ہے۔ اس مقالے میں تینوں موضوعات پر مختصراً روشنی ڈالی جا رہی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اسلامی انقلاب کے بعد کے شعرا کی شاعری کا دقیق مطالعہ اور تحلیل و تجزیہ کیا گیا ہے لیکن سب کی مثالیں دینا اس مختصر مقالے میں ممکن نہیں تھا اس لیے تمام شعرا کے اشعار اس مقالے میں پیش نہیں کیے گئے ہیں۔

۱- اسلامی انقلاب کے بعد کی شاعری میں اوزان میں تبدیلی:

آرٹ اور اس کی تقلید میں شاعری کو عموماً اسلامی انقلاب کے قبل منحنی مجر مغرب زدہ لوگوں نے ایک ایسا فاسد کھلونا بنا دیا تھا جس پر شعور کے ساتھ کی گئی شاعری کے سوا ہر چیز کا اطلاق ہوتا تھا۔ اصیل اور حقیقی شاعری کے نام پر اکثر نامفہوم الفاظ و جملوں کو قارئین کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ وزن و قافیہ اور ایسے دیگر شعری عناصر کو جو قاری پر شعر کے اثرات مرتب کرنے میں حقیقی کردار کے حامل ہوتے ہیں انھیں مختلف بے ہودہ بہانوں سے شاعری سے نکال باہر کر دیا گیا تھا جو بیان و اظہار خیال میں مانع ہوتے تھے۔ در حقیقت شعرا نے اپنے نمایاں صنف کو قوانین شاعری سے جوڑ کر اور ان قواعد کی جکڑبندیوں کا بہانہ بنا کر شاعری کو ہر قسم کے قواعد و ضوابط سے آزاد کر دیا تھا۔ جسے وہ اپنی اصطلاح میں 'شعر آزاد' یا 'شعر سپید' کہتے تھے۔ مغرب زدہ فاسد اور ظالم شاہوں کے شکنجوں سے ملت ایران کی رہائی کے بعد، اس کا ایک مقصد اپنے آپ کی حقیقی واپسی تھی۔ عہد انقلاب کے فنکار، اپنے ماضی کی اصیل اور اعلا اخلاقی اور تہذیبی قدروں کو زندہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ ثقافت جس کی جڑیں قرآن اور اسلام میں پیوست ہیں۔ انسان کو وہ بلندی عطا کرنا چاہتی ہے جس کی زندگی کی بازگشت، اللہ کی جانب ہو۔

اسلامی انقلاب کے بعد کی شاعری میں حیرت انگیز تبدیلی، وزن کی طرف صحیح بازگشت ہے۔ انقلاب کے بعد کے شاعر نے اپنے کلام کو ایک مناسب و موزوں لباس پہنایا ہے۔ اور اسی لباس میں اسے اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ اب انقلاب اسلامی کے بعد کی شاعری میں مشکل ہی سے کوئی بے وزن شعر ملے گا حتی نیمائی اشعار میں — کوتاہ و بلند مصرعوں کے ساتھ۔ محسوس ہونے لگی آئی ہے۔ بعض اوزان کو جو فارسی شاعری کے نادر اوزان میں شمار کیے جاتے ہیں، انقلاب کے شعرا نے نئے طریقے

سے استعمال کیا اور رزمیہ اشعار بھی ایک خاص وزن میں کہے گئے ہیں۔ فارسی شاعری کی بعض ہیئتوں کو نئی زندگی ملی ہے۔ یہاں ہر ایک کا مختصراً ذکر کر رہے ہیں۔

(الف) نادر اوزان پر توجہ:

بعد از اسلام فارسی شاعری کی گیارہ سو سالہ تاریخ میں شعرا نے بعض اوزان میں کمی و بیشی کی ہے جس پر ابھی بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اسلامی انقلاب کے بعد کے ترانوں میں بہت سے اوزان جو فارسی عروض میں نادر اوزان شمار ہوتے ہیں، نئے سرے سے مخصوص طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر محمود شاہرخی نے اس قصیدے میں جو اسلامی جمہوریہ کے قیام کے قریب آنے اور شاہنشاہی نظام کے سرنگوں ہونے پر کہا تھا، ان نادر اوزان میں سے ایک کو استادانہ طریقے پر استعمال کیا اور اپنا قصیدہ مثال کے وزن: فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فع، پر کہا جس کا مطلع یہ ہے:

یاد آرم چو از آن روز غم افزا من
از تف آہ شوم شعلہ سراپا من

مہرداد اوستا نے بھی ایک طویل اور ماہرانہ قصیدہ منوچہری کے قصیدے اور ملک الشعرا بہار کے قصیدے، بعد جنگ، کے طرز پر حماسۂ شہدا، کے نام سے کہا۔ قصیدے کا موضوع شہید کے درجے کی عظمت ہے۔ جس کا وزن، مفاعلن مفاعلن مفاعلن ہے۔ اس قصیدے کے دو اشعار یہ ہیں:

فری شہید و عز و اعتلای او   کرامت و کمال و کبریای او
ولایت و سرود جانفزای او   شہادت و حماسۂ ولای او

کتاب سوار ان آفتاب کے شاعر نے بھی قصیدہ مانند ایک رزمیہ (نظم) مفتعلن فاعلات مفتعلن فع کے وزن پر کہی جس کے ابتدائی اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

تیغ توانائی از نیام بر آرید   چشمۂ خورشید از ظلام بر آرید
باب توسل بہ اعتصام گشودند   دست توسل بہ احترام بر آرید

عصر حاضر میں علامہ طباطبائی کی شخصیت اسلامی معارف کی ایک عظیم شخصیت شمار کی جاتی ہے۔ ایسی عظیم شخصیت روز روز پیدا نہیں ہوتی بلکہ فلک پیر کو برسوں صبر سے کام لینا پڑے گا تب کہیں جا کر ایسی دوسری شخصیت پیدا ہوگی۔ علامہ طباطبائی کی وفات ایرانی معاشرے اور اسلامی ثقافت کا ایک عظیم دردناک سانحہ تھی۔ دو معاصر شعرا نے علامہ کی وفات پر دردناک قصیدے اچھوتے وزن اور ناصر خسرو کی تقلید میں کہے ہیں۔ وزن مفعول فاعلات مفاعیل فع ہے۔ مورد نظر شعرا میں ایک حمید سبزواری ہیں جن کے قصیدے کا مطلع ہے:

بگذار تا دو دیدهٔ دُر افشان کنم
دمساز نال نالہ فراوان کنم

دوسرے شاعر علی معلم ہیں جن کا قصیدہ اسی وزن میں ہے البتہ قافیہ مختلف ہے:

شاید کہ حال و کار دگر گون کنم
برق آن کمی ترست ہم ایدون کنم

ایک اور نادر وزن جسے اسلامی انقلاب کے بعد کے بہت سے شعرا نے اپنایا ہے، وہ بحرِ رجز (مستفعلن مستفعلن مستفعلاتن) کے مزاحفات کا وزن ہے جو رزمیہ اور تال والا ہے۔ بہت سے شعرا نے اس وزن کے مختلف قالب میں خوبصورت اور ہیجان انگیز کلام کہے ہیں جن میں رزم آوروں اور اسلام پر کفر کے حملہ آوروں کو اس طرح متعارف کرایا ہے۔

این طرفہ مردانی کہ خصم خوف و خوابند
بر حلق ظلمت خنجر تیز شہابند

مرتضی نور بخش نے بھی اسی وزن میں ایک خوبصورت غزل کہی ہے جس کا مطلع یہ ہے:

صبح است و بربام ظفر پر جماران   در دست دارد پرچم امیدواران

(ب) نئے اوزان میں اسلامی انقلاب کی رزمیہ شاعری:

فارسی ادب میں رزمیہ اشعار کی کمی نہیں ہے جن میں شاہنامہ فردوسی، گشتاسپنامہ دقیقی اور گرشاسپنامہ اسدی طوسی مشہور ترین آثار ہیں۔ یہ رزمیہ مثنویاں اور اسی طرح ان جیسے دیگر آثار جو فارسی ادب میں پائے جاتے ہیں، سب کے سب بحرِ متقارب اور فعولن فعولن فعولن فعول (فعل) کے وزن میں ہیں۔ ایران میں رزم نگاری کے آغاز سے موجودہ دور تک تقریباً تمام رزم نگاروں نے اس وزن کے علاوہ کسی اور وزن کو رزم نگاری کے لیے مناسب نہیں سمجھا لیکن اسلامی انقلاب نے جہاں ماضی کی تمام قدروں اور معیاروں کو دگرگوں کیا وہیں اپنے انقلابی اور رزمیہ موضوعات کی پیش کش کے لیے ایک نئے وزن کا انتخاب کیا جو دلکش اور تال کے آہنگ کا حامل ہونے کے ساتھ انقلابی ترانوں کے لیے ہر جہت سے موزوں اور مناسب ہے۔ قابلِ ذکر ہے کہ اسلامی انقلاب نے شاہنشاہی نظام کے خلاف اپنی تحریک کے آغاز سے ہی ایرانی عوام میں انقلابی جذبے کو زندہ رکھا۔ اسلامی انقلاب کے مجاہدین تصوراتی اور خیالی مجاہدین نہیں بلکہ ایسے جری اور بہادر لوگ ہیں جو دشمن کی صفوں پر طوفان کی مانند حملہ آور ہوتے اور انھیں درہم برہم کر کے رکھ دیتے ہیں۔

عہدِ انقلاب اسلامی کے شعرا نے اپنے رزمیہ موضوعات کی ترجمانی کے لیے جو وزن منتخب کیا وہ

مستفعلن مستفعلن مستفعلاتن (بحرِ رجز مسدس مُرفّل) ہے۔ یہ وزن اس سے پہلے تک نادر عروضی اوزان میں شمار کیا جاتا تھا اور زیادہ تر قصیدہ گوئی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن اسلامی انقلاب کے شعرا نے اس وزن کو مثنوی کے قالب کے لیے مناسب سمجھا اور اپنے باطنی افکار و احساسات کو اسی وزن میں رزمیہ قالب میں پیش کیا ہے۔ یہ بھی عرض کر دیں کہ اس وزن میں غزلیں اور قصیدے بھی بہت کہے گئے ہیں جن میں سے اکثر کا لب و لہجہ بھی رزمیہ ہی ہے۔ مجموعی طور پر انقلاب کے بعد کا کلام زیادہ تر اسی وزن میں ملتا ہے۔ بعض رزمیہ مثنویوں سے مختصر نمونے یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔

'این فصل را با من بخوان' علی معلم کی ایک رزمیہ مثنوی ہے جس میں اسلامی انقلاب کی تحریک کی صحیح روایت بیان ہوئی ہے۔ اس مثنوی میں ایرانیوں کے ثقافتی تشخص کو مسخ کرنے کی شاہنشاہی نظام کی کوششوں کو برملا کیا گیا ہے۔ تین شعر بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

ہنگامہ میعاد خونین دوبارہ نیست   باور کن ایک رجعت سرخ ستارہ نیست
بوم سیاہ شب سرا را پر بریدند   شب را بہ تیغ فجر خونین سر بریدند
در جان عالم جوشش خون حسینی است   اینک قیام قائم مہدی خمینی است

سپیدہ کاشانی نے بھی طویل، دلکش اور شور انگیز مثنوی کہی ہے جس کا موضوع مجاہدین اسلام کی جاں بازیاں، دلیریاں اور صف شکنیاں ہیں۔ اس کے یہ اشعار دیکھیے:

سنگر نشین، ای پاک، ای گرد دلاور!   ای پاسدار میہن ای خورشید خاور!
آن جا ملایک با تو ہر دم ہم نشیند   قدسیان نور خدا را در تو بینند
ہمت کہ ہم رزمان بہار ما نمیرد   خورشید مان در اوج، خاموشی نگیرد

اس مثنوی کے بعض اشعار تو غیر معمولی رزمیہ لب و لہجے کے حامل ہیں۔

با رشتہ تقوا زنان گرد میہن
باشند روز و شب عتاب دار دشمن

پرویز بیگی حبیب آبادی نے بھی ایک مثنوی کہی ہے جس کا عنوان ہے: 'شہر میعاد گل خون' اس مثنوی میں شاعر نے خرم شہر کی خونین بہار کی منظر کشی کی ہے۔ اسی کے ساتھ اس شہر کے عوام کی استقامت و پائیداری کا بھی بیان کیا گیا ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے:

آن جا بہاران را خزان در پای دارد   تا رخش اندر بستر خون جای دارد
آن جا شہیدان شہر خون را می سرایند   چون رہروان عشق سر بر عرش سایند

شاعر، اس مثنوی کے ایک شعر میں جو بہت شور انگیز اور ہیجان انگیز ہے، کہتا ہے:

دیدم کہ یاران خاک را با خون خریدند   رفتند و بودن را ز رفتن آفریدند

اس سلسلۂ کلام کو اس سے زیادہ بھی طول دیا جا سکتا ہے کیونکہ اکثر انقلابی شعرا نے اس وزن میں مثنویاں اور قصائد کہے ہیں لیکن جہاں تک اس مقالے کی بات ہے تو اختصار کا لحاظ رکھا گیا ہے اس لیے اتنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(ج) رباعی پر توجہ:

رباعی، فارسی شاعری کی ایک صنف ہے جو مختصر موضوعات کے لیے مناسب ہے۔ اسلامی انقلاب کے بعد کے شعرا نے، بہت سے مختصر مضامین اور اپنی یادداشتوں کو اس صنف میں پیش کیا ہے۔ قیصر امین پور نے اپنی ایک رباعی میں جنگ زدہ شہر دیزفول کی تصویر کشی اس طرح کی ہے:

زین شہر، ہمیشہ بوی خون می آید   زین کوی، ہمیشہ جوی خون می آید
ہر چند ہنوز خون پیشین تازہ ست   بس خون کہ پیوستہ ی خون می آید

حسن حسینی کی ذیل کی رباعی میں ایک ایسے مجاہد کی حالت بیان کی گئی ہے جو شوق شہادت رکھتا ہے:

صحرای خطر گام مرا می خواند   صہبای سحر بام مرا می خواند
وقت خوش رفتن است، ہان گوش کنید!   از عرش کسی نام مرا می خواند

بہت سے دوسرے شعرا نے بھی شاہی حکومت کے خاتمے، بہار انقلاب اسلامی کے آنے، جنگ، شہادت اور دسیوں دوسرے موضوعات پر نہایت دلکش رباعیاں کہی ہیں جن میں ان کی مہارت نمایاں ہے ساتھ ہی ان کا لب ولہجہ بھی رزمیہ ہے۔

(د) طویل وزن میں مثنوی گوئی کا رجحان:

طویل مضامین اور داستانوں وغیرہ کے بیان کے لیے مثنوی کا فارم مناسب فارم ہے۔ مثنویوں میں قصیدہ اور غزل کے مقابلے میں حروف ہجا کم ہوتے ہیں۔ فارسی زبان کی مشہور ترین مثنویاں ہر وزن اور بحر میں کہی گئی ہیں۔ عام طور پر ہر مصرعے میں گیارہ سے زیادہ حروف ہجا نہیں ملتے۔ شاہنامۂ فردوسی خمسۂ نظامی، حدیقۂ سنائی، مثنوی مولوی، بوستان سعدی، ہفت اورنگ جامی اور دیگر مثنویوں میں ہجا کے نقطۂ نظر سے ہر مصرعے میں زیادہ سے زیادہ گیارہ ہجا پائے جاتے ہیں۔ لیکن اسلامی انقلاب کے بعد بہت سے شاعروں نے ایسے اوزان مثنوی گوئی کے لیے منتخب کیے جن میں ہجا کے اعتبار سے قصیدہ اور غزل یا قطعہ میں پائے جانے والے حروف ہجا کے مطابق ہیں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس سلسلے میں ظرف ومظروف میں کوئی ہم آہنگی نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر یہ اوزان، مثنوی کے قالب میں مورد نظر موضوعات کے لیے

مناسب نہیں ہیں ہر چند کہ شعرا نے رزمیہ مثنویاں کہنے کے لیے انھیں منتخب کیا لیکن دیگر موارد میں مثنوی گوئی کے لیے اس قسم کے اوزان کا استعمال بے سلیقگی اور کج ذوقی کی دلیل ہے۔ ایک ہم عصر قلم کار کے بقول: ایسے لوگوں کا عمل ٹھیک ایسا ہی ہے کہ ایک باریک اور تنگ گلی سے ٹرک کا لے جانا جو مناسب نہیں ہے۔ اگرچہ انقلاب کے بعد کے اکثر شعرا نے ایسے اشعار کہے ہیں لیکن بطور نمونہ صرف چند شعر پیش کیے جاتے ہیں:

فسانہ گشت و کہن یاد رستم دستان   از آن حماسہ کہ بسرود خلق خوزستان
حکیم توس سزد سر ز خاک بردارد   خدایناہمہ بہ اروند رود بسپارد
بشوید از ہمہ دیوان حدیث شاہان را   طراز نامہ کند نام داد خواہان را
کہ رزم ساحل اروند نقش جیحون شست   سیاہ نامۂ تاریخ را بہ خون شست

اگرچہ اس قسم کی مثنویوں کا سلسلہ قدیم سے ہے اور بظاہر مولانا جلال الدین محمد وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ہمارے عہد تک کے شعرا کے لیے مورد پسند یا مورد توجہ نہیں رہا ہے اگرچہ یہ مثنویاں مضامین کے لحاظ سے عالی ہیں تاہم اس قسم کی مثنویاں کہنے سے پرہیز کرنا ہی بہتر ہے۔

(ھ) وزن و معنی میں ہم آہنگی:

ادبیات فارسی میں وزن و معنی میں ہم آہنگی زمانۂ قدیم سے شعرا اور شعر شناسوں کے مد نظر رہی ہے۔ شاعر اپنے شعر کی تاثیر قاری پر زیادہ کرنے کی خاطر کوشش کرتا ہے کہ ایسے وزن اور قالب کا انتخاب کرے جو اس کے موضوع سے مناسبت رکھتے ہوں۔ مولانا جلال الدین رومی بلخی کے احوال میں ملتا ہے کہ حسام الدین چلپی نے مولانا سے درخواست کی کہ حدیقۂ سنائی کے طرز پر کوئی کتاب تالیف کریں لیکن اس کا وزن عطار کی منطق الطیر کا ہو تا کہ دنیا میں ایک یادگار باقی رہے۔ لہذا مولانا نے حسام الدین کی فرمائش قبول کر کے گراں قدر کتاب مثنوی معنوی لکھی۔ اس سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ اسلاف نے بھی وزن و معنی میں ہم آہنگی کو مد نظر رکھا تھا اور حدیقۃ الحقیقہ کے وزن (فاعلاتن مفاعلن فعلن) کو طویل عرفانی مطالب کے بیان کے لیے مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

اسلامی انقلاب کے بعد کے کلام میں بھی بیشتر وزن و معنی کے درمیان مناسب ہم آہنگی دیکھنے میں آتی ہے جس سے قاری پر کلام کی تاثیر میں شدت پیدا ہوتی ہے اور اسے اپنے زیر اثر لے لیتا ہے۔ ذیل کے دو شعر جو چہار پارہ کے قالب میں ہیں، میرداداوستا کی تخلیق ہے، اس کا موضوع دشمن سے جنگ و مقابلہ ہے، اس کا وزن، کلام کی مجموعی فضا سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

آفتابا تاب اندرین دشت   از افق تا بہ سر منزل من
چون شقایق تگر بر دمیدہ   خون جوشان دل من

ان اشعار میں بعثی دشمن کے مظالم اور جرائم بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد انقلاب کے ساتھ کی جانے والی خیانت کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر مجاہدین اسلام کی ایثار و فداکاری کے مقابلے میں دشمنان اسلام کی سازشوں کا پردہ فاش کیا گیا ہے:

زوزهٔ لاشخوران بعثی در فرا راه بُر دمان چیست
باش تا نعره از دل بر آرد تا تپلی از این سگ، اثر نیست

اس پورے کلام میں جس موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے اس میں موضوع اور وزن میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

ایران میں اسلامی انقلاب کے دشمنوں کے ذریعے انقلاب اسلامی کے بعد جو گوناگوں حادثے رونما کیے گئے ان میں ۶۰ ۱۳ ھ ش کے ساتھ تیر ماہ کا حادثہ خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ اس غم انگیز شام کو ملت ایران نے بہشتی اور ان کے چند ساتھیوں کو جو سب کے سب عوام کے خدمت گار اور قائد کے خلوص پیرو کار تھے، گنوا دیا۔ ذیل کا چہار پارہ جس کے دو بند نقل کیے جاتے ہیں، ایک ایسا گراں قدر فن پارہ ہے جسے نصر اللہ مردانی نے ان حزن میں خوابیدہ شہیدوں کے سوگ میں کہا ہے۔ اس کا مختصر، نرم اور رواں وزن (مفعول مفاعلن فعولن) ہر مصرع میں چار مختصر ہجا کی موجودگی نے مضمون کو موثر بنانے میں معاون ہوا ہے۔ سبک پردازی کو قاری سے ہمکنار کر کے شعر کی تاثیر میں اضافے کا سبب بنا ہے:

هفتاد و دو شاهد بهشتی از کوچهٔ خاک که پر رفتند
با نغمهٔ آسمانی عشق در هفتم ماه تیر رفتند

هفتاد و دو کوکب فروزان تابنده در آسمان اسلام
رفتند غبار تن بشویند در چشمهٔ تابناک الهام

وزن کی بحث کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ یہ بحث ان لوگوں کے لیے سود مند اور راہ گشا ثابت ہوگی جو ایران اسلامی میں فارسی شاعری میں رونما ہونے والے تحولات کا مختلف طریقوں سے جائزہ لیتے ہیں۔

۲۔ انقلاب اسلامی کے بعد کی شاعری میں قافیہ کا کردار:

نیما یوشیج کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ 'شعر بی قافیه آدم بی استخوان است' (بغیر قافیہ کا شعر، بغیر ہڈی کے انسان کی مانند ہے) بے شک قافیہ، وحدت احساس اور فنکار کی حالت کے تحفظ میں بہت موثر ہوتا ہے۔ جب قافیہ آتا ہے تو سامع یا قاری کو وہ مناسبت یا قرینہ یاد آ جاتا ہے جس سے کسی مطلب یا بیان

کی مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ اسی بنا پر قافیہ، ہر شعر کا نقطہ عروج و زیبائش ہے۔ اگر اچھی طرح استعمال کیا گیا ہو تو شعر کی فصاحت و بلاغت میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ کامیاب شاعر، شعر میں بہترین الفاظ کا استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس سے قافیہ بناتا ہے۔ البتہ لفظ، قافیہ، سے مراد یہاں اس کا عام معنی ہے جس میں ردیف اور درمیانی قوافی بھی شامل ہیں۔

اسلامی انقلاب کے بعد، شعرا نے قافیے کے اس اہم کردار پر خاص توجہ صرف کی ہے اور اس سے معنی کے بہتر تفہیم میں مدد لی ہے۔ مثلاً محمد علی مردانی کے ذیل کے شعر میں معروف ترین لفظ کو ردیف کی صورت میں کس خوبصورتی سے کھپایا گیا ہے۔

قامت قیامتان دیار قیام خون افراشتند پرچم حق را به نام خون
پروردگان مکتب آزادی و شرف کردند تیره روز عدو را به شام خون

البتہ اس شعر میں قیام، نام، شام بھی مخصوص تشخص کے حامل ہیں جنھوں نے شعر کی تاثیر میں اضافہ کر دیا ہے۔ وہ آگے کہتے ہیں

هر قطره دگر این قهستان مست رقصد در دهانهٔ آتش به کام خون

ذیل کے قصیدے میں تہمینہ زخت وامیدی نے بھی لفظ 'صبح' کا استعمال ردیف کی صورت میں کیا ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ اس قصیدے میں 'صبح' اسلامی انقلاب کی صبح کے طلوع ہونے کی طرف ایک اشارہ ہے اسی لیے شعر کی تاثیر میں اضافے کا باعث ہے:

شکفته بر لب مشتاق من ترانهٔ صبح
که مرغ جان به سلام به آشیانهٔ صبح

شہریار نے بھی ذیل کے قصیدے میں بہترین اور موثر ترین الفاظ قافیہ کی صورت میں استعمال کیے ہیں۔

سلام ای جنگجویان دلاور نهنگانی به خاک و خون شناور

معنی کی توسیع میں فن قافیہ کا استعمال انھی چند مواقع پر منحصر نہیں بلکہ انقلاب کے بعد کی شاعری میں مصرعوں کے ابتدا اور درمیان میں قافیہ لانے کا رجحان بڑھا ہے۔ مثال کے طور پر حمید سبزواری کے ذیل کے شعر میں نیلی و سیلی قافیہ آغازین ہے اور اس کے سبب شعر میں ایک خاص حسن پیدا ہو گیا ہے اور ہیجان بھی۔

نیلی کنم ز سیلی رخساره را وانگه به موی چاک گریبان کنم

اسی طرح مہرداد اوستا کے ذیل کے شعر میں دو لفظ 'نقا و یا' کو ایک مصرعہ میں قافیہ بنایا گیا ہے جس

سے شعر شور انگیز بن گیا ہے خاص کر اس لیے کہ لفظ لقا' شہید اور حق سے ملنے کے ساتھ نہایت مناسبت رکھتا ہے۔

لقای دوست خواہد و بلای وی   ز پی شہید و ایزدی لقای او

حسن حسینی کے ذیل کے شعر میں الفاظ "تیغ و دریغ" وسطی قافیہ کی صورت میں استعمال ہوئے ہیں اور قاری کے لیے معنی کی تفہیم میں موثر ہیں:

از جز رو مد حیف ایثار بی دریغ   بر تارک پلیدان رو بیدہ زخم کاری

قیصر امین پور کا ذیل کا شعر اگرچہ نیمائی طرز و قالب میں ہے لیکن دو الفاظ 'دور' اور 'گور' وسطی قافیہ کی صورت میں آخر میں استعمال ہوا ہے، جس نے شعر کی دلکشی اور تاثیر بڑھا دی ہے۔

گاہی سر بریدۂ مردی را
باید ز بام و در بیاریم
تا درمیان گور بخوابانیم

کبھی کبھی اسلامی انقلاب کے بعد کی شاعری میں مشکل قافیوں کی طرف شعرا کا رجحان دیکھنے میں آتا ہے مثلاً محمد رضا قیصری کی اس غزل میں جس کا مطلع ہے:

قافلہ‌یان کہ باد بہ بیرق بر آورند
در عرصۂ ستم سخن حق بر آورند

الفاظ: تبرق، خورنق، ازرق، رونق، زورق، مطلق، مطبق، کو قافیہ بنایا گیا ہے۔ اسی بنا پر بعض اشعار ناہموار اور نامانوس نظر آتے ہیں۔

اسلامی انقلاب کی شاعری میں قافیہ کی یہ بحث بھی طولانی ہو سکتی ہے اور اس کے نمونے بھی پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن وہی اختصار کے پیش نظر طول کلامی سے پرہیز کیا جا رہا ہے۔

۳۔ موسیقی الفاظ:

الفاظ، شاعر کے ہتھیار ہیں۔ قادر الکلام شاعر الفاظ و ترکیبات کے استادانہ استعمال سے اپنے گوناگوں احساسات و افکار کو دوسروں تک بخوبی منتقل کر سکتا ہے اور ان پر اثر ڈال سکتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے شاعر کو الفاظ کی تمام قوتوں سے مدد لینا چاہیے اور اپنے ذوق فکر سے بھی کام لینا چاہیے تب ہی وہ سامع (یا قاری) کے ذہن پر خاطر خواہ اثر انداز ہو سکتا ہے۔ شعر میں استعمال ہونے والے الفاظ کی حسن ترکیب، ہم آہنگی اور دلکشی کے ساتھ وزن و قافیہ کا عمدہ استعمال معنی کی بہتر ترسیل و تفہیم میں معاون ہوتا ہے۔ اس سے ایسا آہنگ وجود میں آتا ہے کہ جب یہ الفاظ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو ان سے ایک

مخصوص آہنگ پیدا ہوتا ہے جو مطالب اور حالات کے موافق ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ شاعر، قادر الکلام ہے جو ان کی ترکیب سے پیدا ہونے والی کیفیت سے غافل نہ ہو اور اس نزاکت کو محسوس کرے۔

البتہ سمجھنا چاہیے کہ شعر کی بافت میں ترکیب الفاظ کا حسن مختلف جلوؤں کا حامل ہوتا ہے اور مختلف عوامل کا زائیدہ ہوتا ہے مثلاً الفاظ کی تکرار، اصوات، ہجا، مصوتے، صامت، اور سکوت سب کے سب کلام یا الفاظ کی موسیقی سمجھے جاتے ہیں۔ اس مقالے میں اسلامی انقلاب کی شاعری میں ان سب کا جائزہ لینا مقصود نہیں ہے بلکہ ان میں سے صرف دو نکتوں پر توجہ مبذول کی جائے گی جو یہ ہیں۔

(الف)   شعر کی بافت میں ایک لفظ کی تکرار:

ہم یہ بات جانتے ہیں کہ شعر میں ایک لفظ کی تکرار سے بے شمار صوتی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں اگر صحیح طریقے سے اس کا استعمال کیا گیا ہو۔ علاوہ ازیں کہ شعر دلکش اور فصیح ہو جاتا ہے، تفہیم معنی میں بھی موثر ہوتا ہے۔ یہ بات از منہ قدیم سے شعرا کے پیش نظر رہی ہے۔ اسلامی انقلاب کے بعد کی فارسی شاعری میں بھی اس موضوع پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ سپیدہ کاشانی کے مندرجہ ذیل اشعار دیکھیے:

شبی دراز، شبی مرگ زا، شبی دلگیر   کشیدہ بود بلندای نور در زنجیر

سوار تاختہ یا در غبار می آمد   سیاہ جامہ بہ تن، سوگوار می آمد

مذکورہ اشعار میں معاشرے پر حکمراں گھٹن کے ماحول، امام خمینی کی جلا وطنی اور وطن واپسی، اسلامی انقلاب کی کامیابی اور ظلم و استبداد کی شکست، بیان کی گئی ہے۔ مصرعۂ اول میں بلکہ پورے شعر میں 'شب' طاغوت کی حکمرانی اور اس کے باعث پیدا ہونے والے گھٹن کے ماحول کا استعارہ ہے۔ مصرعۂ اول میں لفظ شب کی تکرار، شعری دلکشی میں اضافہ کے علاوہ معنی کی ترسیل میں بھی موثر ہے۔ دوسرے شعر میں لفظ 'شب' کو دوسرے الفاظ کے ساتھ کچھ اس طرح جوڑا گیا ہے جس سے ایک مناسب آہنگ پیدا ہوتا ہے اور شعر کی بافت میں یہ لفظ اپنا آشکار تشخص حاصل کر لیتا ہے۔ یہ الفاظ دیگر شاعر نے اس ہنر نمائی کے ذریعے شعر کی وہی خوانندگی قاری کے لیے طے کر دی ہے جو اس کا مقصود رہا ہے۔

شب اسارت و محنت، شب دریغ گذشت   سوار فاتح خورشید از ستیغ گذشت

قیصر امین پور کے درج ذیل شعر میں بھی لفظ 'لالہ' کی ہنرمندانہ تکرار سے شعر کی تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے:

ز باغ لالہ چہ گویم ز داغ لالہ چہ گویم
کہ جای نالہ و غم نیست در عزای شہادت

محمد علی محمدی کے اس شعر میں جو اسلامی انقلاب کی سالگرہ پر کہا گیا تھا لفظ 'مست' کی تکرار سے بہمن ماہ کے قریب آنے پر عوام کے شوق و شادمانی اور جوش و ولولے کی عکاسی کی گئی ہے:

من مست لب پیالہ و چشمان یار مست　　گل مست و سرو مست و به آواز زار مست
هر سو فتادہ مستی و ساقی به جا نیی　　خود او فتادہ با نگہ پر خمار مست
رہ بست تا بہ دژ و ز مستان بہار خون　　شد عالمی ز مرحمت کردگار مست

اس گفتگو کو حمید سبزواری کی ایک مثال پر ختم کرتے ہیں:

تنگ است ما را خانہ تنگ است ای برادر
بر جای ما بیگانہ تنگ است ای برادر

(ب) شعر میں ایک صامت کی تکرار:

اسلامی انقلاب کے بعد کی شاعری میں الفاظ کی موسیقی سے متعلق جو دوسرا پہلو بھی شعرا کی توجہ کا مرکز رہا ہے وہ شعر کی بافت میں ایک معین صامت کی تکرار ہے جس سے شعر کی دلکشی اور رسائی میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً علی معلم کے ذیل کے شعر میں سین، شین اور صاد کی تکرار کچھ اس طرح کلام میں در آئی ہے جس نے شعر کی خوبصورتی بڑھا دی ہے اسی کے ساتھ معنی کی تفہیم میں موثر واقع ہوئی ہے:

مردی، شکوہ شوکت عیسی شنیدہ　　موسی صفت بہ سینہ بیضا تنیدہ

سپیدہ کاشانی کے اس شعر میں مذکورہ بالا شعر میں سین، شین کی تکرار کی طرح ذ، ز کی تکرار سے حسن پیدا ہوا ہے:

ذرہ شدہ در پرتو خورشید جان افروز عشق　　در سماع سرخ سربازان حق از سر گذشت

سین اور کاف کی تکرار سے قیصر امین پور کے ذیل کے شعر میں ایک مخصوص جوش و جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس میں بعض الفاظ کی نشست بہت عمدگی سے رکھی گئی ہے۔

دیگر قلم زبان دلم نیست
گفتم
باید زمین گذاشت قلمها را
دیگر سلاح سرد سخن کارساز نیست
باید سلاح تیزتری برداشت
باید برای جنگ
از لولہ تفنگ بخوانم
با واژہ فشنگ

حمید سبزواری نے اپنے ذیل کے اشعار میں ن اور س اور اسی طرح م سے شروع ہونے والے الفاظ کے استعمال کے ذریعے کلام کی زیبائی اور دلکشی میں کافی اضافہ کیا ہے:

بہ ناز دست نواز نسیم سحر　　گشودہ دیدہ شب آرمیدگان از خواب
دمید سبزہ صبح و گل شقیق فلق　　نشست از بر چرخ و تودہ سیماب

مہرداد اوستا نے بھی ن کے حامل الفاظ منتخب کر کے ذیل کا ہیجان انگیز شعر تخلیق کیا ہے:

فرشتہ نغمہ سر کند چو بشنود ترنم نوای ربنای او

واضح رہے کہ موسیقی کلام سے استفادہ بس انہیں چند موارد پر منحصر نہیں ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے وہ مشتے نمونہ از خروارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح شاعری کا یہ وصف دورۂ انقلاب کی شاعری پر منحصر نہیں ہے بلکہ انقلاب کی شاعری میں الفاظ کی موسیقی کا مظاہرہ اتنا وسیع پیمانے پر ہوا ہے کہ یہ اس دور کی شاعری کا ایک نمایاں وصف بن گیا ہے۔

اسلامی انقلاب کے بعد کی شاعری میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا یہ ایک اجمالی جائزہ ہے۔ یہ شاعری چونکہ ایران اسلامی کی قدیم روایات و ادبیات سے گہرے طور پر وابستہ ہے اس لیے بہت سے مواقع پر پختگی، فصاحت، دلکشی میں قدیم فارسی شاعری کے پہلو بہ پہلو بھی ہے اور اس اعتبار سے گہرے مطالعے اور تجزیے کی متقاضی بھی۔

حواشی:

۱- یہ مقالہ اس وقت معرض تحریر میں آیا تھا جب انقلاب کو آٹھ سال ہوئے تھے۔

۲- چہار پارہ = پارہ = چار پارہ

اصطلاح میں شاعری کی ایک صنف، دوبیتی کے بندوں سے مرکب قالب، جس میں قافیہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے لیکن معنی میں متحد ہوتا ہے۔ اس کی معروف ترین شکل وہ ہے جس میں صرف زوج مصرعے قافیہ دار ہوتے ہیں۔ مثلاً فروغ فرخزاد کا یہ چہار پارہ:

گنہ کردم گناہی پر ز لذت　　در آغوشی کہ گرم و آتشین بود
گنہ کردم میان بازوانی　　کہ داغ و کینہ جوی و آہنین بود

یا یہ چہار پارہ از نادر نادرپور:

کنون آفتاب بہ پہلو فتادہ بود　　زنبور ہای نور ز گردش گریختہ
در پشت سبزہ ہای تلک کوب آسمان　　گلبرگہای سرخ شفق تازہ، ریختہ

چہار پارہ جدید صنف ہے جو شعر نو یا انقلاب مشروطیت کے وجود میں آنے کے ساتھ سامنے آئی اور ۱۳۲۰ھ ش کے عشرے میں جدید شعرا نے اس کا خوب استقبال کیا۔

غلام سرور*

بنگال کا فارسی ادب

سرزمین بنگال عصر قدیم سے ہی مختلف سیاسی، سماجی اور ثقافتی تحریکوں کی آماجگاہ رہی ہے۔ ہر زمانے میں یہاں کی آب و ہوا، فطری مناظر، بلند پہاڑیاں، لہلہاتے کھیت، گھنے جنگلات، دریاؤں اور ندیوں کے تانے بانے اس خطۂ ارض کو پرکشش اور ارزش بناتے رہے ہیں۔ یہاں جو بھی آتا ہے اس کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا لیکن فارسی زبان اس قاعدہ کلیہ کے برعکس اس سرزمین پر اپنے گوناگوں اثرات مرتب کئے اور یہاں کی تہذیب و ثقافت پر ان مٹ اور دیرپا نقوش ثبت کئے ہیں۔

جب عہد وسطی مسلمانوں کو عروج حاصل ہوا اور وہ دور دراز کے ملکوں میں بغرض تجارت و تبلیغ دین حق آباد ہونے لگے تو بنگال کی سرزمین نے ان کا خیر مقدم کیا۔ صوفیا کرام کے مساعی جمیلہ کے زیر اثر لوگ جوق در جوق داخل اسلام ہوئے۔ یوں تو مسلم افواج کی آمد سے قبل ہی عرب و ایرانی تجار اور صوفیا کرام بنگال کے ساحلی علاقوں میں آکر آباد ہونے لگے تھے اور اپنی بستیاں بھی قائم کرلی تھیں لیکن ان کا تبلیغی مشن ساحلی علاقوں تک ہی محدود تھا۔

۱۲۰۴ء میں اختیار الدین بن بختیار خلجی نے بنگال میں ترکی سلطنت کا پرچم لہرایا، اور یہاں مدرسے اور مساجد تعمیر کروائے۔ گرچہ اولین حکمراں اور افواج ترکی نژاد تھے لیکن زبان و ثقافت کے اعتبار سے وہ ایرانی رنگ میں رنگ چکے تھے۔ حکمرانی کے سارے آداب و رسوم ایرانی تہذیب و ثقافت کے مرہون منت تھے۔ ان کی درباری اور رسمی زبان فارسی تھی اور ادبا و شعراء کی ایک بڑی جماعت ان کے ساتھ ہمیشہ رہا کرتی تھی۔ نتیجتاً جب ترکی حکمراں سریر آرائے سلطنت ہوئے تو انہوں نے فارسی زبان کو درباری زبان قرار دیا اور دفاتر کا سارا نظم و نسق فارسی زبان میں انجام دیا جانے لگا۔

مسلمانوں کی آمد کے زیر اثر بے شمار مساجد اور مدرسے وجود میں آئے اور صوفیائے کرام کی آمد

---

* ایسوسی ایٹ پروفیسر و صدر شعبۂ فارسی، مولانا آزاد کالج، کلکتہ

کے سبب سارے بنگال میں خانقاہوں اور مزاروں کا جال بچھ گیا۔ بہت ہی کم عرصے میں صوفیائے کرام نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے بنگال کی سرزمین کو لالہ زار بنا دیا اور شہروں اور قریوں میں گھوم گھوم کر دین اسلام کی اشاعت میں مشغول ہو گئے۔ چونکہ ان کی زبان عربی، ترکی یا فارسی تھی لہٰذا جب بھی وہ مقامی لوگوں سے ملتے تو ان کی زبان سیکھنے کی کوشش کرتے اور ساتھ ہی ساتھ فارسی زبان کا بھی جادو جگاتے۔ مقامی آبادی نے نہ صرف ان کا دین قبول کیا بلکہ فارسی کے شیدا ہو گئے۔ بنگالی زبان جو ابھی نوزائیدہ تھی فارسی کے سایہ عاطفت میں آگئی اور بے شمار فارسی اور عربی الفاظ بنگالی لسانیات کا حصہ بن گئے لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بنگالی زبان کے تار و پود کو سنوارنے میں فارسی نے نمایاں کردار ادا کیا۔

بنگال میں فارسی زبان کی پیش رفت کی تاریخ تقریباً آٹھ سو سال پر محیط ہے۔ اگر ہم عہد بہ عہد اس کی پیش رفت کا جائزہ لیں تو ہم اس زبان کے شاندار ماضی کو پانچ ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

ترک و افغان عہد ۱۲۰۴ تا ۱۵۷۶ء:

ترک و افغان عہد کا آغاز بختیار الدین خلجی کے فتح بنگالہ سے ہوتا ہے۔ دراصل اس واقعہ نے بنگال کی تاریخ و ثقافت کو ایک نیا موڑ دیا۔ مشرقی ہند کا یہ خطہ ایک عرصہ سے الگ تھلگ تھا مغربی ہندوستان ایران اور مرکزی ایشیاء سے قریب آگیا۔ یہ دور سیاسی اعتبار سے بڑے ہی نشیب و فراز کا دور تھا اکثر اوقات یہاں کے حکمراں دہلی سلطنت کے لیے ایک چیلنج بن جاتے اور اپنی آزادی کا علم بلند کر دیتے۔ بار بار گورنر بدلے جاتے لیکن افراتفری اور بے اطمینانی کا دور جاری رہتا۔ ۱۲۰۳ سے ۱۳۳۸ء کے درمیان تقریباً تیس گورنر نامزد ہوئے جن میں علی مردان خلجی، غیاث الدین عوض خلجی، طغرل طغان، نصیر الدین بغرا خان اور غیاث الدین بہادر وغیرہ کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ فخر الدین مبارک شاہ نے ۱۳۳۸ء میں اپنی مکمل آزادی کا اعلان کیا اور بنگال کا آزاد حکمراں بن بیٹھا۔ ۱۳۴۲ء میں شمس الدین الیاس شاہ نے الیاس شاہی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ اس خاندان میں سکندر شاہ، غیاث الدین اعظم شاہ جیسے عظیم المرتبت سلاطین نے بنگال کی ترقی اور خوشحالی میں گرانقدر کارنامے انجام دیے۔ ۱۴۹۳ء میں علاء الدین حسین شاہ نے حسین شاہی حکومت کی بنا ڈالی۔ نصیر الدین نصرت شاہ اور غیاث الدین محمود شاہ نے بڑی کامیابی کے ساتھ زمام حکومت سنبھالی۔ ۱۵۳۸ء میں حسین شاہی دور اپنے اختتام کو پہنچا اور سوری اور کرانی خاندان کی حکومتیں بالترتیب قائم ہوئیں اور مغلوں کی آمد تک بنگال میں ان کا سکہ جاری رہا۔ کرانی خاندان کے آخری حکمراں داؤد شاہ کرانی کو اکبر اعظم کی فوج ۱۵۷۶ء میں شکست دی اور بنگال پر مغل پرچم لہرانے لگا۔

ترک و افغان عہد میں شہر لکھنوتی کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ اس دور کے بیشتر مورخوں نے سارے بنگال کو لکھنوتی کے نام سے موسوم کیا۔ یہ شہر دراصل ہندو راجاؤں کے عہد میں لکشمن وتی کے نام

سے مشہور تھا لیکن ترک و افغان عہد میں لکھنوتی کا نام زبان زد ہو گیا۔ بعد میں گوڑ پنڈوا، چنا گانگ، ستارگاؤں، اکدالہ، سلہٹ، منگل کوٹ جیسے بڑے شہر آباد ہو گئے۔ چونکہ دہلی دربار کی زبان فارسی تھی اور ترک حکمراں بھی فارسی آداب و رسوم کے دلدادہ تھے۔ بنگال میں جلد ہی فارسی زبان کا طوطی بولنے لگا۔ دوسری طرف مدرسوں اور خانقاہوں میں عربی زبان کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کی تعلیم عام ہونے لگی۔ وہ بزرگان دین جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں رشد و ہدایت کی شمع روشن کی ان میں شیخ تقی الدین عربی، شیخ جلال الدین تبریزیؒ، شیخ شرف الدین ابو توامہؒ، شیخ اخی سراج عثمانؒ، سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ، شیخ علاء الحق ہندویؒ، شیخ نور قطب عالمؒ، شیخ حسین دھکر پوش، شیخ چاند اولیا، شیخ حمید دانشمندؒ کے نام قابل ذکر ہیں۔ بیشتر صوفیائے کرام فارسی زبان کے ماہر تھے اور فارسی زبان ہی میں تحریر کیا کرتے تھے۔ لیکن اس بات پہ کف افسوس ملنا پڑتا ہے کہ ان کی نگارشات جو ہم تک پہنچی ہیں بہت قلیل ہیں۔ اگر ہمارے آبا و اجداد نے ان گرانقدر ادبی شہ پاروں کی حفاظت کی ہوتی اور آب و ہوا کی نمی اور ہماری غفلت و بے پرواہی نے ان کو برباد نہ ہونے دیا ہوتا تو آج ہم فارسی ادب کے بہترین اور گرانقدر جواہر پاروں سے محروم نہ ہوتے۔

بہر کیف ان کم مائیگیوں اور ستم ظریفیوں کے باوجود چند تصانیف آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں جن پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

بنگال میں فارسی زبان کی اولین تصنیف قاضی رکن الدین سمرقندی نے مکمل کی۔ علی مردان خلجی کے عہد (١٢١٠-١٣) میں جب آپ لکھنوتی میں مقیم تھے ایک ہندو جوگی جس کا نام بھوجر برہمن بتایا جاتا ہے آپ کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوا۔ آپ نے اس کی مدد سے یوگ کی ایک مشہور کتاب امرت کنڈ کا فارسی میں حوض الحیات کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس کتاب کو عربی زبان میں بھی ترجمہ کرنے کا شرف آپ کو حاصل ہے۔

اس دور کے ایک مشہور عالم و صوفی، شیخ تقی الدین عربی جو بنگال کے ایک چھوٹے سے قصبے میسوں میں مقیم تھے امام غزالی کی تصنیف احیاء العلوم کی تلخیص کی جو دستبرد زمانہ ہو گئی۔ شیخ شرف الدین ابو توامہ نے تیرہویں صدی کے اواخر میں ستارگاؤں میں ایک مدرسہ کی بنا ڈالی جہاں بہار کے جلیل القدر صوفی شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے ان کی نگرانی میں اپنی تعلیم مکمل کی شیخ شرف الدین ابو توامہؒ نے اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت کی خاطر ایک مختصر فارسی مثنوی "نام حق تخلیق" کی جو آج بھی مختلف کتب خانوں کی زینت ہے۔ ایک معرکۃ الآرا تصنیف مقامات ان کے نام سے منسوب ہے جو نایاب ہے۔ بنگال میں عہد سلاطین اپنے بے پناہ جاہ و جلال اور جلوہ سامانیوں کے سبب قابل ستائش ہے اور قابل رشک بھی ہے اس دور کے اوائل میں بے شمار صوفیا، عرفان علمی و فضلاء، شعراء و ادبا، بلخ بخارا، سمرقند، ملتان، لاہور دہلی

وغیرہ سے آکر بنگال کے مختلف شہروں اور قصبوں میں آباد ہو گئے۔ سلاطین حکمرانوں کے عہد حکومت میں جب کہ بنگال کا نظم و نسق نامزد گورنروں کے ذمہ تھا دانشوروں کی ایک بڑی تعداد نے بنگال کا رخ کیا۔ ان نامور ادیبوں اور شاعروں میں منہاج سراج، مسعود اشعری، جلال الدین کاشانی، سراج الدین خراسانی سراجی کے نام قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے قیام کے دوران خامہ فرسائی کی جو اشعار کی شکل میں آج بھی موجود ہے۔

١٢٧٦ء میں جب غیاث الدین بلبن نے طغرل کی بغاوت کو فرو کرنے کی غرض سے بنگال پر یورش کی تو اس شاہی لشکر میں امیر خسرو دہلوی، امیر حسن سجزی، ملک قوام الدین، شمس الدین دبیر، قاضی اثیر جیسے نامور اہل قلم موجود تھے۔ ان کی آمد اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اس وقت بنگال کی ادبی فضا میں ایک ارتعاش ضرور پیدا ہوا ہوگا۔ امیر خسرو کب خاموش بیٹھنے والے تھے۔ انہوں نے ایک مختصر مگر جامع "فتح نامہ" تحریر کیا اور اسے اپنی انشاء پردازی کا پہلا امتحان قرار دیا۔ امیر خسرو نے اپنی کتاب دیباچہ غرۃ الکمال میں بنگال کے ادبی ماحول کی جو منظر کشی کی ہے وہ قارئین کے لیے نہایت ہی دلچسپ ہے ملاحظہ فرمائیں:

ہر عربی و خراسانی و ترک وغیرہ آن کہ در شہر ہای ہند از آن مسلمانان است یون دہلی و ملتان و لکھنوتی نہ چون گجرات و مالوہ و دیوگیر کہ آن دیو خانہ ہندوان است در آید و ہمہ عمر صرف کند زبانش گمرہ و البتہ سخن بر طریق ولایت خویش گوید" (دیباچہ غرۃ الکمال ص ٣٦ پٹنہ ١٩٨٨)

ترجمہ: ہر عربی، خراسانی اور ترک وغیرہ جو ان شہروں میں آتا ہے جہاں مسلمان آباد ہیں جیسے دہلی، ملتان اور لکھنوتی وغیرہ اور اپنی تمام عمر صرف کرتا ہے اس کی زبان نہیں بدلتی البتہ وہ اپنے وطن مالوف کی زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ لیکن ان شہروں میں یہ بات ممکن نہیں جہاں ہندوؤں کے مناور ہیں جیسے گجرات مالوہ اور دیوگیر)

امیر خسرو کا لکھنوتی کو دہلی اور ملتان کا ہم پلہ قرار دینا واقعی دلچسپ اور قابل اعتنا ہے۔ ہم اس بات سے اس امر کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس زمانے میں شہر لکھنوتی کا علمی و ادبی معیار کس قدر اعلیٰ و ارفع ہوگا۔

محمد تغلق شاہ کے عہد میں خواجہ کریم الدین سمرقندی تشریف لائے اور ست گاؤں میں مقیم ہو گئے۔ غالباً ان کی خانوادہ ہی میں کمال الدین بن کریم الدین معروف بہ کمال کریم نے قتلغ عز الدین بہرام خان کے حسب فرمائش فقہ اسلامی کے موضوع پر "مجموعہ خانی فی عین المعانی" تصنیف کی۔ یہ کتاب آج بھی نسخہ کی صورت میں کتب خانوں میں محفوظ ہے۔

الیاس شاہی دور حکومت (۱۳۴۲ء-۱۴۹۳ء) فارسی کے زبان و ادب کے لیے بے حد سود مند ثابت ہوا۔ غیاث الدین اعظم شاہ شعر و ادب کا ایسا دلدادہ تھا کہ اس نے حافظ شیرازی جیسے نامور اور عظیم المرتبت کو اپنے دربار میں شرکت کی دعوت دی۔ حافظ تشریف نہیں لائے لیکن اپنی ایک خوبصورت اور مرصع غزل سلطان کی خدمت میں روانہ کی۔ اس تاریخی غزل کا یہ شعر اس قدر زبان زد خاص و عام ہوا کہ آج بھی فارسی ادب کی محفلیں اس شعر کی معنی آفرینی اور غنائیت سے گونج اٹھتی ہیں۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند

زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

غیاث الدین اعظم شاہ کے دور حکومت میں بہار کے مشہور صوفی حضرت شرف الدین یحیٰی منیری کے خلیفہ ارشد حضرت مظفر شمس بلخی بنگال تشریف لائے اور چٹا گانگ کی سرزمین پر تقریباً دو سال تک قیام کیا پھر سفر حج پر روانہ ہوئے۔ ان کے کئی مکتوب غیاث الدین اعظم شاہ کے نام آج بھی ''مکتوبات مظفر شمس بلخی'' میں شامل ہیں جو خدا بخش لائبریری پٹنہ کی زینت ہے۔ غیاث الدین اعظم شاہ کے عہد ہی میں حضرت نور قطب عالم نے بنگال میں چشتیہ خانقاہ کو وسعت دی۔ حضرت نور قطب عالم حضرت علاء الحق پنڈوئی کے صاحبزادے اور خلیفہ ارشد تھے۔ انہوں نے اپنی خانقاہ کو مرکز علم و ادب بنایا اور فارسی ادب کو اپنے جواہر پاروں سے مزین کیا۔ ان کے مکتوبات آج بھی موقر و معتبر فارسی کی مثال ہیں ان کی دو تصانیف انیس الغربا اور مونس الفقراء عرفانی ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی تصانیف کو ہم چشتیہ تعلیمات کا خزینہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ کے سلسلے کے ایک بزرگ شاہ قطب الدین حقانی نے مسائل والمشائخ کے نام سے ایک تصنیف چھوڑی ہے لیکن اس کا کوئی نسخہ نہیں ملتا۔

الیاس شاہی عہد ہی میں رکن الدین باربک شاہ کے دور حکومت (۱۴۵۹ء-۱۴۷۶ء) میں ابراہیم قوام فاروقی نے اپنی معرکۃ الآرا فرہنگ ''شرفنامہ'' کے عنوان سے ترتیب دی جس کا شمار آج بھی فارسی زبان کی شہرہ آفاق فرہنگوں میں ہوتا ہے۔ اسی شرف نامہ میں ہمیں ان شاعروں اور ادیبوں کے تذکرے اور کلام ملتے ہیں۔ جو باربک کے دربار سے منسلک تھے۔ ان میں شہاب الدین حکیم کرمانی، امیر زین الدین ہروی، منصور شیرازی، شیخ واحدی، ملک یوسف بن حمید کے نام قابل ذکر ہیں۔

حسین شاہی عہد گرچہ بنگالی زبان کی ترویج و اشاعت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے لیکن فارسی کے تعلق سے بہت قلیل معلومات فراہم ہو سکی ہیں۔ سید علوی عرف محمد بدھ نے فن تیر اندازی پر ایک شاندار تصنیف مکمل کی جو ''ہدایت الرمی'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ کتاب مخطوطہ کی شکل میں آج بھی موجود ہے۔

غیاث الدین بہادر شاہ (۱۵۵۶ء-۶۰) کے عہد میں عبدالرحمن نامی ایک صوفی شاعر نے گنج راز کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی جو اب بھی ڈھاکہ اور چٹا گانگ کے کتب خانوں کی زینت ہے۔

ترک و افغان عہد کے اواخر میں بہرام سقا ۱۵۶۰ء میں بنگال تشریف لائے اور بردوان کو اپنا مستقر خاص بنایا۔ وہ فارسی کے ایک عظیم شاعر تھے ان کے اشعار ان کی ذہانت طبع اور ندرت خیال کے غماز ہیں۔ ان کی قابل قدر اور پر اوزش دیوان ایشیاٹک سوسائٹی میں موجود ہے۔ ترک و افغان عہد کے آخری فرمانروا داؤد شاہ کرانی کے عہد حکومت میں احمد یادگار نے تاریخ سلاطین افاغنہ جو تاریخ شاہی کے نام سے مشہور ہے داؤد شاہ کے ایما پر تصنیف کی یہ کتاب ایشیاٹک سوسائٹی سے شائع ہو چکی ہے۔

مختصر یہ کہ ترک و افغان عہد بنگال فارسی زبان و ادب کی پیش رفت میں دوسرے صوبوں سے پیچھے نہیں رہا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بیشتر تصانیف یہاں کی مرطوب آب و ہوا اور امتداد زمانہ کی نذر ہو گئیں اور ہمارے اسلاف کے کارناموں پر ایک دبیز پردہ پڑ گیا۔

مغلیہ عہد (۱۵۷۶ء-۱۷۵۷ء):

مغلیہ عہد کو ہم فارسی شعر و ادب کا ایک تابناک دور کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس عہد میں فارسی زبان کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ادبا و شعراء کی ایک بڑی تعداد راج محل، ڈھاکہ، بردوان وغیرہ میں آکر آباد ہوگئی اور اپنے اشہب قلم کی جولانیوں کا مظاہرہ کیا۔

۱۵۷۶ء میں منعم خاں کی قیادت میں مغل فوج بنگال میں داخل ہوئی اور مغلیہ عہد کا آغاز ہوا شدید مخالفت کے باوجود بنگال میں مغلیہ فوج کی برتری قائم ہوگئی۔ اس دور کی ایک خاص بات یہ تھی کہ افسران اعلیٰ اور فوج کے سربراہ فارسی زبان کا شغف رکھتے تھے اور شعراء اور ادباء کے معاملے میں کافی فیاض واقع ہوئے تھے۔

دور اکبری میں جن شعراء نے بنگال کا رخ کیا اور اپنے کلام سے گلزار شعر و ادب کی آبیاری کی ان میں محمد شریف سرمدی اصفہانی، میرزا قیام الدین جعفر بیگ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ امر کافی دلچسپ ہے کہ مغل صوبیدار قاسم خان، اسلام خان، شاہ شجاع وغیرہ بڑے ادب نواز ثابت ہوئے انہوں نے ادیبوں اور شاعروں کو بڑی قدر و منزلت بخشی۔ میرزا محمد قلی تہرانی متخلص بہ سلیم جو ترکی النسل تھے اسی عہد میں بنگال تشریف لائے اور ایک دیوان ترتیب دیا جو آج بھی ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ میں محفوظ ہے۔ آپ بڑے قادر الکلام شاعر تھے لہٰذا انہوں نے ''مثنوی قضا و قدر'' کے علاوہ مثنوی در فتح بنگالہ'' کے عنوان سے بھی ایک طویل مثنوی لکھی جس کا مقصد اسلام خان مشہدی کے فتح آسام (۱۶۳۷ء) کی منظر کشی تھی۔

اسی زمانے میں بنگالی زبان کے عظیم شاعر سید علاول نے نظامی گنجوی کی ہفت پیکر اور سکندر نامہ کو

بنگالی زبان کے قالب میں ڈھالا۔ قاسم خان کا عہد بڑا ہی بار آور ثابت ہوا کیونکہ اس زمانے میں ملا درویش ہروی، ملا وفا ہروی، ملا حکیم شیرازی، میر عبدالقیوم جیسے مایہ ناز ادباء شعراء نے بنگال کی سرزمین پر اپنی سخن گستری کے جادو جگائے۔

جہانگیر کا عہد حکومت بھی کچھ کم تابناک نہ تھا۔ اسی عہد میں میرزا جعفر بیگ قزوینی جو میرزا ناتھن کے نام سے مشہور تھے۔ بہارستان غیبی جیسی معرکۃ الآرا تاریخ مرتب کی۔ دراصل یہ تصنیف بنگال اور آسام میں جہانگیری جنگی مہمات کا تذکرہ ہے جہانگیر کے عہد حکومت میں شاہزادہ شاہ شجاع تقریباً ۲۱ سال (۱۶۶۰-۱۶۳۹ء) تک بنگال کا گورنر رہا۔ اسی زمانے میں محمد معصوم بن حسن نے تاریخ شاہ شجاعی قلمبند کی جو شاہ شجاع کے دور کی اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ عبداللطیف نے ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہفت اقلیم چھوڑی ہے جو چار جلدوں پر محیط ہے اور بنگال اور دیگر خطوں کی تاریخی، جغرافیائی، ثقافتی اور معاشرتی حالات کی متحرک تصویر پیش کرتی ہے۔

شاہ جہاں کا عہد فارسی زبان وادب کی پیشرفت میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس دور میں بے شمار جید اور ممتاز علماء وفضلاء بنگال تشریف لائے اور یہاں کی ادبی فضا کو اپنی شگفتہ بیانی سے معطر کر دیا۔ ان ممتاز دانشوروں میں میرزا محمد صادق کا نام سرفہرست ہے جنہوں نے جہانگیر نگر (موجودہ ڈھاکہ) کو اپنا مستقر بنایا اور وہیں کے ہو رہے۔ انہوں نے چار جلدوں میں اپنی مشہور ومعروف تصنیف صبح صادق ترتیب دی۔ جس کی تیسری جلد میں بنگال کے ادبی ماحول کا تفصیلی تذکرہ ملتا ہے۔ اس جلد کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاہجہانی عہد میں جہانگیر نگر بنگال کا نہ صرف سیاسی بلکہ ادبی مرکز بن چکا تھا کیونکہ ایران اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے شعراء وادباء اس دیار میں آ کر مقیم ہو گئے تھے اور اپنے حسن کلام اور ندرت بیان سے سرزمین بنگالہ کے ثقافتی فضا کو تازگی بخش رہے تھے۔ ان نامور ادیبوں اور شاعروں میں عارف الحق، مولانا ندیم گیلانی روح اللہ مازندرانی، محمد شریف تخلص خسروی، محمد تقی دیدار، تخلص حسین مشہدی، مولانا محمد گیلانی محمد حسین منیر غفاری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ میرزا ابوسعید جو کہ اعتماد الدولہ کے پوتے تھے قاسم خان دوئم کے ساتھ بنگال آئے والہ ہروی جو اپنے دور کے ایک معروف شاعر تھے اسی دور میں ڈھاکہ آ کر مقیم ہو گئے تھے۔

شاہجہانی عہد میں ہی سید جلال الدین معروف بہ نعمت اللہ نے "تفسیر جہانگیر" تصنیف کی۔ میر علاءالملک جو اپنے عہد کے ایک ممتاز دانشور تھے اسی زمانے میں بنگال تشریف لائے اور اپنی ذی قیمت تصانیف چھوڑیں جن میں علم منطق کے موضوع پر "مہذب" اور علم دینیات میں "انوار الہدیٰ" اور "صراط واسط" نامی رسالے قابل ذکر ہیں۔ ان کے بھائی عبدالعالی بھی اس زمانے کے ممتاز شعراء کی صف میں شمار کیے

جاتے تھے۔ ان کی تحریروں میں سورۃ اخلاص کی تفسیر، عدل پر ایک رسالہ، کلام کا مجموعہ اور اپنے برادر بزرگ علاءالملک کی داستان حیات شامل ہیں۔ ممتاز شاعر خواجہ محمد شریف اور مشہور ومعروف علمائے کرام مولانا معزالدین محمد اردستانی اور میر محمد ہاشم نے بھی بنگال میں سکونت اختیار کی تھی۔

محمد ابوالبرکات منیر لاہوری جو عہد شاہجہانی کے مشہور ومعروف شاعروں میں شمار کیے جاتے تھے بنگال تشریف لائے۔ کلیات منیر میں انہوں نے بنگال کا خصوصی تذکرہ "مثنوی در وصف بنگالہ" کے عنوان سے کیا اور اس خطہ ارضی کی بنیادی خصوصیات اور فطری مناظر کی عکاسی کی ہے۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت کے دوران بنگال کا نظم ونسق میر جملہ، شائستہ خان، محمد اعظم اور محمد عظیم کے ہاتھوں میں رہا اور یہ سارے فرمانروا علم وادب کے دلدادہ ثابت ہوئے افسوس کی بات یہ ہے کہ اس زمانے کے ادباء وشعراء کے حالات اب بھی پردہ خفا میں ہیں، بہرکیف یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ فارسی کا سفر اس دور میں بھی جاری رہا اور محمد ولی احمد معروف بہ شہاب الدین طالش نے ۱۶۶۲ء میں "فتح عبریہ" کے عنوان سے ایک تاریخ لکھی جو تاریخ آشام کے نام سے مشہور ہوئی۔ مصنف میر جملہ کا قریبی دوست ہونے کے ناطے بنگال کے سیاسی حالات سے کماحقہ واقف تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس دور کی تاریخ کو اس نے بخوبی قلم بند کیا ہے۔ مختصر یہ کہ مغلیہ عہد فارسی زبان وادب کی تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ تھا جس نے فارسی کو ایسی مقبولیت بخشی کہ بعد کے ایام میں بھی کاروان ادب اسی شان سے گامزن رہا۔

نوابی عہد (۱۷۰۷ء–۱۷۶۵ء):

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت پر زوال کے بادل منڈلانے لگے۔ مرکز کی بدنظمی اور کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے صوبوں میں متعین صوبے داروں نے اپنی خودمختاری کا اعلان شروع کر دیا۔ بنگال کے صوبے دار مرشد قلی خان نے جو کسی زمانے میں اورنگ زیب کا معتمد خاص ہوا کرتا تھا ۱۷۱۷ء میں بنگال کی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ اس طرح اس نے اس خطہ میں نوابی عہد کی بنیاد رکھی اور مرشد آباد کو پایہ تخت قرار دیا۔ بنگال کے نوابوں کی فیاضی اور ادب نوازی کا شہرہ دور دور تک پہنچا اور دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کی ایک بڑی تعداد مرشد آباد آ کر نوابوں کے دربار سے منسلک ہو گئی۔ ان شعراء میں رام نارائن موزوں میر محمد حیات حسرت، ہیرے رام جودت برق، امین الدین امین، میر محمد رضی القدس، میر محمد باقر حزیں، میر محمد تجرید، درومند فقیہ وغیرہ بنگال کی سرزمین کو فارسی شعر وادب کا گہوارہ بنا دیا۔ میر محمد تجرید نے اشعار کے علاوہ کئی نثری تصانیف چھوڑی ہیں جن میں رسالہ اثبات مذہب، رسالہ تحقیق روح، رسالہ در نوافل شرح رسالہ محسن کاشی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ڈھاکہ میں مقیم محمد حسین آزاد بلگرامی جو اپنے وقت کے جید عالم اور دانشور تھے نوبہار مرشد قلی خان تصنیف کی، یوسف علی خان نے تاریخ مہابت جنگی کے علاوہ حدیقۃ الصفا، مجموعۂ یوسفی تذکرہ یوسفی تحریر کی جو نہایت ہی دلچسپی اور اہمیت کی حامل ہیں۔

سید غلام حسین طباطبائی اپنے دور کے ایک مشہور شاعر، ثقہ عالم اور ممتاز ادیب تھے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر بے شمار کتابیں اور رسالے قلم بند کئے۔ ان کی شہرۂ آفاق تاریخی دستاویز سیر المتاخرین کے نام سے مشہور ہے جسے انہوں نے مرشد آباد میں ۱۷۸۲ء میں مکمل کی تھی۔ سیر المتاخرین شائع ہو چکی ہے اور اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ نوابان بنگالہ کے عہد کی سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی حالات سے آشنائی کے حوالے سے یہ بہترین منابع میں شمار کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں غلام حسین طباطبائی نے گرانقدر نثری تخلیقات بھی چھوڑی ہیں جن میں بیت الابرار و بشارت الامامت، شرفنامہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے اپنا ایک دیوان بھی مرتب کیا جو ایشیاٹک سوسائٹی میں محفوظ ہے۔

بنگال کے سیاسی حالات کو قلم بند کرنے والوں میں رائے بالمکند کا نام بھی اول درجہ کے تاریخ نگاروں میں آتا ہے۔ انہوں نے ''عبرت ارباب بصر'' کے نام سے ایک معاصر تاریخی دستاویز پر ۱۷۵۵ء میں مکمل کی۔ نواب جعفر خان کے میر منشی، منشی سلیم اللہ نے ۱۷۶۳ء میں تاریخ بنگالہ تصنیف کی۔ علی ابراہیم خان خلیل نے گلزار ابراہیمی، وقائع جنگ مرہٹہ اور صحف ابراہیم جیسی بیش قیمت تخلیقات کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

نوابی عہد فارسی میں شعری و نثری ادب کی ترقی کے اعتبار سے نہایت ہی تابناک عہد ہے اور اس موضوع پر میرے رفیق کار ڈاکٹر تنویر احمد، کلکتہ نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا ہے جو قابل ستائش ہے۔

برطانوی دور (۱۹۴۷ء-۱۷۶۵ء):

بنگال میں نوابی دور کے انحطاط کے سبب، ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۷۶۵ء میں مغلوں سے دیوانی حقوق حاصل کر لیے۔ اب نظم و نسق اور محصول پر انگریزوں کا حق تسلیم کر لیا گیا۔ کمپنی نے صوبائی انتظام و انصرام کی خاطر فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت سے جاری رکھا اور اپنے افسران کو بھی فارسی زبان سیکھنے کی تلقین کی۔ بڑی تعداد میں فارسی مترجم اور دبیر مقرر کئے گئے۔ ہاں ایک بات ضرور مشاہدہ میں آئی وہ یہ کہ نوابوں کے عہد میں جس طرح شعراء و ادباء کو انعام و اکرام سے نوازا جا رہا تھا اس میں ایک تعطل پیدا ہو گیا۔ اب صرف سرکاری کام کاج کی حد تک فارسی کا چلن باقی تھا اور یہ انگریزوں کی اپنی مجبوری تھی۔

ان نامساعد حالات کے باوجود فارسی زبان و ادب کا کارواں بدستور پیشرفت کرتا رہا۔ بے شمار اہل علم اور اہل قلم حضرات اپنی نگارشات سپرد قلم کرتے رہے۔ ضلع مالدہ میں مقیم غلام حسین سلیم زید پوری نے ۱۷۸۸ء میں بنگال کی ایک مکمل تاریخ ریاض السلاطین کے نام سے تحریر کی۔ یہ کتابی شکل میں ایشیاٹک سوسائٹی کے زیر اہتمام شائع ہو چکی ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ عبد السلام نے کیا ہے۔

مرتضیٰ حسین بلگرامی ۹۵-۱۷۰۰ء جو کیپٹن جوناتھن کے منشی تھے ایک مشہور تاریخی و جغرافیائی کتاب حدیقۃ الاقالیم تصنیف کی۔ میرزا اعتصام الدین نے اپنا سفرنامہ ''شگرف نامہ ولایت'' قلم بند کی جس میں انہوں نے اٹھارویں صدی کے لندن (Landon) کی تصویر کشی کی ہے۔ بردوان کے منشی اسمٰعیل نے بھی فارسی میں ایک سفرنامہ لکھا ہے جو قابل ذکر ہے۔

مولوی عبد الرؤف وحید نے ۱۸۵۳ء میں ''خلاصۃ التواریخ'' ترتیب دی اور ایک شاندار مثنوی ''تاریخ کلکتہ'' کے عنوان سے تحریر کی جو کافی مقبول ہوئی۔ سید الٰہی بخش حسینی (متوفی ۱۷۸۳ء) نے ۱۸۶۳ء میں خورشید جہاں نما قلم بند کیا جو تاریخ عالم و آدم کی ایک مبسوط دستاویز ہے اور ایشیاٹک سوسائٹی میں محفوظ ہے۔ ڈھاکہ کے ناظم سید علی خان بہادر نصرت جنگ نے تاریخ نصرت جنگی لکھی اور مہاراجہ کلیان سنگھ نے خلاصۃ التواریخ اور عجائب الواردات کے زیر عنوان دو تحقیقی اور مستند تواریخ قلم بند کئے۔

مندرجہ بالا تواریخی تصانیف کے علاوہ امیر علی خان نے بیر نگ نامہ، مولوی حیدر بلگرامی نے سوانح اکبری، مولوی نصیر الدین حیدر نے تکمیل یمن اور حمید اللہ خان نے تاریخ چٹا گانگ لکھ کر بنگال کے فارسی ادب کے خزینہ میں گرانقدر اضافہ کیا۔

برطانوی دور حکومت کی ایک خصوصیت یہ رہی کہ انگریزوں نے اپنے اعلیٰ افسروں کو فارسی سے روشناس کرانے کی خاطر پر اثر اقدامات اٹھائے جس کے نتیجے میں یوروپی مستشرقین کی ایک بڑی تعداد فارسی ادب میں دلچسپی لینے لگی ان میں ولیم چیمبرس (William Chambers) فرانس بالفور (Franies Balfocto) ولیم کیرپیٹرک (Willizamkirpatrick) فرانس گلیڈون (Francis Gladwin) نیل بنجامین ایڈمنسٹون (Neil Berjamin Edmonstone) کے نام قابل ذکر ہیں انہوں نے فارسی ادب میں دلچسپی لی اور وقیع تصانیف چھوڑیں علاوہ ازیں یوروپی مستشرقین نے فارسی و عربی ادب کا خصوصی مطالعہ کیا اور فارسی نسخوں کی بازیابی اور تحفظ کے میدان میں گرانمایہ خدمات انجام دیں۔

انگریزوں کے عہد حکومت میں مرشد آباد کا شہر پردہ خفا میں پڑ گیا اور شہر کلکتہ پایہ تخت قرار پایا، اب زیادہ تر ادبی تحریکیں کلکتہ میں سمٹ آئیں۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ بنگال کے دوسرے اضلاع فارسی زبان و ادب کی خدمت سے قاصر رہے۔ کلکتہ کے علاوہ ڈھاکہ، چٹا گانگ، فرید پور، کملا، سلہٹ، بردوان وغیرہ میں مقیم شعراء و ادباء نے فارسی زبان کی خوب آبیاری کی۔

کلکتہ کی سرزمین پر ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا قیام، فارسی، عربی، اردو، بنگالی ادب کی پیشرفت میں ایک نئے باب کا اضافہ تھا۔ اس کالج میں دور دراز سے علماء و فضلاء جمع ہو گئے اور فارسی اور اردو میں درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کا عمل تیز تر ہو گیا۔ بے شمار فارسی کتابیں مثلاً

چہار درویش، تاریخ جہانگشائی، عیار دانش، طوطی نامہ، گلستان و بوستان وغیرہ اردو کے قالب میں ڈھل کر سامنے آئیں۔ ممتاز ادیبوں میں میر امن دہلوی، شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، کاظم علی جواں، مولوی اکرم علی کے نام قابل ذکر ہیں۔

اسلامی علوم اور عربی و فارسی زبان و ادب کے فروغ کی خاطر ۱۷۸۰ء میں مدرسہ عالیہ کا قیام عمل میں آیا۔ بے شمار علماء فضلاء ملک کے دور دراز خطوں سے آکر مدرسے میں درس و تدریس کا کام انجام دینے لگے۔ درس و تدریس کے علاوہ انھوں نے فارسی زبان میں بہترین تصانیف مکمل کیں ان میں ملا معین الدین، مولانا محمد وجیہ، مولوی الہ داد، مولوی لطف الرحمٰن بردوانی، مولانا ولایت حسین، مولوی ہدایت حسین، علامہ عبدالرحمٰن کاشغری مولانا ظفر احمد عثمانی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس مدرسے سے منسلک نہ صرف مسلم علماء بلکہ انگریز دانشوروں نے بھی جو عام طور پر مدرسہ عالیہ کے پرنسپل ہوا کرتے تھے فارسی ادب اور تحقیق میں قابل قدر کارنامے انجام دیے۔ ان فاضل دانشوروں میں سر ولیم نساؤ لیز (Sir William Nassal Lees) ہنری فرڈینینڈ بلاکمین (Henry Ferdinand Blochmann) جی۔ ایس۔ اے۔ رینکنگ (G.S.A.Run King) سر ایڈ وارڈ ڈینیس راس (Sir Edward Denison Ross) اور اے۔ ایچ ہارلے۔ (A.H.Harley) کے اسماء گرامی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان حضرات کا اہم اور قابل قدر کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بیشتر فارسی کتابوں کی تدوین کا کام اپنے ذمہ لیا۔ اور تدوین کے علاوہ انگریزی زبان میں ترجمے بھی کیے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ بیشتر متذکرہ مستشرقین ایشیاٹک سوسائٹی سے منسلک رہے جس کا قیام ۱۷۸۴ء میں سر ولیم جونس کے ہاتھوں گورنر جنرل آف انڈیا وارن ہسٹنگز کے دور حکومت میں عمل میں آیا۔ ولیم جونس فارسی ادب کا دلدادہ تھے۔ گو اس کا تعلق محکمہ عدلیہ سے تھا لیکن فارسی، عربی، سنسکرت اور پالی کے قلمی نسخوں کی بازیافت کی خاطر اس نے ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد رکھی اور بے شمار قدیم نسخے جمع کیے دوسرے لفظوں میں فارسی ادب کی بازیافت میں ایک اہم اور قابل تحسین کردار ادا کیا۔ صرف یہی نہیں فارسی کتب تاریخ کی اشاعت کی غرض سے اس نے بلوتھیکا انڈیکا سیریز (Bibliotheca Indica Series) کا آغاز کیا جس کے زیر اہتمام بیشتر فارسی تاریخی دستاویزات زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئیں۔ اس سیریز سے قبل مطبع نول کشور بھی قبیل کے کارنامے انجام دے چکا تھا لیکن ایشیاٹک سوسائٹی نے فارسی کی اہم تصانیف کی تدوین کا بیڑہ اٹھایا اور انہیں عالمگیر تبصروں کے ساتھ اشاعت کر فارسی طباعت کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور ساری دنیا میں قدیم فارسی نسخوں کو تدوین و تبصرہ کے ساتھ شائع کرنے کا رواج عام ہو گیا۔ وہ کتابیں جو تدوینی مراحل سے گذر کر بی۔ آئی۔ سیریز کے تحت منظر عام

پر آئیں ان میں شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی، احمد یادگار کی تاریخ شاہی، ابوالفضل علامی کا اکبر نامہ، عبدالحمید لاہوری کا پادشاہ نامہ، عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ، معتمد خان کی تاریخ جہانگیری محمد کاظم کا عالمگیر نامہ، شاہنواز خان کی تصنیف معاصر الامراء، غلام حسین سلیم کی تالیف ریاض السلاطین، یوسف علی خان کی تاریخ مہابت جنگی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ایشیاٹک سوسائٹی نے نہ صرف فارسی کتابوں کو زیور طبع سے آراستہ کیا بلکہ بیشتر فارسی تخلیقات کے انگریزی تراجم بھی شائع کیے۔ اس ادارے کے زیر نگرانی ایچ جی ریورٹی (H.G.Raverty) نے طبقات ناصری، بی دے (B. Dey) نے طبقات اکبری بیورج (Baveridge) نے اکبر نامہ، بینی پرساد (Beni Prasad) نے قانون ہمایونی، عبدالسلام نے ریاض السلاطین اور ڈاکٹر عبدالسبحان نے تاریخ مہابت جنگی کو انگریزی زبان کے قالب میں ڈھالا محفوظ الحق نے مجمع البحرین اور رباعیات عمر خیام کا نہ صرف مدوّن شدہ متون تیار کیے بلکہ نقد و نظر کے ساتھ ساتھ سلیس اور خوبصورت انگریزی تراجم بھی پیش کیے۔ علاوہ ازیں ولادیمیر ایوانو (Wladimir Ivanow) نے سوسائٹی میں موجود بیش قیمت اور نادر الوجود قلمی نسخوں کی شاندار فہرستیں تیار کیں جو آج بھی فارسی علم و ادب کے مراکز کے داد و تحسین حاصل کر رہی ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی کا ایک اور اہم علمی کارنامہ ایشیاٹک سوسائٹی جرنل کی اشاعت ہے جس نے ایک عرصے تک تحقیق و تنقید کے نئے گوشوں کی بازیافت کی اور فارسی اور عربی علوم کے بیشتر علمی و ادبی شاہکاروں کا تعارف و تجزیہ پیش کیا مختصر یہ کہ ایشیاٹک سوسائٹی نے فارسی ادب پر عظیم احسانات کیے ہیں جو زریں حروف سے لکھنے کے لائق ہیں۔

فارسی ادب کی تاریخ میں انیسویں صدی کے دوران بڑے انقلاب رونما ہوئے خصوصاً بنگال میں فارسی کو جہاں عروج کے زینے ملے وہیں زوال کی کھائیاں ملیں ۱۸۵۶ء میں اودھ کے نواب واجد علی شاہ معزول کر دیے گئے انگریزوں نے انہیں مع اہل و عیال اور خدام و دربار کلکتہ کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا اور وہ مٹیا برج کے علاقے میں آبسے۔ تخت و تاج کے چھن جانے کے بعد انھوں نے اس دیار میں اپنا دربار آراستہ کیا اور شعر و شاعری کی محفلیں سجائیں۔ علماء و فضلاء ادباء شعراء اور موسیقاروں کی ایک بڑی تعداد مٹیا برج میں جمع ہو گئی اور بنگال کا یہ علاقہ لکھنؤ ثانی کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

یہ ایک حسین حسن اتفاق تھا کہ سلطنت میسور کے زوال کے بعد ٹیپو سلطان کے جانشینوں کو بھی شہر بدر کر دیا گیا اور انہیں کلکتہ جانے کا حکم صادر کیا گیا۔ ٹیپو سلطان کے پوتے شہزادہ بشیر الدین توفیق اور شہزادہ عظیم الدین فارسی کے مایہ ناز شاعروں میں شمار کیے گئے۔ اور ان کی موجودگی نے بھی کلکتہ کو شعر و ادب کا لالہ زار بنا دیا۔

ڈھاکہ کے نوابوں نے بھی علم وادب کی ترویج واشاعت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ان میں خصوصی طور پر خواجہ عبدالحکیم اور خواجہ عبدالرحیم صبا کے نام قابل ذکر ہیں ان کے زمانے میں ڈھاکہ کی ثقافتی زندگی میں فارسی زبان وادب کا ہی طوطی بولتا تھا۔ ان حضرات کی فیاضانہ سرپرستی میں خواجہ حیدر خان، خواجہ عبداللہ کوکب، خواجہ عبدالغفار اختر، نواب احسان اللہ شاھین جیسے مایہ ناز شعرا کرام نے بنگال کی سرزمین کو مشکبار کیا۔ خواجہ عبدالرحیم صبا نے تاریخ کشمیریان ڈھاکہ لکھ کر کشمیری مشاہیر قلم کی یاد تازہ کردی۔

انیسویں صدی کے اوائل میں کلکتہ کی ادبی وثقافتی زندگی کا اندازہ ہم اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ یہاں میرزا اسد اللہ خاں غالب جیسے عظیم اور مایہ ناز شاعر کو بھی بڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑا۔ ۱۸۲۸ء میں غالب نے کلکتہ کا سفر کیا اور تقریباً ڈیڑھ سال یہیں مقیم رہے۔ اسی قیام کے دوران انہوں نے فورٹ ولیم کالج کے ایک مشاعرے میں شرکت کی اور وہاں اپنی غزل پیش کی لیکن کلکتہ کے ناقدین فن نے غالب کے کلام کو مورد تنقید و تنقیص بنایا۔ غالب اس بات سے کبیدہ خاطر بھی ہوئے۔ جب غالب نے لغت نامہ برھان قاطع کے رد و قدح میں قاطع برھان لکھی تو سارے ہندوستان کے علمی حلقوں میں ایک طوفان برپا ہوگیا اور احمد علی احمد نے جو اس دور کے ممتاز ادیب وشاعر تھے موید برھان لکھ کر غالب کے قاطع برھان وبے بنیاد اور دور از قیاس قرار دیا۔ احمد علی احمد نے موید برھان کے علاوہ رسائل استحقاق، تاریخ صنف مثنوی ترانہ عظمت آسمان شمشیر تیز تر وغیرہ تألیف کی اور گرانقدر شعری ونثری خدمات انجام دیں۔

یہی وہ زمانہ تھا جب بنگال کی سرزمین پر راجہ رام موہن جیسی شخصیت بنگال کی نشاۃ ثانیہ میں منہمک تھی انہوں نے ۱۸۲۲ء میں مراۃ الاخبار کے نام سے ایک فارسی اخبار شائع کیا جب کہ اس زمانے میں کسی فارسی اخبار کا تذکرہ ہمیں نہ ایران میں ملتا ہے نہ افغانستان میں۔ فارسی صحافت کے میدان میں آج بھی شہر کلکتہ کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ یہ دور فارسی صحافت کا زریں دور تھا کیونکہ اسی زمانے میں جام جہاں نو، شمس الاخبار، ماہ عالم فروز، آئینہ سکندری، سلطان الاخبار، مہر منیر، حبل المتین، مفتاح الظفر اور آزاد جیسے خبرنامے شائع ہوئے اور فارسی صحافت کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ بہت کم حضرات اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ کلکتہ سے شائع ہونے والے اخبارات نے ۱۹۰۶ء کے ایران آئینی انقلاب میں خاصہ کردار نبھایا تھا۔ ایران اور افغانستان کی اکثر درسی کتابیں کلکتہ یا بمبئی کی مطبوعات ہوتی تھیں یہاں تک کہ حافظ شیرازی کے دیوان کا پہلا ایڈیشن ۱۷۹۱ء میں شہر کلکتہ کی سرزمین پر زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آیا۔

مسلم دانشوروں کے علاوہ ہندو اہل علم حضرات نے بھی فارسی ادب کی خوب آبیاری کی راجہ رام

موہن رائے نے خدا کی وحدانیت پر تحفۃ الموحدین فارسی میں تحریر کی اور مقدمہ عربی زبان میں لکھا۔ ان کے علاوہ گریش چندر سین، بھرت چندر رائے، راجہ کرشن دیب بہادر، دیویندر ناتھ ٹیگور، ہری ناتھ دے، دینا ناتھ پنڈت، راجہ نند سے متر ا، یتی چرن متر اجیسے مشاہیر قلم نے فارسی زبان کی ایسی آبیاری کی جو آب زر سے لکھنے کے لائق ہے ان میں سے بعض اہل قلم نے فارسی زبان میں اپنی تخلیقات قلم بند کیں بعضوں نے فارسی ادب کو بنگلہ زبان میں منتقل کرنے کا بیڑہ اٹھایا دوسرا اہل قلم حضرات نے فارسی کی تاریخی تصانیف کا متن تیار کیا اور بعض نے ان گرانقدر تصانیف کو انگریزی کے قالب میں ڈھال دیا، مختصر یہ کہ ان کے کارناموں سے فارسی زبان کی بیشتر تالیفات کو نئی زندگی ملی اور تحقیق وتنقید کا میدان کافی وسیع ہوگیا۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں بنگال کے آسمان علم وادب پر کئی اور روشن ستارے ابھرے جنہیں صوفی فتح علی ویسی، عبداللہ سہروردی، خادم بردوانی، عبدالغفور نساخ عبدالعلی ورفی، سید کرامت علی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات بڑے پائے کے شعراء وعلماء تھے ان کے کلام کے مجموعے آج بھی فارسی زبان میں ان کے مشق سخن کی غمازی کرتے ہیں۔ عبیدی کا ایک قابل تحسین کارنامہ فارسی اخبار دوربین کی ادارت ہے جو اس زمانے میں خواص کی توجہ کا مرکز تھا۔ عبدالغفور نساخ نے دیوان کے علاوہ اپنی رباعیوں کا ایک مجموعہ مرغوب دل کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ انہوں نے اردو اور فارسی ادیبوں اور شاعروں کا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا تذکرۃ المعاصرین کے نام سے مشہور ہے۔ ہوگلی محسن امام باڑہ کے متولی سید کرامت علی نے رسالہ در لغت لکھی اور عبدالعلی ورفی نے ارمغان احباب کے عنوان سے اپنے کلام کا مجموعہ اپنے رفقاء کی نذر کی۔ مہاراجہ اپورو کرشن بہادر نے ہندوستان کی تاریخ کو شعری جامہ پہنایا اور "شاھنامہ ہند" منظوم کیا۔ ان اصحاب قلم اور شعرائی ذی وقار کے علاوہ جن بزرگوں نے فارسی زبان میں اپنی تخلیقات کے گل بوٹے کھلائے ان میں اکرام احمد ضیغم، عصمت اللہ خاں اتخ بخشی، قادر بخش مفتون، قاضی محمد خان اختر، وحید احمد محمود، نصیر اللہ رمز، وجیہ اللہ سمیع، عبدالباری سعید، عبدالمومن ذوقی، نصیر الدین میر، رشیق کے اسمائے گرامی روشن ہیں۔

۱۸۳۷ء میں برطانوی حکومت کیا ایک آرڈیننس کے ذریعہ فارسی زبان کی جگہ انگریزی، اردو ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں کو سرکاری دفاتر میں کر دیا، دوسری طرف مغربی افکار وثقافت کا اثر ونفوذ بڑھنے لگا اور اسکولوں اور کالجوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کو فروغ حاصل ہوا۔ عوام الناس میں انگریزی زبان کو بڑی مقبولیت حاصل ہوگئی، کیونکہ ذریعہ معاش اور اعلی سرکاری ملازمت انگریزی زبان جانے بغیر ممکن ہی نہ رہا لیکن اب بھی بازار شعر وسخن میں شمع فارسی فروزاں رہی اور علم وادب کے پروانے اس کے گرد طواف کرتے رہے اور اپنی جان نثاری اور جان افروزی کا ثبوت فراہم کرتے رہے فارسی

شعراء اب اردو میں مشق سخن کرنے لگے لیکن رعب و دبدبہ فارسی ہی کا قائم رہا۔ اس دور کے بیشتر شعراء کے مجموعۂ کلام میں فارسی کلام کا حصہ آج بھی اس بات کا غماز ہے کہ جام فارسی اب بھی ان کے ہونٹوں کو شراب ارغوانی سے تر کر رہا تھا۔ سید شرف الحسینی کی گلستان شرف اور رضا علی وحشت کا ''ترانۂ وحشت'' بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ وہ شعراء جو اردو اور فارسی میں یکساں طور پر طبع آزمائی کر رہے تھے ان میں سید محمود آزاد، تمنا گورکھپوری، مظہر الحق حشر، محمود شیرازی، فدا حسین، عبد الرحمن ضیا کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

فارسی زبان و ادب کی گفتگو اور ایران سوسائٹی کا ذکر نہ ہو یہ ممکن نہیں فارسی کے ارباب قلم نے ڈاکٹر محمد اسحق کی رہنمائی میں ۱۹۴۴ء میں اس ادارے کی بنیاد رکھی۔ ان بزرگوں نے فارسی زبان کی پیش رفت اور ہند و ایران کے ثقافتی رشتوں کے فروغ کی خاطر یہ سوسائٹی قائم کی جو آزادی کے بعد فارسی علم و ادب کا ایک عظیم گہوارہ بن گیا۔ یہ ادارہ آج بھی فعال ہے معیاری کتابوں اور انڈو ایرانیکا جیسے رسالے کی اشاعت کے علاوہ مختلف موضوعات پر کانفرنس اور سیمنار وغیرہ کا انعقاد اس کے امتیازی کارنامے ہیں۔ علاوہ ازیں شہر کلکتہ میں کلکتہ یونیورسٹی، شانتی نکیتن میں وشوا بھارتی یونیورسٹی دو مراکز ہیں جن سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ بنگال میں شمع فارسی کی لو مدھم ہی سہی لیکن اب بھی فروزاں ہے۔

''باقی ہے اس چراغ میں خون جگر ابھی''

منابع و مآخذ:

۱- عبد الستار، تاریخ مدرسہ عالیہ کلکتہ، ڈھاکہ ۱۹۵۹ء۔

۲- حکیم حبیب الرحمن، آسودگان ڈھاکہ، ڈھاکہ ۱۹۴۶ء۔

۳- احرار نقوی، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ۳، ۴، ۵، لاہور ۱۹۷۲ء۔

۴- خالدہ حسینی، ایشاٹک سوسائٹی کلکتہ کی خدمات فارسی کلکتہ ۱۹۹۷ء۔

۵- مطیع الرحمن، آئینۂ دیس، پٹنہ ۱۹۷۶ء۔

۶- ظہور الدین احمد، پاکستان میں فارسی ادب، لاہور ۱۹۹۳ء۔

۷- شیخ محمد اکرام، آب کوثر، دہلی ۱۹۹۴ء۔

۸- حمیدہ بیگم، فورٹ ولیم کالج کے ادبی خدمات لکھنؤ ۱۹۸۳ء۔

بنگالی

محمد عبد اللہ۔ بانگلا و شیر فارسی ساہتو، ابیشے شتابدی، ڈھاکہ ۱۹۸۳ء۔

English :

☆ Abdul Karim, Social History of the Muslim in Bengal, Dacca 1959.

☆ Abdur Rahim, Cultural History of Bengal Vol. I & II, Karachi 1963.

☆ Gholam Sarwar Parsian, Studies urdu the Turko Afghans, Ph. Thesis (CU).

☆ M. Mohar Ali, History of the Muslim of Bengal, Vol III, Riyadh 1985.

☆ Abdul Latific, Muslim Mystic Movement in Bengal, Calcutta, 1993.

☆ Nabi Hadi, Dictionary of Indo Persian Literature, New Delhi, 1995.

☆ M. Firoz, Ubaidi Suhrawardi, Calcutta, 2006.

Article:

☆ Gholam Sarwar, Persian in Bengal (1203-1947), Indo-Iranica, Vol. 59, No. 3-4, Sept. 2006.

☆☆☆

ابوسفیان اصلاحی*

مثنوی مولانا روم میں نقوش انسانیت

(پہلی جلد)

مثنوی مولانا روم کا تصوف سے وہی تعلق ہے جو جسم کا روح سے۔ تصوف ایک فلسفہ ہے اور اس فلسفے کی بھرپور نمائندہ مثنوی مولانا رومؒ۔ اس فلسفے کی تائید و توصیف میں قرآن کریم، احادیث نبویہ، آثار صحابہؓ اور صوفیۂ کرام نیز اولیاء عظام کو بطور ماٴ خذ استعمال کیا گیا ہے، کہیں کہیں عربی شاعری کا کمال بھی منظر عام پر لانے کی قابل قدر کاوش کی گئی ہے۔ مثنوی مولانا روم کے بہت سے خیالات سے اختلاف کی گنجائش ہے، بہت سی باتیں بطور احادیث نقل کی گئی ہیں لیکن مجموعہ ہائے احادیث اس سے خالی ہیں۔ تمام تر اختلافات کے باوجود یہ مثنوی اس قدر خصوصیات کی حامل ہے کہ ہر عہد میں ارباب فکر و دانش کا مرجع بنی رہے گی۔ فارسی زبان و ادب کا ایسا خزینہ ہے کہ تا قیامت اس کی حکمتوں کا فیضان یوں ہی جاری و ساری رہے گا۔ اس میں تفسیر قرآن اور توضیح احادیث دونوں ہیں اور ہر فکر اور ہر آواز میں دعوت الی التصوف بھی۔ اس کی بعض کہانیاں ایسی ہیں جنھیں پڑھ کر شرم سے سر جھک جاتا ہے۔ تصوف کے بغیر جسم اور روح کے تعلق کا ادراک مستبعد ہے۔ مولانا روم کی ہر تان روح پر ٹوٹتی ہے۔ روح کی بالیدگی کی تفہیم و تشریح کے لیے ہزار ہا انداز اختیار کیے گئے۔ متصوفین کے نزدیک استدلال و استشہاد کا یہ ایک مستند ذریعہ ہے۔

مثنوی مولانا روم کے اشعار سے الفت و محبت کے نغمے پھوٹتے ہیں۔ مروت و انسانیت کی ترجمانی، بنی نوع انسان کی اصل حیثیت، کمال ضبط کی تلقین، کبر و نخوت پر تیشہ زنی اور وفاداری اور انکساری کی تعریف و تذکیر کی گئی ہے۔ اسی طرح فساد فی الارض، عداوت، ظلم و تعدی اور قہر و غضب سے اجتناب پر زور دیا گیا ہے۔ نیک بننا، نیکوں کی صحبت اختیار کرنا اور نیکیوں کو عام کرنا مولانا روم کے یہاں معراج ہے۔ اس میں دل بستگی اور شگفتگی کے ایسے سامان ہیں کہ جنھیں انسانی اقدار کا معیار و محور قرار دیا

---

* اسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

جا سکتا ہے۔ اس میں زہر کا وہ تریاق ہے جس کا ملنا دشوار است۔ آج کی دکھتی، تڑپتی اور بلبلاتی ہوئی انسانیت کے لیے یہ مثنوی کسی درماں سے کم نہیں۔ اس میں عشق حقیقی کی غیر معمولی جلوہ سامانی ہے اور اسی جلوہ سامانی کا تسلسل عشق انسانی سے جا جڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا روم نے خلق خدا کو ''عیال اللہ'' کا درجہ دیا ہے اور اس کے لیے فرحت قلب بن جانا آپ کا عین مسلک ہے۔

ما عیال حضرتیم و شیر خوار گفت الخلق عیال للالہ

(ہم اللہ کے عیال اور شیر خوار ہیں (خدا نے) فرمایا ہے مخلوق اللہ کی عیال ہے)

مولانا روم کے خیالات سے مبرہن ہے کہ عشق حقیقی کے بغیر عشق ابن آدم نا مکمل اور نا تمام رہے گا، خالق کو مخلوق سے الگ کر کے مخلوق کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا، خالق کے تعلق سے انسانی تعلق کی راہیں استوار ہوتی ہیں۔ خالق اور مخلوق کے مابین ایک ایسا التزام ہے کہ دونوں کو منفصل کیا جا سکتا ہی نہیں۔ اسی لیے مولانا روم نے عشق حقیقی کے ساتھ ساتھ اس کے بندوں کے دلوں میں اترنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور قرآن کریم کا اصول تکریم انسانیت اور تقویم انسانیت آپ کے پیش نظر تھا۔ اسی لیے انھوں نے حب خداوندی کو سنگ میل اور حب انسانیت کو مشعل جاں تصور کیا ہے۔ عشق حقیقی میں یوں زمزمہ سنج ہیں:

عشق حقیقی:

جسم خاک از عشق بر افلاک شد کوہ در رقص آمد و چالاک شد

(خاکی جسم عشق کی وجہ سے آسمانوں پر پہنچا۔ پہاڑ ناچنے لگا اور ہوشیار ہو گیا)

جملہ معشوق ست و عاشق پردہ زندہ معشوق ست و عاشق مردہ

(تمام کائنات معشوق ہے اور عاشق پردہ ہے، معشوق زندہ ہے اور عاشق مردہ ہے)

زانکہ عشق مردگاں پایندہ نیست چونکہ مردہ سوئے ما آیندہ نیست

(اس لیے کہ مردوں سے عشق پائدار نہیں ہے، اس لیے کہ مردہ ہماری طرف آنے والا نہیں ہے)

رفاقت:

عشق حقیقی سے متعلق نہ جانے کتنے اشعار سے مثنوی مملو ہے۔ عشق حقیقی انسانوں کو تمام روگوں سے نجات دلانے کا ضامن ہے اور یہی مخلوق کو خالق سے عشق کا پابند بنا دیتا ہے۔ رفاقت، موانست اور غم خواری مولانا روم کی شخصیت کا جز لاینفک ہے، درد دیکھ کر دردمند بن جانا اور مظلوم و مقہور کو دیکھ کر مضطرب ہو جانا شیوۂ روی تھا۔ احباب کو خوش رکھنا اور خوشیوں کو تقسیم کرنا ہی زندگی کا لائحہ عمل تھا اور اسی کی عکاسی اپنے اشعار و افکار میں کرتے رہے:

طیبات از بہر کہ للطیبین   یار را خوش کن مرنجان و ببین

(پاک چیزیں کس کے لیے ہیں۔ پاک لوگوں کے لیے، دوست کو خوش رکھ اور رنجیدہ نہ رکھ اور دیکھ)

یاد یاراں یار را میموں بود   خاصہ کاں لیلیٰ و ایں مجنوں بود

(دوستوں کی یاد دوست کے لیے مبارک ہوتی ہے، خصوصاً جب کہ وہ لیلیٰ اور یہ مجنوں ہو)

مولانا کے یہاں وفاداری اور رفاقت کی بے پناہ اہمیت ہے۔ بے وفائی اور عداوت خطرہ عظیم ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرتی اقدار ٹوٹ جاتی ہیں!

زہر محض ست آں کہ باشد بے وفا   ہب لنا یا ربنا نعم الوری

(جو بے وفا ہے وہ خالص زہر ہے اے ہمارے پروردگار ہمیں اچھی مخلوق عطا کر دے)

مولانا نے وفاداری اور عہد کی پاسداری کو نہ صرف یہ کہ اسے معاشرتی اقدار میں شامل کیا ہے بلکہ اسے دینی فریضہ قرار دیا ہے۔

وعدہ کردن را وفا باشد بجاں   تا بہ بینی در قیامت فیض آں

(وعدہ کو جاں (ودل) سے پورا کرنا ضروری ہے، تاکہ قیامت میں تو اس کا فیض دیکھے)

مواسنت:

مثنوی کے بہت سے اشعار سے مولانا کی رقیق القلبی اور غم گساری عیاں ہے۔ مولانا زندگی کی تمام جہتوں سے بخوبی واقف تھے اور انسانی قدروں کی نزاکتوں پر اچھی گرفت تھی اور ان تمام پہلوؤں کا اہل اسلام اور تصوف کی روشنی میں جائزہ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا دل دریائے محبت میں غوطہ زن تھا۔ مندرجہ اشعار میں محبت ومودت کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔

اے مبارک خندہ آں لالہ بود   می نماید دل چو در از درج جاں

(اس شخص کی مسکراہٹ بڑی مبارک ہے جو موتی جیسا صاف آبدار دل جان کی ڈبیہ سے دکھاتا ہے)

رحم خواہی رحم کن بر اشکبار   رحم خواہی بر ضعیفاں رحم آر

(تو رحم چاہتا ہے تو آنسو بہانے والے پر رحم کر، تو رحم چاہتا ہے تو کمزوروں پر رحم کر)

ہر کجا آب رواں سبزہ بود   ہر کجا اشک رواں رحمت شود

(جہاں کہیں آب رواں ہو سبزہ ہوتا ہے، جہاں کہیں اشک رواں ہو رحمت ہوتی ہے)

لفظہا و نامہا چوں دامہا است   لفظ شیریں ریگ آب عمر ماست

(لفظ اور نام جالوں کی طرح ہیں۔ میٹھا لفظ ہماری عمر کے پانی کا ریت ہے)

بحر کو آبے بہر جو می دہد   ہر خسے را برسرو رو می نہد

(وہ دریا جو نہر کو پانی دیتا ہے اور ہر تنکے کو سر اور منھ پر رکھتا ہے)

کم نخواہد گشت دریا زیں کرم   از کرم دریا نگردد بیش و کم

(اس کرم کی وجہ سے دریا کم نہ ہوگا۔ کرم کی وجہ سے دریا کا کچھ گھٹتا بڑھتا نہیں)

مہر تلخاں را بشیریں می کشد   زانکہ اصل مہر ہا باشد رشد

(محبت کڑوؤں کو مٹھاس کی طرف کھینچتی ہے، اس لیے کہ محبتوں کی اصل راہ روی ہے)

صالحین:

مولانا روم کے یہاں اس طرح کے مذکورہ خیالات کا ایک دفتر موجود ہے بلکہ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس مثنوی میں خزینہ محبت مدفون ہے، اسے ابھارنے اور اس پیغام محبت کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ تقدیم محبت کے لیے رومی نے بے شمار انداز اپنائے۔ مذکورہ اشعار میں مسکراہٹوں کو لٹانے، مجسم رحم و کرم بن جانے، آب رواں ہو جانے اور بحر بیکراں کے مانند لٹانے کی بات کرتے ہیں، مثنوی اور خود مولانا منارۂ نور کے مثل ہیں۔ دل جیتنا اور دلوں کے لیے فرحت وانبساط بن جانا مولانا کی فطرت تھی۔ وہ ساری دنیا میں نیکیوں اور اچھائیوں کو عام کرنے کے خوگر تھے۔ صحبت صالح آپ کا متاع بے بہا تھی۔ مولانا کا مندرجہ شعر نہ جانے کہاں کہاں نقل کیا جاتا ہے اور کہاں کہاں پڑھا جاتا ہے۔

صحبت صالح ترا صالح کند   صحبت طالح ترا طالح کند

(نیک کی صحبت تجھے نیک بنائے گی، بدبخت کی صحبت تجھے بدبخت بنائے گی)

اسی خیال کی ترجمانی دوسرے اشعار میں بھی کی گئی ہے:

نیکواں رفتند وسنتہا بماند   وز لئیماں ظلم و لعنتہا بماند

(نیک لوگ گزر گئے اور ان کے طریقے رہ گئے، اور کمینوں سے ظلم اور لعنتیں باقی رہ گئیں)

ہر کہ او ابداع ناخوش ساختے   سوئے او نفریں رود ہر ساعتے

(جس کسی نے کوئی طریقہ ایجاد کیا اس کی جانب ہر وقت لعنت جاتی ہے)

رنگہائے نیک از خم صفات   رنگ زشتاں از سیاہ آبہ جفات

(نیک لوگوں کے رنگ صفا کے مٹکے سے ہیں اور بروں کے رنگ میل کچیل کے سیاہ پانی سے ہے)

صبغۃ اللہ نام آں رنگ لطیف   لعنۃ اللہ بوئے ایں رنگ کثیف

(صبغۃ اللہ اس پاک رنگ کا نام ہے، لعنۃ اللہ اس گندے رنگ کی بدبو ہے)

زر پرستی:

مذکورہ اشعار سے مترشح ہے کہ مولانا ایک خوبصورت دنیا اور ایک پر کیف ماحول برپا کرنے کے خواہاں تھے۔ وہ قتل و غارت گری، بغاوت و سرکشی اور فساد فی الارض کے معاند تھے۔ عالم انسانی کے در و دیوار کو خوش رنگ بنانے کے لیے مضطرب ہیں۔ انھوں نے تلقین کی ہے کہ صالحین اور خدام خلق کو دنیا ہمیشہ ادب و احترام سے یاد کرتی ہے۔ اور دنیا کے سکون و اطمینان کے قاتلین کی ہمیشہ تذلیل و تحقیر کی گئی ہے، صالحین کے چہروں پر چمک اور بدکاروں کے چہروں پر ظلمت و سیاہی کی لیپ ہوتی ہے۔ "ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ" (ان پر ذلت و حقارت پوت دی گئی ہے)۔ پاکباز اور پاک طینت لوگوں نے اللہ کے رنگ کو تمام رنگوں کے بالمقابل ترجیح دی ہے کیوں کہ یہ رنگ تمام رنگوں سے اعلیٰ و افضل ہے "صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ" (اللہ کا رنگ اختیار کرو اور اللہ سے اچھا رنگ کس کا ہوگا) اور یہ رنگ سادگی، انکساری اور تقنع سے متصف ہے۔

زر و نقرہ چیست تا مفتوں شوی — چیست صورت تا چنیں مجنوں شوی
(سونا اور چاندی کیا ہے؟ کہ تو اس کا عاشق ہے، صورت کیا ہے؟ کہ تو ایسا پاگل ہے؟)

ایں سرا و باغ تو زندان تست — ملک و مال تو بلائے جان تست
(یہ محل اور باغ، تیرا قید خانہ ہے، تیرا ملک اور مال تیری جان کے لیے مصیبت ہے)

اے خنک آں کو نکو کاری کند — زور را بگذارد و زاری کند
(اے (مخاطب) قابل مبارکباد ہے وہ شخص جو نیکی کرے، زور کو چھوڑ دے اور عاجزی اختیار کرے)

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ — خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ
(پتھر (موسم) بہار میں کب سرسبز ہوتا ہے، مٹی بن جا تا کہ رنگ برنگ کے پھول اگیں)

بند بگسل باش آزاد اے پسر — چند باشی بند سیم و بند زر
(اے بیٹا! قید کو توڑ، آزاد ہو جا، سونے چاندی کا قیدی کب تک رہے گا)

کبر سے اجتناب:

یہ مثنوی دراصل کتاب تصوف ہے اور تصوف میں جھکاؤ، تذلل اور بے نفسی کی تعلیم دی گئی ہے۔ ایک صوفی کی نظر میں یہ دنیا محض زخرف ہے۔ وہ دنیاوی جاہ و حشمت اور عظمت و رفعت کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، یہ سب چیزیں میل کے مترادف اور ظل زائل کے مانند ہیں۔ اس کا ایک ہی رجحان اور ایک ہی عمل اور وہ ہے عشق الٰہی۔ یہ عشق اس کے اندر ایسا ثبات اور ایسا استقلال پیدا کر دیتا ہے کہ دنیاوی رنگینیاں اس

کے قدموں کو مرتعش نہیں کر سکتیں۔ مولانا نے انکبار کو خلاف انسانیت قرار دیا ہے، کبر شیطان کی اور خشوع خضوع انسان کی علامت ہے۔

مرد را زنبور گر نیشے زند — طبع او آں لحظہ بر دفعی تند
(اگر انسان کو بھڑ ڈنک مارتی ہے، اس کی طبیعت اس وقت اس کو دفع کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے)

زخم نیش اما چو از ہستیٔ تست — غم قوی باشد نگردد درد سست
(لیکن اگر تیرے تکبر کا ڈنک کا زخم ہے، تو غم زیادہ ہوگا، درد کم نہ ہوگا)

شکر کن غرہ مشو بینی مکن — گوش دار و ہیچ خود بینی مکن
(شکر کر، گھمنڈ نہ کر، انکار نہ کر، سن اور کبھی تکبر نہ کر)

صد دریغ و درد کایں عاریتے — امتاں را دور کرد از امتے
(افسوس صد افسوس کہ اس عارضی چیز نے امتوں کو امت سے دور کر دیا)

پنجہ زد با آدم از نازے کہ داشت — گشت رسوا ہمچوں سرگیں وقت چاشت
(تکبر کی وجہ سے حضرت آدم کے مقابلہ میں آ گیا، اس طرح رسوا ہوا جیسے دن چڑھے گوبر)

بر بدیہائے بداں رحمت کنید — بر منی و خویش بینی کم تنید
(بروں کی برائی پر رحم کرو، خودی اور خود پسندی پر نہ اکڑو)

باد کبر و باد عجب و باد ظلم — برد اورا کہ نبود از اہل علم
(تکبر کی ہوا اور غرور کی ہوا اور سبک سری کی ہوا اس کو اڑا لے گئی، اس لیے کہ وہ اہل علم میں سے نہ تھا)

ظلم و تشدد:

انکبار و افتخار انسانی زندگی کے لیے حد درجہ مہلک ہے۔ اس کی وجہ سے آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اسے نفس کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا، خود سری اور انانیت سر کا تاج بن جاتی ہے۔ کبر قرابتوں اور محبتوں کا دشمن ہے۔ نفس پرستی کو ہوا دیتی ہے۔ خود عدم توازن کا شکار ہو جاتی ہے، قرآن کریم نے انکبار کی جو علامتیں پیش کی ہیں مولانا نے اپنی شاعری میں اس سے استفادہ کیا ہے۔ متکبرین سے اللہ کی جنگ ہے اور منکسر المزاج انسان سے اللہ کو پیار ہے۔ انکبار در حقیقت ظلم و تشدد اور عدوان و بغاوت کو نمو دیتا ہے۔ اس کے سبب معاشرتی قدریں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے ظلم و بربریت کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ کیونکہ ظلم سے قوت فکر اور تاب پرواز کند ہو جاتی ہے۔

آہن و سنگ از ستم برہم مزن — کایں دو میزایند ہمچو مرد و زن
(ظلم کو لوہے اور پتھر کو باہم نہ ٹکرا، اس لیے کہ دونوں مرد اور عورت کی طرح بچے دیتے ہیں)

چاہ مظلم گشت ظلم ظالماں — ایں چنیں گفتند جملہ عالماں

(ظالموں کا ظلم اندھیرا کنواں تھا، تمام عالموں نے یہی کہا ہے)

ہر کہ ظالم تر چہش با ہول تر — عدل فرمودست بدتر را بتر

(جو زیادہ ظالم ہے اس کا کنواں زیادہ خوفناک ہے، انصاف نے فرمایا ہے بدتر کو بدتر)

بر ضعیفان گر تو ظلمے می کنی — داں کہ اندر قعر چاہے بے نی

(اگر تو کمزوروں پر ظلم کرتا ہے، سمجھ لے کہ تو اتھاہ کنویں کی گہرائی میں ہے)

سنگ و آہن را مزن برہم گزاف — گہ ز روئے نقل و گہ از روئے لاف

(خواہ مخواہ پتھر اور لوہے کو نہ ٹکرا، کبھی نقل کے طور پر اور کبھی شیخی سے)

ہچو آہن ز آہنی بیرنگ شو — در ریاضت آئینہ بے زنگ شو

(لوہے کی طرح لوہے پن سے بے تعلق ہو جا، ریاضت کرکے بغیر زنگ کے آئینہ بن جا)

عداوت:

مذکورہ اشعار میں ظلم و طغیان سے تہی دامن ہونے کی تاکید کی جا رہی ہے۔ کیونکہ سفاکیت سے اتحاد و اتفاق اور ہم آہنگی اور یگانگت کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ انحطاط اور زوال معاشرے کی علامت بن جاتے ہیں۔ لوگوں کے سامنے صرف مایوسی اور تاریکی ہوتی ہے۔ اس لیے بار بار مولانا نے سنگ و آہن سے گریز کرنے کی تاکید کی ہے۔ عداوتوں سے خوشیاں اور مسرتیں دم توڑ دیتی ہیں۔

ناصحاں گفتند از حد مگذراں — مرکب استیزہ را چنداں مراں

(نصیحت کرنے والوں نے کہا حد سے نہ گزر، جھگڑے کی سواری کو اس قدر تیز نہ دوڑا)

ناصحاں را دست بست و بند کرد — ظلم را پیوند در پیوند کرد

(اس نے نصیحت کرنے والوں کے ہاتھ باندھے اور قید کر دیا، ظلم کو پیوند در پیوند کر دیا)

کایں شہ بیدین و ظالم بس عدوست — می نہ داند ہیچ دشمن راز دوست

(یہ بادشاہ بے دین اور ظالم بہت بڑا دشمن ہے۔ دوست اور دشمن میں فرق نہیں کرتا)

حسد:

مذکورہ اشعار سے مترشح ہے کہ مولانا ظلم و تعدی اور عداوت و قساوت سے معاشرے کو پاک دیکھنے کے خواستگار تھے، وہ دنیا کے گوشے گوشے میں عشق کو بھر دینا چاہتے تھے۔ کیونکہ یہی ایک ایسا نسخۂ کیمیا ہے جو تمام معاشرتی امراض کا سم قاتل ہے۔ اس نسخۂ کیمیا کے فروغ و احیاء کے لیے تا دم زیست فکری

جد و جہد کرتے رہے۔ مولانا مختلف انداز اور مختلف پیرایۂ بیان میں اپنے اس پیغام محبت کو عام کرتے رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ فارسی زبان محبتوں کی زبان ہے۔ اسی لیے اپنے جذبۂ عشق کی تشہیر و تبلیغ کے لیے اسی شیریں زبان کا انتخاب کیا۔ مولانا نے حسد کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے کیونکہ حسد ایک ایسا مہلک مرض ہے جو انسانی اقدار کو تار تار کر دیتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے بھی اس کی شناخت کی طرف یوں اشارہ کیا:

"ومن شر حاسد اذا حسد"

مولانا نے اپنے متعدد اشعار میں حسد کی فتنہ انگیزیوں کا جائزہ لیا ہے:

ایں جسد خانۂ حسد آمد بداں — کز حسد آلودہ گردد خانداں

(یہ جسم حسد کا گھر ہے، سمجھ لے حسد میں پورا خاندان مبتلا ہو جاتا ہے)

خانمانہا از حسد گردد خراب — بادشاہی از حسد گردد غراب

(حسد سے گھرانے تباہ ہو جاتے ہیں۔ حسد کی وجہ سے شاہی باز (دل) کوا بن جاتا ہے)

ایک جگہ ایک وزیر کی فریب کاری اور عیاری کا ذکر کرنے کے بعد یہ شعر نقل کیا کہ

حال عالم ایں چنیں ست اے پسر — از حسد میخیزد ایں ہا سر بسر

(اے لڑکے دنیا کا حال یہی ہے اور یہ سب باتیں حسد سے پیدا ہوتی ہیں)

وزیر کی چالبازیوں اور مکاریوں کی مزید وضاحت درج ذیل اشعار میں کی گئی ہے

بامید آنکہ از نیش حسد — زہر او در جان مسکیناں رسد

(اس امید پر کہ حسد کے ڈنک کے ذریعہ اس کا زہر مسکینوں کی جان پر پہنچ جائے گا)

ہر کسے کو از حسد بینی کند — خویش را بے گوش و بے بینی کند

(جو شخص حسد کی وجہ سے اپنی ناک کاٹتا ہے، وہ اپنے آپ کو بے کان اور بے ناک کا کر لیتا ہے)

غصہ:

قرآن کریم میں مسلمانوں کی بہت سے خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ ایک بنیادی امتیاز یہ ہے کہ انھیں "کاظمین الغیظ" کہا گیا ہے، یعنی وہ غصہ کو پی جانے والے ہیں۔ وہ برانگیختہ اور برافروختہ نہیں ہوتے بلکہ ہر حالت میں توازن اور تناسب کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ بہر نوع فکر و فہم کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے کیونکہ غصہ بڑی سے بڑی تباہیوں اور معاشرتی بعد کا سبب ہے، ایک مغلوب الغضب کو قیام حدود کا خیال نہیں رہتا، گویا کہ قرآن کریم کی زبان میں غصہ بھی ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ یہ ہم آہنگی اور رشتوں کے تمام سلسلوں کو منقطع کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا روم نے بھی اسے ہوائے شر قرار دیا ہے:

باد خشم و باد شہوت باد آز | برد او را کو نبود اہل نماز

(غصہ کی ہوا اور شہوت کی ہوا حرص کی ہوا اس شخص کو جنبش دیتی ہے جو بے نماز ہو)

گفت دشمن را ہمی بینم بچشم | روز و شب بر وی ندارم ہیچ خشم

(کہا میں دشمن کو آنکھ سے دیکھتا ہوں۔ شب وروز اس پر غصہ نہیں کرتا ہوں)

خشم بر شاہاں شہ و ما را غلام | خشم را من بستہ ام زیر لگام

(غصہ بادشاہوں پر حکمراں ہے اور ہمارا غلام ہے، میں نے غصہ پر زین اور لگام کس دی ہے)

مذکورہ مباحث سے واضح ہے کہ مثنوی مولانا روم میں بے شمار ایسے پہلو اور نکات ہیں جن سے عشق ومحبت کے نغمے پھوٹتے اور الفت ویگانگت کے سوتے ابلتے ہیں۔ ہر آن باد نسیم اور رحمت باراں کا احساس ہوتا ہے، یہ مثنوی ایک ایسی دنیائے عجیب ہے جو کراہتوں اور قباحتوں سے پاک ہے، فصل گل سے عبارت اور موسم خزاں سے عداوت ہے، انسانی زندگی مسرتوں سے لبریز اور قساوتوں سے گریز ہے، مولانا نے الفت وعقیدت کے ایسے نغمے چھیڑے کہ برتر وکہتر کے تمام امتیازات مٹ گئے اور اکبر واصغر ایک ہو گئے۔ یہاں اخلاق عالیہ اور اقدار عظیمہ کی ایسی داستان رقم کی گئی ہے کہ جس سے تمام انسانی زخم مندمل ہونے لگتے ہیں۔ مولانا کی شاعری قسی القلب کو قلب سلیم میں تبدیل کرنے کی قابل قدر کاوش ہے، اسے دل کی نزاکتوں کا احساس ہے، اس پر سنگ باری کے برعکس گل پوشی کے لیے خواہاں ہے، اسرار محبت کے افشا کے لیے مولانا نے قرآن کریم، احادیث اور آثار صحابہ سے استدلال کیا ہے، صوفیہ کرام اور اولیا اللہ کے فضائل سے بھی استفادہ کیا ہے۔ داستان محبت کی تشریح وتفسیر میں یہودیت کو ناسور انسانیت قرار دیا ہے۔ ان کی فتنہ انگیزیوں کی نقاب کشائی کی ہے اور انھیں دین اسلام اور دنیائے محبت کا دشمن شمار کیا ہے اس مثنوی کے آئینہ میں آج کے اسرائیل کی قباحت ودنائت کو بھی ملحوظ کیا جا سکتا ہے۔ یہ مثنوی ایک طرف اگر فکر وفلسفہ، زبان وبیان کی میزان اور تصوف، تخلق کا معیار دستور ہے تو دوسری طرف عشق کی انجیل اور لوح محبت بھی۔ لیکن نتیجہ بحث کے طور پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اس مثنوی کا کوئی دینی استناد نہیں ہے، زبان وبیان اور شعری نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت ہے لیکن اسلامی زاویے سے اس کا تجزیہ کیا جائے تو یہ مثنوی بنی نوع انسان کو سردمہری کی تعلیم دیتی ہے اور اس کے اندر اس دنیا سے تنفر کا بیج بوتی ہے جب کہ اسلام اس کا سراسر مخالف ہے کیونکہ دنیا کشت آخرت ہے۔

☆☆☆

محمد فیروز*

انیسویں صدی میں بنگال کا ایک فارسی محقق: آغا احمد علی احمد

انیسویں صدی میں بنگال میں جو فارسی کے محققین گزرے ہیں، ان میں ایک نہایت روشن نام آغا احمد علی احمد (۱۸۳۹ء–۱۸۷۳ء) کا ہے جو ڈھاکہ میں پیدا ہوئے لیکن اپنی زندگی کا آخری ایک تہائی حصہ کلکتہ میں گزارا جہاں وہ کلکتہ مدرسہ میں فارسی کے استاد رہے، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں فارسی کے مخطوطوں کو مرتب کیا اور فارسی لغات، قواعد اور عروض سے متعلق متعدد کتابیں فارسی زبان میں تحریر کیں۔

آغا احمد کا بحیثیت محقق جائزہ لینے سے قبل آئیے ان کی حیات وخدمات پر ایک اجمالی نظر ڈالیں۔

حالات زندگی:

آغا احمد علی احمد کا اصل نام "احمد علی" تھا، تخلص "احمد" جب کہ "آغا" خاندانی لقب تھا جیسا کہ ان کے دادا اور والد کے نام بالترتیب آغا عبد العلی اور آغا شجاعت علی تھے۔[۱]

آغا احمد علی ۲۰ شوال ۱۲۵۵ھ کو ڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔ جیسا کہ ان کے ہم عصر مستشرق ہنری بلوخمن (Henry Blochmann) نے آغا کی فارسی تصنیف لغت آسمان پر اپنے انگریزی دیباچے میں ذکر کیا ہے۔[۲] بلوخمن نے آغا کی تاریخ پیدائش سنہ عیسوی میں نہیں دی ہے لیکن مذکورہ ہجری تاریخ کو اگر عیسوی میں تبدیل کریں تو ۲۷ دسمبر ۱۸۳۹ء کی تاریخ نکلتی ہے۔[۳]

آغا احمد علی نے ڈھاکہ میں فارسی کی تعلیم وہاں کے عالم شاہ جلال الدین بخاری سے حاصل کی[۴] اور بقول بلوخمن اپنی کم عمری میں ہی فارسی ادب میں بے پناہ استعداد حاصل کر لی۔[۵]

آغا ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء میں کلکتہ آ گئے[۶] اور اسی سال انھوں نے شہر کے تال تلہ علاقے میں کلکتہ مدرسہ کے نزدیک ایک اپنا مدرسہ قائم کیا جس کا نام انھوں نے اپنے نام کی مناسبت سے مدرسہ احمدیہ رکھا اور جس کے وہ تاحیات صدر رہے۔[۸]

* سابق ریڈر، شعبۂ عربی وفارسی، کلکتہ یونیورسٹی

کلکتہ میں آغا تحقیق و مطالعے کی غرض سے ایشیاٹک سوسائٹی لگاتار جایا کرتے تھے تاکہ اس کے کتب خانے سے استفادہ کر سکیں اور اس طرح ان کی ملاقات مذکورہ مستشرق ہنری بلوکمن کے علاوہ سنسکرت کالج کے پروفیسر ایڈورڈ کاول (Edward Cowell) سے ہوئی۔ آغا کی علمیت سے متاثر ہو کر پروفیسر کاول نے انھیں ساٹھ روپے ماہانہ تنخواہ پر اپنا نجی اتالیق مقرر کر لیا۔[۹]

اندازہ ہے کہ بلوکمن نے بھی آغا احمد علی سے علمی استفادہ کیا تھا۔ کیونکہ وہ خود کو ان کا "شاگرد" بتاتے ہیں۔[۱۰] پروفیسر کاول ہی کی سفارش پر کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل ولیم ناساؤ لیس (William Nassau Lees)[۱۱] نے آغا احمد علی کو ۱۸۶۳ء میں مدرسہ میں فارسی کا استاد مقرر کر دیا۔[۱۲]

کلکتہ مدرسہ میں آغا کی تقرری کا ذکر کرتے ہوئے عبدالستار جنھوں نے مدرسہ کی تفصیلی تاریخ دو جلدوں میں لکھی ہے فرماتے ہیں کہ "یہی وہ زمانہ ہے کہ مرزا غالب کلکتہ آئے ہوئے تھے اور مسلم انسٹی ٹیوٹ میں ایک مجلس تھی۔ اس مجلس میں آغا صاحب بھی موجود تھے۔ ان دونوں میں کسی علمی مسئلے پر اختلاف پیدا ہو گیا تھا"[۱۳]۔ عبدالستار کے خیال میں آغا احمد علی اور مرزا غالب کے درمیان مذکورہ مجلس میں جو اختلاف رائے پیدا ہوا تھا وہی اس واقعے کا سبب بنا جس میں دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف کتابیں لکھیں۔[۱۴]

تعجب ہے کہ عبدالستار کی طرح دیگر مصنفین نے بھی کلکتہ میں آغا احمد علی کی مرزا غالب سے ملاقات کا ذکر کیا ہے[۱۵] لیکن یہ قطعی ناقابل یقین ہے کیونکہ مرزا غالب کلکتہ میں ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء سے ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء تک مقیم رہے تھے[۱۶] جب کہ آغا احمد علی اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

کلکتہ مدرسہ میں اپنے تدریسی فرائض انجام دینے کے علاوہ آغا احمد علی ایشیاٹک سوسائٹی میں فارسی کے قلمی نسخوں کی تدوین اور فارسی میں مختلف موضوعات پر اپنی کتابوں کی تالیف میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں ہے کہ آغا کب تک کلکتہ مدرسہ سے وابستہ رہے۔ لیکن گمان غالب یہ ہے کہ انھوں نے دوران ملازمت ہی انتقال کیا تھا۔ وہ بلوکمن کے بقول ذما کہ میں بخار میں مبتلا ہو کر ۹ ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ (جولائی ۱۸۷۳ء) کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔[۱۷]

تحقیقی کارنامے:

آغا احمد علی کے تحقیقی کارناموں کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ تدوین مخطوطات اور طبع زاد تصانیف۔

الف ۔ تدوین مخطوطات:

آغا احمد علی نے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانے میں محفوظ تاریخی و ادبی اہمیت کے حامل کئی فارسی مخطوطوں کو اس سوسائٹی کے لیے ایڈٹ کیا اور ان کے ہاتھوں مرتب شدہ ان متون کو سوسائٹی اپنے

مطبوعاتی سلسلے (Bibliotheca Indica Series) کے تحت یکے بعد دیگرے شائع کرتی رہی۔ ان میں سے ساقی مستعد خاں کی مآثر عالمگیری کو آغا نے تنہا ایڈٹ کیا جب کہ دیگر نسخوں جیسے فخرالدین گرگانی کی ویس و رامین، نظامی گنجوی کی 'سکندر نامہ بحری' (اقبال نامہ سکندری)، عبدالقادر بدایونی کی 'منتخب التواریخ'، معتمد خاں کی 'اقبال نامہ جہانگیری' اور ابوالفضل کی 'اکبر نامہ' کو انھوں نے بعض دیگر دانشوروں بشمول اسپرنگر (Springer) اور لیس (Lees) کے اشتراک سے مرتب کیا۔[۱۸]

ب ۔ طبع زاد تصانیف:

آغا احمد علی کی اولین تصنیف جو فارسی لغت نویسی سے متعلق تھی، مؤید برہان (۱۸۶۳ء) تھی۔ یہ کتاب جب ۱۸۶۵ء میں کلکتہ میں شائع ہوئی تو اس شہر کے ادبی حلقوں میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ آغا نے یہ کتاب خود ان کے بقول "برہان کی تائید میں لکھی تھی اور اس نے اس کا نام 'مؤید برہان' رکھا۔[۱۹]" واضح رہے کہ برہان تخلص تھا محمد حسین تبریزی کا جن کی تصنیف 'برہان قاطع' کے خلاف مرزا غالب نے اپنی 'قاطع برہان' (۱۸۶۲ء) لکھی تھی۔

مؤید برہان کے جواب میں جب غالب نے تیغ تیز (۱۸۶۷ء) لکھی تو آغا نے اس کے خلاف شمشیر تیز تر (۱۸۶۸ء) لکھی۔ کیونکہ مؤخر الذکر نے سوچا کہ "خاموش رہنا مناسب نہ ہوگا"[۲۰]۔ مذکورہ تصانیف نے کس طرح مرزا غالب اور آغا احمد علی کے حامیوں کو ایک دوسرے کی موافقت و مخالفت میں کتابوں پر کتابیں لکھنے کا سلسلہ شروع کرنے پر مجبور کیا[۲۱]۔ وہ چونکہ موجودہ مقالے کے دائرے سے باہر ہے اس لیے میں آغا کی دوسری تحقیقی کتابوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

اس طرح کی ایک تصنیف 'رسالہ ترانہ' ہے جو آغا احمد علی نے ۱۸۶۷ء میں لکھی اور بلوکمن نے اسی سال "ایک شاگرد کی طرف سے خراج تحسین کے طور پر شائع کیا۔"[۲۲] یہ رسالہ فارسی میں رباعی کی بحروں سے متعلق ہے۔

آغا کی دوسری کتاب جو فارسی قواعد سے متعلق تھی رسالۂ اشتقاق کے نام سے ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی اور انہوں نے خود ہی اس کا اختصار اردو میں رسالہ مختصر اشتقاق کے عنوان سے ۱۸۷۰ء میں شائع کیا جو "اردو میں آغا احمد کی واحد کتاب" ہے۔[۲۳]

آغا احمد علی کی آخری تصنیف، جو بلوکمن کے انگریزی دیباچے کے ساتھ ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی ہفت آسمان' ہے۔ یہ کتاب فارسی میں مثنوی نگاری کی تاریخ اور اس کی بحروں سے متعلق ہے۔ آغا نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ چونکہ فارسی میں مثنویوں کی سات بحریں مستعمل ہیں اس لیے انھوں نے اس کتاب کا نام ہفت آسمان رکھا ہے[۲۴]۔ چونکہ شائع شدہ کتاب صرف "آسمان اول" ہے جو نظامی گنجوی کی

مثنوی 'مخزن الاسرار' میں استعمال کی گئی بحر سے متعلق بحث پر مشتمل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے مثنوی کی بقیہ چھ بحروں پر بحث کے لیے کتاب کی مزید جلدیں تحریر کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ کیونکہ وہ آسمان اول کے متن میں ایک جگہ ایرانی مثنوی نگار ثنائی مشہدی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ثنائی کی مثنویوں سے متعلق بحث ''آسمان ششم میں کی جائے گی'' [۲۵]۔ لیکن آغا کی بے وقت موت کے سبب اس کا یہ منصوبہ کہ ہفت آسمان کی بقیہ جلدیں مکمل کریں ادھورا رہ گیا۔

آغا نے تاریخ ڈھاکہ بھی لکھی تھی لیکن وہ چھپی نہیں۔ [۲۶]

بحیثیت محقق:

آغا احمد علی احمد کا بحیثیت محقق جائزہ لینے کے لیے ہمیں ان کی ان کتابوں کو پرکھنا ہوگا جن تک ہماری رسائی ہوسکی ہے اور جن کا ذکر اس مقالے کے پچھلے حصے میں کیا جاچکا ہے۔

آغا نے ایشیاٹک سوسائٹی کے لیے جن فارسی مخطوطوں کو ایڈٹ کیا تھا ان میں سے ہم صرف ماثر عالمگیری ہی کو لے سکتے ہیں کیونکہ اسے آغا نے تنہا مرتب کیا تھا جب کہ بقیہ نسخوں کو انھوں نے دوسرے دانشوروں کے اشتراک سے ترتیب دیا تھا۔

ایشیاٹک سوسائٹی نے مآثر عالمگیری کا جو متن ۱۸۷۱ء میں شائع کیا اس کے صفحہ اول پر آغا احمد علی کا نام ایڈیٹر کی حیثیت سے درج ہے اور اس کے ساتھ مدرس کلکتہ مدرسہ میں مذکور ہے۔ آغا نے اس کے مقدمہ میں مآثر عالمگیری کے مصنف محمد ساقی مستعد خاں کے مختصر احوال پیش کیے ہیں [۲۷]۔ کتاب کے حواشی سے یہ صاف ظاہر ہے کہ آغا نے متن کی تدوین کے لیے تین مخطوطوں کو سامنے رکھا تھا۔ ان میں سے قدیم ترین نسخہ کو بنیاد بنایا اور دیگر دو نسخوں سے مقابلہ کرکے عبارات کے فرق کو حواشی میں واضح کیا۔ بعض نکات کی تصحیح و توضیح کے لیے انھوں نے اکثر مستند تواریخ جیسے عالمگیر نامہ، مآثر الامراء، تذکرہ سلاطین چغتا اور 'منتخب اللباب' سے حوالے بھی حاشیے میں دیے ہیں [۲۸]۔ اسی طرح آغا نے ان تمام شرائط کی پابندی کی ہے جو کسی مخطوطے کی صحیح طور سے ایڈیٹنگ کے لیے لازمی ہیں۔

جہاں تک آغا کی طبع زاد تصانیف کا تعلق ہے تو ہم سب سے پہلے ان کی مشہور تصنیف 'مؤید برہان' کو لیتے ہیں۔ یہ کوئی فارسی لغت نہیں ہے بلکہ مرزا غالب کی قاطع برہان کی تردید میں لکھی گئی وہ کتاب ہے جس میں آغا نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ غالب نے محمد حسین تبریزی کی برہان قاطع کی جو خامیاں بتائی ہیں وہ لسانی و معنوی نقطۂ نظر سے سراسر بے بنیاد ہیں۔ آغا نے جس طرح مکمل دلائل کے ساتھ حسین تبریزی کا دفاع کیا ہے وہ ان کی علمیت کی دلیل ہے۔

آغا نے کس قدر تحقیق کے بعد اپنی کتاب مؤید برہان لکھی تھی اس کا اندازہ اس کتاب کے مقدمہ

سے لگایا جاسکتا ہے جس کا نص اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

''یہ بات چھپانے کی نہیں کہ میں نے قاطع برہان کا جواب لکھنے کے لیے صرف ایک دو کتاب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جن کتابوں سے استفادہ کیا وہ ہیں اداۃ الفضلا از قاضی خان بدر محمد دہلوی، شرف نامہ از میرزا ابراہیم بن قوام فاروقی، مؤید الفضلا از شیخ محمد ابن شیخ لاد دہلوی، مدار الافاضل از مولانا شیخ الہدیٰ فیضی تخلص، فرہنگ جہانگیری از میر جمال الدین حسین انجوی شیرازی، مجمع الفرس مشہور بہ فرہنگ سروری از جلال محمد قاسم کاشانی متخلص بہ سروری، فرہنگ رشیدی از ملا میر عبدالرشید تتوی، کشف اللغات از عبدالرحیم ابن احمد سور، سراج اللغات از نواب سراج الدین علی خان آرزو، چراغ ہدایت جو خان آرزو کی سراج اللغات کی دوسری جلد ہے، خیابان گلستان جو انھی کی (یعنی خان آرزو کی) ہے، بہار عجم از رائے ٹیک چند بہار، نوادر المصادر، جواہر الحروف، ابطال ضرورت، جو تینوں ہی صاحب بہار عجم کی تصانیف ہیں، مصطلحات الشعراء از سیالکوٹی مل لاہوری، ہفت قلزم و ہفت جلد از غازی الدین حیدر بادشاہ غازی، غیاث اللغات اور نفائس اللغات، کہ دونوں مولوی اوحد الدین بلگرامی کی تصانیف ہیں، ترجمۂ قاموس از ساسان پنجم اور دیگر شرحیں اور رسائل'' [۲۹]

مندرجہ بالا کتابوں کے حوالوں سے جس طرح آغا نے برہان قاطع میں درج ہر اس لفظ کو پرکھا ہے جس پر غالب نے تنقید کی تھی اور ٹھوس شواہد کی روشنی میں حسین تبریزی کی تعبیرات کو درست ثابت کیا ہے، وہ آغا کی محققانہ روش کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ آغا کی یہی روش ان کی شمشیر تیزتر میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ خود آغا کے بقول ''اس طرح پر لکھی گئی ہے جو مؤید برہان میں ہے'' [۳۰]۔ نجیب جمیل نے درست فرمایا ہے کہ ''دونوں کتابیں مؤید برہان اور شمشیر تیزتر فارسی لغت نویسوں کے لیے نہایت اہم ہیں'' [۳۱]۔

اگر مذکورہ دو کتابیں لغت نویسی کے میدان میں آغا احمد علی کی تحقیقی کاوش کا ثبوت ہیں تو ان کی دیگر دو کتابیں رسالہ ترانہ اور ہفت آسمان جن کا ذکر قبل کیا جاچکا ہے۔ عروض کے میدان میں آغا کی علمیت کو واضح کرتی ہیں۔

'رسالۂ ترانہ' کا موضوع بحث فارسی میں رباعی کا آغاز وارتقا اور اس کے بحور واوزان کی تحقیق ہے۔ مصنف نے لفظ ''رباعی'' کی تعریف کے ضمن میں رباعی اور دوبیتی کے درمیان فرق کی نشاندہی کی ہے اور اس امر کی بھی توضیح کی ہے کہ رباعی کو ''ترانہ'' کیوں کہتے ہیں۔ آغا نے اس رسالے میں رباعی کے چوبیس اوزان متعین کیے ہیں اور ان کی تفصیل پیش کی ہے۔''[۳۲]

رسالۂ ترانہ میں مصنف نے ہندوستان اور ایران کے مشہور شعرا کی رباعیوں کے نمونے بھی دیے ہیں۔ آغا نے اس رسالے کی تالیف کے لیے کس قدر تحقیق وجستجو سے کام لیا تھا۔ اس کا اندازہ صنائع وبدائع اور عروض وقوافی سے متعلق ان مستند کتابوں سے لگایا جاسکتا ہے جن سے آغا نے استفادہ کیا تھا کیونکہ مصنف نے اپنی بحث کے دوران ان کتابوں سے حوالے دیے ہیں۔ اس رسالے میں جابجا جن کتابوں کے حوالے ملتے ہیں وہ یوں ہیں:

مخزن العروض، آتشکدۂ آذر، کشف الاصطلاحات، رسالہ عروض، بدائع الافکار، ہفت قلزم، معیار البلاغہ، مجمع الصنائع، معیار الاشعار، مراۃ الخیال اور مخزن الفوائد۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ آغا احمد علی کا رسالہ ترانہ فارسی میں رباعیات نگاری کی تاریخ پر ایک تحقیقی کام ہے اور ہندوستان میں لکھی گئی اپنی نوعیت کی واحد کتاب نظر آتی ہے۔

ہفت آسمان فارسی میں مثنوی نگاری کی تاریخ اور اس کے بحور واوزان سے متعلق بحث پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو لکھنے کے لیے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے آغا کو باضابطہ طور پر مامور کیا تھا اور انھوں نے کئی تحقیق کے بعد اسے تیار کیا تھا۔ اس کا اندازہ ان کے اس مقدمہ سے لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے اس کتاب پر لکھا ہے اور جس کا ملخص اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

> ''فقیر کثیر التقصیر احمد (علی احمد) یہ عرض کرتا ہے کہ قبل اہالی کمیٹی ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے سکندر نامہ کی دوسری جلد معروف بہ بحری، کا نصف اول شائع کیا تھا جس کا متن ڈاکٹر اسپرنگر اور آغا محمد شوستری نے تصحیح کیا تھا۔ امسال کہ ۱۸۶۹ء سنہ عیسوی اور ۱۲۸۵ سنہ ہجری ہے مذکورہ کمیٹی کے ارباب نے اس کا نصف آخر جو بندہ نے تصحیح کیا تھا شائع کیا۔ بعد میں ان کی خواہش ہوئی کہ اس مثنوی کے مصنف نظامی گنجوی کے احوال اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بیان بھی کہ مثنوی کیا ہے، کس شاعر نے اسے لکھا ہے، اس کے اوزان اور موضوعات کیا ہیں اور اس تعلق سے پنج گنج معروف بہ خمسۂ

> نظامی کی تفصیل اور یہ کہ اس کے تتبع میں کون کون سی مثنویاں لکھی گئیں۔ یہ تمام باتیں (کتابی صورت میں) شائع کی جائیں۔ لہٰذا میں نے مختلف تذکروں، جیسے نفحات الانس اور بہارستان جامی، تذکرۃ الشعراے دولت شاہ سمرقندی، تذکرہ ہفت اقلیم محمد امین رازی، مراۃ الخیال شیر خان لودی، مراۃ العالم بختاور خان عالمگیری، تذکرہ میرزا طاہر نصرت آبادی اصفہانی، ریاض الشعراے علی قلی خان والہ داغستانی، آتشکدہ آذر اصفہانی، کلمات الشعراے سرخوش، خزانۂ عامرہ آزاد بلگرامی اور عروض وقوافی اور صنائع وبدائع سے متعلق کتابوں اور رسالوں سے استفادہ کیا اور اس تحقیق سے جو کچھ میسر ہوا اسے ان اوراق میں ثبت کردیا۔ خدا کے کرم سے امید ہے کہ یہ کتاب بھی رسالہ ترانہ کی طرح مقبول ہوگی۔ چونکہ محققان فن کے نزدیک اوزان مثنوی سات ہیں اور یہ کتاب اس پر ہے، اس لیے میں نے اس کا نام ہفت آسمان رکھا۔''[۳۳]

اگرچہ جیسا کہ قبل ذکر کیا گیا ہے صرف ''آسمان اول'' ہی مکمل ہوسکا تھا کہ آغا کی بے وقت موت ہوگئی پھر بھی یہ حصہ بقول تمن ''اپنے آپ میں مکمل ہے اور فارسی شعرا اور انکی منظومات سے متعلق بیش قیمت اطلاعات فراہم کرتا ہے۔''[۳۴]

ہفت آسمان کے شروع میں آغا احمد علی نے فارسی میں مثنوی نگاری کے آغاز وارتقا پر عالمانہ گفتگو کی ہے اور بحث کے دوران جن مستند کتابوں سے حوالے پیش کیے ہیں ان میں سے چند کے نام یوں ہیں: رسالۂ قافیہ، میزان القوافی، بدائع الافکار، مجمع الصنائع، ہفت قلزم، دریائی لطافت، مخزن الفوائد اور کشاف الاصطلاحات۔[۳۵]

ہفت آسمان میں سب سے زیادہ تفصیلی گفتگو نظامی گنجوی اور ان کی مثنوی مخزن الاسرار پر ہے اور اس ضمن میں آغا نے ہندوستان اور ایران کے تقریباً ان تمام شعرا کا ذکر کیا ہے جنھوں نے مخزن الاسرار کے طرز پر مثنویاں لکھی ہیں اور ان مثنویوں سے نہ صرف نمونے درج کیے ہیں بلکہ ان پر ناقدین کے تبصرے بھی پیش کیے ہیں۔ مثال کے طور پر عرفی شیرازی کا ذکر کرتے ہوئے آغا کہتے ہیں کہ عرفی نے مخزن الاسرار کے تتبع میں جو مثنوی لکھی تھی وہ مجمع الابکار ہے لیکن اکثر اسے مجمع الافکار کہا گیا ہے اور اس

مثنوی نے کچھ ابیات نقل کرنے کے بعد آغا عرفی کی مثنوی نگاری پر دو ناقدین کی رائے پیش کرتے ہیں۔ آغا کی عبارت کا اردو ترجمہ یوں ہے:

> "آزاد بلگرامی کہتے ہیں کہ عرفی قصیدہ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں جب کہ ان کی غزل اور مثنوی مساوی درجے کی حامل ہیں۔ لیکن ابوالفتح گیلانی کے بھائی حکیم ہمام کے فرزند حکیم حاذق کی رائے میں ان کی (عرفی کی) مثنوی کا درجہ کم ہے۔"[۱۲]

عرفی کی مذکورہ مثنوی کا مطلع، جو مندرجہ ذیل ہے:
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، موج نخست است ز بحر قدیم نقل کرنے کے بعد آغا اس پر حکیم حاذق کا تبصرہ اور پھر اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔ آغا کی عبارت کا اردو ترجمہ یوں ہے:

> "وہ (حکیم حاذق) کہتے ہیں کہ (عرفی کے اس شعر میں) لفظ "موج" کی جگہ لفظ "مد" مناسب تر ہوتا۔ میں (آغا احمد علی) کہتا ہوں کہ اگر چہ "مد" کا لفظ "بسم اللہ" اور "بحر" دونوں کے ساتھ نسبت رکھتا ہے لیکن شعری لحاظ سے "بحر" کے ساتھ "مد" اتنی روانی نہیں رکھتا ہے جتنی کہ "موج"۔"[۱۳]

آغا احمد علی اپنی بحث کے دوران موضوع سے متعلق اہم اطلاعات بھی بہم پہنچاتے ہیں۔ مثلاً مخزن الاسرار کے تعلق سے وہ ان شرحوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جو اس مثنوی پر لکھی گئی ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ شرحیں کن کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مخزن الاسرار کی ایک شرح محمد بن رستم بن احمد بن محمود اتکی کی لکھی ہوئی ہے جو "در کتاب خانہ دہلی است و ہم در کتابخانہ (ایشیاٹک) سوسائٹی نمبر ۸۲۹ اما ناتمام و یکی از ابراہیم تتوی و یکی از امان اللہ، این ہر دو در کتابخانہ دہلی۔"[۱۴]

حاصل کلام:

مندرجہ بالا بحث سے یہ واضح ہے کہ آغا احمد علی احمد نے ۳۴ سال کی کم عمری میں اپنے انتقال سے قبل جو دس سال کلکتہ میں گزارے تھے اس میں وہ فارسی زبان و ادب کے ایک فاضل محقق کی حیثیت سے اپنے لیے ایک منفرد مقام بنا لینے میں کامیاب رہے تھے اور اتنی مختصر سی مدت میں ان کا اتنا کچھ حاصل کر لینا ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اگر وہ چند سال اور زندہ رہتے تو فارسی تحقیق کے میدان میں مزید کارہائے نمایاں انجام دے گئے ہوتے۔

حواشی:

۱- محمد عبداللہ، بانگلار پشتے فارسی ساہتیہ (بنگلہ)، ڈھاکہ ۱۹۸۳ء، ص ۱۳۱
۲- [illegible] ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۴ء تک کلکتہ مدرسے کے پرنسپل رہے تھے۔ عبدالستار، تاریخ مدرسہ عالیہ، ڈھاکہ ۱۹۵۹ء، جلد دوم، ص ۱۵۵
۳- آغا احمد علی، ہفت آسمان، کلکتہ ۱۸۷۳ء، دیباچہ از بلوخمن، ص ۴
۴- ابوالنصر محمد خالدی، تقویم ہجری و عیسوی (دہلی ۱۹۷۵ء) میں دیے گئے جدول کے مطابق
۵- عبدالستار، ص ۱۹۳؛ عبداللہ، ص ۱۳۱
۶- ہفت آسمان، دیباچہ، ص ۴
۷- عبداللہ، ص ۱۳۱
۸- ہفت آسمان، دیباچہ، ص ۴؛ عبداللہ، ص ۱۳۲
۹- عبدالستار، ص ۱۹۳؛ عبداللہ، ص ۱۳۲
۱۰- ہفت آسمان، دیباچہ، ص ۴
۱۱- لیس ۱۸۵۵ء سے ۱۸۷۰ء تک کلکتہ مدرسے کے پرنسپل رہے تھے (عبدالستار، ص ۱۵۴)
۱۲- ہفت آسمان، دیباچہ، ص ۴؛ عبدالستار، ص ۲۹۲؛ عبداللہ، ص ۱۳۲
۱۳- عبدالستار، ص ۱۹۳
۱۴- ایضاً، ص ۱۹۳-۱۹۵
۱۵- عبداللہ، ص ۱۳۴
۱۶- مالک رام، ذکر غالب، دہلی ۱۹۷۶ء، ص ۹۳-۹۹
۱۷- ہفت آسمان، دیباچہ، ص چہارم
۱۸- خالدہ وحشی، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی خدمات فارسی، کلکتہ ۱۹۹۶ء، ص ۲۹۵-۲۹۹
۱۹- آغا احمد علی، مؤید برہان، کلکتہ ۱۸۹۵ء، ص ۴
۲۰- آغا احمد علی، شمشیر تیزتر، کلکتہ ۱۸۶۹ء، ص ۳۰۲
۲۱- تفصیل کے لیے دیکھیں کلیم سہسرامی، بنگال میں غالب شناسی، ڈھاکہ ۱۹۹۰ء، ص ۴۰-۴۷
۲۲- ہفت آسمان، دیباچہ، ص ۴
۲۳- عبداللہ، ص ۱۳۶
۲۴- ہفت آسمان، ص ۴

۲۵- ایضاً،ص ۱۱۷

۲۶- عبدالستار،ص ۱۸۵؛عبداللہ،ص ۱۳۷

۲۷- محمد ساقی مستعد خان، مآثر عالمگیری،مرتبہ آغا احمد علی،مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال،کلکتہ،۱۸۷۱ء،ص ۳-۱

۲۸- ایضاً،ص ص ۲۹،۳۹،۶،۷۰،۱۸۰،۲۶۸

۲۹- آغا احمد علی،مؤید برہان،ص ص ۵-۱۱

۳۰- آغا احمد علی،شمشیر تیز تر،کلکتہ،۱۸۶۸ء،ص ۳۲

۳۱- ہفت آسمان،دیباچہ،ص سوم

۳۲- آغا احمد علی،رسالہ ترانہ،کلکتہ،۱۸۶۷ء،ص ص ۷-۸

۳۳- ہفت آسمان،متن،ص ۲

۳۴- ہفت آسمان،دیباچہ،ص چہارم

۳۵- ہفت آسمان،متن،ص ص ۳-۵

۳۶- ایضاً،ص ۱۱۴

۳۷- ایضاً،ص ۱۱۳

۳۸- ایضاً،ص ۹۳

☆☆☆

عابد حسین*

سپاہ تازہ اور اقبال

سپاہ تازہ بر انگیزم از ولایت عشق
کہ در حرم خطری از بغاوت خرد است

اقبال ایک دیدہ و بینا شاعر تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع اور نظر عمیق تھی۔ دینی اور دنیوی علوم میں ید طولی رکھتے تھے اور فلسفہ کے عالم تھے۔ عالمی سیاست کے پیچ و خم سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی شاعری کو جزو پیغمبری بنایا۔ اقبال اس اعتبار سے ایک مجتہد العصر تھے کہ انہوں نے اپنی گرد و پیش کی دنیا کا جائزہ لیا۔ مغرب و مشرق کے افکار و نظریات پر ناقدانہ نگاہ ڈالی، ماضی کے اثاثہ کی ایک جوہری کی طرح چھان بین کی اور مستقبل کے امکانات سے حتی الامکان بھی صرف نظر نہیں کیا۔ اقبال کے یہاں انسان کے تمام اعمال و افعال، ایجادات و اختراعات کا منتہائے مقصود ایک ایسے ماحول کی تخلیق ہے جس میں انسان کی تمام پوشیدہ قوتوں کو ظہور پذیر ہونے کا موقع ملے۔ یہ قوتیں اسی صورت میں وجود میں آسکتی ہیں جب انسان کی پوری شخصیت کو پنپنے اور پروان چڑھنے کا بھرپور موقع ملے اور اس کے جسمانی اور روحانی تقاضوں کو تسکین حاصل ہو انسان نہ محض مادہ ہے اور نہ محض روح بلکہ ان دونوں کی آمیزش سے ترکیب پانے والی ایک ناقابل تقسیم اکائی ہے۔

اقبال کا دور ایک شدید آشوب اور بحران کا دور تھا اور سب سے زیادہ پریشان کن معاملہ مغرب کا ہمہ گیر غلبہ اور دنیائے مشرق، بالخصوص عالم اسلام کی شکست و ریخت تھا چنانچہ ہمعصر دیگر دانشوروں کی طرح اقبال کے دل و دماغ پر ان حالات کی ہیجانی کیفیت حاوی رہی اور اپنے اس کرب و اضطراب کو بار بار اپنی تخلیق میں پیش کرتے رہے کیونکہ اقوام مغرب کے استیلا اور استعمار کی زد زیادہ تر دنیائے اسلام بلکہ خود اسلام پر تھی اس لیے واضح طور پر انہوں نے کہا۔

ع کہ در حرم خطری از بغاوت خرد است

* صدر شعبہ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

گویا اقبال نے عہد حاضر کے مسموم فضا کو صحت مند بنانے کے لئے پس چہ باید کرد میں مکمل کر قدم اٹھایا۔ اس میں اسرار و رموز کی طرح حکیمانہ افکار پر زور نہیں ہے لیکن ان کا مغرب کے خلاف مشرق سے لگاؤ ہے خواہ اس کے وجوہ کچھ ہوں، پوشیدہ نہیں ہے۔ ان کے کلام سے رہ رہ کر جھلکتی ہے۔

سوز و ساز و درد و داغ از آسیاست
ہم شراب و ہم ایاغ از آسیاست
عشق را ما دلبری آموختیم
شیوۂ آدمگری آموختیم
ہم ہنر ہم دیں ز خاک خاور است
رشک گردوں خاک پاک خاور است
وا نمودیم آنچہ بود اندر حجاب
آفتاب از ما و ما از آفتاب

اقبال کے نظام فکر و فن میں عشق کو مرکزی اہمیت حاصل ہے یہ اس اہمیت کو نظر انداز کر کے کوئی شخص اقبال کے فلسفۂ حیات سے بہرہ مند اور لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ عشق راہ کی دشواریوں اور رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اقبال کے یہاں عشق ایک زبردست محرک عمل ہے جو ایک طرف تسخیر فطرت میں انسان کی مدد کرتا ہے اور دوسری طرف اسے کائنات کے ساتھ متحد رکھتا ہے انسان اس کی بدولت اتنی بلندی اور قوت حاصل کر لیتا ہے کہ "جبریل امین" کو بھی "صید زبوں" خیال کرنے لگتا ہے:

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدی
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

انسان میں عشق کی وجہ سے حریت کا ایسا مستحکم اور شدید احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کی نظر میں ساری مادی اور خارجی بندشیں بے وقعت اور کمزور ہو جاتی ہیں اور ظاہری علوم یعنی عقل و حکمت اس کے غلام بن جاتے ہیں۔ بقول اقبال:

من بندۂ آزادم عشق است امام من
عشق است امام من، عقل است غلام من

گویا اقبال کے نزدیک عشق ایک نظام فکر ہے، جسے انہوں نے روحانی حقائق کی برتری ثابت کرنے کے لئے اپنایا ہے، خودی کی استواری اور پختگی کا دار و مدار بھی عشق کی رہنمائی پر منحصر ہے جو اقبال کے فلسفۂ حیات کی بنیاد ہے۔ اور یہی وہ خاص جوہر ہے جو فقیروں کو آداب خود آگاہی سکھا کر، شاہنشاہی

کے اعلیٰ منصب پر فائز کرتا ہے اقبال نے نکلسن کے نام ایک مکتوب میں اپنے تصور عشق کے تعلق سے لکھا ہے کہ یہ لفظ "عشق بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی کسی شئے کو اپنے اندر جذب کر لینے اور جزو بنا کر اپنا لینے کی آرزو کا نام عشق ہے جس کا کمال یہ ہے کہ تخیل پیدا کر لے۔ قدر و مرتبہ کو پہچانے اور ساتھ ہی ادراک کام سے اسے بروئے کار بھی لائے۔ حقیقت میں عشق کا کام یہ ہے کہ عاشق و معشوق کو متمیز کر کے اپنی اپنی جگہ انفرادی شخصیت اور اہمیت بخش دے۔

اقبال عقل کو خدا داد نعمت مانتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ عقل کے کچھ حدود ہیں۔ ان حدود کے باہر اس کے دعوے لا حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس کی رسائی صرف خارجی دنیا تک ہے اس لئے حقیقت شناسی سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف عشق اپنے کو چون و چرا کے الجھاوے میں نہیں ڈالتا بلکہ جو کچھ کرتا ہے کر گزرتا ہے اور یقین و اعتماد کی رہنمائی میں اصل حقائق تک پہنچ کر ہی دم لیتا ہے۔ اقبال عقل کو عشق کی رہبری کا محتاج تصور کرتا ہے۔ اور عقل کی عظمت کا بھی معترف ہے۔

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ
عقل ہم است و از ذوق نظر بیگانہ نیست
لیکن این چارہ را آں جرات رندانہ نیست

گویا اقبال کے یہاں عقل و دانش کی دو قسمیں ہیں ایک دانش برہانی دوسرا دانش شیطانی اگر علم و عقل باطنی شعور سے آگاہ نہیں ہے اور صرف جسم پروری کا کام کر رہا ہے تو یہ دانش شیطانی ہے اس کے برعکس اگر روحانی حقائق کے ذریعہ منزل مقصود تک پہونچنے کا راستہ ہموار کر رہا ہے تو یہ دانش برہانی ہے اور یہی اقبال کے یہاں عشق ہے۔

عقل خود بین دگر و عقل جہان بین دگر است
بال بلبل دگر و بازوی شاہین دگر است

مولانا روم نے بھی کہا ہے

علم را بر دل زنی یاری بود
علم را بر تن زنی ماری بود

اقبال نے "پس چہ باید کرد" میں ولایت عشق سے پیام تازہ لے کر اقوام شرق کو خطاب کیا ہے کیونکہ اقبال کا اصل مقصد اقوام مشرق کی از سر نو سرگرمی، حیات، توانائی گرم رفتاری تھا۔ وہ اس کی افسردہ رگوں میں خون حیات دوڑا دینا چاہتے تھے تاکہ وہ حقیقی معنوں میں زندہ و توانا اور کشمکش حیات کے قابل

ہو جائیں ان کا موجودہ جمود و تعطل دور ہو جائے اور زندگی کی سرگرمی میں کوشاں رہیں۔ چونکہ مقابلہ مغرب کی ترقی یافتہ مادی تہذیب سے تھا اس لئے پہلی ضرورت ترک جمود اور اقدام بہ حرکت تھی۔ اس کے لئے انہوں نے تاریخ اور بالخصوص اسلامی تہذیب کو پیش نظر رکھتے ہوئے انقلاب اندر شعور پر زور دیا۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔ ''ان اللہ لا یغیر بقوم حتیٰ یغیر ما بانفسھم ''جس سے مراد باطنی اور روحانی قوتوں کا استعمال ہے جن کے حدود فطری طور پر ایمان و عرفان اور شریعت و طریقت سے جا ملتے ہیں۔ اقبال کے تصورات سے بخوبی عیاں ہے کہ وہ کائنات کی مادی تسخیر ہی نہیں بلکہ روحانی تسخیر کے بھی قائل ہیں جو مادی قوتوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ عبد اور عبدہٗ کے فرق کو ظاہر کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ عبدہٗ کی کائنات پر حکمرانی ہے۔

عبدہٗ چند و چگون کائنات
عبدہ راز درون کائنات

مختصر عشق کو عملی طور پر ایمان کی حرارت اور گرم جوشی ہی سے تعبیر کرنا چاہئے جس کا مقصد حیات کو فعال بنا کر دنیائے انسان میں انقلاب پیدا کرنا ہے۔ اس وقت اقوام مشرق بالفعل غلامی اور مجبوری کی زندگی بسر کرنے پر بے بس ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس کے اندر ہنگامہ باطن پیدا ہو۔ اقبال نے عشق کے ساتھ ہی ایک اور اہم نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

''کہ در حرم خطری از بغاوت خرد است''

یہ ایک بلیغ مصرع ہے۔ ارباب نظر جانتے ہیں کہ فلسفہ اسلامی کی تاریخ میں جب یونانی افکار و خیالات کو ترقی ہوئی تو ایسی ہی تعقل پرستی کی تحریک وجود میں آئی تھی اور الہیاتی فلسفہ معرض خطر میں پڑ گیا تھا۔ اس وقت مغرب کے جدید علوم و فنون نے بھی ایسی ہی تشکیک اور تعقل پرستی کی فضا پیدا کر دی ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے یہ بغاوت خرد، دین کی جڑیں اکھیڑ دینے کے درپے تھی جس کے خطرناک نتائج ہمارے سامنے ہیں اور اب تو سائنس اور فلسفہ کے ساتھ نفسیات، لادینیت (سیکولرزم)، اشتراکیت، جنسیات، عمرانیات م فلکیات م ٹکنالوجی، جدید ذرائع ابلاغ اور تہذیب مغرب کا مادی طلسم بھی جس میں تحریک عریانی ایک مجرب عنصر ہے، شریک ہو گئے ہیں، تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مشرق پورے طور پر مغرب کا نمونہ بن جائے گا۔ اور اس کا اپنا وجود برقرار نہیں رہ سکے گا اور مغرب کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا کہ مشرق اس کا تابع بن جائے۔

اقبال اقوام مشرق کی تباہی کو دیکھ رہے تھے انہوں نے تقلید مغرب کے مضرات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ قوموں کی حقیقی نشو و نما آزادی ہی کی فضا میں ممکن ہے جس میں وہ

اپنی طبعی صلاحیتوں کے مطابق سرگرم کار ہوں۔ اسی لئے حملۂ مغرب کے جواب میں انہوں نے فلسفۂ خودی کا ادراک کیا۔ یعنی اس کے مقابلہ میں اپنے وجود کو استحکام بخشا جائے۔ اقبال نے خرد کی قوتوں کو تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان میں جو مضرت رسانی کا امکان ہے اس کا ازالہ عشق ہی تہذیبی عنصر سے ممکن ہے جو ان کو صحیح نتائج عطا کر کے حیات انسانی میں اس کا صحیح مصرف پیدا کرتا ہے۔ البتہ علمی اور عقلی تحقیقات اور دانش برہانی کے نتائج خواہ کتنے ہی وسیع ہوں، انہیں صالح حیات کو ملحوظ رکھے بغیر روبہ عمل لانا ضرر سے خالی نہیں ہے۔ علم اور عقل مقصود بالذات نہیں بلکہ محض حیات کو خوب تر بنانے کا ذریعہ ہے۔ عقل کے جسم پر جنون عشق ہی کی قبا زیب دیتی ہے۔

زمانہ ہیچ نداند حقیقت او را
جنون قباست کہ موزوں بقامت خرد است

جس طرح نسخہ ہائی شفا میں بعض جز مصلح ہوتے ہیں اسی طرح عشق بھی عقل کا مصلح ہے۔ اس سے بالواسطہ ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مجرد عقل فاسد ہے۔ اس کی پرکھ، اس کی اصلاح، اس کو مفید بنانا اس انسان پر موقوف ہے جو صحیح بصیرت اور فطری مزاج رکھتا ہو یعنی بندۂ مومن جس کا دل نور ایمان سے روشن اور راست بیں ہو۔ وہ عقل کے مادۂ فاسد کا ادراک کر سکے اور اپنی نگاہ نکتہ بیں سے جو خیر کو شر سے ممیز کرتی ہے، عقل کو رہزنی اور تعمیری مقاصد کے لئے استعمال کرے۔ عقل کی ادنیٰ سے ادنیٰ دریافت مثلاً آگ بھی اسی صورت میں مفید ہے کہ اس سے حرارت اور روشنی کا کام لیا جائے نہ کہ آتش زنی اور خانماں سوزی کا وسیلہ بنایا جائے۔ بندۂ مومن کی نگاہ پاک بیں خرد کا احتساب کر کے، اس کا کھوٹا، کھرا پرکھ کر اس کے مس خام کو کندن بنا دیتی ہے۔

اقبال نے اپنی مثنوی ''پس چہ باید کرد'' میں سیاہ تازہ کو پیش کر کے مشرقی اقوام کو دعوت دیا ہے کہ اپنے زور بازو، اپنے وسائل، اپنی سرزمین، باغ و راغ، اپنے دریا و پہاڑ، اپنی ملی روایات پر اعتماد اور فخر و ناز کرو اور مغربی تہذیب و سیاست کی فسوں کاریوں سے ہوشیار رہو۔ مختلف عنوانات کے ذریعہ ان عوامل کو اجاگر کیا ہے جو اقوام کی بقا کے راز دار ہیں تاکہ ان کی بنیاد پر دستور حیات مرتب کیا جائے روح انقلاب سے سرشار اقبال کا یہ نوائے شوریدہ مقصد حیات کے تقاضوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ خیر الامم کا منبع عرب تھا جس نے بنی نوع انسان کی تاریخ میں مہتم بالشان باب کا اضافہ کیا۔ دنیا کو خالص جمہوریت کا صاف ستھرا نمونہ پیش کیا اور ملوکیت اور نسلی امتیاز کا قلع قمع کر دیا ان کی بدولت ایک نئی دنیا وجود میں آئی اور علوم و فنون کو فروغ ہوا۔ اقبال اقوام مشرق کو پیغام دے رہے ہیں کہ اے اہل مشرق تم اٹھو، لادینی کا خاتمہ کر دو عقل و علم کو عشق سے ہمکنار کر دو تاکہ نار و نور سے ہم آغوش ہو کر جہان تاب ہو۔ اقوام متحدہ

سے بہتری کی امید بے سود ہے۔ اہل یورپ کی مجلس گویا مجلس سالوسال ہے۔ آخیر میں اقبال حضور رسالت مآب ﷺ میں عرض پرداز ہے کہ اس فرزند مشرق، اس حدی خوان اسلام کو ایسی آتش نوائی عطا ہو جو اہل مشرق کے سینوں میں نئی لگن، امنگ پیدا کرے اور وہ اپنے گونا گوں امراض سے شفا پا کر آفاق میں ایک صحت مند دینی فطرت کے تحت نئی افکار، اور اصول و آئین کو پھیلا سکے۔

خود بدانی قدر تن از جان بود
قدر جان از پرتو جانان بود

تا نگیر اللہ غلام ہیچ امید
با مرا مشکیں نردان یا کلید

فارسی زبان وادب کی ترویج واشاعت میں شیخ شرف الدین احمد بن یحیٰ منیری کا حصہ

نام نیک رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیکت برقرار

بیشک بھارت ورش صدیوں سے رشی منیوں، تپسیوں، جوگیوں، قلندروں اور صوفی سنتوں کا دیش رہا ہے۔

شیخ ابوالحسن علی ہجویری، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، قاضی حمید الدین ناگوری، شیخ بہاء الدین زکریا سہروردی، شیخ صدر الدین عارف، خواجہ فرید الدین گنج شکر، محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، حضرت بو علی قلندر پانی پتی، حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی، سید اشرف جہانگیر سمنانی، حضرت سید محمد گیسو دراز، حضرت شیخ احمد عبد الحق محدث دہلوی اور حضرت شرف الدین احمد بن یحیٰ منیری جیسے صوفیائے کرام کسی نہ کسی صورت میں اسی سرزمین سرسبز وشاداب ہند سے وابستہ رہے ہیں۔
بعبارت دیگر کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ قدیم سے ہی سرزمین پہناور، گل وبلبل ہند ہمیشہ صوفیوں، قلندروں، مبلغین اور عالمان دین کا مرجع ومسکن رہا ہے۔ صوفیائے کرام مصیبت کے وقت ہمیں تنگ وتاریک غار سے باہر نکال کر عالم روحانی کے سفر کے لیے ہماری راہنمائی کرتے ہیں۔

سوانح حیات:
سلطان المحققین حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد بن یحیٰ منیری بن شیخ اسرائیل بن

---

* اسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ عربی فارسی اردو ومطالعات اسلامی، وشو بھارتی یونیورسٹی، شانتی نکیتن، مغربی بنگال

حضرت امام محمد تاج رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ عالم دین، معروف صوفی اور شریعت وطریقت کے بہترین استاد تھے۔ آپ کا تعلق سلسلہ فردوسیہ جو سلسلہ سہروردیہ کی ایک شاخ ہے، سے تھا۔

آپ کے جدامجد، حضرت امام محمد تاج رحمۃ اللہ علیہ مبلغ اسلام کی حیثیت سے ۵۷۶ھ میں بیت المقدس سے منیر شریف، پٹنہ، بہار، ہندوستان ہجرت کیا۔ وہ یہاں کے راجہ سے نبرد آزما ہوئے اور منیر شریف کو فتح کرلیا۔ منیر شریف پٹنہ شہر سے قریب ۲۰ میل پچھم واقع ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ راقم الحروف کو اسی سال یعنی مئی ۲۰۱۱ء کے مہینہ میں اس تاریخی اور روحانی جگہ کو دیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔

تولد:

شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری کی پیدائش ۲۹ شعبان المعظم ۶۶۱ھ میں سلطان ناصر محمود کے زمانہ میں منیر شریف میں ہوئی۔ بیسویں صدی کے ایک معروف ایرانی دانشمند اور محقق علی اکبر دہخدا رقم طراز ہیں:

"احمد بن شیخ یحییٰ منیری از اہل قصبہ منیر بنگالہ ہند واز شاعران
قرن ہفتم ہجری واز پیروان ومعارف مشائخ نقشبندیہ بود"[۲]

مزید دہخدا نے حضرت شیخ کو فارسی کے معروف شاعروں میں شمار کرتے ہوئے بطور نمونہ مندرجہ ذیل اشعار نقل کیا ہے۔

روی سیہ و موی سفید آوردم
چشمی گریان قدی چو بید آوردم
چون خود گفتی کہ ناامیدی کفر است
فرمان تو بردم و امید آوردم[۳]

تعلیم وتربیت:

عام بچوں کی طرح زمانہ کے رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر اور مکتب میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے پیش حضرت علامہ ابوتوامہ زانوئے تلمذ تہہ کیا اور علوم دینی وعقلی شامل فقہ، علم کلام، منطق، فلسفہ، حدیث اور ریاضی وغیرہ حاصل کیا۔ حضرت علامہ اشرف الدین ابوتوامہ اس زمانہ کے بہت بڑے استاد مانے جاتے تھے۔ انہوں نے غیاث الدین بلبن کے عہد (۱۲۴۸ء-۱۲۸۱ء) میں بخارا سے دہلی ہجرت کی تھی۔

شادی:

استاد اور شاگرد کے مابین رشتہ اتنا گہرا ہوا کہ شیخ شرف الدین اپنے استاد کے ہمراہ سنار گاؤں،

بنگلہ دیش چلے گئے اور انھوں نے ان کے ساتھ ۲۲ سال[۴] زندگی گزاری۔ استاد کی بیٹی کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک بھی ہو گئے۔

وفات:

آپ تاریخ ۶ شوال بروز جمعرات ۷۸۲ھ مطابق ۱۳۸۱ کو اس دار فانی سے دار البقار حلت کر گئے۔ حضرت سید اشرف الدین جہانگیر سمنانی نے نماز جنازہ پڑھائی۔

دلا ہرگز نیابی در جہان ہمچو شرف یحییٰ
کہ ما لاملک ازو شد سید اشرف جہانگیری

مندرجہ ذیل قطعہ سے تاریخ وفات اخذ کی جاسکتی ہے

روز پنج شنبہ زمہ شوال بودای جوان
کہ رحلت کرد شیخ شرف الدین یحییٰ ازین جہان
سال حفت صد ہجری و دگر ہشتاد بود
این چنین قطب مشائخ سوی جنت شد روان[۵]

والدہ ماجدہ:

آپ کی والدہ ماجدہ بی بی رضیہ ایک متدین، خدا ترس اور نہایت ہی نیک عورت تھیں۔ مشہور ہے کہ ان کی والدہ ماجدہ نے بغیر وضو کبھی بھی اپنی اولاد (حضرت شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری) کو دودھ نہیں پلایا۔

معرفت الٰہی:

وہ اپنے برادر عزیز کے ہمراہ پیر کی تلاش میں دہلی روانہ ہوئے۔ مشائخ کرام سے ملاقاتیں ہوئیں۔ بالآخر حضرت خواجہ نجیب الدین فردوسی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ ان کی شخصیت سے کافی متاثر ہوئے، ہیبت طاری ہوئی۔ پھر ان سے بیعت لے لی اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔ وہ حضرت خواجہ نجیب الدین فردوسی کی روحانی شخصیت سے متاثر ہونے کا حال خود بیان فرماتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

"من چون پیہ خواجہ نجیب الدین بدیدم خوفی در دل من افتادہ شد کہ
ہر روز آن خوف زیادہ می شد"[۶]

خرقہ خلافت حاصل کرنے کے بعد منیر شریف لوٹ رہے تھے۔ راستے میں ہی اپنے پیر کی وفات

کی خبر سنتے ہی سفر ترک کر دیا اور بقصد ریاضت صحرا نوردی میں مشغول ہو گئے۔ عرصہ دراز تک پہاڑوں اور جنگلوں میں بھٹکتے رہے۔ مدتوں پر مشقت زندگی گزاری ہے۔ بالآخر بہار شریف میں مقیم ہوئے اور درس وتدریس ور شد و ہدایت میں مشغول ہو گئے۔ شیخ ابوالفضل علامی آئین اکبری میں لکھتے ہیں:

> ''شیخ شرف منیری یحییٰ بن اسرائیل کہ سر آمد چشتیاں بود واز شیخ نظر فیض برگرفت و از خوردی در کہساران ریاضت کردی و با روزی دیدان شیخ نظام اولیاء برادر خود شیخ جلال الدین بہ دہلی آمد او خویش شیخ نجیب الدین فردوسی رفت و ارادت آورد و خلافت، شیخ شمس الدین مظفر بلخی و شیخ جمال اودی کہ جمال قتال نیز خواندند از و خلافت دارند وفراوان تصنیف از وبیادگار از ان میان مکتوبات او برخی نفس از مون دارد'' [۸]

پروفیسر ہادی حسن نے بھی اس سلسلے میں بہت مفید معلومات فراہم کی ہیں:

> "He passed the rest of his life observing an ideal sufis austerity, although his contemporary sovereign, Muhammad bin Tughlaq, and Firoz Shah Tughlaq, best owed lavish endowments for the maintenance of his Khanqah at a village, now called Bihar Sharif"[9]

بہار شریف میں عقیدت مندوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ شاہان وقت بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ محمد بن تغلق نے ایک بلغاری مصلیٰ حضرت کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کیا۔ مکتوبات صدی میں مذکور ہے:

> ''چون جلال الدین در شہر دہلی در آمدی روسوی بہار کردی و سینہ بمالید فرمودی عشق از طرف بہار می آید۔'' [۱۰]

حضرت شاہ عبداللہ شطار رقم طراز ہیں:

> ''بندہ معتقد کسی نیست۔ ہمہ بزرگان یکی اند۔ اما بندہ معتقد سلطان المحققین حضرت شیخ شرف الحق والدین منیری و بندگی

> حضرت خواجہ فرید الدین عطار مستم و جای کہ این ہر دو بزرگان رسیدہ اند کسی کمتر رسیدہ است و آنچہ کہ این ہر دو بزرگان حقائق و دقائق را در این بیان کردہ اند کسی بیان نکردہ است'' [۱۱]

وہ علوم دینی وعلوم متداول زمان جیسے تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، منطق، فلسفہ، ریاضی و ہندسہ کے ماہر کامل تھے جس کا اندازہ مندرجہ ذیل فارسی تصانیف و تالیفات کے عمیق مطالعہ سے ہوتا ہے۔

تصنیفات وتالیفات:

۱- شرح آداب المریدین: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے آداب المریدین حضرت ضیاء الدین ابوالنجیب سہروردی کی مشہور کتاب ہے۔ یہ عربی زبان میں ہے۔ دراصل شرح آداب المریدین اسی کتاب کی مفصل شرح ہے۔

۲- ارشاد الطالبین: اس مختصر رسالہ میں طالبان حق کو ہدایتیں دی گئی ہیں۔

۳- ارشاد السالکین: چار سو صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب بعنوان ''ارشاد السالکین'' مسئلہ توحید، آخرت، عقل، روح، وکائنات وغیرہ پر بہت ہی اہم اور مفید کتاب ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کے تمام موجودات میں خالق کائنات کا نور متنوع شکل میں موجود ہے۔

۴- رسالہ مکیہ و ذکر فردوسیہ: اس غیر مطبوعہ رسالہ میں اذکار کے اقسام بتائے گئے ہیں۔

۵- فوائد المریدین: برکت نماز با جماعت، فیض و برکات آیات قرآن، گورستان، منکر و نکیر، بہشت و دوزخ، زندگی و موت، مفہوم عبادت، قیامت، ایمان، حقوق والدین، حقوق ہمسایہ، حقوق زوجین وغیرہ پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

۶- لطائف المعانی: یہ معدن المعانی کا خلاصہ ہے جس کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔

۷- رسالہ اشارات: جیسا کہ رسالہ کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ اس میں کل اناتیس اشارات ہیں جس میں مسائل تصوف کی طرف خاص فلسفیانہ نقطہ نظر سے اشارہ کیا گیا ہے۔ خود شناسی پر تاکید کی گئی ہے۔ ان کے مطابق کائنات شناسی اور خدا شناسی کی طرح خود شناسی بھی نہایت ہی ضروری عمل ہے۔

۸- رسالہ اجوبہ: دراصل یہ رسالہ حضرت مخدوم جہاں کے جوابات کا مجموعہ ہے۔ انھوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں، خویش و اقارب اور مریدوں کے سوالات پر مندرجہ بالا جوابات تحریر فرمائے تھے۔

۹- فوائد رکنی: اس رسالہ میں انھوں نے اپنے ایک مرید خاص حضرت رکن الدین کو حج بیت اللہ کے وقت سفر و حضر میں مطالعہ کے لیے ہدایتیں دی ہیں۔

ملفوظات:

۱- معدن المعانی: حضرت مولانا ابن بدر عربی رحمۃ اللہ اپنے زمانے کے بہت بڑے اور مشہور کاتب اور مخدوم الملک کے مرید خاص تھے۔ انھوں نے اس کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ اس میں ۷۴۹ھ سے ۷۵۱ھ تک کے ملفوظات درج ہیں۔ اس کتاب میں نکات تصوف کے علاوہ تفسیر، حدیث، فقہی مسائل اور علم کلام جیسے اہم موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انیسویں صدی کے بہت بڑے محقق اور ناقد سید صباح الدین عبدالرحمٰن فارسی زبان و ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ملفوظات کی عظمت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''...... جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مخدوم الملک کی خانقاہ
> کی مجلسوں میں نہ صرف تصوف کے عقدہ ہای لاینحل حل کیے
> جاتے تھے بلکہ وعظ و نصیحت، رشد و ہدایت، اوامر و نواہی،
> اوصاف حمیدہ اور اخلاق حسنہ کی تعلیم بھی جاری تھی۔ ان ہی
> تعلیمات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت مذہب و
> تصوف دو الگ الگ چیزیں نہ تھیں، بلکہ دونوں ہی ایک ہی شاخ
> کے دو بر تھے۔''[۱۱]

حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری صفائی طینت اور پاکیزگی پر خاص تاکید فرماتے ہیں۔

پاک شوتا زاصل دین گردی
آن چنان باش تا چنین گردی
ہرچہ جز حق بسوز و غارت کن
ہرچہ جز دین از و طہارت کن[۱۲]

آپ بذات خود گوشہ نشینی پسند فرماتے تھے اور اپنے دوستوں، خویش و اقارب اور مریدوں کو بھی گوشہ نشینی کی تلقین فرماتے تھے

ای سنائی کم ثنای گیر
بروہ سنت آشنای گیر[۱۳]

انسان کو چاہیے کہ نفس تکبر کو ہلاک کردے:

نفس کافر را بکش مومن بباش
چون بکشتی نفس را ایمن باش
آدمی زاد تا نہ شد شد مردوم
گہ پری گاہ دیو گہ کژدوم
دشمنت نفس خاکش دار
کعبہ حق دل است پاکش دار[۱۴]

۲- خوان پرنعمت: خوان پرنعمت میں ۷۶۲ھ سے ۷۵۱ھ تک ملفوظات شامل ہیں۔ اس میں تصوف کے جزوی نکات بالتفصیل بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ فقہی اور شرعی مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

۳- راحت القلوب: راحت القلوب دس مجلسوں کے ملفوظات پر مشتمل ہے جس میں رضائے الٰہی، مبدا و معاد، تعظیم تلاوت کلام پاک، فضیلت نماز جمعہ، روز عاشورہ اور کلام پاک کی بعض آیتوں کی تفسیر جیسے مضامین کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ راحت القلوب کو بھی حضرت مولانا زین بدر عربی نے ترتیب دیا ہے۔

۴- مخ المعانی: مخ المعانی ۵۳ مجلسوں میں منقسم ہے۔ فضیلت روزہ و توبہ، آداب طعام، صدق، مرتبہ شہدا، شب معراج، تصفیہ و تزکیہ باطن جیسے مضامین پر بحث و مباحثہ ہوا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ سچائی دوستی کی بنیاد ہوتی ہے۔

۵- مونس المریدین: مونس المریدین میں ۱۰ شعبان المعظم سے محرم ۷۵۵ھ کے ملفوظات نقل کیے گئے ہیں۔ شریعت، طریقت، حقیقت کے معانی، شب برات کی فضیلت، خواب کے اقسام، حیا کی فضیلت، سجادہ اور صاحب سجادہ کی تعریف وغیرہ اس میں شامل ہیں۔

۶- گنج لایخفیٰ: اس میں ربیع الاول ۷۶۰ھ سے لے کر ذی الحجہ ۷۹۰ھ کے ملفوظات شامل ہیں۔ اس ملفوظ کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر مجلس کے ملفوظات لکھتے وقت دن مہینہ اور سال کی خاص پابندی کی گئی ہے۔ انھوں نے شب قدر کی تاریخ کو مخفی رکھنے کی وجہ پر مدلل بحث کی ہے۔

۷- فوائد الغیبی: فوائد الغیبی بتیس مجلسوں کے ملفوظات اور ایک سو بانوے صفحوں پر مشتمل ہے جس میں حضرت مخدوم الملک نے نکات تصوف پر عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ بحث کی ہے۔

۸- نفز المعانی: اس کے جامع اور مرتب شیخ شہاب الدین عماد ہیں۔ یہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس

میں ذات وصفات، ذکر ومراقبہ، فکر وتفکر اور ظاہر وباطن جیسے موضوعات شامل ہیں۔

۹- **تحفۂ غیبی:** مرتب حضرت مولانا زین بدر عربی نے حضرت شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری کی حیات میں ہی ان ملفوظات کو جمع کیا اور مرتب کیا۔ حضرت مخدوم الملک نے بعض جگہ اس کی تصحیح بھی کی ہے۔

مکتوبات:

فارسی زبان ادب کے مطالعہ میں حضرت شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری کے مکتوبات کی اہمیت مسلم ہے۔ ان کے مکتوبات اردو اور انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکے ہیں۔

آسٹریلیا کے نامور دانشور اور محقق پول جیکسن نے مکتوبات کا بہترین انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ پول جیکسن فارسی سیکھنے کی غرض سے ۱۹۶۷ء میں ایران گئے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہ ۱۹۷۰ء میں ہندوستان آئے اور اس عظیم کام کو انجام دینے کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے مکتوبات کے علاوہ خوان پر نعمت کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

حضرت شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری کے کل مکتوبات کو مندرجہ ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱- مکتوبات صدی
۲- مکتوبات دوصدی
۳- مکتوبات بست وہشت

۱- **مکتوبات صدی:** شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری نے اپنے مرید خاص قاضی شمس الدین، حاکم چوسر، کی روحانی تعلیم وتربیت کے لیے یہ خطوط لکھے تھے۔ آپ قاضی صاحب کو بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ وصال کے وقت آپ نے انھیں فرزند عزیز کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

مکتوبات صدی نسخۂ خطی کی شکل میں کتابخانہ آرکیالوجی، پٹیالہ، پنجاب، پٹنہ اور ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں بھی موجود ہے۔ انھوں نے مکتوبات صدی میں تصوف کے تمام ضروری نکات پر محققانہ انداز میں مدلل روشنی ڈالی ہے۔ یہ مکتوبات ۷۴۷ھ میں سپرد قلم ہوئے۔ نامور کاتب اور مرید خاص حضرت مولانا زین بدر عربی نے ان مکتوبات کی نقل کو اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن رقم طراز ہیں:

> ''مکتوبات صدی میں تصوف کے تمام اہم مسائل پر مختصر مگر محققانہ مباحث ہیں۔''[۱۵]

۲- **مکتوبات دوصدی:** حضرت مخدوم الملک نے اپنے دوستوں، خویش واقارب اور مریدوں کی تعلیم وتربیت اور ان کے سوالات کے جوابات دینے کی غرض سے ان لوگوں کے نام خطوط لکھے تھے۔ ان خطوط کے جامع اور مرتب بھی حضرت زین بدر عربی ہی ہیں۔ انھوں نے بڑی محنت سے ان قیمتی خطوط کو ترتیب دیا ہے۔ ان ہی خطوط کے مجموعہ کا نام مکتوبات دوصدی ہے۔

۳- **مکتوبات بست وہشت:** جیسا کہ نام سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ مکتوبات بست وہشت دراصل اٹھائیس خطوط کا مجموعہ ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں حضرت سیدنا مولانا امام مظفر بلخی آپ کے سب سے عزیز اور خاص مرید تھے۔ انھوں نے یہ خطوط انھیں مرید عزیز کو لکھے تھے۔ آپ خود ہی پیر ومرشد کے مابین مضبوط اور مستحکم رشتہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

> ''تن مظفر جان شرف الدین، جان مظفر تن شرف الدین، شرف الدین مظفر، مظفر شرف الدین''۔

انھوں نے ان مکتوبات میں تصوف کی باریکیاں اور ذات خداوند قدوس کو مستند ومدلل حوالوں کے ذریعہ سمجھایا ہے۔ یہ مکتوبات آیات قرآن، احادیث نبوی اور صحابہ وصوفیا کرام کے اقوال زریں سے آراستہ ومزین ہیں۔

بے شک حضرت مخدوم الملک کی تمام تصنیفات اور تالیفات مخصوص مکتوبات نہایت ہی ارزش مند اور ذی قیمت ہیں۔ اسلوب بیان سادہ اور سلیس ہے۔ بمصداق ''آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد'' اشارے آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں اور باتیں دل میں اتر بھی جاتی ہیں۔ زبان وبیان تصنع وتوضیح سے پاک ہے۔ بقول شاعر ع دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر۔ انھوں نے مسائل تصوف کو محققانہ اور فلسفیانہ انداز سے اس طرح سمجھایا ہے کہ قاری کو پوری تشفی ہو جاتی ہے اور مزید تشنگی باقی نہیں رہتی ہے۔ مزید انھوں نے مکتوبات کو بالخصوص دینی ومذہبی موضوعات کے تبلیغ واظہار کے وسیلے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مشاہیر وقت اور اہل قلم مکتوبات کی دینی، مذہبی، تاریخی اور ادبی ارزش واہمیت کے اعتراف میں متفق الرای نظر آتے ہیں۔ تاریخ سلسلہ فردوسیہ میں مرقوم ہے:

> ''مخدوم الملک کی تمام تصانیف اور ملفوظات یوں تو اہم اور مشعل ہدایت ہیں لیکن ان کے مکتوبات کی اہمیت، مقبولیت اور افادیت بالخصوص بہت زیادہ ہے۔''

فارسی مکتوبات نگاری کو انھوں نے ایک مستقل فن کا درجہ عطا کیا۔ جن مضامین کو بیان کرنے کے لیے عظیم کتابیں درکار تھیں انھیں مضامین کو انھوں نے مکتوبات اور ملفوظات کے ذریعہ بحسن وخوبی اور تشفی

بخش بیان کر دیا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان کو ہندوستان میں پروردہ سلسلہ فردوسیہ مانتے ہیں:

''طریقہ فردوسیہ کو ہندوستان میں پروان چڑھانے کا کام شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری نے انجام دیا۔ ان کے مکتوبات تصوف کا بڑا بیش قیمت ذخیرہ ہیں۔''[۱۸]

انھوں نے یہ خطوط روحانی درس اور تعلیم و تربیت کے لیے لکھے تھے جس کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ بندے کا رشتہ معبود حقیقی سے جوڑ دیا جائے۔

حضرت مخدوم کی تصنیفات و تالیفات و ملفوظات و مکتوبات میں توحید، اخلاق حسنہ، خرابی و فساد دنیا، حقوق اللہ، حقوق العباد، حقوق النفس، اصلاح معاشرہ، تاریخ، حدیث، منطق، فلسفہ، اقدار انسانی، تعلقات بین بندگان و معبود حقیقی، توبہ، اتحاد با دشمن، تجدید توبہ، طلب پیر، اہلیت شیخ، ولی، ارادت، کرامت، انوار، تجلی کشف، سالک و مجذوب، امراض ظاہر و باطن، تصوف، طریقت، ارکان طریقت، شریعت و طریقت، طہارت، نیت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، بندگی، قرآن، عبادت، کلمہ طیبہ جیسے مضامین بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ تمام بحث و مباحثہ ان ہی مضامین کے گرد و پیش گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ نصیر الدین چراغ دہلوی ان کو راہ سلوک و معرفت خداوندی کے رہبر و راہنما کی حیثیت سے خطاب کرتے ہیں:

''مکتوبات شیخ شرف الدین کفر صد سالہ را بر کف دست نمود''[۱۹]

مکتوبات اعلیٰ انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ اعلیٰ انشا پردازی کی تمام خصوصیات ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مولانا مناظر حسن گیلانی نثر نگاری کی تعریف میں لکھتے ہیں:

''دینی و علمی برتریاں جو حضرت مخدوم کو بارگاہ ربانی سے ارزانی فرمائی گئی ہیں، ان سے تو دنیا واقف ہے۔ لیکن کم از کم میرا خیال تو یہی ہے کہ نثر نگاری میں سعدی شیرازی کے بعد کسی کا نام ہند ہی میں نہیں بلکہ ایران میں بھی اگر لیا جا سکتا ہے تو شاید وہ بہار کے مخدوم الملک ہی ہو سکتے ہیں۔ مکتوبات کی شکل میں جو ارقام فرمایا ہے۔ فارسی زبان میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔''[۲۰]

انھوں نے کچھ اشعار بھی لکھے ہیں اور خاص طور سے اپنی بات کی دلیل اور مثال کے لیے جو اشعار نقل کیے ہیں وہ قابل صد تحسین ہیں۔ مندرجہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

شرف زنار و تسبیحت یکی شد
تو خواہی خواجہ شو خواہی غلامی اے

پہلے مکتوب میں موضوع توحید کی یوں تشریح کی ہے:

پیش توحید او نہ کہنہ نہ نوست
ہمہ ہیچ اند ہیچ اوست کہ اوست
کی بود ما ز ماجدا ماندہ
من و تو رفتہ و خدا ماندہ

اپنی بات کی دلیل کے طور پر شیخ فرید الدین عطار کے اشعار نقل کیے ہیں:

چند بینا ہزار سال ابلیس
نبودش کار جز تسبیح و تقدیس
ہمہ طاعات او برہم نہادند
ترا استغنای حق برباد دادند

اسی طرح سے مثنوی کے اشعار میں مضامین دینی و مذہبی پر روشنی ڈالی گئی ہے:

مشوای عاصی بیچارہ نومید
کہ چوں پیدا شود اشراق خورشید
اگر افتد بہ قصر بادشاہی
ہم افتد نیز بر کنج گدای
کسی کو برہنہ افتاد بے راہ
درو بہ تابد آن خورشید درگاہ
چوں کار مخلصاں آمد خطرناک
گنہگاراں بند این گوی چالاک

ایک مکتوب میں مناجات ذیل درج ہے:

خداوندا امید ما وفا کن
دلم را از کرم حاجت روا کن
منور دار جانم را بنوری
دلم را زندہ گردان از حضوری

دلم را محرم اسرار گرداں
زخواب غفلتم بیدار گرداں

چون جان را منقطع شد از جہان دم
تو ما را ذوق ایمان دہ دران دم

چوں با ایماں فرو بردی بہ خاکم
نیاید از جہانی جرم باکم

خداوندا ہمہ بیچارہ گانیم
دراں ہنگام چوں نظارہ گانیم

کہ داند تا بہ معنی متقی کیست
سعید از ما کدام است و شقی کیست

اشعار ذیل میں عاجزی وانکساری بدرجہ اتم موجود ہے:

از تو بخشیدن است و بخشیدن
از من افتادن است و بخشیدن

دل گم گشتہ را رہی بنمای
مردم دیدہ را دری بکشای

بد ما نیک شد چو پذیرفتی
نیک ما بد شد چو بگرفتی

بندۂ خویش کن ہر خواہم
تحفۂ خویش کن دہ آہم

آپ معرفت الٰہی کے لیے بے قرار ہیں:

گر دو جہاں دہند مارا
چوں بے وصل تو نیست بی توایم

وہ مزید کہتے ہیں:

ما را بجز این جہاں جہانی دگر است
جز دوزخ و فردوس مکانی دگر است

مندرجہ ذیل قطعہ میں طلبگار عفو ورحمت ہونے کا درس دیتے ہیں:

نومید نیم ز حضرت تو بسیار شود اگر گناہم
زیرا کہ بہ عفو و رحمت تست در دنیا و آخرت پناہم

آپ کی شخصیت اور قدر ومنزلت کے بارے میں پروفیسر نبی ہادی نے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"The deep spiritual insight, which established his position as the leading sufi of Bihar, actually displayed itself in his letters. With sustained seriousness, he thought out all the essential problems concerned with the enlightened of man's in her personality, consolidated then under one hundred headings, and addressed them in the form of letters of one of his devoties. The object of these letters that is, the transmission of a Sufi's moral and religious teachings, became easier due to the excellent literary qualities possessed by their author the collection is popular as Maktubat-e-Sadi"22

حوالے:

۱- سیر الاولیاء ص ۲۲۹ نقل از فارسی بعہد سلاطین تغلق، ڈاکٹر شعیب اعظمی، نعمانی پریس، دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۸۱
۲- لغت نامہ دہخدا، علی اکبر دہخدا، زیر نظر ڈاکٹر محمد معین، شمارہ ۲۹، شمارہ مسلسل ۴۲، شمارہ حرف: "ش" اداکاہ تہران، دانشکدہ ادبیات، سازمان لغت نامہ، تہران، خرداد ماہ ۱۳۳۱ھ ش، ص ۳۲۱
۳- ایضا
۴- مکتوبات صدی (اردو)، احمد یحییٰ منیری، از ترجمہ پروفیسر سید شاہ محمد نعیم ندوی، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۷

۵- مراۃ الاسرار قلمی، ص ۵۸، نقل از فارسی بعہد سلاطین تغلق، ڈاکٹر شعیب اعظمی، نعمانی پریس، دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۸۲

۶- مکتوبات صدی، ص ۱۹

۷- ایضاً

۸- آئین اکبری، ابوالفضل، بہ تصحیح سر سید احمد خاں، سر سید اکادمی، دانشگاہ اسلامی، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء، ص ۲۱۱

۹- Dictionary of Indo-Persian Literature, Prof. Nabi Hadi, Indira Gandhi National Centre for Arts, Delhi, 1995, p.561

۱۰- مکتوبات صدی، ص ۱۹

۱۱- بزم تیموریہ، سید صباح الدین عبدالرحمن، دار المصنفین، اعظم گڑھ، اتر پردیش، ۱۹۸۹ء، ص ۳۳۶

۱۲- ہمان، ص ۳۳۸

۱۳- ہمان

۱۴- معدن المعانی، شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری، ص ۲۰، نقل از فارسی بعہد سلاطین تغلق، شعیب اعظمی، ص ۸۲

۱۵- بزم صوفیہ، سید صباح الدین عبدالرحمن، ص ۳۷۷

۱۶- مکتوبات صدی (اردو)، احمد بن یحییٰ منیری / پروفیسر سید شاہ محمد نعیم ندوی، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۳۰

۱۷- تاریخ سلسلۂ فردوسیہ، ص ۱۹۲، نقل از مکتوبات صدی، ص ۳۰

۱۸- بزم صوفیہ، سید صباح الدین عبدالرحمن، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ص ۳۰

۱۹- مکتوبات صدی، ص ۳۲

۲۰- ہمان

۲۱- ہمان، ص ۳۶

۲۲- Dictionary of Indo-Persian Literature, Prof. Nabi Hadi, Indira Gandhi National Centre for Arts, Abhinav Publication, 1995, p.560

☆☆☆

رعنا خورشید *

عہد تغلق کے نامور فارسی شعراء

۱۰۲۶ء میں فارسی زبان محمود غزنوی کے ساتھ سرزمین ہند میں داخل ہوئی تعجب خیز امر یہ ہے کہ یہ خارجی زبان اتنی سرعت سے یہاں ریشہ گیر ہوئی کہ یہاں کی داخلی زبان پر اپنی لطافت، شیرینی، دلکشی کی وجہ سے صدیوں تک حکومت کرتی رہی اور اپنے بیش قیمت گرانمایہ اور لافانی سرمایۂ ادبی سے ادب کے دامن کو مالا مال کر دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں سلاطین غزنوی، غوری، مملوک خلجی اور تغلق حکمران وقت ہونے کے ساتھ علم و ادب کے دلدادہ اور شیدائی تھے۔ حکمرانوں کی سرپرستی اور ذوق و شوق کے نتیجہ میں فارسی نے ہندوستان میں اپنی جو پہچان بنائی وہ لائق ستائش ہے۔ سلاطین تغلق نے فارسی شعر و ادب کے فروغ میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اس دور میں متعدد شاعر، ادیب، انشاء پرداز اور علماء موجود تھے جن کے کارنامے اس عہد کی ادبی، تہذیبی اور تمدنی تاریخ کا روشن باب ہیں۔

عہد تغلق میں شعر و سخن کے فروغ و ارتقا کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس خاندان کے حکمران نہ فقط علم دوست باذوق مدبر تھے بلکہ باکمال ارباب علم و ادب کی قدر اور سرپرستی کیا کرتے تھے، برنی سلطان محمد تغلق کے جود و سخا فراست و درایت، شعر فہمی اور علم دوستی کی ان الفاظ سے تعریف کرتا ہے۔

''در معقولات فلاسفہ رغبتی تمام داشت و چیزی از علم معقول
خوانده بود'' [1]

حضرت امیر خسرو اور حسن دہلوی کا براہ راست تعلق عہد خلجی سے رہا ہے لیکن ان دونوں حضرات کی زندگی کے آخری ایام عہد تغلق میں گزرے۔ لہٰذا اس نقطہ کو مد نظر رکھتے ہوئے ان مایہ ناز ہستیوں کو عہد تغلق کے شعرا کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں معرکۃ الآرا ہستیوں نے فارسی شعر و ادب کو جس طرح نکھارا اور جو مقام دیا صدیوں تک کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

حضرت امیر خسرو:

فارسی شعروادب کو حیات تازہ عطا کرنے والی شخصیت حضرت امیر خسرو کی تھی۔ امیر خسرو کا پورا نام ابوالحسن یمین الدولہ اور تخلص خسرو تھا۔ آپ کے والد امیر سیف الدین محمود ترکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور پٹیالی میں اقامت گزیں ہوئے۔ سلطان التمش کی فوج میں ایک ذمہ دار عہدے پر فائز ہوئے۔ سلطان نے خوش ہو کر امیر کے لقب سے سرفراز کیا اور پٹیالی میں جاگیر عطا کی۔ امیر خسرو ۶۵۱ء بمطابق ۱۲۵۳ء میں پٹیالی میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والد کے سایہ سے محروم ہو گئے۔ پھر آپ کے نانا عماد الملک نے پرورش و تربیت کی۔ امیر خسرو نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ لیکن بقول شبلی نعمانی ۲۰-۱۵ سے فارغ ہو چکے تھے۔ متعدد زبانوں پر قدرت کے ساتھ ساتھ فن خطاطی کا بھی شوق تھا۔

امیر خسرو کی یہ خوش نصیبی تھی کہ کم عمری میں ہی یعنی ۶۷۱ھ بمطابق ۱۲۷۲ء میں حضرت نظام الدین اولیا کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے تھے۔

محمد وحید اختر رقمطراز ہیں: ؎

> ''حضرت نظام الدین اولیا کی نظر میں خسرو کی اتنی قدر و منزلت تھی کہ جو بات آپ کے سامنے اور لوگ نہ کر سکتے تھے خسرو کر سکتے تھے ۔۔۔ خسرو کی گوناگوں صفات کا آپ سے بڑھ کر کون قدر دان ہو سکتا تھا۔ جب خسرو نے اپنا تذکرہ جو افضل الفوائد کے نام سے مشہور ہے لکھنا شروع کیا تو اس کے چند اوراق آپ کے سامنے ملاحظہ کے لئے پیش کئے۔ آپ نے انہیں دیکھ کر فرمایا کہ ''نیکو نوشتہ و نیکو نام کردہ'' (یعنی تو نے خوب لکھا ہے اور نام بھی اچھا رکھا ہے۔''

مولانا شبلی رقمطراز ہیں خواجہ صاحب نے امیر خسرو کو ''ترک اللہ'' کا خطاب دیا تھا۔ اور اسی لقب سے پکارتے تھے۔ امیر خسرو نے اس پر جا بجا فخر کیا ہے۔ چنانچہ ایک قصیدے میں شیخ المشائخ کی مدح میں فرماتے ہیں:

برزبانت چون خطاب بندہ ترک اللہ رفت   دست ترک اللہ گیر و ہم بہ للہش سپار

جس وقت حضرت نظام الدین کی وفات ہوئی غیاث الدین تغلق بنگال پر فوج کشی کے لئے گیا ہوا تھا تو امیر خسرو بھی اس کے ساتھ ہمرکاب تھے۔ جب مرشد کے انتقال کی خبر سنی تو بہت زیادہ غمگین اور

دل برداشتہ ہو گئے اور بے قرار ہو کر دہلی آ گئے۔ یہاں پہنچ کر اپنی بقیہ زندگی اپنے مرشد کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر گزار دی۔ طبیعت ہر وقت ملول و مکدر رہتی۔ کہتے۔

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس   چل خسرو گھر اپنے رین بھی چہوں دیس

مرشد کی جدائی اور غم میں ۱۸ شوال ۷۲۵ھ بمطابق ۱۳۲۴ء میں اس جہان فانی سے راہی ملک بقا ہوئے۔

حضرت نظام الدین اولیا کی وصیت کے مطابق خسرو کو ان کی پائنتی کی طرف دفن کیا گیا۔ مغل بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر کے زمانے میں باہر کی چار دیواری اور لوح امیر مہدی خواجہ کی زیر نگرانی تیار کی گئی اور لوح پر اس زمانے کے شاعر شہاب الدین معمائی کا کہا قطعہ تاریخ کندہ کیا گیا۔

شد ''عدیم المثل'' یک تاریخ او   وان دگر شد طوطی شکر مقال

حضرت امیر خسرو کئی حکمرانوں اور خوانین کے درباروں سے منسلک رہے۔ جب سن شعور کو پہنچے تو اس پر سلطنت دہلی پر غیاث الدین بلبن تخت نشین تھا۔ اس نے بڑی فراخ دلی سے امیر خسرو کی سرپرستی کی امیر خسرو نے بھی اس کا حق ادا کرنے کے لئے مثنوی ''تغلق نامہ'' لکھ کر اسے سلطان کے نام معنون کر دی۔

دو سال تک اس کے دربار سے وابستہ رہے ۱۲۸۰ء میں بلبن کے بیٹے خان شہید کے ملازموں میں داخل ہو کر ملتان چلے گئے۔ اس زمانے میں دہلی کے بعد ملتان علم وادب کا سب سے بڑا مرکز خیال کیا جاتا تھا۔ ۱۲۸۵ء میں شاہزادہ سلطان محمد مغلوں کے ہاتھوں شہید ہوا تو اس افراتفری کے ماحول میں خسرو کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ کسی طرح رہائی حاصل ہوئی اور دہلی آ کر بلبن کے دربار میں شہزادہ محمد کا دردناک مرثیہ سنایا۔ اس مرثیہ کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

واقعہ است این یا بلا از آسمان آمد پدید   آفتست این یا قیامت در جہان آمد پدید
مجلس یاران پریشان شد چو برگ گل ز باد   برگ ریزی گوئی اندر بوستان آمد پدید
بس کہ آب چشم خلقی شد روان از چار سو   جوئے آب دیگر اندر مولتان آمد پدید
خواستم تا ز آتش دل بر زبان آرم سخن   صد زبان آتشیم در دہان آمد پدید
جمع شد سیارہ در برجے مگر طوفان شود   چون بہ برج آبی انجم را قران آمد پدید
من نخواہم جز نہان جمعیت واین کی شود   خود محالست این بنات النعش پروین کی شود

شہزادہ سلطان محمد کی شہادت نے سلطان غیاث الدین بلبن کو زندہ در گور کر دیا تین سال بھی نہیں گزرے تھے کہ سلطان کا انتقال ہو گیا۔

۱۲۹۰ء میں جب سلطان جلال الدین خلجی تخت نشین ہوا تو خسرو اس کے دربار سے وابستہ ہو کر

ندیم خاص میں شامل ہو گئے، مصحف داری اور امارت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز کر دیے گئے۔ بہر حال عہد خلجی میں اثر و رسوخ کے ساتھ زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ اپنے علم و فن کی ہنر نمائی کرتے رہے۔ خاندان خلجی کے زوال کے بعد غیاث الدین تغلق کے عہد تک زندہ رہے۔ اس زمانے میں بھی خسرو کو بڑی قدر و منزلت حاصل رہی۔

الغرض امیر خسرو ان شعرا میں سے تھے جن کی عزت و منزلت نہ صرف ان کی زندگی بلکہ اس دار جہان فانی سے کوچ کرنے کے بعد بھی ان کی رفعت و عظمت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

امیر خسرو فارسی کے قادر الکلام اور یگانہ روزگار ہونے میں کسی بھی صاحب علم و ادب کی دو رائے نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ عربی، ہندی زبان اور کھڑی بولی پر مہارت رکھتے تھے۔ ہندی زبان کا بنیادی اثر کا سبب یہی تھا کہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی والدہ ہندنژاد خاتون تھیں۔ مثلاً

زحال مسکیں مکن تغافل ورائے نیناں بنائے بتیاں	کہ تاب ہجراں ندارم اے جان نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلش چو عمر کوتاہ	سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

امیر خسرو کی ہمہ گیر طبیعت موسیقی کی طرف مائل تھی۔ وہ ہندوستانی راگوں پر قدرت رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے موسیقی کو ترکیب دے کر ایک نیا رنگ دیا ہے۔ محمد وحید مرزا رقمطراز ہیں۔ [۵]

''اعجاز خسروی میں ایک جگہ خسرو نے خراسان سے کچھ موسیقی
دانوں کے ہندوستان وارد ہونے کا تذکرہ کیا ہے اور ہندوستانی
ماہرین فن کو دعوت دی کہ وہ ان کے مقابلے میں آئیں تاکہ
قریان بالا کو یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ بہار ہندوستان میں
پر نکیسے ہیں''

یہ بات واضح ہے کہ امیر خسرو کو ایرانی اور ہندوستانی دونوں موسیقی کے اصولوں پر مہارت تھی۔ فارسی راگوں کے بکثرت نام ان تصانیف میں جا بجا ملتے ہیں۔

امیر خسرو کثیر التصانیف تھے کو نظم اور نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ وہ مختلف موضوعات پر قلم اٹھانے کی زبردست صلاحیت رکھتے تھے۔ حضرت امیر خسرو نے پانچ دیوان ترتیب دیے ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱- **تحفۃ الصغر**: یہ امیر خسرو کا پہلا دیوان ہے جو انہوں نے ۶۷۱ میں مرتب کیا، اس میں وہ قصائد ہیں جو انہوں نے سولہ سے بیس سال کی عمر تک کہے تھے۔ یہ دیوان ۳۵ قصائد، پانچ ترجیع بند اور ترکیب بند ایک مختصر مثنوی اور متعدد چھوٹے بڑے قطعات پر مشتمل ہے۔

۲- **وسط الحیوۃ**: یہ خسرو کا دوسرا دیوان ہے یہ انیس سے چوبیس سال کی عمر تک کا کلام ہے۔ اس دیوان میں ۵۸ قصیدے، آٹھ ترجیع بند اور متعدد رباعیات اور قطعات ہیں۔

۳- **غرۃ الکمال**: یہ خسرو کا تیسرا دیوان ہے یہ چونتیس ۳۴ سال سے لے کر تینتالیس ۴۳ سال کی عمر تک کے کلام پر مبنی ہے۔ بقول محمد وحید مرزا کے ''اس میں شبہ نہیں کہ اگرچہ دیوان غرۃ الکمال کی نظمیں بہت قابل قدر ہیں لیکن اس کا دیباچہ زیادہ بیش قیمت چیز ہے۔ یہ دیون خسرو کے پانچوں دیوانوں میں سب سے زیادہ بڑا ہے اور ان کے کلام کے بہترین نمونے اس میں موجود ہیں'' (ص ۲۱۶)

زیادہ تفصیل میں نہ جا کر اس دیوان کے صرف ایک قصیدہ ''دریائے ابرار'' کا ذکر کرنا ضروری خیال کیا گیا اس لئے کہ یہ قصیدہ حضرت نظام الدین اولیا کی مدح میں ہے جس کی پیروی میں پایہ کے شعرا مثلاً جامی نے ''لجۃ الافکار'' اور نوائی نے ''بحر الافکار'' کے نام سے جواب لکھے ہیں۔

محمد وحید مرزا رقم طراز ہیں: [۵]

''نوائی نے مجالس النفائس میں لکھا ہے کہ خسرو کہا کرتے تھے کہ
اگر حوادث زمانہ سے میرا تمام کلام مفقود اور معدوم ہو جائے
اور صرف یہ قصیدہ باقی رہ جائے تو مجھے کچھ فکر نہ ہوگی۔ اس لیے
کہ جو کوئی اس قصیدے کو پڑھے گا وہ اقلیم سخن میں میرے مرتبے
اور قابلیت کا معترف ہوگا۔''

۴- **بقیہ نقیہ**: یہ دیوان امیر خسرو نے چونسٹھ ۶۴ سال کی عمر میں مرتب کیا۔ یہ دیوان ایک دیباچہ اور متعدد ابیات پر مشتمل ہے۔ ضخامت کے اعتبار سے یہ دیوان غرۃ الکمال سے بہت چھوٹا ہے۔ لیکن کلام کی پختگی اور بعض کلام کے بعض نادر نمونوں کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہے۔

۵- **نہایت الکمال**: یہ دیوان خسرو نے سلطان غیاث الدین تغلق کے انتقال اور محمد تغلق کی تخت نشینی یعنی اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے مرتب کیا تھا۔ یہ دیوان بائیس ۲۲ قصائد، پانچ ترجیع بند، چار چھوٹی چھوٹی مثنویوں، متعدد قطعات، اور رباعیات پر مشتمل ہے۔

امیر خسرو کی تاریخی مثنویاں:

قران السعدین: ۶۸۸ھ بمطابق ۱۲۸۹ء میں ۳۶ سال کی عمر میں خسرو نے اپنی پہلی مثنوی لکھی۔ اس مثنوی میں بغرا خان اور کیقباد یعنی باپ بیٹے کی صلح اور ملاقات کا واقعہ بیان کیا ہے۔

مفتاح الفتوح: یہ خسرو کی دوسری مثنوی ہے جو ۶۹۰ھ بمطابق ۱۲۹۱ء میں لکھی گئی اس میں جلال الدین کی فتوحات کا ذکر ہے خسرو کی یہ مثنوی ان کی دوسری تاریخی مثنویوں کے مقابلے میں بہت مختصر ہے۔

عشقیہ یا مثنوی خضر خان اور دول رانی: یہ مثنوی ۷۱۵ھ بمطابق ۱۳۱۵ء میں لکھی گئی یہ مثنوی سلطان جلال الدین کے بیٹے خضر خان اور گجرات کے راجہ کی بیٹی دولرانی کے قصہ عشق ومحبت پر مشتمل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خضر خان نے اپنی رومانی داستان خود لکھی تھی۔ جسے بعد میں امیر خسرو نے خضر خان کی فرمائش پر نظم کا جامہ پہنایا۔

نہ سپہر: یہ مثنوی ۷۱۸ھ بمطابق ۱۳۱۸ء میں تصنیف کی گئی مفتاح الفتوح کی طرح یہ بھی تاریخی مثنوی ہے۔ اس میں مبارک شاہ خلجی کے عہد کے حالات و واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ مثنوی نو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے ہر باب کو "سپہر" کا نام دیا گیا ہے اور ہر سپہر ایک مختلف بحر میں ہے۔

تغلق نامہ: یہ مثنوی غیاث الدین تغلق کے مختصر سے عہد حکومت کے واقعات پر مشتمل ہے۔ یہ خسرو نے اپنے انتقال ۷۲۵ھ بمطابق ۱۳۲۴ء سے کچھ عرصہ پہلے کہی تھی۔

امیر خسرو نے نظامی گنجوی کے خمسہ کے جواب میں مندرجہ ذیل پانچ مثنوی کہی ہیں۔ یہ پانچوں مثنویاں ۶۹۸ھ/ ۱۲۹۸ء تا ۷۰۱ھ/ ۱۳۰۱ء کے عرصہ میں لکھی گئی۔

مطلع الانوار: یہ مخزن الاسرار کے جواب میں ۶۹۸ھ بمطابق ۱۲۹۸ء میں مکمل ہوئی اور سلطان علاء الدین خلجی کے نام منسوب کی گئی۔

شیرین خسرو: یہ نظامی کی مثنوی 'خسرو شیرین' کے جواب میں لکھی گئی اس کا سال تصنیف ۶۹۸ھ بمطابق ۱۲۹۸ء ہے۔

مجنون لیلی: یہ نظامی کی لیلی مجنون کے جواب میں ۶۹۸ھ بمطابق ۱۲۹۸ء میں لکھی گئی ہے۔

آئینہ اسکندری: یہ نظامی کی مثنوی سکندر نامہ کے طرز پر ۶۹۹ھ بمطابق ۱۲۹۹ء میں لکھی گئی

ہشت بہشت: یہ اس سلسلے کی آخری مثنوی ہے جو ۷۰۱ھ بمطابق ۱۳۰۱ء میں مثنوی 'ہفت پیکر' کے جواب میں لکھی گئی۔

اس کے علاوہ خسرو کا دیوان بھی ان کے شاعرانہ افکار کا غماز ہے۔

امیر خسرو کی خواہ نثر ہو یا نظم ہر جگہ ان کی فکر و قلم کی جولانیاں دکھائی دیتی ہیں۔ انہوں نے تقریباً تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ غزل میں خاص طور سے غزل کو اس کے مزاج کے حساب سے ڈھال کر اس کے دامن کو وسیع کیا ہے خسرو کا طرۂ کمال یہ ہے کہ انہوں نے عشق و حسن کے معاملات، ہجر و جدائی کے درد و کسک اور سوز و گداز کی تڑپ کو شعر کے پیکر میں ڈھال دیا ہے کہ خوانندہ پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ مثلاً

می روی و گریہ می آید مرا ساعتی بنشین کہ باران بگذرد

امیر خسرو نے اپنے تازہ و انوکھی تشبیہات کی جدت سے اپنی غزل کو انفرادیت عطا کر دی ہے۔ مثلاً

خرام آن صنم نازنین ہمیاری کبوتری بخرام آمدہ است پنداری

عام طور پر رفتار محبوب کو مور یا چکور سے تشبیہ دی جاتی ہے لیکن خسرو کو کبوتر کی مستانہ چال میں بھی وہی کیفیت و مستی نظر آتی ہے۔

منظر کشی، مضمون آفرینی، جذبات نگاری اور موسیقیت کے ساتھ ساتھ جس چیز نے ان کے کلام کو آفاقیت اور ہمہ گیر مقام بخشا وہ کلام میں صوفیانہ رنگ کی آمیزش ہے۔ حقیقت میں سوز و گداز احساس سپردگی، جذبہ شوق و سرمستی اور سرخوشی و مدہوشی تصوف کے ذریعہ ہی غزل میں آئی ہے۔

یہی وہ عناصر غزل ہیں جنہوں نے امیر خسرو کو مقبولیت کے مقام پر پہنچایا۔

امیر خسرو کی کچھ نثری تصنیف حسب ذیل ہیں۔

۱- **اعجاز خسروی یا رسائل الاعجاز:** یہ خسرو کی ضخیم نثری تصنیف ہے ۷۱۹ھ بمطابق ۱۳۱۹ء میں مکمل ہوئی اس کتاب میں امیر خسرو نے مرصع اور مزین نثر کے نمونے پیش کئے ہیں۔

۲- **خزائن الفتوح یا تاریخ علائی:** یہ کتاب ۷۱۱ھ بمطابق ۱۳۱۱ء میں لکھی گئی یہ علاء الدین خلجی کے عہد کی مختصر تاریخ ہے۔

۳- **افضل الفوائد:** یہ کتاب خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات پر مشتمل ہے، مرید ہونے کے بعد ۷۱۹ھ میں خسرو نے افضل الفوائد مرشد کی خدمت میں پیش کی۔

حسن دہلوی:

امیر حسن دہلوی نام، نجم الدین لقب اور والد کا نام علاء الدین سیستانی المعروف ہلائی ہجری ۶۵۲ھ بمطابق ۱۲۵۴ء بدایوں میں پیدا ہوئے لیکن پرورش و پرداخت و نشو و نما دہلی کی آب و ہوا میں ہوئی، امیر حسن امیر خسرو سے ایک سال چھوٹے تھے۔ اور دونوں کی تحصیل علم کا زمانہ ایک ہی رہا ہے۔ یہ زمانہ تھا جب سلطان غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھا۔ سلطان غیاث الدین بلبن کی اولاد میں اس کا بڑا بیٹا سلطان محمد بڑا لائق و فائق تھا۔ وہ خود تعلیم یافتہ اور علم و فضل کا دلدادہ تھا سلطان اس سے جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ۶۹-۶۶۸ھ میں غیاث الدین بلبن کا چچازاد بھائی شیر خان جو سلطنت کا رکن اعظم اور ملتان کا گورنر تھا فوت ہو گیا۔ تو سلطان بلبن نے اپنے بیٹے سلطان محمد کو قاآن الملک کے خطاب کے ساتھ چتر و تاج اور کثیر فوج کے ساتھ ملتان کی طرف روانہ کیا۔

سلطان محمد جو خان شہید کے نام سے بھی جانا جاتا ہے اس کا قاعدہ تھا کہ ہر دوسرے تیسرے سال اپنے باپ کی زیارت کے لئے ملتان سے دہلی آیا کرتا تھا ۶۷۸ھ کے دورہ میں وہ امیر خسرو اور حسن دہلوی جو اس دور میں افق شاعری کے روشن ستارے تھے اپنے ساتھ ملتان لے گیا۔ اور علی الترتیب مصحف داری

اور دوات داری کی خدمات پر مامور کر دیا ان دونوں حضرات نے پانچ سال تک شہزادہ کے زیر سایہ ندما کی حیثیت سے ملتان میں مقیم رہے۔

۶۸۳ھ میں شہزادہ سلطان محمد ملتان میں حکمرانی کو چودہ پندرہ سال بھی نہ گزرے تھے کہ تاتاریوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس حادثہ کا امیر خسرو اور حسن دہلوی دونوں پر بہت زیادہ اثر پڑا۔ چنانچہ امیر خسرو نے نظم میں اور حسن دہلوی نے نثر میں نوحہ خوانی کی، اس واقعہ کے بعد دونوں دہلی چلے آئے۔ خان شہید کے حادثہ نے غیاث الدین بلبن کو زندہ در گور کر دیا اور ۶۸۶ھ میں اس کا انتقال ہو گیا اس کے بعد خسرو اپنے وطن پٹیالی اور حسن دہلوی دہلی میں رہے۔

حسن دہلوی بیشمار صفات سے آراستہ تھے وہ ایک خوش مزاج نہایت سنجیدہ، پاکیزہ اطوار، قناعت پسند، متوکل اور صوفیانہ مزاج کے مالک تھے۔ حسن دہلوی ۵۲ سال کی عمر میں ۷۰۶ھ میں حضرت نظام الدین اولیا کے مرید ہوئے۔ اور اس کے بعد تقریباً ۳۲ سال تک بقید حیات رہے ۸۸ سال کی عمر میں سن ۷۳۸ھ میں وفات پائی مخدوم الاولیاء سے مادۂ تاریخ وفات نکلتا ہے۔

حسن دہلوی نظم و نثر دونوں میں مہارت رکھتے تھے۔ آپ نے بیشتر تصانیف علاءالدین خلجی کے عہد میں تصنیف کیں۔ شاعری میں ایک دیوان ترتیب دیا تھا جو دست برد زمانہ سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ نثری تصانیف میں "مخ المعانی" یہ ایک مختصر تصنیف ہے اس میں لفظ "عشق" کے ذریعہ تصوف اور معرفت کے نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا ہے، حسن اپنی اس تصنیف کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ ایک دن اس کتاب کو حضرت کی خدمت میں لے گیا آپ نے اس کو بے حد پسند فرمایا۔ اب تک یہ کتاب گوشہ گمنامی میں پڑی ہوئی تھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاد پروفیسر خلیق احمد نظامی نے متعارف کرایا۔ اس کے علاوہ نثری مرثیہ جو خان شہید کی وفات پر کہا تھا وہ حسن دہلوی کے قلم کی جدت ہی ہے کہ انہوں نے پہلی بار نثر میں مرثیہ نگاری کی تاریخ رقم کی، نثری ادب میں حسن دہلوی کا شاہکار "فوائد الفواد" ہے جو ارشادات شیخ اور تلقین مرشد کے موضوع پر ایک مستند ملفوظ شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ احکام طریقت، اخلاقی تعلیم کے ساتھ ساتھ ادبی حیثیت سے بھی ایک نمایاں مقام کی حامل ہے۔ جابجا برجستہ اشعار اور شعرا کے ذکر سے بھی اس کی ادبی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کتاب کی زبان صاف اور سلیس شیریں اور دلکش ہے۔

جیسا کہ قبلاً تذکرہ کیا گیا حسن دہلوی نظم و نثر دونوں میں مہارت رکھتے تھے کم سنی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا ان کے کلام میں پاکیزگی سوز و گداز کے ساتھ داخلی جذبات و کیفیات کا تاثر جابجا نظر آتا ہے۔

مرزا وحید اختر خسرو اور حسن دہلوی کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ سے کرتے ہیں۔[۴۹]

"امیر خسرو اور خواجہ حسن دہلوی نے جن کے نام پر نہ صرف دہلی

بلکہ تمام ہندوستان کو ناز ہے اور بجا طور پر ہے اس لیے ان کے
مقابلے کے شاعر ایران کی شاعر خیز زمین نے بھی کم پیدا کئے ہیں
اور ہندوستان میں تو اس وقت سے اب تک چھے سو سال کے
طویل عرصے میں کوئی ایسا فارسی گو شاعر نہیں پیدا ہوا جو ان کی
برابری اور ہمسری کا دعویٰ کر سکے"

اس میں کوئی شک نہیں کہ حسن دہلوی کے کلام میں سلاست، لطافت، شستگی کی وجہ سے ہی ان کو "سعدی ہند" کہا جانے لگا۔ وہ خود بھی اپنے کلام میں جابجا اشارہ کرتے ہیں۔

حسن گلی ز گلستان سعدی آورده است — که اہل معنی گلچین آن گلستان است

بدر چاچ:

عہد تغلق کا مشہور ترین شاعر بدر الدین چاچی تھا۔ بدر الدین چاچ یا شاش یعنی تاشقند کا رہنے والا تھا۔ سلطان محمد بن تغلق کے دربار میں اس کی بڑی عزت و قدر تھی وہ نہ صرف اس کے دربار کا ملک الشعراء تھا بلکہ سلطان نے اس کو "فخر الزمان" کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔ وہ خود اپنے شعر میں اپنے اس خطاب کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

دریں در بدر چاچی را سخن شیرین غلامی دان
اگرچہ خسرو عالم کند "فخر الزمان" لقبش

بدر کی زندگی کے بارے میں زیادہ اطلاعات فراہم نہیں ہوتی۔ فارسی ادب میں اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ وہ قصیدے کا شاعر ہے اور اس کے زیادہ تر قصائد سلطان محمد تغلق کی مدح میں ہیں۔ ان قصائد کی اہمیت اس لئے اور بڑھ جاتی ہے ان میں بدر نے بعض تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان قصائد کو تاریخی ماخذ کی حیثیت سے ایک مقام حاصل ہے۔ ان قصائد کی زبان مشکل و پیچیدہ ہے۔ ان قصائد کی طرز نگارش کے بارے میں شیخ اکرام کا بیان ہے:

"طرز تحریر کی غرابت، معموں کی فراوانی، مشکل الفاظ اور پیچیدہ اور
دقیق تشبیہوں کی وجہ سے ان سے محظوظ ہونا ہر ایک کا کام نہیں"[۵۰]

قصائد کے علاوہ بدر چاچ نے ایک مثنوی "شاہنامہ" لکھی تھی۔ بدایوں لکھتا ہے

"از شعرای مشہور در زمان سلطان محمد، بدر شاشی مذکور است، کہ
شاہنامہ بنام او گفتہ، قریب بہ سی ہزار بیت و ہمین کہ تاریخ
منظوم است غنیمت است"[۵۱]

عصامی:

عہد تغلق کے مشہور شعرا میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس کے حالات زندگی کے بارے میں زیادہ اطلاعات نہیں ملتی ہیں البتہ ان کی مثنوی ''فتوح السلاطین'' سے جو داخلی شواہد یا اشارے ملتے ہیں اس سے اس کی زندگی اور اس دور کے بارے میں کافی اطلاعات فراہم ہوتی ہیں۔

عصامی ۱۳۱۰ء تخمیناً پیدا ہوا اس کے صحیح نام کے بارے میں معلوم نہیں ہے البتہ اتنا معلوم ہے کہ اس کے اجداد میں سے فخر الممالک عصامی خلفائے عباسی کا وزیر تھا۔ کسی بات سے خلیفۂ وقت سے رنجیدہ خاطر ہو کر ترک وطن کر کے اپنے خاندان کے ساتھ ہندوستان آیا اور ملتان میں آکر اقامت گزین ہوا اس وقت دہلی سلطنت پر سلطان شمس الدین التمش برسر اقتدار تھا جو اسلامی ممالک سے آنے والے علماء اور اہل علم کی عزت وقدر کیا کرتا تھا۔ فخر الدین ملتان سے دہلی آیا تو سلطان نے ان کا بڑا پر جوش خیر مقدم کیا بلکہ منصب وزارت کے عہدے پر فائز بھی کیا۔

عصامی کے دادا عز الدین عصامی جو عہد بلبن میں ایک فوجی افسر تھے۔ انہوں نے ہی ان کی پرورش و پرداخت کی کیونکہ کسی بھی تذکرے میں ان کے والد کا نام یا دیگر اطلاعات کا ذکر نہیں ملتا۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بچپن ہی میں والد کے سایہ سے محروم ہو گئے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ جب محمد بن تغلق نے دہلی کے امراء کو دیوگری میں منتقل ہونے کا حکم دیا تو عصامی نے بھی اپنے دادا کے ساتھ دکن کی جانب سفر اختیار کیا۔ لیکن ان کے دادا سفر کی صعوبتیں برداشت نہ کر سکے اور راستے میں ہی جان بحق ہو گئے۔ عصامی ملول و مضطرب اکیلے ہی دیوگری پہنچے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۶ سولہ سال تھی۔ دیوگری تقریباً چوبیس سال تک ایک غیر معروف تخلص زدہ ادیب کی حیثیت سے زندگی بسر کرتا رہا۔ اس کا دوسرا سبب یہ تھا کہ وہ اپنے معاصرین کے طور طریقوں سے آزردہ خاطر تھا۔ لہٰذا اسی آزردگی کی وجہ سے ہجرت کا مستحکم ارادہ کر لیا۔ جس کا اشارہ اپنی مثنوی میں کرتا ہے:

شدم ساختہ تا ز اقصای ہند ... سوی کعبہ گردم مراحل پسند

لہٰذا اپنی تصنیف ''فتوح السلاطین'' مکمل کرنے کے بعد مدینہ منورہ چلا گیا کیونکہ اس کتاب کی تصنیف کے بعد اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ اس لئے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ اسے مکمل کرنے کے بعد حجاز چلا گیا اور وہیں اس کا انتقال ہوا ہوگا۔ اس کی تاریخ وفات کے متعلق کسی بھی تذکرے میں کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔

عصامی کی شہرت کا انحصار اس کی تصنیف ''فتوح السلاطین'' پر ہے جو اس نے چالیس سال کی عمر میں لکھی۔ یہ اس نے علاء الدین حسن بہمن شاہ (گنگو یا گانگو) کے ایما پر ۵۰-۱۳۴۹ء میں تصنیف کر کے اپنے سرپرست کے نام معنون کی۔ یہ منظوم تاریخ دو جلدوں پر مشتمل ہے اس میں عہد غزنوی سے لیکر سال

تصنیف تک یعنی محمد بن تغلق کے عہد حکومت تک کے تاریخی حالات درج ہیں۔ یہ مثنوی پانچ ماہ کی مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

''فتوح السلاطین'' میں تقریباً بارہ ہزار اشعار ہیں جو شاہنامہ فردوسی کی بحر یعنی بحر متقارب میں لکھی گئی ہے۔ اس کا اسلوب بیان واضح اور سادہ ہے۔ علمی و ادبی اعتبار سے اس کا پایہ بلند نہیں ہے لیکن تاریخی حیثیت سے اس کی قدر و منزلت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس مثنوی کی ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں شاعر نے حقائق بیانی کے ساتھ ساتھ شاعرانہ مبالغہ آرائی سے پرہیز کیا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی ذاتی حالات و احساسات پر بھی پردہ نہیں ڈالا مثلاً:

طبیعت بہ دامان من چنگ زد ... بہ قارورۂ عزم من سنگ زد
بگفتم مرا ہیچ فرزند نیست ... کہ جز تو ای طبع پابند نیست

وزین پس ز زن خواستن منکرم ... ہم از خانہ آراستن منکرم

بدان تا محروم اسیر عیال ... بپا در نیایم درین خشک سال
خصوصاً درین دور آخر زمان ... کہ جز فتنہ کم زاید اندر جہان

صاحب آب کوثر کا بیان ہے:[9]

''عصامی نے واقعات کو بڑی احتیاط اور وضاحت سے نظم کیا چونکہ وہ خاندان خلجی اور تغلق کے لئے ایک قریب العہد مورخ ہے اور ویسے بھی اس وقت دولت آباد وغیرہ میں کئی لوگ ایسے تھے جن کے لئے اس دور کے شمالی ہند کے واقعات چشم دید تھے۔ اور عصامی کی ان تک رسائی تھی۔ اس لئے ان کی مثنوی کی تاریخی اہمیت کافی ہے''

مسعود بک: سلطان فیروز شاہ تغلق کے اقارب میں سے تھے۔ ان کا اصل نام شیر خان تھا۔ مسعود بک غالباً خطاب تھا۔ ایک زمانہ میں بڑی شاہانہ اور اہل ثروت کی طرح زندگی گزاری اس کے بعد مزاج و طبیعت میں تبدیلی آگئی صوفیانہ اور درویشانہ زندگی کی طرف مائل ہو گئے۔ شیخ رکن الدین بن شہاب الدین کے مرید ہوئے۔

دیوان کے علاوہ تصوف کے موضوع پر کئی کتابیں لکھیں۔ مثلاً تمہیدات، مراۃ العارفین وغیرہ۔ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:[10]

"بجز در سلسلۂ چشتیہ ہیچ کس این چنین اسرار حقیقت را فاش نکردہ و
مستی نہ کردہ کہ او کردہ"

مسعود کے اشعار سے بھی ان کی عارفانہ فکر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں

اس روحانیت کی خرابات میں عجیب و غریب قسم کے مست اور آزاد لوگ ہیں جو قدح بادہ کے لئے اپنے سر کا پیالہ بنا کر پیش کر دیتے ہیں یعنی وہ عاشق صادق جو منازل معرفت الٰہی طے کر چکا ہے جو اپنے وجود کو وجود مطلق میں مدغم کر چکا ہے وہ جذبۂ جانفشانی سے متاثر ہو کر بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہو جاتا ہے مثلاً:

اندرین دور خرابات عجیب مستانند
کز پی بادہ قدح کاسۂ سر گردانند
صورت نقش برون دادہ درون ننشند
معنی گنج درون کردہ برون ویرانند

یعنی یہ عارف باللہ اندر سے بہترین نقاش ہیں۔ جنہوں نے جلوۂ الٰہی اور عشق خداوندی سے اپنے دل کو آراستہ کر لیا ہے اپنی ظاہری حالت یعنی ظاہری نقش کو باہر نکال دیا ہے۔ علم و حکمت اور معرفت و طریقت کے خزانے کے موتیوں سے اپنے باطن کو آراستہ کر لیا ہے، ظاہری سراپے کو ویران اور بے رونق کر لیا ہے اور باطن کو نور الٰہی سے سجا لیا ہے۔

از تن افگندہ ہمہ خرقۂ ترکیب برون تا بخود ماندہ بصورت نہ بکس می مانند

ان درویشوں نے اپنے جسم سے خرقۂ ترکیب یعنی ظاہری لباس کو اتار دیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نہ اپنی صورت سے ملتے ہیں اور نہ کسی دوسرے کی صورت سے ملتے ہیں یعنی یہ عارف باللہ کفر و ایمان کی قید سے آزاد ہیں انہوں نے ہر مذہب اور فرقہ کی تائید کردہ پابندی سے اپنے کو بری کر لیا ہے۔

اس قبیل کے بیشمار اشعار ہیں جس سے مسعود کی عارفانہ فکر اور وجدانی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے وجود کو وجود مطلق کے جلووں میں اس قدر مدغم و غرق کر لیا تھا کہ اپنے آپ سے بیگانہ ہو گئے تھے۔

درک شان نیست درین چشم معنی مسعود گر چہ پیدا بنمایند ولی پنہانند
گر کشف شدہ و راز در آن حال ز مسعود معذور بدارید کہ گویا دگری بود

مطہر کڑہ: مطہر جو الہ آباد سے ۴۰ میل شمال مغرب جو قدیم زمانے میں صوبے کا دارالسلطنت تھا وہاں کے رہنے والے تھے۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں بقید حیات تھے نہ صرف فیروز شاہ بلکہ اس عہد کے امراء کا

مداح تھے۔ لیکن افسوس ان کی زندگی کے بارے میں تفصیلات نہیں ملتی ہیں ان کا پورا نام شیخ مظہر الدین تھا، ان کے خاندان کا شمار اپنے دور کے شرفا میں ہوتا ہے۔ ان کا گھرانہ مذہبی اور حنفی مسلک تھا، کہا جاتا ہے کہ مطہر خود آگرہ کے قاضی تھے۔ انہیں فیروز شاہ تغلق کے مقربین اور درباری ہونے کا اعزاز حاصل تھا، مختلف مواقع پر وہ سلطان کے انعامات و اکرامات سے بھی سرفراز ہوتے رہے تھے۔

مطہر شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے مرید تھے۔ مرید کی وفات پر آپ نے ایک بلند پایہ مرثیہ لکھا ہے۔

ز دور محنت این نہ سپہر زنگاری کدام دل کہ نہ خون گشت از جگر خواری
کجا بجام طرب مجلسی بنا کردند کہ از سپہر نبارید سنگ قہاری

چہ دانی آنکہ در اوراق کارخانۂ غیب قضا چہ نقش برآرد ز کلک جباری
زدست چرخ ندانم کجا کنم فریاد کہ بر گذشت بما جور او ز بسیاری
جہان بماتم خواجہ نصیر الدین محمود ہزار گونہ فغان کرد و نوحہ و زاری
بقیۂ سلف و یادگار اہل کرم کہ کرد ختم خلافت بملک دینداری

مطہر صوفی منش اور درویش صفت شخص تھے۔ بیشتر تذکرہ نگاروں نے ان کو بڑے پرشکوہ اور وجیہ القاب سے یاد کیا ہے۔ مثلاً تاریخ محمدی کا مصنف "ختم الشعرا" کے لقب سے یاد کرتا ہے۔

مطہر کا کلام فصاحت و بلاغت، سلاست و سادگی بیان کا آئینہ دار ہے۔ وہ ایک شیریں زبان اور تمکین بیان شاعر تھے۔ زیر نظر اشعار سے ان کے سادگی بیان اور شیرینی کلام کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

فرو کن پردۂ خرگاہ و چنگ آہستہ تر می زن کہ ہر چہ آہستہ می گیری نوا ہا زاری آید

نشاط مئی غنیمت دان کہ جمع شادمانیہا اگر اندک بود بعد از غم بسیار می آید
می خواہم کہ یک روزی کنم وحشت ولی شرمم از آن ریش سپید و گوشۂ دستار می آید

مطہر صاحب دیوان شاعر ہیں، شیخ محمد اکرام بدایونی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"مطہر کا دیوان پندرہ ہزار اشعار پر مشتمل تھا لیکن یہ دیوان شیخ
عبدالحق محدث دہلوی کے زمانے میں ہی کمیاب بلکہ نایاب ہو گیا
تھا خوش قسمتی سے ڈاکٹر وحید مرزا کو اس کا نامکمل نسخہ حاصل ہوا
ڈاکٹر صاحب و مولوی محمد شفیع پرنسپل اورینٹل کالج لاہور نے کالج

میگزین میں بیش قیمت مضامین لکھے اور شاعر کو ایک نئی زندگی
دے دی۔[110]

سید بندہ نواز گیسودراز:

سید محمد الحسینی الملقب بہ بندہ نواز گیسودراز ۱۳۲۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے چار پانچ سال کی عمر میں اپنے والد مخدوم سید محمد یوسف المعروف شاہ راجو قتال کے ساتھ سلطان محمد تغلق کے حکم سے دہلی سے دولت آباد تشریف لے آئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ دس سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کے ماموں سید ابراہیم نے آپ کی پرورش کی۔ گیسودراز پندرہ سال کے تھے آپ کی والدہ اور ماموں کے درمیان کسی بات پر پرخاش ہوگئی لہٰذا وہ اپنے بھائی سے ناراض ہوکر دلی آ کر بس گئیں لہٰذا یہاں دہلی میں آپ نے کسب علم کیا۔ اور نہایت چھوٹی عمر میں حضرت چراغ دہلی کی خدمت میں حاضر ہوکر ان کے مریدین میں شامل ہوگئے۔ شیخ محمد اکرام سیر محمدی کے حوالے سے لکھتے ہیں:[12]

''کہ جب آپ مرشد کی خدمت میں اپنے واقعات بیان کرتے
تھے حضرت چراغ دہلی فرماتے کہ مجھے ستر برس کے بعد ایک
لڑکے نے پھر سے شائق بنا دیا ہے اور واقعات سابق کو یاد دلایا ہے''

جب حضرت چراغ دہلی کا ۷۵۷ھ میں انتقال ہوا، کہا جاتا ہے اس سے تین دن قبل گیسودراز کو خلافت عطا کردی تھی، اس کے بعد گیسودراز کافی عرصہ دلی میں مقیم رہے ۸۰۱ھ میں امیر تیمور کے حادثہ کی وجہ سے دہلی سے دکن کی طرف راہ اختیار کی۔ مختلف شہروں چندیری، بڑودہ، اور کنبایت ہوتے گجرات کچھ عرصہ قیام کے بعد دولت آباد چلے گئے۔ دولت آباد سے گلبرگہ کی جانب رخ کیا۔ جو اس وقت شاہان بہمنی کا دارالسلطنت تھا۔ اس کے بعد آپ گلبرگہ میں مقیم ہوگئے جو کچھ سال بعد ۱۴۲۲ء میں اس عالم فانی سے عالم بقا کی طرف رخ کیا۔

کہا جاتا ہے کہ گیسودراز کے ملفوظات کو ان کے بڑے صاحبزادے سید محمد اکبر حسینی نے ''جوامع الکلم'' کے نام سے جمع کئے تھے بقول شیخ محمد اکرام کے یہ ملفوظات شائع ہوگئے ہیں۔[13]

حضرت گیسودراز جس طرح تصوف و عرفان میں اپنا نمایاں اور اونچا مقام رکھتے ہیں اسی طرح علم و فضل اور تصنیف و تالیف میں بھی کم نہیں ہیں۔ آپ صاحب تصانیف تھے۔ ان تصانیف کی تعداد ۱۰۵ بتائی جاتی ہے۔ آپ کی زیادہ تر تصانیف تصوف کے موضوع پر ہیں۔ اس کے علاوہ شرح فصوص الحکم، معارف شرح عوارف، شرح فقہ اکبر، رسالہ سیرۃ النبی، شرح آداب المریدین، اسماء الاسرار وغیرہ آپ کی بیشتر تصانیف فارسی میں ہیں۔

''حسین گیسودراز کو شاعری کی طرف بھی دلچسپی تھی۔ آپ صاحب دیوان شاعر ہیں آپ کا دیوان مولوی سید عطا حسین کی تصحیح کے بعد شائع ہوگیا ہے۔ جو زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہے۔ آپ کا زیادہ تر کلام عاشقانہ رنگ میں ہے۔ مثلاً

حسن تو ای نگار مرا عشقباز کرد   شکل تو ای سوار مرا ترک تاز کرد
ای حر کہ دید قبلۂ ابروی آن جوان   از قبلہ باز گشت بمعشق نماز کرد
آن قد ہمچو سرو و رخ لالہ فام تو   از کشت و باغ ہر دو مرا بی نیاز کرد
دی بادہ خوردہ مست و پریشان ہمی گذشت   دنبال او نمودم و او احتراز کرد
الطاف اوست عام و لیکن مرا خصوص   دشنام چند داد ز خلق امتیاز کرد

حسین گیسودراز کو موسیقی سے بھی دلچسپی تھی موسیقی کی باریکیوں کو خوب سمجھتے تھے شیخ محمد اکرام سیر محمدی کے حوالے سے مجلس سماع کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:[14]

''آپ کی مجلس میں ـــــ اکثر فارسی کی غزلیں گائی جاتی تھیں۔
فرماتے ہیں ہندی کی چیزیں نرم، لوچدار اور دل میں رقت پیدا
کرنے والی ہوتی ہیں۔ اور اس کا راگ بھی نرم ہوتا ہے ـــــ لیکن
موسیقی کے فن اور موسیقار کے جذبات کا اظہار فارسی ہی میں بہتر
طریقے پر ہوا ہے اور اس کی کچھ اور ہی لذت ہوتی ہے''

ظہیر دہلوی: عہد تغلق کا معروف صاحب دیوان شاعر تھے۔ بدایونی نے اس کے اشعار نقل کئے ہیں۔

کلاہ گوشۂ حکم تو از طریق نفاد   ربودہ از سر گردون کلاہ جباری
گر ملک خواند خاک درت را فلک مرنج   نرخ گہر بہ طعن خریدار شکند

ملک احمد: یہ امیر خسرو کے بیٹے تھے۔ اور فیروز شاہ تغلق کے ندیم خاص تھے گرچہ شاعر تھے لیکن ان کے کسی دیوان کے بارے میں کوئی معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ بقول بدایونی بڑا قادر الکلام نقاد تھے۔ انہوں نے اپنے متقدمین کے کلام پر اصلاح بھی کی ہے۔ مثلاً ظہیر دہلوی کے ذیل شعر میں پہلے مصرعے میں اس طرح تبدیلی کی ہے۔

گر ملک خواند خاک درت را فلک مرنج   نرخ گہر بہ طعن خریدار شکند

ظہیر دہلوی ملک نے اس کے پہلے مصرع میں اس طرح تبدیلی کیا۔

گر اعل خواند سنگ درت مشتری مرنج   نرخ گہر بہ طعن خریدار شکند

ادبی، علمی، اور تہذیبی اعتبار سے عہد تغلق کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے اس دور میں بڑے بڑے نامور

شعرا اور ادبا کی تعداد نظر آتی ہے۔ جنہوں نے شعر و ادب کے مختلف میدانوں پر قلم فرسائی کی ہے۔ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ امیر خسرو اور حسن دہلوی کے دم سے ہی فارسی شعر و ادب نے اپنا صحیح مزاج اور مقام حاصل کیا۔ خسرو کی نثر یا نظم ہر جگہ نہ صرف اپنی عظمت و فضیلت کے جھنڈے لہرائے نہ صرف اہل ہند نے بلکہ ایران نے بھی ان کی رفعت و منزلت کا لوہا مانا ہے انہوں نے نہ صرف غزل میں اپنے ماہرانہ افکار و فن کی ہنر نمائی کی ہے ان کے قصائد اور مثنویاں بھی کسی درجہ سے کم نہیں ہے۔ اعلیٰ شہادت کی بہترین ماخذ ہیں۔

جہاں تک حسن دہلوی کا تعلق ہے ان کے کلام سے جذبات و خیالات درونی کی پاکیزگی اور سچائی بخوبی نظر آتی ہے۔

حسن دہلوی کا نثری شاہکار "فوائد الفواد" اپنے طرز تحریر اور سادہ انداز نگارش کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صوفیانہ شاعر کو بھی اس عہد میں فروغ ہوا۔ صوفی شعرا میں مسعود بک اور سید حسین گیسو دراز کے نام قابل ذکر ہیں۔ جن کے ادبی گوہر ہائے گرانمایہ سے اس دور کا ادبی سرمایہ پُر نظر آتا ہے۔

حواشی:

۱- تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۵۹
۲- شعر العجم، جلد دوم، ص ۹۸
۳- امیر خسرو، ص ۱۶۲
۴- ایضاً، ص ۳۳۲
۵- ایضاً، ص ۲۱۷
۶- ایضاً، ص ۱۵
۷- آب کوثر، ص ۳۲۳
۸- منتخب التواریخ، ج اول، ص ۲۳۱
۹- آب کوثر، ص ۲۹-۲۲۸
۱۰- اخبار الاخیار، ص
۱۱- آب کوثر، ص ۳۲-۲۳۱
۱۲- آب کوثر، ص ۳۶۷
۱۳- ایضاً، ص ۳۷۲

☆☆☆

سید محمد اسد علی خورشید*

نثر فارسی ہند: قرنین درخشاں

فارسی ادب کا شمار دنیا کے غنی ترین ادبیات میں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اپنی ہزار سالہ مدت عمر میں اس ادب نے مختلف ادوار کا مشاہدہ کیا لیکن اس یک الف سال کا عہد شباب بڑا طویل تھا۔ جو تقریباً سات صدیوں پر محیط ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ۱۲۰۶ء میں سلاطین مملوک سریر آرائے اورنگ ہند ہوئے اور پھر ۱۸۵۷ء میں آخری مغل تاجدار کے سر سے دیہیم فرمانروائی اتر کر برطانوی استعمار کے زیب سر ہوا۔ اس مدت شباب میں فارسی ادب کو سلاطین مملوک کی بزم بھی نصیب ہوئی تو فرمانروایان خلجی و تغلق کی مجلسیں بھی، شاہان سادات و لودی کی محفلیں بھی ملیں تو تاجداران مغلیہ کا پرشکوہ دربار بھی۔ ان تمام خاندانوں کے اولوالامر نے اپنے اپنے ذوق و شوق کے مطابق فارسی ادب کی ترویج و اشاعت اور ارتقاء و نفوذ کی قابل ذکر مساعیاں کیں۔ جن میں عہد مغلیہ کی سرپرستی میں تمام اصناف ادب فارسی اپنے شباب کی معراج پر پہنچا۔ لیکن مغلوں سے قبل ہی جب کہ فارسی ادب کا ہندوستان میں عنفوان شباب تھا، اس کا ریعان جوانی اور سبزہ بہارانی مرحلہ نورستگی سے گزر کر رعنائی و زیبائی کے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو چکا تھا اور مغل سلاطین سے قبل کے سلاطین ہند نے اپنی زرپاشیوں اور ادب پروریوں سے اس ادب کے تمام خد و خال بڑے نمایاں اور واضح کر دیے تھے۔ خواہ وہ سلسلۂ مملوک کے حکمراں ہوں، خواہ خانوادۂ خلجی و تغلق کے فرمانروا۔ ابھی کی فارسی کے تمام اصناف سخن کی ترویج کی مساعیاں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

پیش نظر مضمون میں ان ہی دو صدیوں یعنی تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی کی فارسی منثورات کا مختصر اذکر پیش کیا گیا ہے کیونکہ جتنی توجہ دورۂ مغلیہ کی تین صدیوں کے فارسی ادبیات کی طرف علما و محققین فارسی نے کیں ویسا احتفا۔ بدقسمتی سے مغلوں کے قبل کی دو صدیوں اور ہند میں برطانوی استعمار کے قیام اور مابعد کی فارسی ادبیات کی طرف نہیں کیا گیا۔ مابعد مغل تو تنزلی و انحطاط سے فارسی ادب کا سابقہ ہوا لیکن ماقبل مغل تو بلاشبہ فارسی ادب کے درخشاں قرون تھے۔ جس میں ہندوستان کے افق ادب کو حسن

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نظامی، فخر مدبر، مؤید جاجرمی، منہاج سراج، سدید الدین عوفی، امیر خسرو، حسن سجزی، ضیاء برنی، ضیاء نخشبی، شرف الدین یحییٰ منیری اور عین الملک ماہرو جیسے مہر درخشاں اور شہاب ثاقب اپنی ضیا پاشیوں اور نور تابانیوں سے سحر مانند کر رہے تھے۔ ان شاران فارسی میں بیشتر مذاق شاعری کے بھی امین تھے جبکہ سراجی خراسانی، جمال ہانسوی، تاج ریزہ، عمید لوئکی، شہاب مہمرہ، بوعلی قلندر، بدر چاچ، عصامی، مخدوم جرم پوش، مسعود بک، اور مطہر کڑہ جیسے سخن سنجان فارسی اپنی زمزمہ آرائیوں سے گلستان شعر فارسی کو بہار آگیں کر رہے تھے۔

ہندوستان میں مسلم حکمرانی کی تاسیس واقعی ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک کی تخت نشینی سے شروع ہوتی ہے۔ عہد قطبی میں ہی فارسی زبان وادب کے ارتقاء کی راہیں استوار ہوئیں، فارسی تکلم و تمدن کی زبان کی حیثیت اختیار کر گئی اور فارسی ادبیات کی شاہانہ سرپرستی ہونے لگی اور یہ سلسلہ روز افزوں عہد شمسی و بلبنی میں بھی از دیاد کے ساتھ کم و بیش چوراسی سال کی مدت تک جاری رہا پھر ملوک خلجی و تغلق کی فرمانروائی کے تقریباً سو سال میں فارسی ادب کے ارتقاء و نشوو کی بہترین مساعیاں جاری رہیں۔ غرض تیرہویں، چودہویں صدی عیسوی میں ہندوستان فارسی زبان وادب کے ایک بہترین دبستان کی شکل میں اپنا وجود مستحکم کر چکا تھا۔ دراصل سفاک منگولوں کے ہاتھوں ایران و عراق کی تباہی و بربادی نے ہندوستان کے لیے ایک نادر موقع فراہم کر دیا تھا اور ارباب فضل و کمال، علما و شعراء، اولیا و صوفیا اور دوسرے ارباب علم و فضل کے لیے ہندوستان امن و طمانین گیا۔ چنانچہ سب نے بلا خوف و تردد ہندوستان کا رخ کیا اور یہاں آباد ہو کر فارسی ادب کی ترقی و ترویج کا موجب ہوئے۔

تیرہویں صدی عیسوی کے ہندوستان میں فارسی نثر کے علمبرداروں میں ہمیں اولاً حسن نظامی نیشاپوری کی ذات نظر آتی ہے جو اس عہد کی نہایت تابناک شخصیت ہے۔ حسن نظامی نے نہایت گراں قدر فنشیانہ نثری کارنامہ تاج المآثر اپنی یادگار چھوڑا ہے۔

تاج المآثر:

تاج المآثر، قطب الدین ایبک کے غیر معمولی کارناموں کا ایک مستند تاریخی دستاویز ہے جو ۱۱۹۱ء میں محمد غوری کی کامیاب مہم اجمیر کے ذکر سے شروع ہو کر ۱۲۱۷ء میں التمش کے خلف اکبر ناصر الدین محمود کے لاہور کی امارت پر فائز کیے جانے کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔ اس کتاب کے مشمولات محمد غوری کے ہندوستان کی پانچ مہمات کے اجمالی ذکر، قطب الدین ایبک کے عہد نیابت و بادشاہت کی تفصیلات اور التمش کے عہد کے اولین سات سالوں کے واقعات کو محیط ہیں۔ معاصر تاریخی دستاویز ہونے کی بنا پر تاج المآثر کو ہر دور میں مستند و معتبر ماخذ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اپنے عہد کی

تاریخ کے ساتھ ساتھ یہ کتاب معاصر معاشرتی، فرہنگی اور عسکری اطلاعات کا بھی منبع ہے۔ حسن نظامی نے اس کتاب میں شاعرانہ طرز تحریر اختیار کیا ہے اور تشبیہات و استعارات کی فراوانی ہے۔ زبان نہایت دشوار و پر تکلف اور صنائعات ادبی سے مزین ہے۔ مسجع و مقفیٰ عبارتیں، فنی طرز و اسلوب نگارش اور بے تحاشہ عربی الفاظ و ترکیبات کی آمیزش نے اگرچہ کتاب کے مطالعے کو دشوار بنا دیا ہے لیکن اس کی افادیت و اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور ہندوستان میں لکھی جانے والی فارسی میں پہلی تاریخ کی کتاب ہونے کی بنیاد پر بڑی پر ارزش و وقیع ہے۔

شجرہ انساب:

تیرہویں صدی عیسوی کے ہندوستان میں فارسی نثر کا ایک عالم جلیل محمد بن منصور فخر مدبر معروف بہ مبارک شاہ تھا جس نے شجرہ انساب اور آداب الحرب نامی دو مشہور تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔ فخر مدبر نے شجرہ انساب یا بحر الانساب، چودہ سال کی جگر کاوی کے بعد لکھ کر قطب الدین ایبک کے نام معنون کیا۔ اپنے اس نثری کارنامے میں فخر مدبر نے ابتداء جناب رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم اور عشرہ مبشرہ کے نسبی شجروں کی تدوین کا ارادہ کیا تھا لیکن جب کام شروع کیا تو دائرہ وسیع تر ہوتا گیا یہاں تک کہ اس کتاب میں اس نے ۱۳۶ شجروں کو مدون کر ڈالا جن میں حضرت نبی کریم علیہ التحیۃ والثناء اور حضرات عشرات کے علاوہ مہاجرین قریشی النسل، انصار مدینہ، شام و یمن کے حکمران اسلام و ماقبل اسلام کے عربی شعراء، ماقبل اسلام کے سلاطین عجم، اموی و عباسی خلفاء وغیرہ کے نسبی شجرے شامل ہیں۔ بحر الانساب میں مرقوم ہر شجرے سے قبل صاحب انساب نے ایک مفصل تمہید بھی رقم کی ہے۔ بحر الانساب یا تاریخ فخر الدین مبارک شاہ کا سبک تحریر بہت زیادہ مصنوع اور پر تکلف نہیں اور نہ ہی بہت سادہ و سلیس بلکہ شگفتگی و پاکیزگی کا آئینہ دار ہے۔ وہ ازکار تشبیہات و استعارات سے احتراز ہے اور عربی الفاظ و ترکیبات کا معتدل استعمال نظر آتا ہے۔

آداب الحرب والشجاعۃ:

فخر مدبر کی دوسری نثری تصنیف ''آداب الحرب والشجاعۃ'' جنگی و حربی سائنس اور آئین و ضوابط پر محتوی ہے جو شمس الدین التمش کے نام معنون کی گئی ہے۔ یہ کتاب چونتیس ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں فخر مدبر نے سلاطین و وزراء کے فرائض سے لے کر گھوڑوں کی شناخت، ان کی بیماری و علاج، اقسام اسلحہ، لشکر کے خصائص، فوجی کیمپ کے آئین، میدان جنگ کے نقشے، افواج کی صف آرائی، مقابلہ و مبارزت اور حصار جنگ کے قواعد وغیرہ جیسے مضامین پر سیر حاصل مباحث کیے ہیں۔ اصطلاحات جنگ

کے بیان کے موقع پر تو آداب کی زبان میں ثقالت ہے لیکن عموی طور پر پیرایہ بیان دلچسپ ہے اور موضوع کی خشکی کے باوجود قصص و حکایات کے استعمال نے کتاب کو دلچسپ اور مؤثر بنا دیا ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی کی ایک عبقری شخصیت سدید الدین محمد عوفی کی ہے۔ محمد عوفی علم و فضل میں یگانۂ عصر تھا اور اس نے نثر میں لباب الالباب اور جوامع الحکایات ولوامع الروایات اپنی یادگار چھوڑی ہے۔

لباب الالباب:

محمد عوفی نے لباب الالباب ۱۲۲۲ء میں تصنیف کی اور ناصر الدین قباچہ کے وزیر اعظم کے نام معنون کیا۔ یہ کتاب شعرائے معاصر و متقدم کا تذکرہ ہے اور فارسی ادب میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے اولیت کا مقام رکھتی ہے۔ تذکرہ لباب الالباب کی ہی بنا پر محققین ادب نے فارسی ادب میں تذکرہ نویسی کی روایت کی ابتدا کا سہرا ہندوستان کے سر باندھا ہے۔ لباب الالباب دو جلدوں میں منقسم ہے۔ سات ابواب پر مشتمل جلد اول میں عوفی نے شعر و شاعری کی فضیلت و معنی، مختلف سلاطین اور ارباب اقتدا کی فارسی شاعری وغیرہ کا ذکر کیا ہے جب کہ پانچ ابواب پر مشتمل جلد دوم میں طاہریوں سے لے کر سلجوقیوں تک کے عہد کے فارسی شعرا اور قباچہ کے دربار سے وابستہ شعراء کا تذکرہ ہے۔ لباب الالباب کا طرز نگارش مصنوع اور منشیانہ ہے۔

جوامع الحکایات ولوامع الروایات:

محمد عوفی نے ناصر الدین قباچہ کی ایما پر جوامع کی تصنیف کا کام شروع کیا لیکن اثنائے تالیف ہی میں قباچہ کی موت ہوگئی اور عوفی نے التمش کے وزیر نظام الملک کے دربار سے وابستگی اختیار کر لی اور اسکی سرپرستی میں اس تالیف کو ۳۳-۱۲۳۲ء میں اختتام تک پہنچایا۔ جوامع چار جلدوں میں سو ابواب اور دو ہزار ایک سو تیرہ حکایات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب فارسی ادب کا سرمایہ افتخار اور ضخامت و موضوعات کی بوقلمونی و رنگارنگی کی بنا پر ممتاز ہے۔ جوامع کی زیادہ تر حکایتیں ناصحانہ ہیں اور عدل، حیا، تواضع، عفو و کرم اور حلم و بردباری وغیرہ جیسے اخلاقی اوصاف و مکارم اخلاق کی تعلیم سے لبریز ہیں۔ جوامع کی زبان نہایت سلیس و سادہ اور رواں ہے اور لباب الالباب کی مصنوع طرز تحریر سے بالکل جداگانہ سبک کا نمونہ ہے۔

چچ نامہ:

محمد بن علی بن حامد کوفی نے سندھ کی مشہور و معروف عربی تاریخ منہاج الدین والملک کا فارسی میں "فتح نامہ" کے نام سے ۱۲۱۶ء میں ترجمہ کیا جو بعد میں "چچ نامہ" کے نام سے معروف ہوا۔ اصل عربی کتاب اور مصنف دونوں پردۂ خفا میں ہیں۔ محمد کوفی نے ناصر الدین قباچہ کے عہد میں چچ نامہ تالیف کر کے

قباچہ کے وزیر اعظم عین الملک کے نام منسوب کیا۔ اس کتاب میں سندھ کی تاریخ اور محمد بن قاسم کا تفصیلی ذکر اور اس کے جنگی و حربی واقعات کی تفصیلات موجود ہیں۔ اس کتاب کو سندھ کی تاریخ کی حیثیت سے بڑا استناد و اعتبار حاصل ہے۔ اور اس میں خطۂ مذکور کے مذہبی، عمرانی اور معاشرتی حالات پر وقیع و پر ارزش اطلاعات ملتی ہیں۔ یہ کتاب اپنے طرز بیان کی روانی و سادگی اور سلاست و شیوائی کے لحاظ سے اہم ہے۔ اسلوب نگارش رواں اور بے ساختہ ہے۔

طبقات ناصری:

۱۲۶۰ء میں قاضی منہاج الدین معروف بہ منہاج سراج جرجانی نے اپنی مشہور زمانہ تاریخ طبقات ناصری کی تالیف کر کے سلطان ناصر الدین محمود کے نام معنون کیا۔ طبقات ناصری ہر دور میں ایک اہم اور مستند و معتبر ماخذ کی حیثیت سے قابل اعتنا رہی ہے۔ یہ کتاب تیس طبقات میں منقسم ہے جن میں آفرینش عالم سے لے کر اپنے زمانے تک کے تاریخی واقعات صاحب طبقات نے مذکور کیے ہیں۔ طبقات ناصری میں سلاطین غور و غزنی اور قطب الدین ایبک سے ناصر الدین محمود تک سلاطین دہلی اور ان کے امراء کے حالات مندرج ہیں۔ صاحب طبقات نے فتنۂ مغول کا بچشم خود مشاہدہ کیا تھا اور اس نے اپنی طبقات کے آخری طبقے میں اس بلائے مغول کا ذکر کیا ہے جس نے چین سے لے کر ہندوستان تک کو سراسیمہ کر ڈالا تھا۔

طبقات منہاج سراج کی زبان اور اسلوب بیان نہایت سادہ و روان اور بے ساختہ ہے۔ عام فہم انداز بیان نے تاج المآثر کے برعکس طبقات ناصری کو زیادہ پسندیدہ اور مقبول بنا دیا۔ صاحب طبقات نے جس انداز میں تاریخی وقائع قلم بند کیے ہیں اس سے صحت و استناد روایات پر کوئی حرف نہیں آتا۔ منہاج نے کہیں کہیں شاہراہ بیان پر مسجع فقرے قندیلیں روشن کر کے غنائیت کا طرز بھی اختیار کیا ہے لیکن اس سے مفاہیم و معنی نہ تو اوق ہوئے ہیں نہ ہی ثقل کا شائبہ پیدا ہوا ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی کی ایک اور صاحب فضل و کمال شخصیت مؤید جاجرمی کی تھی۔ مؤید جاجرمی نے امام غزالی کی مشہور زمانہ تصنیف احیاء العلوم کا فارسی ترجمہ کیا اور التمش کے نام معنون کیا۔ مؤید کے ترجمہ احیاء العلوم پر محمود شیرانی نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس ترجمے میں مترجم احیاء نے مسجع طرز تحریر اختیار کیا ہے۔ اسی زیر بحث صدی میں ابوبکر بن علی بن عثمان کاشانی نے البیرونی کی کتاب الصدنہ کا ترجمہ فارسی میں کیا اور اس ترجمے کا کام بھی عہد شمسی میں ہی ہوا۔

عہد وسطی کے ہندوستان کی اس صدی یعنی تیرھویں صدی عیسوی میں کچھ مشہور و معروف چشتی ملفوظات مثلاً دلیل العارفین، فوائد السالکین، اسرار الاولیاء اور راحت القلوب وغیرہ بھی معرض وجود میں

آئے۔ لیکن محققین وعلماء کا ایک طبقہ اسے مجہول قرار دیتا ہے جب کہ ایک طبقہ اس کی اصالت کا قائل ہے۔ یہ ملفوظات اپنے زمانے میں بڑے مشہور ومعروف تھے اور عوام وخواص میں بڑے مقبول تھے۔ اصالت و بطالت کی بحث سے احتراز کرتے ہوئے اگر ان ملفوظات کے طرز نگارش اور سبک تحریر پر نظر ڈالی جائے تو یہ نہایت سادہ ورواں اور عام فہم انداز میں لکھے گئے فارسی نثر کے شہ پارے ہیں اور ہوتے بھی کیوں نہیں کہ ملفوظات تو ملفوظات ہی ہوتے ہیں۔

عہد وسطی کے ہندوستان کی تیرہویں صدی عیسوی کے نصف آخر اور چودھویں صدی عیسوی کے ربع اول کی نہایت مہتم بالشان، باکمال اور عبقری ونابغہ روزگار شخصیت امیر خسرو کی ہے۔ تنہا امیر خسرو کی ذات وہ ذات ہے جو مابعد قرون مذکور میں موجود تمام وجود پر بھاری ہے۔ اور جس کے علم وفضل وکمال کی جلالت نے ہندوستان کے فارسی ادب کو آسمان علیین پر پہنچا دیا۔ وہ سخن گوئی ونواسخی کی جولانگاہ ہو یا انشا پردازی ونثاری کی رزمگاہ ہر جگہ امیر خسرو اپنی منفرد وخسروانہ شان کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں اور اپنی فضیلت کا پرچم لہراتے نظر آتے ہیں۔ امیر خسرو نے میدان نثر میں اپنے اشہب قلم کی جولانی دکھاتے ہوئے اعجاز خسروی، خزائن الفتوح اور افضل الفوائد جیسی منثور تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔ مؤخر الذکر تصنیف خسروی جو حضرت محبوب الٰہی کے ملفوظات کا مجموعہ ہے وہ متذکرہ بالا ملفوظات کی طرح علمائے محققین کی نظر میں مشکوک ومجہول ہے۔ البتہ اعجاز خسروی اور خزائن الفتوح بالتحقیق امیر خسرو کے ہی رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔

اعجاز خسروی:

اعجاز خسروی یا رسائل الاعجاز امیر خسرو کا پانچ جلدوں پر مشتمل مہتم بالشان منثور کارنامہ ہے جو اپنے انتہائی مصنوع طرز تحریر کی بناء پر سارے فارسی ادب میں بے مثال اور کمیاب ہے۔ تنہا اعجاز خسروی کو امیر خسرو کی ہمہ جہت شخصیت اور یگانہ زمانہ تشخص کا مظہر اتم قرار دیا جاسکتا ہے۔ اعجاز خسروی کے تمام رسائل خطوط وحروف میں منقسم ہیں۔ اس کتاب کا طرز تحریر وانداز نگارش جداگانہ اور ممتاز ہے بلکہ خود صاحب اعجاز کے بقول اس کتاب کا سبک تحریر خود ان کا ایجاد کردہ ہے۔ امیر خسرو نے اعجاز خسروی کی تکمیل ۱۳۲۱ء میں کی۔ اعجاز خسروی فرہنگی اور لسانی زاویہ نگاہ سے بڑی مفید اور کارآمد ہے۔ دقیق الفاظ، رقیق معنی، عمیق افکار نادر ودلکش ترکیبات وفقرات اس کتاب کا خاصہ ہیں۔

خزائن الفتوح:

امیر خسرو کے نثری کارنامے میں خزائن الفتوح یا تاریخ علائی کو اہم مقام حاصل ہے۔ صاحب خزائن نے اپنی اس تصنیف میں عہد علائی کے اولین سولہ سال کے اہم واقعات ومہمات قلم بند کیے ہیں۔

یہ کتاب اپنے ادبی وتاریخی خصائص کی بنیاد پر وقیع، گرانبہا اور پرارزش ہے۔ امیر خسرو نے ۱۳۱۱ء میں خزائن کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ خسرو کی یہ تصنیف نثر فنی کا بہترین نمونہ ہے جس میں صاحب کتاب نے صنائعات ادبی کا بہ وفور اور استادانہ استعمال کیا ہے۔ خزائن کی تقسیم خسرو نے نسبتوں میں کی ہے جو مختلف مخصوص عناوین کے تحت مندرج ہیں۔

زیر بحث دوقرن کی ایک اور اہم ومحترم شخصیت حسن سجزی کی ہے۔ حسن سجزی امیر خسرو کے معاصر اور گہرے دوست تھے اور علم وفضل اور زہد وتقویٰ میں نادر زمانہ تھے۔ حسن سجزی نے بھی شاعری ونثاری میں اپنی فضیلت کا سکہ جمایا ہے بلکہ فن شاعری میں انھیں سعدی ہند تصور کیا جاتا ہے۔ حسن سجزی نے نثر میں مخ المعانی اور فوائد الفواد اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

مخ المعانی:

مخ المعانی حسن سجزی کی تصنیف لطیف ہے جس کا موضوع عشق ہے اور مصنف نے نہایت حسین ودلکش انداز میں عشق کے اسرار ورموز بیان کیے ہیں۔ اس کتاب میں صاحب مخ المعانی نے عشق کی حروف تہجی ع ش ق کو موضوع بحث بنا کر اس سے بہترین معانی اخذ کرتے ہوئے اپنے منطقی، معنوی، فکری اور فلسفیانہ استدلال سے مفاہیم وکیفیات عشق میں بڑا خوبصورت ارتباط پیدا کیا ہے۔ تفسیر عشق کے موضوع پر حسن سجزی کا یہ رسالہ صوری ومعنوی حسن کا بہترین مرقع ہے۔ سادہ وروان اور تعقید سے خالی طرز نگارش نے حسن عشق کا ایسا سماں باندھا ہے کہ عقل فلک پیا بھی عاشق ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

فوائد الفواد:

حسن سجزی کا دوسرا منثور کارنامہ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات کی فوائد الفواد کے نام سے تالیف ہے۔ حسن نے فوائد الفواد کو پانچ جزو اور ہر جزو کو مختلف مجلسوں میں تقسیم کیا ہے۔ صاحب فوائد نے اس تالیف کا کام ۱۳۰۷ء میں شروع کیا اور ۱۳۲۲ء میں پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ فوائد الفواد صوفیانہ وعارفانہ موضوع ومطالب پر مشتمل وہ روشن قندیل ہے جو شاہراہ سلوک کے مسافروں کی راہنمائی کرتی ہے۔ اس کتاب کی زبان نہایت سلیس وسادہ ہے بالخصوص ان مقامات پر جہاں رموز واسرار طریقت کی عقدہ کشائی کی گئی ہے البتہ فوائد کے اجزاء کی تمہید وتتمہ میں جس میں حسن سجزی نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں اور صنائعات ادبی ومعنوی استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے ان حصص فوائد کی عبارتیں کچھ حد تک مغلق اور مصنوع ہوگئی ہیں لیکن پھر بھی تعقید وپیچیدگی کا الزام عائد نہیں کیا جاسکتا ہے۔ فوائد الفواد حسن عبارت، لطافت تقریر، عذوبت بیان اور سلاست وروانی کا آئینہ ہے۔

تاریخ فیروز شاہی:

تاریخ فیروز شاہی چودہویں صدی عیسوی کے ایک عالم جلیل و فاضل نبیل ضیاء الدین برنی کی تصنیف ہے جسے صاحب کتاب نے ۱۳۵۸ء میں اختتام کو پہنچایا۔ تاریخ فیروز شاہی سلطنت دہلی کی مکمل ایک صدی یعنی ۱۲۵۹ء سے ۱۳۵۲ء تک کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔ برنی نے اس کتاب کو وہاں سے شروع کیا ہے جہاں منہاج سراج نے اپنی طبقات ناصری کو ختم کیا ہے۔ یعنی بلبن کے سال جلوس سے لے کر فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت کے اولین چھ سالوں تک کے واقعات اور آٹھ بادشاہوں کے دور اقتدار کا یہ ایک مستند و معتبر تاریخی دستاویز ہے۔ تاریخی اعتبار سے جتنی مفید معتبر برنی کی تاریخ فیروز شاہی ہے اتنی ہی اہم اور لائق اعتنا یہ ادبی حیثیت سے بھی ہے۔ صاحب تاریخ فیروز شاہی نے اپنی اس تصنیف میں نہایت سادہ و سہل، شستہ و شائستہ اور بے ساختہ انداز تحریر اختیار کیا ہے۔ اپنے اسلوب نگارش کی بنیاد پر یہ تاریخ بہت معروف و مشہور ہوئی اور فضیلت و برتری میں برنی نے اپنے پیشرو منہاج سراج کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔

بساتین الانس:

چودہویں صدی عیسوی کی ایک اور عالم و فاضل شخصیت تاج الدین محمد احسان دبیر کی ہے جس نے غیاث الدین تغلق اور محمد بن تغلق کے زمانوں میں دبیر مملکت کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔ احسان دبیر نے ۱۳۲۶ء میں بساتین الانس لکھی جو کلیان کے بادشاہ اور سراندیپ کی ملکہ کی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب عہد مذکور کی تہذیبی و فرہنگی اوضاع کی آئینہ دار ہے۔ اس کتاب میں مصوری، مجسمہ سازی، موسیقی و آلات موسیقی، کپڑوں کی قسموں، تقریبات، پھول و عطریات غرض چودہویں صدی کے ہندوستان کی فرہنگی و تہذیبی تصویر نہایت خوبصورت اور موثر طرز تحریر میں نظر آتی ہے۔ احسان دبیر نے نہایت دلنشیں اور کوتاہ جملوں کا استعمال کیا ہے۔ مسجع عبارتیں، عربی و فارسی اشعار سے تلمیح اور تمثیل و استشہاد بساتین الانس کی خصوصیات ہیں۔ صاحب بساتین چونکہ منصب دبیری و منشی گیری پر مامور تھا اس لیے اسکے منشیانہ قلم کی جولانی اس کی تصنیف میں بھی نظر آتی ہے۔

قرون مذکور کی ایک اور صاحب فضل کمال شخصیت ضیاء الدین نخشبی کی ہے جو ایک صوفی صافی مشرب اور عزلت نشیں و زاویہ گزیں تھے۔ ضیاء نخشبی نے ساری زندگی دربار شاہی اور اہل دول سے دوری بنائے رکھی اور تصفیہ باطنی و رشد و ہدایت میں مشغول رہے۔ انھوں نے متعدد نثری تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

سلک السلوک:

عرفان و تصوف کے موضوع پر سلک السلوک ضیاء نخشبی کی گرانمایہ تصنیف ہے جو ایک مقدمہ اور ایک سو اکیاون سلک پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا طرز نگارش سادہ و دلنشیں اور ناصحانہ ہے۔

طوطی نامہ:

ضیاء نخشبی نے ۵۲ داستانوں پر مشتمل طوطی نامہ بھی تالیف کی جو دراصل سنسکرت زبان کی مشہور داستانیں ہیں۔ اس کتاب میں ضیاء نخشبی نے سادہ و رواں طرز تحریر کا استعمال کیا ہے اور ایک طوطی کی زبان سے پند و موعظت اور عالی تعلیم کا درس دیا ہے۔

چہل ناموس:

چہل ناموس بھی ضیاء نخشبی کی عرفان و تصوف کے موضوع پر قابل ذکر تصنیف ہے جس میں صاحب کتاب نے انسان کے اعضائے جسمانی کی عارفانہ توضیح و تشریح کرتے ہوئے عرفان کے اسرار سربستہ کو فاش کیا اور سالک تو من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کے مصداق اپنے نفس و وجود کو پہچان کر خالق ازل کے عرفان کا ادراک کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس کتاب کی زبان بھی عام فہم اور سادہ و شیریں ہے۔

داستان گلریز:

ضیاء نخشبی کی داستان گلریز ایک عشقیہ داستان ہے جو مجاز کے پیرائے میں ہے۔ اس تصنیف کا سبک نگارش مسجع و مرصع ہے۔

اس کے علاوہ ضیاء نخشبی نے عشرۂ مبشرہ اور لذات النساء کی بھی تالیف کی جو چودہویں صدی عیسوی کی فارسی نثر میں ان کا ایک قابل اعتنا اضافہ ہے۔

اسی چودہویں صدی عیسوی کی ایک نہایت مرتاض، زہد و اتقاء میں نابغۂ زمانہ شخصیت شیخ شرف الدین بن یحییٰ منیری کی ہے جو شاہانہ سرپرستوں سے کوسوں دور اور ارباب اقتدار کی منت پذیریوں سے دامن کشاں بہار شریف میں مسند رشد و ارشاد سجائے طالبین کے تصفیۂ بطون میں مشغول تھے اور اپنے قلم دررج سے فارسی نثر کے خزینے میں لعل و گوہر کا اضافہ کر رہے تھے۔

مخدوم شرف الدین کی ذات والا صفات سالکین مرصاد اور طالبین رموز حقیقت کے لیے ایک طرف روشن و مصفا قندیل تھی تو ان کی ترقیمات جویان عرفان و متلاشیان حق کے لیے آج بھی مشعل راہ ہے۔ حضرت مخدوم کی تصنیفات میں مکتوبات صدی، مکتوبات دو صدی، مکتوبات بست و ہشت، معدن

المعانی، لطائف المعانی، مخ المعانی، خوان پر نعمت فوائد رکنی، ارشاد الطالبین، رسالہ مکیہ وغیرہ مشہور ومعروف ہیں۔

مکتوبات صدی:

مکتوبات صدی حضرت مخدوم بہار کا گرانقدر مجموعۂ مکاتیب ہے۔ مکتوبات صدی حضرت شرف الدین کے ان مکاتیب کا مجموعہ ہے جو حضرت مخدوم نے اپنے مرید قاضی شمس الدین حاکم چوسہ کو اسرار ورموز عرفان پر لکھے ہیں۔ ان مکاتیب کی زبان نہایت سادہ وعام فہم ہے۔ اور اسرار تصوف کو اس فارسی کے قالب میں ڈھالا ہے جو دل پر اپنے نقوش ثبت کرتی ہے۔

مکتوبات دوصدی:

مکتوبات دوصدی حضرت مخدوم کے ان مکاتیب کا مجموعہ ہے جو ۱۳۶۶ء کے جمادی الاول سے رمضان کے اوائل یعنی پانچ ماہ کی مدت میں لکھے گئے ہیں۔ مکتوبات صدی کے برعکس مکتوبات دوصدی کے مکتوب الیہم مختلف ہیں۔ ان مکاتیب کی زبان بھی بہت سادہ ودلکش اور مکتوب الیہم کی استعداد کے مطابق ہے کیونکہ حضرت مخدوم نے یہ مکاتیب مریدین ومعتقدین کے سوالات کے جواب کے طور پر تحریر فرمائے تھے۔

مکتوبات بست وہشت:

یہ ان مکاتیب کا مجموعہ ہے جو حضرت مخدوم نے اپنے مرید مولانا مظفر بلخی کو لکھے تھے اور جن میں زیادہ تر مکاتیب مولانا مظفر کی وصیت کے مطابق ان کے ساتھ قبر میں دفن کر دیے گئے تھے محض یہ اٹھائیس خطوط کسی طرح دفن ہونے سے رہ گئے۔

معدن المعانی:

حضرت مخدوم کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے زین بدر عربی نے جمع کیا ہے۔ اس میں ۷۴۶ھ مطابق ۱۳۴۵ء تک کے وہ ملفوظات ہیں جو مریدین ومعتقدین مجلس کے سوالات کے جواب میں حضرت مخدوم نے زبان مبارک سے ارشاد فرمائے تھے اور جامع ملفوظ نے اپنی یاد کے مطابق جمع کر لیے تھے۔ چنانچہ جامع ملفوظ نے اس کی وضاحت کی بلکہ تجمیع ملفوظ میں اگر عین الفاظ مخدوم کہیں یاد نہ رہے تو ان کے معنی ومفاہیم کا ملاً ذہن نشین تھے اور میں نے اصل معنی کو محفوظ کر لیا ہے اس میں کوئی تغیر وتبدل نہیں کیا ہے۔

خوان پر نعمت:

یہ بھی حضرت مخدوم کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جو معدن المعانی کے بعد کے سنین یعنی ۱۳۴۵ء سے ۱۳۵۰ء کے ملفوظات پر مشتمل ہے اور اس کے بھی جامع زین بدر عربی ہی ہیں۔

مخ المعانی:

یہ بھی حضرت مخدوم کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جس کے جامع سید شہاب الدین عماد حافظی ہیں۔ یہ بھی حضرت شیخ کی مجالس کے بعد جامع نے رقم کیے ہیں اور یہ وضاحت کی ہے عین الفاظ کی رعایت نہیں کی گئی ہے اور جہاں معنی یا الفاظ فہم میں نہ آسکے انہیں بعد میں حضرت مخدوم سے دریافت کر کے لکھا گیا ہے۔

شرح آداب المریدین:

یہ کتاب حضرت ضیاء الدین نجیب سہروردی کی عربی تصنیف آداب المریدین کی شرح ہے جو حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری نے ۱۳۶۵ء میں اپنے ایک مرید قاضی اشرف کی خواہش پر فارسی میں لکھی۔ اس کتاب کی زبان بھی بہت سادہ وروان اور سلیس ہے۔

قرون مذکور کی ایک اور صاحب فضل وہنر شخصیت عین الملک عبداللہ ماہرو کی ہے جو تغلقی وتغلق حکمرانوں کے یہاں بڑا معتبر اور صاحب منصب تھا۔ عین ماہرو نے مختلف مناصب پر رہتے ہوئے جو مکاتیب صاحبان اقتدار، ہم منصبان یا ماتحتوں کو لکھے وہ فارسی انشاء پردازی کا بہترین نمونہ ہیں جن کی انشائے ماہرو کے نام سے تدوین ہوئی۔

انشائے ماہرو:

انشائے ماہرو عین الملک عبداللہ ماہرو کے منشآت کا مجموعہ ہے جس کا طرز نگارش اور شیوۂ تحریر فارسی کے مترسلین اور منشیوں کی روش کے مطابق ہے۔ اس مجموعہ میں ایک سو چونتیس منشآت شامل ہیں جن میں مکاتیب بھی ہیں اور مناشیر بھی، امثال وعرضداشت بھی ہیں اور عہد نامہ وپروانہ ورقعہ وتہنیت نامہ بھی۔ عین ماہرو نے اپنے منشآت میں مصنوع طرز تحریر اختیار کیا ہے۔ صناعات ادبی کا بکثرت استعمال ہے جس کی بناء پر عام قاری کے لیے ان منشآت کی تفہیم پر از اشکال ہے۔ ان منشآت میں عین ماہرو نے اپنے زمانے کی تاریخی وسیاسی، تہذیبی وفرہنگی اور معاشرتی ومعاشی تصویر کشی بھی کی ہے۔ عین ماہرو کے منشآت اپنے عہد کی فارسی نثر کا بہترین اور عمدہ نمونہ ہیں۔

ہندوستان کے فارسی ادب میں مذکورہ دو صدیاں فرہنگ نویسی کے اعتبار سے بھی اہم اور لائق توجہ ہیں۔ تیرہویں صدی عیسوی ہی وہ صدی ہے جس میں ہندوستان میں فارسی فرہنگ نویسی کی ابتداء ہوئی۔ چنانچہ ہندوستان میں عہد علائی کا اولین فارسی فرہنگ نویس فخر الدین قواس تھا جس نے فرہنگ قواس کی تدوین کی۔

فرہنگ قواس:

فرہنگ قواس ہندوستان میں مدون ہونے والی اولین فارسی بفارسی لغت ہے جو رائجہ مدوین لغت کے برخلاف حروف تہجی کے بجائے مضامین کے اعتبار سے مرتب ہوئی ہے اور اس میں مفردات کے معنی لیے گئے ہیں۔ صاحب فرہنگ نے بہت اہتمام سے یہ سعی کی ہے وہ اس میں عربی لغات بالکل نہ آنے پائیں اور خالصاً فارسی ہو لیکن یہ کوشش بہت کامیاب نہیں رہی ہے۔ فرہنگ قواس میں کچھ ہندی زبان کے الفاظ بھی نظر آتے ہیں جو الفاظ کے معنی کی وضاحت کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں صاحب فرہنگ نے شواہد کے طور پر بہت سے معروف وغیر معروف شعراء کے اشعار مندرج کیے ہیں۔ فرہنگ قواس ہندوستان کی فارسی لغت کی تاریخ میں بڑی اہمیت کی حامل ہے اور عہد اکبری تک تمام فرہنگ نویسوں کا ماخذ رہی ہے۔

دستور الافاضل:

دستور الافاضل کی تدوین ۱۳۴۲ء میں محمد بن تغلق کے عہد حکومت میں ہوئی اس کا مولف حاجب خیرات دہلوی معروف بہ رفیع تھا۔ دستور الافاضل کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے اور ہر حرف کو باب قرار دے کر ان کے ذیل میں وہ الفاظ جن کے حروف اول حرف باب سے مطابقت رکھتے ہیں مندرج کیے گئے ہیں۔ اس لغت میں نہ تو الفاظ کے تخرج وتلفظ کا اہتمام کیا گیا ہے اور نہ ہی شعری شواہد لائے گئے ہیں۔ ہندوستان میں مؤلفہ لغات میں تقدم کے اعتبار سے دستور دوسرے مرتبے پر ہے اور بہت سے فرہنگ نویسوں کا ماخذ رہی ہے۔

لسان الشعراء:

ہندوستان میں تالیف ہونے والی فرہنگوں میں قدامت کے اعتبار سے تیسرے درجے پر فائز لسان الشعراء کے مصنف کا نام معلوم نہیں البتہ وہ عاشق تخلص کرتا تھا اور فیروز شاہ تغلق کے زیر سرپرستی تھا۔ اپنے مقدمے میں صاحب لسان نے تالیف فرہنگ کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ چونکہ فرہنگ اسدی طوسی اور

فرہنگ قواس سے استفادہ آسان نہیں کیوں کہ یہ مبوب نہیں ہیں اس لیے اس نے لسان الشعرا کی تالیف کی تا کہ استفادہ آسان ہو۔ صاحب لسان نے الفاظ کے مخرج وتلفظ کی صحت کے لیے ہموزن الفاظ بھی تحریر کیے ہیں ساتھ ہی ہم وزن مشکل الفاظ کی توضیح بھی کر دی ہے۔ لسان الشعراء اپنے عہد کی مقبول ومعروف فرہنگ تھی اور تقریباً صدی تک فرہنگ نگاروں کا ماخذ ومنبع رہی ہے۔ صاحب لسان نے اپنی فرہنگ میں الفاظ کے حروف اول کو باب اور حرف آخر کو فصل متعین کیا ہے۔

ان دو قرون مذکورہ کی فارسی نثر کے اس اجمالی ذکر سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کیسے کیسے گرانقدر اور بیش بہا اضافے فارسی ادبیات میں ہوئے اور فارسی ادبیات کے نفوذ وارتقاء کی اس درخشاں صدیوں میں کیسے کیسے مہر وماہ پرتو افگن ہوئے۔

اس مدت مطالعہ کے فارسی نثر نگاروں نے ماقبل عہد کی طرز نثر کو ہی اختیار کیا۔ معاصر ایران کی نثر میں جو تغیر وتبدل ہوا وہی ہندوستان کی فارسی نثر میں بھی ہمیں نظر آتا ہے۔ جملے اور عبارتیں طولانی ہونے لگیں، صنائع معنوی ولفظی کا التزام ہو گیا اور عربی لغات وترکیبات کی فراوانی ہو گئی۔ یہ تو کیفیت تھی ان نثر نگاروں کی فارسی نثر کی جنھوں نے دقت پسندی واشکال کو پسند کیا اور اپنے فضل وکمال کا پرچم بلند کرنے کے لیے اپنے کمیت قلم کی عنان ڈھیلی چھوڑ دی۔ لیکن اس مدت مطالعہ کے وہ نثر نگار جنھوں نے سادگی وشستگی اور سلاست ومتانت کو پسند کیا اور شاہراہ ترقیم وتحریر پر اپنے شبدیز قلم کی لگام تھامے رکھی انھوں نے تعبیر وکوتاہ جملے ودلپذیر ودلنشین الفاظ وترکیبات اور صناعات ادبی سے حتی الامکان اجتناب کرتے ہوئے عام فہم اور لطیف ورواں آثار تصنیف کر کے فارسی ادب کے دامن کو لعل وگہر سے بھر دیا۔

یہ دو صدیاں فارسی ادب کے لیے اس اعتبار سے بھی بہت اہم ہیں کہ اسی میں ہندوستان نے فارسی ادب میں تذکرہ نگاری اور ملفوظ ادب کا بیش بہا اضافہ کیا اور فرہنگ نویسی کا رجحان پیدا ہوا۔ اس سے قبل کے ایرانی فارسی ادب میں تذکرہ نگاری وملفوظ نویسی کی روایت موجود نہ تھی۔ اور نہ اس کثرت سے فرہنگ نگاری کا غلغلہ تھا اور یقیناً یہ ہندوستان کی طرف ایرانی فارسی ادب کے لیے ایسا ارمغان تھا جو ہمیشہ ہندوستان کے فارسی ادب کے لیے باعث تفاخر ومباہات ہوگا۔

ماخذ:

۱- عہد تغلقیان ہند کی نامہ و منامہ و فارسی منثورات، سید محمد اسد علی خورشید، ۲۰۰۲ء۔
۲- مکتوبات صدی، خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ ۱۹۹۳ء۔

۳- سیرت الشرف، سید منیر الدین احمد، خدا بخش لائبریری پٹنہ ۱۹۹۳ء
۴- انشائے ماہرو، ادارہ تحقیقات پاکستان، لاہور، ۱۹۶۵ء
۵- تاریخ ادبیات در ایران (جلد ۳و۴)، انتشارات فردوسی تہران، ۱۳۶۳ش
۶- تاریخ فیروز شاہی، شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۵۷ء
۷- بزم مملوکیہ، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۸۶ء
۸- ضیاء الدین نخشبی زندگی و آثار، ڈاکٹر محمد احتشام الدین، المجیب سہ ماہی (جولائی - ستمبر ۲۰۱۰ء) پھلواری شریف، پٹنہ

☆☆☆

کلیم اصغر *

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں فارسی اخبارات کا کردار

ہندوستان میں فارسی صحافت کی ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک شائع ہونے والے اخبارات

ایک مختصر جائزہ

مغلیہ عہد میں فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان تھی اور اس زبان نے صدیوں تک ہندوستان پر حکومت کی۔ اٹھارویں انیسویں صدی میں بھی فارسی زبان علمی اور ادبی حلقوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا اس برّاعظم کے وسیع خطوں میں عمل دخل ہوا تو اس نے اپنے ''استحکام اور دوام'' کے لیے ثقافت کے پرانے نشان آہستہ آہستہ نیست و نابود کرنے شروع کر دیے۔ یہ زبان صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہ تھی بلکہ پڑھے لکھے ہندو بھی فارسی بولتے اور لکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ راجہ رام موہن رائے کو جب اپنی مذہبی اصلاحی تحریک شروع کرنے کا خیال آیا تو انھوں نے فارسی زبان میں ''مراۃ الاخبار'' جاری کیا۔[1]

یوں تو ہندوستان میں صحافت کا باقاعدہ آغاز اٹھارہویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ہوا۔ ۲۹ رجنوری ۱۷۸۰ء کو کلکتہ سے جمس اگسٹس ہکی (James Augustus Hicky) نے انگریزی زبان کا ہیکیز گزٹ یا کلکتہ جرنل ایڈورٹائزر شائع کیا۔ اس طرح ہندوستان میں صحافت کی بنیاد انگریزی زبان کے ذریعہ رکھی گئی۔[2]

کلکتہ ہی سے فارسی کا پہلا اخبار ''مراۃ الاخبار'' کی شکل میں ۲۰ راپریل ۱۸۲۲ء میں راجہ رام موہن رائے کی ادارت میں شائع ہوا ڈاکٹر عبد السلام خورشید کا بیان ہے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل برصغیر میں فارسی زبان میں کل انیس اخبار نکلا کرتے تھے لیکن ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال اپنی کتاب جنوب ہند کی اردو صحافت (۱۸۵۷ء سے پیشتر) کے صفحہ ۲۹ پر تحریر فرماتے ہیں کہ ''۱۸۵۷ء سے پہلے فارسی زبان میں کل ۲۲ اخبار جاری تھے۔''[3]

---

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

فارسی صحافت کا سب سے بڑا مرکز کلکتہ تھا جہاں سے نو اخبار جاری ہوتے تھے، دوسرا مرکز دہلی تھا جہاں سے دو اخبار شائع ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ آگرہ، بمبئی، مدراس، ہی رام پور، لدھیانہ، کراچی، سکھر اور پشاور سے ایک ایک اخبار جاری ہوا۔ انھیں میں سے چار اخبار سرکاری سرپرستی میں چھپتے تھے۔ مثلاً ''جام جہاں نما'' کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی حاصل تھی۔ ''سراج الاخبار'' دہلی، بہادر شاہ ظفر کا کورٹ گزٹ تھا، اخبار سیرام اور لدھیانہ اخبار، عیسائی تبلیغی مراکز کے زیر اہتمام جاری تھے۔ [۳]

۱۸۵۷ء سے قبل فارسی اخبارات نے سماجی آگہی، مصری حسیت اور سیاسی شعور کی بیداری میں ایک نمایاں کردار نبھایا ہے جسے کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں اس دور کے مشہور و معروف ان اخباروں پر تبصرہ کیا جا رہا ہے۔ جس کا تعلق ۱۸۵۷ء کی تحریک سے بالواسطہ یا بلاواسطہ رہا ہے۔ ان میں پہلا اخبار ''مراۃ الاخبار'' ہے۔

مراۃ الاخبار:

انیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہوا تھا یہ نہ صرف ہندوستان کی تاریخ میں فارسی کا پہلا اخبار تھا بلکہ پوری دنیا میں پہلے اخبار کی حیثیت سے پہچانا گیا۔ اگر محققین کے درمیان ''مراۃ الاخبار'' اور ''جام جہاں نما'' کو فارسی کے پہلے اخبار کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ عبدالعلی، اسانیال اور امداد صابری وغیرہ نے 'جام جہاں نما' کی اشاعت کی تاریخ ۲۱ر مارچ ۱۸۲۲ء ہے لیکن دوسرا گروہ جس میں محمد عتیق صدیقی، عبدالسلام خورشید اور اسلم صدیقی وغیرہ ہیں کی رائے میں یہ تاریخ مئی ۱۸۲۲ء ہے۔

لیکن اسلم صدیقی کی ہی تحقیق کے مطابق اخبار ''جام جہاں نما'' پہلی بار ۲۸ مارچ ۱۸۲۲ء کو English Trading House سے شائع ہوا یہ مکمل طور سے ہندوستانی زبان (اردو) میں شائع ہوا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس اخبار کا آٹھواں شمارہ جو ۱۸۲۲ء میں شائع ہوا تھا وہ فارسی زبان میں نکالا گیا تھا۔ [۳] جس سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ یہ اخبار اردو میں تو ''مراۃ الاخبار'' سے پہلے شائع ہوا تھا لیکن فارسی میں اس کے بعد تبدیل کیا گیا اس تحقیق کے ذریعہ یہ بات پوری طرح ثابت ہو گئی کہ ''مراۃ الاخبار'' فارسی کا پہلا اخبار ہے۔ یہ اخبار ۱۸۲۳ء تک مسلسل ہفتہ میں ایک بار جمعہ کے روز شائع ہوتا تھا اس اخبار نے تحریک آزادی ہند اور لوگوں کو بیدار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

لیکن افسوس کہ ابھی تک بھی اس کی اصل کاپی دستیاب نہیں ہو سکی۔ اس لیے اس کے آغاز و اشاعت کے بارے میں اختلاف رائے پائی جاتی ہے۔ مگر کلکتہ جرنل کے مطابق کہ جو ایک ہی زمانے میں چھپتے تھے اس سے ''مراۃ الاخبار'' کے سلسلے میں اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اور اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کلکتہ جرنل کی خاص توجہ روز نامہ ''مراۃ الاخبار'' اور اس کے مدیر راجہ رام موہن رائے پر تھی

راجہ رام موہن رائے ''مراۃ الاخبار'' کے پہلے شمارے کے اداریہ میں اخبار بیان کرتے ہیں کہ جس کو کلکتہ جرنل نے ۲۳ر اپریل ۱۸۲۲ء کے شمارے میں لکھا ہے۔

کچھ لوگ ہندوستان کے لوگوں کی ترقی اور بہبودگی کے لیے ملکی اور غیر ملکی خبریں انگلش میں چھاپ رہے ہیں۔ وہ افراد جو انگلش جانتے ہیں ان خبروں سے باخبر ہوتے ہیں لیکن تمام ہندوستانی انگلش نہیں جانتے اور جو لوگ انگلش نہیں جانتے اور جو لوگ انگلش سے واقف نہیں وہ افراد اوضاع و احوال زمان سے بے خبر ہیں اسی سبب یہ فارسی کا ہفت نامہ شروع کیا جا رہا ہے مجھے امید ہے کہ ہندوستان کے وہ تمام افراد جن کا تعلق اعلیٰ طبقوں سے ہے اور فارسی جانتے ہیں اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور جو افراد اخبار کے مطالعہ میں دلچسپی رکھتے ہیں ہم ان کی خدمت میں ''مراۃ الاخبار'' ارسال کریں گے۔ [۵]

اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ راجہ رام موہن رائے لوگوں کی سیاسی، علمی اور سماجی بیداری کے لیے کتنے کوشاں تھے۔ آپ نے آزادی ہند کی خاطر اپنے قلم اور ذہن کو وقف کر دیا تھا اور آپ معاشرہ و سماج میں غلط رسم و رواج پر سخت تنقید کیا کرتے تھے۔

جام جہاں نما:

یہ فارسی کا دوسرا اخبار ہے جو مئی ۱۸۲۲ء کو شروع ہوا اور یہ بھی ہفتہ وار اخبار تھا اس اخبار کے مدیر منشی سدا سکھ تھے اس اخبار کو کچھ برسوں تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی حاصل رہی لیکن اس کے بعد یہ سرپرستی نامعلوم اسباب کی بنا پر ختم ہو گئی۔ فارسی کے ساتھ اردو ضمیمہ بھی شائع کیا جاتا تھا اس کا نام بھی ''جام جہاں نما'' تھا جس میں مضامین کے علاوہ انگریزی فارسی نظموں کے ترجمہ بھی شائع ہوتے تھے۔ یہ ہفت نامہ خاص طور سے کلکتہ میں زندگی بسر کرنے والے انگریزوں کے لیے شروع کیا گیا تھا تاکہ وہ اس اخبار کے ذریعہ ہندوستانی زبان (اردو) سے رغبت حاصل کریں۔

شمس الاخبار:

یہ اخبار ماتھر موہن مترا کی ادارت میں ۱۸۲۳ء میں کلکتہ سے شروع ہوا جو کہ بارہ صفحات پر مشتمل تھا اور ہفتہ میں ایک بار جمعہ کے دن شائع ہوتا تھا لیکن مالی مشکلات اور دیگر اسباب کی بنا پر ۱۸۲۹ء میں بند ہو گیا۔

اخبار ہی رام پور:

یہ اخبار جس کے شائع ہونے کا مقام اس کے نام سے ظاہر ہے صوبہ بنگال میں ہی رام پور سے ۱۸۲۶ء کے اوائل سے مئی ۱۸۲۸ء تک ہفت نامہ کی شکل میں چھپتا رہا۔ اس ہفت نامہ کی خوبی یہ تھی کہ یہ بنگالی زبان کی خبروں کا ترجمہ فارسی میں کر کے چھاپا جاتا تھا یہ بھی مالی بحران کا شکار ہو گیا اور مجبوراً اس کو بھی بند کرنا پڑا۔

آئینۂ سکندر:

یہ اخبار ۱۸۳۱ء میں شروع ہوا جو کہ ہفتہ میں ایک بار دوشنبہ کو شائع ہوتا تھا اور سولہ صفحات پر مشتمل تھا اس اخبار میں ہمیشہ جدیدیت نظر آتی تھی۔ ۱۲۷ ویں شمارہ کے بعد اس کے پہلے صفحہ پر اخبار کے نام کی مناسبت سے حافظ شیرازی کا یہ شعر لکھا ہوتا تھا:

آئینۂ سکندر جام جم است بنگر
تا بر تو عرضہ دارد احوال ملک دارا

اس اخبار میں مدیر کا کہیں نام نہیں دیکھا گیا لیکن امداد صابری نے اپنی کتاب تاریخ صحافت اردو کی پہلی جلد میں غالب کے خطوط کے حوالہ سے اس کے مدیر کا نام سراج الدین لکھا ہے ؎ محمد عتیق صدیقی نے بھی اپنی کتاب ہندوستانی اخبار نویسی میں ڈاکٹر عبدالستار کے حوالے سے سراج الدین ہی کو آئینہ سکندر کا مدیر تحریر کیا ہے ؎۔ اس اخبار میں سیاسی اور سماجی خبروں کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی خبریں بھی شائع کی جاتی تھیں۔

آگرہ اخبار و زبدۃ الاخبار:

یہ شمالی ہند کا وہ پہلا اخبار ہے جسے آگرہ سے منشی واجد علی نے زبدۃ الاخبار کے نام سے ۱۸۳۳ء میں جاری کیا تھا۔ زبدۃ الاخبار کی اشاعت سے ایک سال پہلے یہ آگرہ میں فارسی میں آگرہ اخبار کے نام سے چھپتا تھا۔ محمد عتیق صدیقی کے مطابق جس وقت زبدۃ الاخبار چھپنا شروع ہوا تو آگرہ اخبار بند ہو گیا۔ لیکن امداد صابری نے لکھا ہے ۱۸۳۳ء میں آگرہ اخبار کا نام بدل کر زبدۃ الاخبار ہو گیا۔ زبدۃ الاخبار بہت اہم اخبار تھا اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انگریزی اخبار اس سے خبریں نقل کر کے چھاپا کرتے تھے۔

ماہ عالم افروز:

یہ اخبار ۱۸۳۳ء میں مولوی وہاج الدین کی سرپرستی میں ہفتہ میں ایک بار شنبہ کو چھپتا تھا جو کہ سولہ صفحات پر مشتمل تھا۔ یہ وہ اخبار ہے کہ جس نے انگریزوں کے انصاف کی قلعی کھولی تھی۔ تاریخ تحریک آزادی ہند کی جلد دوم میں یہ واقعہ نقل ہے کہ ماہ عالم افروز نے یہ خبر انگریزوں کے انصاف سے متعلق لکھی تھی:

''ایک انگریز افسر جو شکار کھیلنے گیا تھا اور غلطی سے ایک عورت کے گولی ماردی تھی جس کا مقدمہ بھی چلا مجسٹریٹ نے اسے رہا کر دیا اور تنبیہ کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ اخبار نے لکھا کہ مجسٹریٹ نے نسلی پاسداری سے کام لیا اور قاتل کو رہا کر دیا جو ایک دولت مند انسان ہے۔ ایک بے گناہ شخص کی موت کے لیے نہ اسے مجرم گردانا نہ قصوروار ٹھہرایا۔'' ؎

سلطان الاخبار:

یہ اخبار ۱۲ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو رجب علی لکھنوی کی ادارت میں کلکتہ سے نکلنا شروع ہوا یہ بھی ہفتہ میں ایک روز یکشنبہ کو شائع ہوتا تھا اور سولہ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس اخبار نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف بڑی بے باکی سے اعتراضات کیے تھے جس کی وجہ سے اس اخبار کے خلاف ۱۸۵۷ء میں مقدمہ چلا۔ یہ اخبار اس لحاظ سے بہت اہم مانا جاتا ہے کہ اس نے لوگوں کے تئیں بیداری اور تحریک آزادی ہند کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا اس کے مدیر رجب علی خود مرد آزادی خواہ اور ایک معروف صاحب قلم تھے۔ آپ نے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں حصہ لینے والوں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھائی۔

لدھیانہ اخبار:

یہ اخبار ۱۸۳۵ء میں عیسائی تبلیغی مراکز کے زیر اہتمام لدھیانہ سے شروع ہوا۔ یہ اخبار شروع میں عیسائی عقائد کی تبلیغ کا کام کرتا تھا اور بعد میں تاریخی و علمی مضامین کو بھی جگہ دی گئی اس اخبار کی سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں خبروں کا آغاز لاہور کی خبروں سے ہوتا تھا اور تقریباً اختتام لدھیانہ کی خبروں پر ہوتا تھا۔ شروع میں یہ چار صفحات پر مشتمل تھا لیکن ۶ رجون ۱۸۴۰ء کو ان کے صفحات کی تعداد بڑھا کر آٹھ کر دی گئی تھی۔

سراج الاخبار:

یہ اخبار ۱۸۴۱ء میں سید اولاد علی کی سرپرستی میں ہفتہ میں ایک بار دہلی سے نکلتا تھا۔ اس کو درباری اخبار کے نام سے یاد کیا جاتا تھا کیونکہ یہ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں شائع ہوتا تھا اور آٹھ صفحات پر مشتمل تھا اس کے شروع کے پانچ صفحات پر دربار سے متعلق خبریں ہوا کرتی تھیں باقی تین صفحوں پر دیگر خبریں ہوا کرتی تھیں اس اخبار میں انگریزوں کے خلاف مبہم طور سے مختصر مضامین بھی چھپتے تھے۔

مہر منیر:

یہ اخبار محمد علی کی ادارت میں یکم مئی ۱۸۴۱ء میں نکلنا شروع ہوا یہ فارسی کا وہ پہلا اخبار ہے کہ جو ہفتہ میں تین بار یعنی شنبہ، سہ شنبہ اور پنجشنبہ کو نکلتا تھا اور اس اخبار کے پہلے صفحہ پر یہ شعر لکھا رہتا تھا:

از عنایات کردگار قدیر
گشت مہر منیر عالم گیر

اس اخبار میں بھی سیاسی، ادبی اور سماجی ہر طرح کی خبریں و مضامین شائع ہوتے تھے۔

احسن الاخبار:

یہ فارسی کا وہ پہلا اخبار ہے جو کہ بمبئی (ممبئی) سے ۱۹ر نومبر ۱۸۴۲ء کو شائع ہوا اس کے مدیر کے سلسلے میں کوئی اطلاع نہیں ملتی اسی اخبار میں مرزا غالب کی قمار بازی کے جرم میں گرفتار ہونے کی خبر ۲۵ر جون ۱۸۴۸ء کو چھپی تھی [۱۰]۔ اس خبر نے اس اخبار کو تاریخی اہمیت کا حامل بنا دیا۔

اعظم الاخبار:

یہ اخبار ۱۸۴۸ء میں مدراس سے شروع ہوا۔ اصل میں یہ اخبار اردو میں شائع ہوا تھا لیکن ایک دو صفحہ فارسی کے شامل کیے جاتے تھے۔ افسوس کہ ۱۱ر مارچ ۱۸۵۲ء سے اس کے فارسی حصہ کو ختم کر دیا گیا تھا۔

گلشن نوبہار:

یہ وہ اخبار ہے جس نے ہمیشہ انگریزوں کے ظلم وستم کے خلاف بہت ہی دلیرانہ طریقہ سے آواز اٹھائی اور اس کے مدیر عبدالقادر نے تحریک آزادی ہند ۱۸۵۷ء میں آزادی خواہان کے ساتھ شرکت کی اس اخبار نے لوگوں کے اندر سیاسی بیداری پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور اسی کے جرم میں انگریزی حکومت نے گلشن نوبہار کے چھاپہ خانہ کو بند کر دیا۔ یہ اخبار ۱۸۵۱ء میں کلکتہ سے نکلنا شروع ہوا تھا اور ۱۸۵۸ء میں بند ہو گیا۔

مفرح القلوب:

یہ اخبار کراچی سے ۱۸۵۵ء میں نکلنا شروع ہوا اور ۱۸۸۳ء تک ہفتہ میں ایک بار نکلتا رہا اور تقریباً اس ۳۰ رسال کے عرصے میں کئی مدیر تبدیل ہوئے جس میں مرزا محمد جعفر، مرزا احمد صادق مشہدی اور محمد شفیع اہم مانے جاتے ہیں۔ اس اخبار کے اوپر یہ شعر لکھا رہتا تھا:

ای نام تو راحت دل و جان
سرمایۂ فرحت فراواں

اس اخبار میں بھی دوسرے اخباروں کی طرح ملکی وغیر ملکی خبروں کے علاوہ سیاسی و ادبی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔

۱۸۵۷ء میں مذکورہ اخباروں کے علاوہ کچھ اور اخبار بھی شائع ہوتے تھے جن کو انگریزوں کے ظلم وستم کا نشانہ بننا پڑا اور وہ بند ہو گئے "دوربین" نام کے ایک اور فارسی اخبار کے خلاف مقدمہ چلا ادھر

پشاور کے فارسی اخبار "مرتضائی" کے مدیر کو تحریک آزادی کا ہم نوا ہونے کی بنا پر نہ صرف گرفتار ہونا پڑا بلکہ اس اخبار کو بھی بند کر دینا پڑا۔

اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک کو اصل شکل دینے اور اس کے زور پکڑنے میں اس دور کے فارسی اخباروں نے جو اہم رول (کردار) ادا کیا ہے وہ فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

مآخذ:

۱- احسن الاخبار، ۲۵ر جون ۱۸۴۸ء۔
۲- اردو صحافت، مقالات کا مجموعہ، انور علی دہلوی، اردو اکادمی، دہلی ۱۹۸۷ء۔
۳- تاریخ تحریک آزادی ہند، جلد دوم، تارا چند، مترجم غلام ربانی تاباں، دہلی، ۲۰۰۱ء۔
۴- تاریخ صحافت اردو، امداد صابری، جلد اول، دہلی ۱۹۵۳ء۔
۵- جنوبی ہند کی اردو صحافت (۱۸۵۷ء سے پیشتر): ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، حیدرآباد، ۱۹۸۱ء۔
۶- صحافت پاکستان و ہند میں، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، لاہور ۱۹۶۳ء۔
۷- ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، محمد عتیق صدیقی، دہلی ۱۹۵۷ء۔
۸- Calcutta Journal, 23rd April, 1822, vol.II no. 98
۹- Md. Aslam Siddiqi: Persian Press in India, Indo-Iranica, 1947

حواشی:

۱- ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) ص ۱۳۹
۲- اردو صحافت، مقدمہ۔
۳- جنوبی ہند کی اردو صحافت (۱۸۵۷ء سے پیشتر) ص ۴۹
۴- صحافت پاکستان و ہند ص ۵۷
۵- Md. Aslam Siddiqui: Persian Press inIndia, Indo-Iranica, 1947
۶- Calcutta Journal, 23rd April, 1822, vol.IIno, 98.P. 583
۷- تاریخ صحافت اردو، جلد ا، ص ۸۰
۸- ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۳۹
۹- تاریخ تحریک آزادی ہند، جلد دوم، ص ۱۴۰
۱۰- احسن الاخبار، ۲۵ر جون ۱۸۴۸ء۔

☆☆☆

مولانا آزاد بحیثیت فارسی شاعر

مولانا آزاد جامع الصفات، مجمع الکمالات، اسلام کے عاشق، حق کے طرفدار، حریت کے پرستار، ملت کے خدمت گزار، اتحاد و اتفاقات کے خواستگار اور علم و آگہی کے تاجدار تھے۔ وہ علم کا اور علم ان کا تعاقب کرتا رہا، دونوں فاتح بھی ہوئے اور مفتوح بھی۔ ان کے قلم نے علم کو اور علم نے ان کے قلم کو حیات جاوید بخشا، جب تک وہ باحیات تھے، علم کی صفات کا علم بلند رہا یوں کہیے کہ جب تک علم باقی رہے گا ان کے اصول اور وجود کا علم بلند رہے گا۔ مولانا کی شہرت کی بنیاد متاع ورد، زور قلم اور حسن رقم ہے، سیاسی مسائل، مذہبی رموز و نکات، شعری فسوں گری، ادبی عشوہ گری، بحر ارکی رعد اور خطابت کی کڑک کے ذریعے ان کا قلم اپنی چمک دمک اور مہک بکھیرتا رہا، طلاقت، فصاحت، بلاغت اور خطابت کے دریا میں جو علمی طغیانی نظر آرہی ہے وہ موصوف کے ذکر جمیل اور اسلوب جلیل کی مرہون منت ہے وہ بے مثال عالم، پر گہر انشاء پرداز، یگانۂ روزگار، بلند پایہ مدبر، مخلص سیاست داں اور ماہر قرآنیات کے ساتھ ساتھ فارسی کے بلند پایہ شاعر بھی تھے انھوں نے رودکی، فردوسی، نظامی، فیضی، عرفی اور صائب تبریزی کی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور اپنی شاعری میں ان کی تقلید بھی کرتے رہے ان مشہور شعراء کی طرح مولانا آزاد نے غزل، قصیدہ، رباعی، اور مثنوی کی صنف میں بھی گراں بہا خدمات انجام دی ہیں۔ مولانا کی بیشتر مثنویوں تک ہنوز محققین کی رسائی نہیں ہو سکی اس لیے وہ گمنامی کے دبیز پردہ میں پڑی ہوئی ہیں۔ ان کی چند مثنویاں جو منظر عام پر آچکی ہیں ان کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اس فن کے بھی شہسوار تھے ہم ان کی مثنویوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مثنوی کے فن اور مولانا کی خدمات کا ایک خاکہ یہاں پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس سے ان کی بلند پایہ مثنویوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ مثنوی فارسی کی مشہور ترین صنف ہے، اور بیشتر عظیم شعراء نے اس صنف کا استعمال کثرت سے کیا ہے مثنوی میں بہت ہی وسعت ہوتی ہے جس کا ہر شعر علیحدہ ہوتا ہے اور اس میں یہ پابندی بھی نہیں ہوتی

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔۳۲

کہ پوری نظم ایک ہی قافیہ میں پروئی جائے، اشعار کی تعداد بھی مقرر نہیں ہوتی اس لیے جس قدر بھی چاہیں اسے وسیع سے وسیع تر کیا جاسکتا ہے، مضامین کی قید بھی نہیں ہوتی، بزمیہ رزمیہ عشقیہ فلسفیانہ جو بھی مضمون چاہیں اس کے ذریعہ ادا کیے جاسکتے ہیں۔ اس صنف کے متعلق مقدمہ شعر و شاعری کے صفحہ ۲۷۵ پر مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

> ''مثنوی اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور بکار آمد صنف ہے۔ جتنی صنفیں فارسی اور اردو شاعری میں متداول ہیں ان میں کوئی صنف مسلسل مضامین بیان کرنے کے قابل، مثنوی سے بہتر نہیں ہے۔ ناممکن اور فوق العادت باتیں اور حد سے زیادہ مبالغہ اور غلو بھرا ہوا ہے۔ اور اکثر مثنویوں میں شاعری کے فرائض بھی پورے ادا نہیں ہوئے، مثنوی میں علاوہ ان فرائض کے جو غزل یا قصیدہ میں واجب الادا ہیں کچھ اور بھی شرائط ہیں جن کی مراعات نہایت ضروری ہے۔''

حالی مثنوی کے ضمن میں حسب ذیل آٹھ شرائط درج فرماتے ہیں:

۱- ربط کلام: ہر بیت کو دوسری بیت سے ایسا تعلق ہونا چاہیے جیسے زنجیر کی ہر کڑی کو دوسری کڑی سے۔
۲- جو قصہ بیان کیا جائے اس کی بنیاد ناممکن اور فوق العادت باتوں پر نہ رکھی جائے۔
۳- مبالغہ اسی حد تک استعمال کیا جائے کہ جو مطلب بیان کرنا منظور ہے مبالغے کے سبب اس کا اثر سامع کے دل پر نہایت قوت کے ساتھ ہو۔ نہ یہ کہ اس کا رہا سہا یقین بھی جاتا رہے۔
۴- مقتضائے حال کو موافق کلام ادا کرنا خاص کر قصے کے بیان میں ایسا ضروری ہے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو بلاغت کا بھید صرف اسی بات میں چھپا ہوا ہے۔
۵- جو حالت کسی شخص یا کسی چیز یا مکان وغیرہ کی بیان کی جائے وہ لفظاً اور معناً نیچر اور عادت کے موافق ایسی ہونا چاہیے جیسے کہ فی الواقع ہوتی ہے لیکن جو لوگ صنعت الفاظ پر فریفتہ ہوتے ہیں اور لفظی مناسبتوں پر جان دیتے ہیں وہ کبھی بھی نیچرل حالت کی تصویر نہیں کھینچ پاتے۔
۶- قصے میں اس بات کا لحاظ بھی رکھنا ضروری ہے کہ ایک بیان دوسرے کی تکذیب نہ کرے۔
۷- قصے کے ضمن میں کوئی بات ایسی بیان نہ کی جائے جو تجربے اور مشاہدے کے خلاف ہو ـــــ اسی طرح قصے کے ضمن میں ایسی جزئیات بیان کرنی جن کی تجربہ اور مشاہدہ تکذیب کرتا ہو ہرگز جائز نہیں ہے۔

۸۔ جس طرح ان اہم اور ضروری باتوں کو جن پر قصے کی بنیاد رکھی گئی ہے نہایت صراحت کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح ان ضمنی باتوں کو جو صاف صاف کہنے کی نہیں ہیں، رمز و کنایہ میں بیان کرنا ضروری ہے۔''

مثنوی تمام انواع شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ہے۔ شاعری کے جتنے انواع و وہ سب اس میں نہایت خوبی کے ساتھ ادا کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً مناظر قدرت، جذبات انسانی تخیل، واقعہ نگاری وغیرہ ان تمام چیزوں کی ادائیگی کے لیے مثنوی سے زیادہ کوئی اور صنف موزوں اور کارآمد ثابت نہیں ہوئی۔ علامہ شبلی نعمانی شعر العجم جلد چہارم کے صفحہ ۲۰۸ پر مثنوی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مثنوی میں اکثر کوئی تاریخی واقعہ یا کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے، اس بناء پر زندگی اور معاشرت کے جس قدر پہلو ہیں سب اس میں آجاتے ہیں۔ عشق و محبت، رنج و مسرت، غیظ و غضب، کینہ و انتقام، غرض جس قدر انسانی جذبات ہیں سب کے سماں دکھانے کا موقع مل سکتا ہے۔ تاریخ میں مختلف اور گوناگوں واقعات پیش آتے ہیں، اس لیے ہر قسم کی واقعہ نگاری کا کمال دکھایا جا سکتا ہے۔ مناظر قدرت، بہار و خزاں، گرمی و سردی، صبح و شام، یا جنگل و بیاباں، کوہ و صحرا، سبزہ وغیرہ کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔ اخلاق فلسفہ تصوف کے مسائل نہایت تفصیل سے ادا کیے جا سکتے ہیں۔''

مولانا آزاد نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی اور کامیاب رہے، اردو فارسی دونوں زبانوں میں ان کی مثنویوں نے شہرت حاصل کی۔ مولانا آزاد کی فارسی زبان میں منظوم تقریظ بھی ہے۔ جو مثنوی کے فارم میں ہے، یہ مجموعی طور پر ۲۲ اشعار پر مشتمل ہے، اس مثنوی کا اختتام مولانا نے حضرت امیر خسرو کے ایک شعر پر کیا ہے۔ جسے دواوین میں لکھا گیا ہے۔ مولانا آزاد کے اس کلام میں چند مطلع ہیں جب کہ بقیہ کلام بھی مطلع کے شکل میں ہے لیکن کچھ مطلع غیر مردف اور دیگر قافیہ اور ردیف کے ساتھ ہیں، بہار گل، موسم پر بہار، وقت نشاط، شور قلقل، صوت بلبل، ابر محیط کن، سرشار رحیق بادی، مئے بے خودی، بادۂ معرفت، کار خرد، عبد رحیم اہل عرفان، شمع فروز بزم، پیر و مشائخ، در منثور، احوال خدا رسیدگانست، سواد نور جانست، شہ حجازی، اور توقیع قبول جیسی تراکیب اس کلام میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

اے ساقی خوش خرام بر خیز   از مئی بہ بہار گل چہ پرہیز

ابرکہ ز کوہسار آمد	در موسم پُر بہار آمد
کایام ربیع و نوبہار است	این وقت نشاط و وصل یار است
شادیم کہ ابر ہمرسیدہ	بردوش ہوائے خوش پریدہ
وقتی است کہ دور ساغر مئی	مطرب بدر آید از دف و نے
چوں نغمہ شود بہ شور قلقل	کاں سیر بود بہ صوت بلبل
از خستیاں مترس گاہی	بہ ابر محیط کن نگاہی
خنداں چو گل اند گل فروشاں	سرشار رحیق بادہ نوشاں
پُر کن مئی بے خودی بہ ساغر	تا این لب خشک خود کنم تر
از بادۂ معرفت بدہ جام	تا کار خرد شود بانجام
گل جام بکف در انتظارت	ہل آں کہ غم رود بغارت
گر بادۂ ناب نیست ساقی	از بادۂ علم کن تلافی
آن علم کہ زاں شود منور	ایں سینۂ عالماں برتر
آن عبد رحیم اہل عرفاں	آں شمع فروز بزم ایماں
دیں پرور و پیر و مشائخ	ہر ہر قدمش بہ شرع راسخ
کیفیت شاں بہ در منثور	بہ خوبی و حسن گرد مذکور
احوال خدا رسیدگانست	خرّش ز سواد نور جانست
صیریست کہ بے زوال آمد	ماہیست کہ با کمال آمد
آں را کہ سرے بہ نکتہ دانیست	داند کہ چہ ریزش معانی ست
باشد بہ کف خرد پسنداں	چوں ساغر مے بہ دست رنداں
یارب بہ طفیل بے نیازی	وز صدق آں شہ حجازی

''ایں نامہ کہ خامہ کرد بنیاد
توقیع قبول روزبش باد''

یہ مولانا آزاد کی ایک مثنوی کی تمہید ہے جس میں ۱۹ اشعار ہیں۔ اس تمہید کا ایک عنوان بھی ہے، جس کو مولانا آزاد نے ''تمہید عاشقانہ و طلب مئے از ساقی'' لکھا ہے۔ یہ مثنوی حضور ملک معظم کی تاجپوشی کے موقع پر بطور تقریظ لکھی گئی تھی۔ اس مثنوی کے ۱۹ اشعار میں سے بیشتر غیر مردف اور کچھ قوافی و ردائف کے ساتھ ہیں، اس کلام میں جو تراکیب استعمال کی گئی ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں، ملک ہستی، جان ہستی،

بذوق بادہ، کسب ضیا، بردوش ہوائے خوش پریدہ، نسیم صبح، سرشار رحیق بادہ نوشاں، دور ساغر مے، شور قلقل، بصوت بلبل، بحدیث مستی، طریق ہستی، ریش قاضی۔

اے ساقی مست عشق مستم   مے دہ، مے دہ کہ مے پرستم
اے بادہ فروش ملک ہستی   وی ہستی جان و جان ہستی
مستیم بذوق بادۂ تو   اے منزل امن جادہ تو
کایام بہار شادمانی ست   این وقت نشاط و کامرانی ست
از کسب ضیا نمود موجود   ہر گل بچمن چراغ بے دود
شادیم کہ ابرہی رسیدہ   بردوش ہوائے خوش پریدہ
امروز چراغ گل بہ گلشن   کردست نسیم صبح روشن
خنداں چو گل اند گل فروشاں   سرشار رحیق بادہ نوشاں
وقتے ست کہ دور ساغر مے   مطرب بدر آید از دف و نے
چوں نغمہ شود بہ شور قلقل   کاں سرمہ بود بصوت بلبل
زاہد بحدیث مستی ما   شاکی ز طریق ہستی ما
اما ز کلام او مندیش   کاں را فراق مے غم خویش
از محتسباں مترس گاہی   بر ابر محیط کن نگاہی
قاضی چو زما شود نہ راضی   در شیشہ کنیم ریش قاضی
اے ساقی جام ارغوانی   تا چند زدرد قصہ خوانی
مائیم نگار مادر آغوش   آواز سرود عشق در گوش
پیش نظر شراب رنگیں   لیکن ز تہی دست غمگیں
اے پیر مغاں تساہلی چیست؟   با بادہ کشاں تغافلی چیست؟
این ہستی ز جہت ز مستاں   بالا خوانی ز مے پرستاں!

☆ مولانا آزاد نے اس مثنوی میں تشبیب سے قبل "تجاہل عارفانہ وکیفیت وجدانی" کے عنوان سے ۹ر اشعار کہے ہیں۔ اس مثنوی کی تشبیب میں ۵ر اشعار ہیں اس تشبیب کا ایک عنوان بھی ہے، جسے مولانا آزاد نے "تشبیہ عاشقانہ از شراب ناب" سے موسوم کیا ہے۔ اس مثنوی میں بھی چند ابیات مطلع کی شکل میں جب کہ بعض قوافی وردوائف کے ساتھ ہیں، اس میں جو تراکیب مستعمل ہوئی ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں۔ 'پیر مغاں، دست تو، نگہائے حسن، بوئے گل عذار وغیرہ۔ یہ پانچ اشعار بھی مطلع کی شکل اور قوافی ردیف کے ساتھ بھی ہیں۔ اس میں مستعمل تراکیب یہ ہیں بادۂ ناب، حال آزاد، خانہ خراب و آباد وغیرہ۔

تجاہل عارفانہ وکیفیت وجدانی

ساقی در دست تو چہ چیز است   ساقی ساقی بگو چہ چیز است
این جیست شراب ارغوانیست   یا گویم کہ آب ارغوانیست
ہاں ہاں بوئے کہ شمیدم   یعنی نگہائے حسن دمیدم
نے نے این رنگ روئے یار ست   نے نے این بوئے گل عذار است
این پیر مغاں بیک فرجام   کاین بادہ ز شیشہ ریخت درجام
ہاں ہاں یعنی اشارۂ کرد   حیراں یعنی اشارۂ کرد
مے دہ مے دہ دگر صدائے   یعنی مقتا صفت نوائے
جیشے دارم بگو نہ نیم   گل می نیم چرا نہ چینم
مفتوں شدم و دگر چہ گویم   مجنوں شدم و دگر چہ گویم

تشبیہ عاشقانہ از شراب ناب

رحمے رحمے علیل ہستم   یعنی بے قال و قیل ہستم
این بادۂ ناب و حال آزاد   یعنی خانہ خراب و آباد
آں درد چو بود این دوا شد   آں ساز چو بود این دوا شد
بلقیس چو اوست این سلیمان   قبلہ است گر اوست این مسلماں
آں ناز بود نیاز این است   واں پردہ بود کہ راز این است

غایت طلب شراب کے عنوان کے تحت اس مثنوی میں ۲ر اشعار ہیں، تمہید اور تشبیب کے بعد مولانا نے اس مثنوی کے مقصد کی طرف گریز کیا ہے اور گریز کا عنوان انھوں نے "تمہید دگر بہ گریز طرف مقصود" لگایا ہے۔ اس دوسرے تمہید یا گریز میں ۱۰ر اشعار ہیں۔

پر کن مے بے خودی بہ ساغر   تا این لب خشک خود کنم تر
جز بادہ دگر سرے نہ دارم   جز مے ہوسے بدل نہ آرم

تمہید دگر بہ گریز طرف مقصود

ہاں ساقی خوش خرام برخیز   در جام بلور بادہ ریز
بیروں ز سرائے خود قدم نہ   ساغر ز مے کہن بہم دہ
ہر سوز طرب صدا بلند است   ہر محفل بہ عیش پائے بند است
ہر سمت صدائے عشرت انگیز   مینائے جہاں ز بادہ لبریز

ہر ذرہ ز جوشش صفائی — می کردہ آئینہ نمائی
آئینہ یک و تمام دیدہ — یک جلوہ جا بجا رسیدہ
ہر جوش چو جام بادہ ناب — در شوق کسے دہن پر از آب
ہر دل بہ طرب سرور دارد — ہر سر بہ سرش غرور دارد
بلبل بہ چمن ز نغمہ خوانی — مست است بناز خوش بیانی
پرکن بہ مئے بہار مخمور — خون ست بہ خوشہ ہائے انگور

☆ جشن تاجپوشی کے عنوان سے اس مثنوی میں مزید ۱۸ را شعار ہیں۔ اشعار غیر مردف بھی ہیں اور قوافی و ردائف کے ساتھ بھی ہیں، ان اشعار میں مستعمل تراکیب یہ ہیں، ایوان فلک، بزم فلک، نعرۂ مست، مئے فروشاں، براہ سر نہادہ، آغوش طلب کشور علم حکمرانی، آہ دلسوز، آہوئے کرم، غلام خانہ زاد، شہباز ہمم، تہہ نگینش، اطراف زمیں، راہ نشاط، رایت سیاست، غازۂ حسن، ستارۂ کلاہش وغیرہ۔ یہ طویل مثنوی پیش کی جارہی ہے جس سے ان کی روانی و روانی کا اندازہ قارئین خود کر سکتے ہیں:

جشن تاجپوشی

ایوان فلک چہ زرنگار است — در بزم فلک چہ ایں بہار است
زد نعرۂ مست بادہ نوشاں — شوریست بگوئے مئے فروشاں
عیش است براہ سر نہادہ — آغوش طلب رہے کشادہ
ہر شاہد حسن جلوہ آرا — ہر شوق طرب بدست آرا
در گوش دلم عجب صدائے — مستم چو رباب زیں نوائے
جشنیست کہ جشن شادمانی — خوش راحت و عیش زندگانی
شد تخت نشیں بہ تخت انگلینڈ — خوش بخت شد است بخت انگلینڈ
یعنی ایڈورڈ شاہ جم جاہ — شد تخت نشیں بہ عزت و جاہ
شاہیست چہ شاہ مہربانی — در کشور علم حکمرانی
اقبال ز پائے او مقیم است — از رشک دل شہاں دونیم است
محسود کہ تحمل او شب و روز — فریاد و فغان و آہ دلسوز
دولت چو غلام خانہ زادش — صولت ز صدائے او بپائش
آہوئے کرم بہ او رمیدہ — شہباز ہمم بہ او پریدہ
اطراف زمیں تہ نگینش — شوکت بہ جہاں شدہ مکینش

صد گنج مراد زیر پائش — صد راہ نشاط سوئے جائش
افراختہ رایت سیاست — ممتاز بہ حشمت و فراست
اے غازۂ حسن خاک راہش — خورشید ستارۂ کلاہش
فرخندہ بہ چشم دل نگاہش
[illegible] راز جہاں سزد پناہش

☆ گریز بہ دعا کے عنوان سے اس مثنوی کا اختتام ۵ را شعار پر ہوا ہے۔ اس طرح مجموعی طور پر اس مثنوی میں ۹۰ را شعار ہیں، حضور ملک معظم کے جشن تاجپوشی پر مولانا آزاد نے فارسی زبان میں یہ شگفتہ اور پر لطف مثنوی قلم بند کی تھی، جس سے ان کی قادر الکلامی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اشعار قوافی و ردائف پر بھی مشتمل ہیں اور غیر مردف بھی۔ مستعمل تراکیب شراب مدح، آب مدح، لائق مدح، صدائے دلیر، دعائے دلشاد، رعب عزّ و جاہی وغیرہ ہیں۔ گریز کے اس انداز سے آپ بھی لطف اندوز ہوں:

گریز بہ دعا

سرخوش ز شراب مدح بودم — غوطہ زن آب مدح بودم
کامد کہ ــ صدائے دلیر — بخش دار مقام خویش بنگر
تو لائق مدح نیست آزاد — بس کن بس کن دعائے دلشاد
ختم بہ دعا کنون بہ آرم — کائے رب قدیر کردگارم
باشد بہ ادب قیام شاہی — باصولت و رعب عزّ و جاہی

مولانا آزاد کی یہ فارسی مثنوی جب منظر عام پر آئی تو عوام نے اسے پسند بھی کیا اور حیرت زدہ بھی ہوئی کہ جو شخص زندگی بھر حرارت، حرکت، حرمت اور حریت کا درس دے رہا تھا، جو غلامی کے خلاف نہ صرف نعرے بلند کر رہا تھا بلکہ برسرپیکار بھی تھا، جس کے ضمیر و خمیر میں وطن پرستی، حب الوطنی اور ملک دوستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی وہ کسی ارضی شہنشاہ کی تعریف اس انداز میں بھلا کیسے کر سکتا ہے۔ مثنوی کی تخلیق جشن تاجپوشی اور تعظیم ملک کے متعلق عبد الغفار شکیل اردو ادب علی گڑھ آزاد نمبر کے صفحہ ۲۱۳ پر لکھتے ہیں کہ:

"مجھے پہلے پہل اس مثنوی کو دیکھ کر ذرا سا تامل ہوا کہ مولانا کی شخصیت، خیالات اور جذبات دیکھتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہے کہ مولانا جیسا آزاد منش کسی ارضی شہنشاہ کی شان میں مدح سرائی کرے لیکن مولانا کے مشہور معروف پرچہ الہلال کی ایک اشاعت میں مجھے اس کا جواز مل گیا اور یک گونہ اطمینان بھی۔

مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۱۲ء کے الہلال جلد ا نمبر ۱۱ میں مولانا نے ملک
معظم کی تصویر شائع کرتے ہوئے شذرات کے کالم میں لکھا ہے
کہ "ہم نے ملک معظم کی تصویر کو لوحِ امید کہا ہے۔ہم کو
ہندوستان کی گورنمنٹ اور اس کے ماتحت حکام سے خواہ کتنی ہی
شکایتیں ہوں مگر دنیا کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس پیغام پر امید کی
محبت اور وفاداری سے کوئی دل خالی نہیں" ملک معظم کے حسن
اخلاق اور جذبۂ محبت نے مولانا کو گرویدہ کیا جس کے نتیجہ میں
مولانا نے اس مثنوی کی تخلیق کی۔"

☆ مولانا آزاد نے غزل میں بھی طبع آزمائی کی لیکن افسوس کہ مولانا آزاد کے فارسی کلام میں صرف ایک غزل تک ہی ہماری رسائی ہوسکی ہے۔غزل فارسی شاعری کی مقبول ترین صنف ہے، جلال الدین رومی، حکیم سنائی، خواجہ عطار، فخر الدین عراقی، شیخ سعدی، امیر خسرو، حسن سجزی، حافظ شیرازی، نظیری نیشاپوری، شفائی، حکیم کاشانی، عبدالقادر، بیدل اور غالب دہلوی وغیرہ فارسی کے ممتاز غزل گو شعرا ہیں۔جن میں رومی، سعدی، اور حافظ کا درجہ انتہائی بلند ہے۔مولانا آزاد کی غزل میں عشقیہ رنگ غالب ہے۔ان کی اس فارسی غزل میں محض ۵ اشعار ہیں، دو مطلع ہیں جب کہ مقطع ندارد۔ "گریاں" "ہجراں" اور "پنہاں" وغیرہ قوافی ہیں۔ ردیف "را" کی ہے۔غزل کے ارکان یہ ہیں: مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن اور بحر۔بحر مجتث مثمن محذوف ہے۔یہ غزل مولانا آزاد نے کلکتہ میں منعقد مشاعرہ ۲۵ رجون ۱۹۰۲ء کے لیے شاہ برطانیہ کے جشن تاجپوشی کے سلسلے میں کہی تھی چشم گریاں، شبان ہجراں، چشم فسوں ساز، بیان پنہاں، سفیر مرگاں، اور درد ہجراں کی تراکیب اس فارسی غزل میں مستعمل ہوئی ہیں۔ اس غزل کا لفظی ترجمہ یا تشریح کرنے سے بہتر یہ ہے کہ اس کا منظوم اردو ترجمہ پیش کیا جائے اگرچہ منظوم ترجمہ مولانا کے معیار کا نہیں ہوسکتا لیکن اہل اردو کے لیے ترجمانی کا کام ضرور کرسکتا ہے۔مولانا کی غزل اور اس کا منظوم ترجمہ پیش خدمت قارئین ہے:

غزل

کنی ز گریہ اگر منع چشم گریاں را — رواں بود کہ ندیدی شبان ہجراں را
توانم آں کہ کنم ضبط آہ وا فغاں را — مگر علاج بگو چیست چشم گریاں را
الٰہی چشم فسوں ساز ما چہ مستی باست — کہ مست و بے خبر انداخت ہوشیاراں را
دریں مشاعرہ محرم نمی تواں فہمید — چہ طور گویم الٰہی بیان پنہاں را

بیا بیا تو طبیبا! چرا نمی آئی — بغیر مرگ دوا نیست درد ہجراں را

غزل کا منظوم ترجمہ:

منع کرتے ہو کیوں رونے سے میری چشم گریاں کو — کبھی دیکھا نہیں ہے تم نے شاید درد ہجراں کو
میں کرسکتا ہوں ضبط آہ و فغاں تو تم ہی بتلاؤ — میں کیسے روک دوں رونے سے اپنی چشم گریاں کو
الٰہی اس کی چشم مست ہے سحر آفریں اتنی — کہ بےخود کردیا ہے جس نے خود سے اہل عرفاں کو
مرے افکار کا محرم نہیں اس بزم میں کوئی — بیاں کیسے کروں میں انجمن میں راز پنہاں کو
نہ آؤ پاس میرے اے مسیحا! تم چلے جاؤ — کرے گی موت ہی اب ختم میرے درد ہجراں کو

مولانا آزاد کے فارسی کلام میں ہماری رسائی ان کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کلام میں صرف ایک غزل تک ہی ہوسکی جب کہ بعض محققین نے اور خود مولانا آزاد کی تحریروں سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ موصوف نے متعدد فارسی غزلیں کہیں لیکن محققین آزاد نے ان کی ایک غزل ہی مختلف مقام پر درج کی ہے اور دوسری غزلوں کے بارے میں صرف یہ کہتے ہوئے گریز کیا ہے کہ انھوں نے اور غزلیں بھی سنائی جیسا کہ مولانا آزاد خود ۵ رجولائی ۱۹۰۲ء الحکم پٹنہ "جشن تاجپوشی کا کلکتہ میں دلچسپ مشاعرہ" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس میں پہلی غزل کے بعد لکھتے ہیں کہ: "اس کے بعد میں نے اپنی دوسری فارسی کی غزل (کمالت ایں خیالات ایں) کے چند اشعار پڑھے اور ان دونوں فارسی غزلوں پر تمام اہل مجلس نے بالعموم اور جناب شمس نے بالخصوص داد دی۔"

☆ مولانا آزاد نے دیگر اصناف سخن کی طرح رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے کیونکہ رباعی کا دامن جس قدر وسیع ہے اسی قدر حسین بھی ہے۔اس میں پند و موعظت کے مضامین بھی بیان ہوتے ہیں اور محفل گرمانے کے لیے موسیقی کا کام بھی یہی رباعی ہی دیتی ہے۔اس کی تاریخ انتہائی قدیم ہے، رباعی خالص عربی زبان ولغت کا لفظ ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رباعی عربی سے ہی فارسی و اردو میں آئی لیکن پروفیسر محمود شیرانی نے رباعی کو ایران کے فارسی شعراء کی جدت طبع کا نتیجہ بتایا ہے۔بقول ڈاکٹر پرویز "رباعی کا وزن ایران میں عربوں کی آمد سے بہت پہلے ہی اکثر دیہاتوں میں "ترانہ" کے نام سے عوام کی زبان پر جاری اشعار میں موجود تھا، دیگر زبانوں مثلاً انگریزی میں Quatrain، پشتو میں چاربیتہ، سنسکرت میں چارچرن اور ہندی میں چوپائی، بھی بنیادی طور پر رباعی کے ہم وزن ہیں۔رباعی کے نام تاریخ، ابتداء، ارتقاء اور فن کے متعلق سید سلیمان ندوی مقالات سلیمان کے صفحہ ۳۲۱ پر لکھتے ہیں:

"فارسی اصناف سخن میں رباعی چار مصرعوں کی نظم ہوتی ہے مگر اس
کوزہ میں سمندر بند ہوتا ہے۔بڑے سے بڑا فلسفیانہ خیال دقیق

سے دقیق اخلاقی نقطہ اور پیچیدہ سے پیچیدہ صوفیانہ مسئلہ جو صفحوں اور
دفتروں میں نہیں سماتا دو سطروں میں پورا کا پورا ادا ہو جاتا ہے۔''

وجہ تسمیہ کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

''رباعی عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چار والے کے ہیں۔
عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ چونکہ یہ چار مصرعوں سے مرکب
ہوتا ہے اس لیے اس کو رباعی کہتے ہیں لیکن محمد بن قیس رازی نے
سعدی کے معاصر ہیں المعجم فی معاییر اشعار العجم ۲۰۹ میں یہ لکھا کہ اہل
عرب اس کو رباعی اس لیے کہتے ہیں کہ بحر ہزج جس میں دو دو جز
کا ایک شعر ہو جاتا ہے اس طرح چار مصرعوں میں چار شعر
ہو جاتے ہیں۔ لیکن دولت شاہ کا بیان ہے اس وجہ تسمیہ کی نسبت
وہی ہے جو عام خیال ہے یعنی یہ کہ تا فضلاء لفظ دوبیتی نے گو
ندیدند گفتند کہ ایں چہار مصرعہ است رباعی فی شاید گفتن۔''

رباعی کا ابتدائی نام دوبیتی ہے اور اس کا عربی نام بھی دوبیتی ہے۔ عربی میں آج بھی اس کو
دوبیتی ہی کہتے ہیں لیکن اس دوبیتی نے عجم میں قدم رکھا تو اس کا نام رباعی ہو گیا اور آج بھی یہ رباعی ہی
کہلاتی ہے۔

محمد بن قیس رازی نے المعجم فی معاییر اشعار العجم میں رباعی کے حسب ذیل نام بتائے ہیں:

۱- قول: ہر چہ از ان جنس برابیات تازی (عربی) سازند آں را قول خوانند۔
۲- غزل: و ہر چہ مقطعات فارسی باشد آں را غزل خوانند۔
۳- ترانہ: اہل دانش ملحونات ایں وزن را ترانہ نام کردند۔
۴- دوبیتی: شعر مجرد آں را دوبیتی خوانند از بہرائے آنکہ بنائے آں بر دو بیش نیست۔
۵- رباعی: و مشہور آں را رباعی خوانند بحر آنکہ بحر ہزج در اشعار عرب مربع الاجزا آمدہ است پس
ہر بیت از یں وزن دو بیت عربی باشد۔

محمد بن قیس رازی کی تصریح کے مطابق رباعی کا پہلا نام ترانہ رکھا گیا اور دوسرے نام بعد میں
رکھے گئے لیکن دولت شاہ کا بیان ہے کہ پہلے اس کا نام دوبیتی رکھا گیا پھر رباعی دوبیتی کا لفظ تو عربی میں
ہمیشہ کے لیے رہ گیا مگر فارسی میں چھٹی صدی تک ہی باقی رہا اور اس کے بعد رباعی ہو گیا۔

تیسری صدی کے آخر میں رباعی کی صنف پیدا ہوئی۔ رباعی گو شعراء کے ضمن میں تذکروں میں

سب سے پہلا نام حضرت بایزید بسطامی المتوفی ۲۲۴ھ کا ملتا ہے چنانچہ مجمع الفصحاء میں یہ رباعی ان کے
نام سے ہیں:

اے عشق تو کشتہ عارف و عامی را
سودائے تو گم کردہ نکو نامی را
ذوق لب میگون تو آورد برون
از صومعہ بایزید بسطامی را

سید سلیمان نے رباعی کے متعلق مقالات سلیمان کے صفحہ ۳۸۲ پر بڑی دلچسپ تفصیلات پیش کی ہیں۔ لکھتے ہیں:

''اس کا نام ترانہ رکھ دینا کہ ایک بڑے فتنہ کے حوالے کر دیا۔
خاص و عام اس مفتوں اور عالم و عامی اس کے والہ و شیدا ہیں۔
زاہد و فاسق کو اس سے رغبت ہے اور نیک و بد کو اس سے گہری
دلچسپی جو لوگ نظم و نثر میں فرق نہیں کر سکتے اور موزوں اور غیر
موزوں کی تمیز نہیں رکھتے ان کو اس ترانہ کو سن کر رقص و وجد کا عالم
طاری ہو جاتے ہیں جو لوگ آواز چنگ سے محروم محض ہیں وہ بھی
دوبیتی پر جان دیتے ہیں۔ دختران خانہ اور مستورات زنانہ ترانہ
کی آواز اور دوبیتی کا عشق ان کو پردہ عصمت سے باہر لے آتا
ہے اور حق یہ ہے کہ خلیل ابن احمد کے بعد سے جن اوزان شعر کا
اضافہ ہوا ہے ان میں کوئی بھی اس زیادہ دل سے نزدیک اور
طبیعت کی گرفتاری کا سبب نہیں ہے۔''

مولانا آزاد کی فارسی رباعیات میں چند گراں قدر ہیں مثال کے طور پر یہ رباعیاں پیش خدمت
ہیں۔ ان رباعیوں کے ساتھ ان کا منظوم اردو ترجمہ بھی پیش کرنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے لیکن
مولانا کے افکار اور معیار دوقار تک پہنچنا ہم جیسے ادنیٰ طالب علم کے لیے ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ تراجم اس
پایہ کے تو نہیں ہیں لیکن اس کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔ مولانا کی رباعیوں کے ساتھ منظوم ترجمہ بھی پیش
خدمت ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

☆ مذکورہ رباعی میں ناز، انداز اور پرواز قوافی کے طور پر مستعمل ہیں جب کہ ''تو بود'' اس کی ردیف ہے:

نقاش چو نقش ساز انداز تو بود
دل دادہ صورت گری ناز تو بود
یک شب ہمہ صرف زلف مشکیں تو کرد
یک روز تمام چہرہ پرواز تو بود

منظوم اردو ترجمہ:

نقاش جس کی نقش گری پہ تھا تجھ کو ناز
دلدار جس کی جلوہ گری پہ تھا تجھ کو ناز
اک رات جب وہ تمہاری زلفوں کے سائے میں
اس رات اس صنف پری پہ تھا تجھ کو ناز

☆ مولانا آزاد کی یہ رباعی غیر معروف ہے۔ بجام، بکام، اور تمام قوافی ہیں۔ شور عطش اور کار من کی تراکیب اس رباعی میں استعمال کی گئی ہیں۔ اس رباعی کا بھی اردو ترجمہ پیش خدمت ہے:

ساقی! ساقی! بدہ بدہ جام بجام — عمر تو دراز باد وقت تو بکام
ایں تشنہ لبی من و ایں شور عطش — پر کن پر کن کہ کار من تمام است تمام

منظوم اردو ترجمہ:

ساقیا جام پہ دے مجھ کو جام — ہو دراز عمر پورے ہوں سب کام
دور ہو جائے میری تشنہ لبی — کام اب ہو رہا ہے میرا تمام

☆ زمستاں دستاں، پرستاں اس رباعی کے قوافی ہیں جب کہ ''آموز'' ردیف ہے مولانا آزاد نے اس رباعی میں صرف ایک ترکیب ہی استعمال کی اور وہ ہے ''مردئی خویش'' ہے۔ مولانا آزاد کی رباعی اور اس کا منظوم ترجمہ ملاحظہ ہو:

گر عیش طلب کنی ز مستاں آموز — و از غم ز تنگ دستاں آموز
مردئی خویش حق تست لیکن زاہد؟ — خوش زیستن از بادہ پرستاں آموز

رباعی کا منظوم ترجمہ:

عیش کی خواہش اگر ہے تجھ کو مستوں سے یہ سیکھ — ہے اگر رنجیدہ خاطر فاقہ مستوں سے یہ سیکھ
تیرا اے زاہد! یہ حق ہے چاہتا ہے موت اگر — ہے خوشی درکار تو بادہ پرستوں سے یہ سیکھ

☆ یہ مولانا آزاد کی ایک غیر معروف رباعی ہے۔ بہار، خمار اور کنار اس کے قوافی ہیں۔ ایک ترکیب جو اس رباعی میں استعمال ہوئی ہے وہ قافیہ کے ساتھ ''زیر کنار'' ہے۔ مولانا آزاد کچھ یوں لب کشاں ہیں:

ساقی تو نگاہ کن بریں ابر بہار — یک ساغری دہ و ببیں لطف و خمار
وقتیست کہ ماہ روئے با ناز و ادا — یک زیر نظر باشد و یک زیر کنار

مولانا آزاد کی رباعی کا منظوم ترجمہ:

دیکھو ساقی آکے یہ ابر بہار — جام دے پھر دیکھ یہ لطف و خمار
آگیا ہے وقت جب ایک ماہ رو — سامنے ہو، دوسرا ہو ہمکنار

☆ مولانا آزاد کی یہ رباعی بھی غیر معروف ہے۔ سیر، زیر اور بخیر کے الفاظ اس میں قوافی کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں اس رباعی میں مستعمل فارسی تراکیب قابل ذکر نہیں ہیں:

از مہر و لطف او نہ شد طبعم سیر — بر بالا روم کہ خود نہ بالا است نہ زیر
ای عمر بروبرو کہ یاد تو زیاد — ای مرگ بیا بیا کہ یاد تو بخیر

مولانا آزاد کی رباعی کا اردو ترجمہ:

اس کے لطف و مہر سے حالت نہیں ہے میری سیر — میں کبھی ہوں اس سے بالا اور کبھی ہوں اس سے زیر
عمر رفتہ جا جہاں سے یاد ہو تیری فزوں — آ بھی جا اے موت! آجا یاد ہو تیری بخیر

☆ مولانا آزاد کا یہ ایک فارسی قطعہ تاریخ ہے، جو تذکرۂ صادق کی طباعت کو یادگار بنانے کے لیے لکھا گیا تھا۔ سال طباعت اس کے آخری اور چوتھے مصرعہ ''سرمہ چشم ناظریں بادا'' سے ۱۳۱۵+۵=۱۳۲۰ ہجری نکلتا ہے۔ اس کے ارکان یہ ہیں: فاعلاتن، مفاعلن، فعلن۔ اور بحر: بحر خفیف مسدس مخبون محذوف ہے۔ مولانا آزاد کا یہ قطعہ تاریخ ۴ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ آفریں، اور ناظریں، قوافی ہیں جب کہ ردیف ''بادا'' کی ہے۔ لب ہاتف، اور سرمہ چشم ناظریں کی تراکیب قابل ذکر اور نمایاں ہیں۔

چاپ کردند ایں کتاب ثمیں — فکر شاں را صد آفریں بادا
از لب ہاتف ایں ندا آمد — سرمہ چشم ناظریں بادا

☆ مولانا آزاد کے یہ دو اشعار خدا بخش لائبریری پٹنہ کے جرنل نمبر ۴ صفحہ ۱۵ پر درج ہیں۔ مولانا آزاد نے یہ شعر مولانا محمد یوسف جعفری رنجور کے نام ایک خط میں تحریر فرمائے ہیں لکھتے ہیں کہ ''ساقی نامہ کی ابتداء کر دی ہے۔ یہ دو اشعار لکھ چکا ہوں'' اس کے بعد دونوں اشعار تحریر کیے ہیں۔ ان اشعار کو شاہجہاں پوری نے ساقی نامہ کے دو شعر کے عنوان سے ارمغان آزاد کے صفحہ ۷۶ پر درج کیا ہے اور اس کی وضاحت بھی کی ہے جو لفظ بہ لفظ ملاحظہ ہو۔ ''مولانا آزاد نے یہ دو شعر مولانا محمد یوسف جعفری رنجور مرحوم کے نام ایک خط میں تحریر فرمائے ہیں، لکھا ہے کہ ساقی نامہ کی ابتداء کر دی ہے۔ دو شعر لکھ چکا ہوں۔ اس کے بعد یہ دونوں شعر تحریر کیے ہیں اور دریافت کیا ہے'' کیا یہ بحر مناسب ہے؟'' خط میں ساقی نامہ کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں شاید یہ وہ ساقی نامہ ہو جو تہنیت جشن تاجپوشی ملک معظم کی تقریب سے لکھی جانے والی مثنوی میں شامل ہے۔ اس خط پر تو کوئی تاریخ درج نہیں جس سے یہ دونوں شعر نقل ہوئے ہیں۔ البتہ جشن تاج پوشی کے سلسلے کا مشاعرہ ۲۵ رجون ۱۹۰۲ء کو کلکتہ میں ہوا تھا اور مثنوی اور قطعات تاریخ اسی موقع کے لیے لکھے گئے تھے۔ ممکن ہے ساقی نامہ کے ان اشعار سے تذکرۂ صادق پر تقریظ میں مثنوی کا آغاز کیا ہو۔ ان اشعار کے ارکان یہ ہیں: فاعلاتن، فاعلاتن یا فاعلان۔ اور بحر کا نام یہ ہے: بحر رمل مسدس محذوف۔ پہلے شعر میں شیخ اور کرم جب کہ دوسرے شعر میں بندہ نواز اور راز و نیاز قوافی ہیں۔ ساقی ماہ لقا مخزون ز کرم، اور جام دادہ ز مے راز و نیاز کی تراکیب جاذب نظر ہیں۔

ساقی ماہ لقا نیک شیخ — یک نگہ بر من مخزون ز کرم
اے خدائے تو شوم بندہ نواز — جام دادہ ز مے راز و نیاز

☆ مولانا آزاد کا یہ فارسی شعر ایک قصیدہ کی تشبیب میں ہے۔ اہل علم اس قصیدہ کی تحقیق و تلاش و جستجو میں لگے ہوئے ہیں اس کے ارکان یہ ہیں: مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعولان یا فعولن۔ بحر کا نام، بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف مقصور محذوف ہے۔ مولانا آزاد کے تشبیب کے اس شعر میں قافیہ عناں اور ردیف 'را' ہے۔ اس ایک شعر میں ہی مولانا آزاد نے تین تین تراکیب استعمال کی ہیں جو کچھ اس طرح ہیں، موج معانی، نیثون وہم اور ساحل لب۔ اس شعر کے بارے میں شاہ جہاں پوری ارمغان آزاد کے صفحہ ۸ پر لکھتے ہیں کہ" مولانا آزاد کا یہ شعر "ارمغان آزاد میں شامل نہیں محترم حکیم نصیر الدین اجمیری (کراچی) کے حافظے میں محفوظ تھا۔ "ارمغان آزاد" آں موصوف کی نظر سے گزری تو انھوں نے یہ شعر سید محمود احمد برکاتی کو سنایا۔ برکاتی صاحب نے خاکسار کو تحریر فرمادیا۔ بعد میں یہ شعر خود مولانا کے قلم سے البلاغ میں شمارہ ۴ صفحہ ۱۵ پر چھپا ہوا نظر آگیا۔ مولانا نے البلاغ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کے شمارے میں دارالارشاد کے تحت لکھا تھا "اب سے آٹھ سال پہلے میں نے ایک قصیدے کی تشبیب میں کہا تھا" اور پھر یہ شعر نقل کیا، یہ قصیدہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا، معلوم نہیں موضوع کوئی شخصیت تھی یا علم و فن؟"۔ مذکورہ شعر پیش خدمت ہے:

بر موج معانی کہ ز نیثون سہم خاست
تا ساحل لب آمد و بر تافت عناں را

☆☆☆

سیدہ عصمت جہاں*

عہد آصفیہ میں فارسی تاریخ نویسی

ہندوستان کے فارسی ادب میں تاریخ نویسی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستانی مورخین نے فن تاریخ نویسی سے خاص دلچسپی لی، یہی وجہ ہے کہ تاریخ المآثر، طبقات ناصری، تاریخ فیروز شاہی، تغلق نامہ، مراۃ احمدی، مراۃ سکندری، تاریخ فارشتہ، تزک بابری، ہمایوں نامہ، اکبر نامہ، طبقات اکبری، تزک جہانگیری، شاہ جہاں نامہ، مآثر عالمگیری، تذکرۃ الملوک، عمل صالح، ریاض السلاطین، زبدۃ التواریخ، منتخب التواریخ، تزک تازان ہند، خلاصۃ التواریخ، فتوح السلاطین، حدیقۃ العالم، گلزار آصفی وغیرہ جیسی تواریخ منصہ شہود پر آئیں۔

سلطنت آصف جاہی حیدرآباد دکن کی آخری مسلم حکومت تھی۔ یہ عظیم الشان سلطنت دکن پر تقریباً دوسو چونتیس برس برسراقتدار رہی۔ اس عہد کی فارسی تواریخ میں سے کچھ نایاب و کمیاب تواریخ یہ ہیں:

فتوحات آصفی:

یہ تاریخ نظم میں لکھی گئی ہے۔ یہ تاریخ جانشینان اورنگ زیب کی چہل سالہ دور حکومت کی تاریخ اور خاص کر نواب نظام الملک آصف جاہ کی مفصل سوانح حیات ہے۔ تاریخی واقعات کی ابتدا ۱۱۱۸ھ سے ہوتی ہے۔ محمد شاہ کے پچیسویں سال جلوس تک خاندان تیموریہ کے چھ بادشاہوں اور پانچ عہد یداران سلطنت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تاریخی اور عہد کے لحاظ سے آصف جاہ بہادر کے سوانحات بیان کیے ہیں مثلاً مختلف صوبہ جات کی حکومت دکن کی فتوحات اور دربار دہلی کی وزارت وغیرہ ان واقعات سے کتاب کا دو ثلث مملو ہے اور اسی وجہ سے مصنف نے اس کا نام "فتوحات آصفی" رکھا ہے۔ اس کتاب کا مصنف سید ابوالفیض دہلوی مرزا عبدالقادر بیدل کا شاگرد تھا۔ یہ کتاب ۱۱۱۸ سے ۱۱۵۶ھ تک کے حالات و واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ دفتر استیفا نظام اور دوسرا کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

نسخۂ فتحیہ:

زوال سلطنت مغلیہ کی تاریخ ہے۔ خصوصاً دکن کے واقعات کا مفصل تذکرہ ہے جو مغفرت ماب نواب آصف جاہ بہادر اور ان کے دو جانشینوں کے دورِ حکومت سے متعلق ہے۔ اس کا مصنف یوسف محمد خاں اعظم شاہی نواب آصف جاہ بہادر کے اہل دربار سے تھا۔ چنانچہ اس نے اکثر واقعات عینی مشاہدات کی بنا پر لکھے ہیں۔ تاریخ فتحیہ دو حصوں میں ہے پہلا حصہ مبارز خان کی لڑائی ۱۱۳۶ھ سے نواب ناصر جنگ شہید کی حکومت اور مظفر جنگ کے خروج ۱۱۶۳ھ تک دکن کے چھبیس سالہ واقعات پر مرکوز ہے ہے۔ دوسرے حصے میں نواب آصف جاہ بہادر کے اہل دربار اور سلطنت مغلیہ کے ان امراء کا تذکرہ ہے جو فرخ سیر کے آغاز حکومت سے محمد شاہ کی وفات تک گزرے ہیں۔ تاریخ فتحیہ واقعات دکن کے متعلق اہم ترین تصنیف مانی جاتی ہے۔

راحت افزا:

سلاطین تیموریہ کی عمومی تاریخ ہے۔ اس میں دو باب ہیں۔ پہلا باب آل تیموریہ کے ان بادشاہوں کا تذکرہ ہے جو ایران و توران میں برسرِ حکومت رہے ہیں۔ دوسرے باب میں ظہیر الدین بابر کے عہد سے عالمگیر ثانی کے چوتھے جلوس تک ہندوستان کے تیموری بادشاہوں کے واقعات کو نہایت اختصار کے ساتھ لکھا ہے اس کے بعد ۱۱۳۱ھ سے ۱۱۷۰ھ تک تقریباً چالیس سال کے حالات خصوصاً دکن کے معاملات، نواب نظام الملک آصف جاہ بہادر اور ان کے فرزند نواب ناصر جنگ شہید کے سوانحات، اس تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں کہ اس سے کتاب کا دو ثلث حصہ ان سے مملو ہو گیا ہے اور اس لحاظ سے یہ تاریخ سلاطین تیموریہ کے بجائے نواب آصف جاہ بہادر اور نواب ناصر جنگ کے دورِ حکومت سے مختص ہو گئی ہے۔ اس کتاب کو مصنف سید محمد علی بن محمد صادق حسینی برہانپوری نے نواب نجف علی یار شمشیر جنگ کی ایما پر ۱۱۷۰ھ میں لکھا۔

تاریخ ظفر:

فرماں روایان دکن کی تاریخ ہے جسے لالہ گردھاری لال احقر نے ۱۱۸۵ھ میں لکھا۔ یہ تاریخ دو ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں سلاطین قطب شاہیہ کے واقعات اور اورنگ زیب کے تسخیر گولکنڈہ کا تذکرہ ہے۔ باب دوم میں سلاطین تیموریہ اور شاہانِ آصفیہ کے وقائع مرکوز ہیں ان کے ضمن میں جگہ جگہ گولکنڈہ اور حیدرآباد کے مشہور مقامات و عمارات کا ذکر اس خصوصیت کے ساتھ آیا ہے کہ اس سے قبل اس کی بہت کم نظیر ملتی ہے۔ دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ شاہانِ آصفیہ کا ذکر کرتے ہوئے اکثر مقامات پر مرہٹوں کا حال بھی لکھ دیا ہے اور بلا کسی رد و رعایت کے حقیقت حال کو ظاہر کیا گیا ہے۔ کئی مواقع پر شاہی

فرامین اور سرکاری مراسلات بھی نقل کیے گئے ہیں۔ جن سے واقعات کی تصدیق و توثیق میں بے حد مدد ملتی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۲ء میں گورکھپور سے طبع ہوئی ہے۔

سوانح دکن:

شاہانِ آصفیہ کی تاریخ ہے اور ان کے اہل دربار کا تذکرہ اور دکن کے چھ صوبوں کا حال شامل ہے۔ منعم الدولہ قدرت جنگ خواجہ منعم خاں ہمدانی اورنگ آبادی نواب میر نظام علی خان بہادر آصف جاہ بہادر کے امرا میں سے تھا۔ سوانح دکن ۱۱۹۵ھ کی تالیف ہے اور دکن کی اہم ترین تاریخ مانی جاتی ہے۔

ماثر نظامی:

نواب قمر الدین خان بہادر نظام الملک آصف جاہ اول کی مخصوص سوانح حیات ہے جس میں یوم ولادت سے وفات تک ہر قسم کے رسمی اور ذاتی حالات و واقعات مرقوم ہیں۔ یہ خاندان آصفیہ سے تعلق رکھنے والے تاریخی مصادر میں نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا مصنف لالہ منسارام اور اس کے اجداد نواب آصف جاہ کے اہل دربار سے تھے۔ ماثر نظامی نواب میر نظام علی خان بہادر آصف جاہ ثانی کے پچیسویں سال جلوس ۱۲۰۰ھ کو مکمل ہوئی۔ ماثر نظامی کا قلمی نسخہ دفتر استیفا نظام اور کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

تمکین شکرف:

یہ دکن کی عمومی تاریخ ہے جس میں سلاطین دہلی کے فتوحات سے ابوالمظفر جلال الدین شاہ عالم کے ستائیسویں سال جلوس تک کے حالات مرقوم ہیں۔ یہ کتاب حیدرآباد کے پہلے ریذیڈنٹ رچرڈ جانسن کے نام معنون ہے۔ اس میں ابتداً صوبہ جات دکن کے مقامی حالات سلاطین دہلی کی فتوحات دکن کی کیفیت اور اس کے بعد دکن کی سلطنتوں کے حالات ہیں۔ آخر میں اورنگ زیب کی فتوحات دکن سے ۱۲۰۰ھ تک سلاطین تیموریہ کا تذکرہ ہے۔ یہ تاریخ مختصر ہونے کے باوجود اہمیت کی حامل ہے۔ جسے مصنف لالہ لچھمی نارائن شفیق نے ۱۲۰۲ھ میں مکمل کیا۔ اس کا مخطوطہ انڈیا آفس میں موجود ہے۔

ماثر آصفی:

یہ شاہانِ آصفیہ کی مفصل تاریخ ہے۔ آغاز سلطنت سے ۱۲۰۰ھ تک کے حالات و واقعات پر محیط ہے۔ لچھمی نارائن شفیق جو نواب نظام الملک آصف جاہ اول کے دیوان منسارام کا فرزند اور غلام علی آزاد بلگرامی کا شاگرد تھا اس نے ماثر آصفی ۱۲۰۸ھ میں لکھی اور اس میں نظام الملک آصف جاہ اول کے اجداد کا بھی مختصراً احوال لکھا ہے۔ پھر آصف جاہ اول، نواب ناصر جنگ، نواب صلابت جنگ اور نواب نظام علی خان بہادر آصف جاہ ثانی کے مفصل حالات لکھے ہیں۔ آخر میں ضمناً مرہٹوں کے حالات، امیروں اور راجاؤں کے تذکرے بھی مرقوم کیے ہیں۔

تزک آصفیہ:

جسے آصف نامہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ نواب نظام علی خان بہادر آصف جاہ ثانی کے عہد کی مبسوط و مفصل تاریخ ہے جس میں ابتدا جلوس سے ۱۲۰۹ھ تک کے واقعات ہیں۔ ابتدا میں آصف جاہ اول کے اجداد کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد آصف جاہ اول کے آغاز حکمرانی سے نواب نظام علی خان کی تخت نشینی تک اور ناصر جنگ اور صلابت جنگ کے ضروری حالات بھی لکھے گئے ہیں۔ اس کا مصنف شاہ تجلی نواب نظام علی خان بہادر کے اہل دربار سے تھا۔ یہ تاریخ ۱۳۱۰ھ میں حیدرآباد سے طبع ہوئی ہے۔

نسخۂ نصریہ:

یہ مختصر رسالہ نواب میر نظام علی خان بہادر آصف جاہ ثانی کی سوانح و تخت نشینی کے اہم واقعات کا مرقع ہے۔ یہ رسالہ نصر اللہ خان نے ۱۱۸۵ھ میں تصنیف کیا باوجود مختصر ہونے کے آصف جاہ ثانی کے عہد کی تواریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ مصنف نے کئی واقعات عینی مشاہدات کی بنا پر لکھے ہیں۔ مصنف کے ہاتھ کا واحد قلمی نسخہ دفتر استیفا میں موجود ہے۔

ماہنامہ:

یہ شاہان آصفیہ کی ایک اہم تاریخ ہے جس میں ابتدا سلطنت سے نواب سکندر جاہ بہادر آصف جاہ ثالث کی مسند نشینی ۱۲۱۸ھ تک کے حالات مرقوم ہیں۔ اس کا مصنف خواجہ غلام حسین خان جوہر نواب نظام علی خان بہادر آصف جاہ ثانی کے دیوان رکن الدولہ بہادر و میر موسیٰ خان کی سرکار میں ملازم تھا۔

ماہ لقا بائی چندا کی فرمائش پر اس نے ماہنامہ تصنیف کیا۔ ماہنامہ ایک مقدمہ، چودہ لمعات اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں شاہان آصفیہ کا حسب و نسب مرکوز ہے۔ لمعہ اول تا پنجم آصفی حکمرانوں کا احوال درج ہے۔ لمعہ ششم میں عہد نظام علی خان بہادر کے اعیان و امرا کا ذکر ہے۔ لمعہ ہفتم میں میر اکبر علی خان کا تذکرہ و حالات ہیں۔ لمعہ ہشتم میں سوانح چندا بی بی ماہ لقا بائی مذکور ہے۔ خاتمہ ماہ لقا بائی چندا کے اردو کے کلام پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ سالار جنگ میوزیم کے کتاب خانہ میں موجود ہے۔

حدیقۃ العالم:

سلاطین قطب شاہیہ اور شاہان آصفیہ کی مبسوط و مکمل تاریخ ہے، جس میں سلطان قلی قطب شاہ کی تخت نشینی سے ۱۲۲۳ھ تک کے واقعات مرکوز ہیں۔ یہ تاریخ دو مقالوں میں منقسم ہے۔

مقالہ اول قطب شاہوں کے متعلق ہے اور مقالہ دوم شاہان آصفیہ کے متعلق ہے جو آغاز سلطنت سے ۱۲۰۹ھ تک کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کے مصنف میر ابوالقاسم بن رضی الدین موسوی

شوستری المخاطب بہ میر عالم بہادر عہد نظام علی خان بہادر آصف جاہ ثانی سرکار انگریزی کے وکیل مقرر ہوئے اور پھر عہدہ وزارت سے سرفراز ہوئے۔ آپ کا شمار دکن کے امرائے کبار میں ہوتا تھا۔

حدیقۃ العالم دکن کی تواریخ میں اہم ترین تصنیف مانی جاتی ہے۔ یہ تاریخ پہلی بار ۱۲۶۶ھ میں اور دوسری بار ۱۳۱۰ھ میں چھپی ہے۔

نگارستان آصفی

یہ شاہان آصفیہ کی اولاد و احفاد و اعیان و امرا کی تاریخ ہے جسے سید التفات حسین خان بخاری نے ریذیڈنٹ ہنری رسل کی فرمائش پر ۱۲۳۱ھ میں تصنیف کیا۔ اس میں آصف جاہ اول کے اجداد و اولاد کی تفصیل درج ہے۔ نگارستان آصفی ۱۳۲۳ھ میں حیدرآباد سے طبع ہو چکی ہے۔

تذکرہ نزل:

یہ دراصل قصبہ نزل کی تاریخ ہے جو قلمرو سرکار آصفیہ کے صوبہ گلشن آباد میدک میں واقع تھا لیکن ضمناً شاہان آصفیہ کے اکثر ایسی سوانحات بھی لکھی ہیں جو دوسری تواریخ میں ایسی صراحت کے ساتھ نہیں ملتے۔ اسی وجہ سے تواریخ آصف جاہی میں تذکرہ نزل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ تاریخ ۱۳۲۳ھ میں حیدرآباد سے طبع ہوئی ہے۔

مراۃ الاخبار:

یہ شاہان آصفیہ اور ان کے امرا و حکام کی ایک اہم تاریخ ہے جس میں ابتداء سے نواب ناصر الدولہ میر فرخندہ علی آصف جاہ رابع کی تخت نشینی کے حالات درج ہیں۔ اس کا مصنف فیض الحق محمد فیض اللہ چشتی المخاطب بہ فضل علی خان منشی آصف جاہی نے ۱۲۴۳ھ میں اسے تالیف کیا اور اس تاریخ میں شاہان آصفیہ اور ان کے امرا و حکام کے جو واقعات بیان کیے ہیں۔ وہ معتبر مصادر اور ثقہ مسموعات کی بنا پر ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔ مراۃ الاخبار کا واحد قلمی نسخہ دفتر استیفا نظام میں موجود ہے۔

گلزار آصفیہ:

شاہان قطب شاہیہ اور شاہان آصفیہ کی تاریخ ہے جو ابتدا سے ۱۲۵۸ھ تک کے حالات و واقعات پر محیط ہے۔ مصنف حکیم غلام حسین دہلوی المخاطب بہ خازن زماں خان نواب سکندر جاہ بہادر کا طبیب خاص تھا۔ اس نے اس کی تالیف کا آغاز ۱۲۵۵ھ میں کیا اور تین سال اور چند ماہ کی مدت میں یعنی ۱۲۵۸ھ سے اسے تمام کیا۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور چار باب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔

مقدمہ میں مصنف کے حالات درج ہیں۔

باب اول سلاطین قطب شاہیہ کے متعلق ہے۔
باب دوم شاہان آصفیہ کے متعلق ہے۔
باب سوم دربار آصفیہ کے وزرا، امرا، مشاہیر، علما، حکما اور شعرا کے حالات پر مشتمل ہے۔
باب چہارم دکن کے صوبہ جات کے متعلق ہے۔
خاتمہ میں ریذیڈنٹس، وکلا، سرکار انگریزی، ساہوکار، تاجر اور ذی ثروت اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے۔
یہ تاریخ دکن کی اہم ترین تواریخ میں شمار کی جاتی ہے۔
گلزار آصفیہ ١٣٠٨ھ میں لکھنؤ سے طبع ہوئی ہے۔

تاریخ یادگار مکھن لال:

خاندان آصفیہ کی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ نواب نظام علی خان بہادر آصف جاہ ثانی کے عہد سے تالیف کتاب تک کے حالات پر محتوی ہے۔

یہ تاریخ بارہ فصلوں پر مشتمل ہے جسے راے مکھن لال منشی نے جو ریذیڈنسی میں منشی تھا چارلس مٹکاف کی فرمائش پر ١٢٣٩ھ میں اس کی تالیف شروع کی اور ایک سال بعد ١٢٤٠ھ میں اس کو مکمل کیا۔ یہ تاریخ اگرچہ کہ مختصر ہے لیکن خاندان آصفیہ کی تواریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے اور اس میں ایسی معلومات ہیں جو دوسری تواریخ میں مشکل ہی سے نظر آتی ہیں۔ تاریخ یادگار مکھن لال منشی ١٣٠٠ھ میں حیدرآباد سے طبع ہوئی ہے۔ اس تاریخ کا انگریزی میں ترجمہ ١٩٩٣ء میں حیدرآباد سے طبع ہوا ہے۔

تاریخ آصف جاہی:

شاہان آصفیہ کی تاریخ ہے جسے ١٢٦٦ھ میں محمد قادر خان بیدری نے شمس الامرا امیر کبیر نواب فخر الدین خان بہادر کی زیر سرپرستی تالیف کیا تھا۔ اس تاریخ میں دکن کی دوسالہ تاریخ کے علاوہ یہاں کے ادبی و اجتماعی آداب و رسوم جیسے عرس کوہ مولا علی، عزاداری سید الشہدا الحسین بن علی (ع)، میلاد النبیؐ، عید نوروز، دیوالی، دسہرہ، ہولی وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس تاریخ میں دکن میں مروجہ اصطلاحات سے بکثرت استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس تاریخ میں ضمناً حیدر علی ٹیپو سلطان، ایسٹ انڈیا کمپنی، منصب داروں، مرافعوں، وہابیوں وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس تاریخ کا ڈاکٹر زیب حیدر استاد فارسی جامعہ عثمانیہ نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو کہ ١٩٩٣ء میں حیدرآباد سے طبع ہوا ہے۔

غرض مذکورہ بالا فارسی تواریخ شاہان آصفیہ کے عالی شان کارناموں و فتوحات اور دکن کی عدیم المثال تہذیب و تمدن کا سچا مرقع ہے۔

☆☆☆

جہانگیر اقبال تانترے*

کشمیر میں فارسی مثنوی نویسی کی تاریخ: ایک مختصر جائزہ

کشمیر بھی ہندوستان کے باقی علاقوں کی طرح فارسی زبان و ادب کا گہوارہ رہا ہے بلکہ ١٨٩٣ء تک کشمیر میں فارسی بحیثیت سرکاری زبان رہی مگر ان و تیغ اور علمی و ادبی زبان کے اثرات آج بھی نہ صرف کشمیر بلکہ تمام ہندوستانی زبانوں میں موجود ہیں۔ کشمیر میں فارسی زبان کی آمد کب اور کہاں سے ہوئی اس سوال کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا ہے البتہ ایک تاریخی پہلو یہ بھی ہے کہ کشمیر اور ایران کے ادبی تعلقات ساسانی عہد سے قبل کے تھے جس کی زندہ مثال پنڈت وشنو شرما کشمیری کی پنچ تنتر کو ایران لے جایا گیا اور پہلوی زبان میں اس کا ترجمہ سرکاری اخراجات پر کروایا گیا۔ یہ نقطہ تاریخی اور تحقیقی اعتبار سے بہت اہم ہے کہ دونوں ملکوں کے ادبی، ثقافتی اور تجارتی تعلقات ہزاروں سال پرانے ہیں۔

بعض محققین کا یہ بھی خیال ہے کہ کشمیر میں ابتدائی بسنے والے ہند یوروپی اور ہند ایرانی شاخ سے کٹ کر وسط ایشیا کے ملکوں سے ہوتے ہوئے کشمیر آ کر بسے تھے۔ نقلوں کا ایک جھرمٹ اپنے ساتھ لائے تھے۔ کشمیر کے وسط ایشیا کے ان ملکوں سے تجارتی اور تہذیبی تعلقات کی بدولت ترقی یافتہ فارسی زبان کے اثرات یہاں وارد ہوتے رہتے تھے۔ ہندو راجاؤں کے عہد میں بھی یہ تعلقات قائم رہے تھے پھر اسلامی عقائد، طرز زندگی اور طرز فکر کی لہریں ایران کو اپنی آغوش میں لینے کے بعد جب وسط ایشیا کی طرف بڑھیں تو یہ کشمیر کی سرحدوں سے بھی گزر گئیں۔ یہ بات بھی شک سے بہت دور ہے کہ وسط ایشیا سے تعلق کی بنا پر جہاں فارسی زبان کا رواج ہو چکا تھا اور آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا اس طریقے سے فارسی اس عہد میں یہاں کوئی اجنبی زبان نہیں تھی۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اس وقت کشمیر میں موجود تھی جو اس زبان سے واقف تھے۔ کچھ فارسی علما، جن میں حضرت سید شرف الدین بلبل شاہ اور مولانا احمد علامہ کشمیر میں موجود تھے۔[1]

فارسی زبان علم و ادب کے نشو و نما اور ذریعہ اظہار کے تشکیل میں ان صوفیاے کرام اور علما و عوام

---

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ فارسی، سری گر یونیورسٹی، سری نگر، کشمیر

کے ساتھ کشمیر میں پہنچی جو تعلیم و تبلیغ اور ارشاد و ہدایت کے لیے اس وقت کشمیر میں تشریف لائے تھے۔ جب اسلامی عقائد کا دائرہ وسط ایشیا سے ترکستان تک پھیلا تھا۔ چونکہ اسی زبان کے بدولت کشمیر میں اسلام پہنچا۔ پھر آہستہ آہستہ دینی تعلیمات اور تبلیغات کے ساتھ ساتھ اس زبان کی اتنی وسعت ہوئی کہ سرکاری کاموں کی زبان مثلاً عدالت اور مراسلات کی زبان بن گئی۔ کشمیر میں فارسی زبان کو ایسی ہمہ گیری حاصل ہوئی کہ کشمیری پنڈتوں نے بھی اسی زبان کو علمی و ادبی زبان اختیار کر لیا۔ تحریر و تقریر دونوں پر ایسا کمال حاصل کیا کہ اہل زبان بھی دنگ رہ جاتے تھے۔ اسی اعتبار سے علامہ اقبال نے کشمیر کو "ایران صغیر" کہا تھا۔

فارسی ادب میں مثنوی وہ صنف شعر ہے جو ہیئت کے اعتبار سے ہر شعر کے دونوں مصرے ہم قافیہ ہوں مگر ہر شعر کا قافیہ بدلتا ہو۔ دو ہم قافیہ مصرعوں کی رعایت سے اس کا نام مثنوی طے پایا ہے۔ ڈاکٹر محمد یوسف لون صاحب نے اپنی کتاب "کشمیر میں فارسی مثنوی نویسی کا ارتقا" میں مذکورہ بالا مثنوی کی تعریف لکھی ہے مگر میرا ذاتی ماننا ہے کہ مثنوی کا نام نہ صرف اس کی ہیئت سے طے پایا ہے بلکہ اس کا موضوعی دامن اتنا وسیع ہے کہ دوسرے اصناف شعر میں اتنی ہمہ گیری وسعت نہیں ہے۔ چونکہ بیانیہ شاعری نے اپنے لیے مثنوی کا ملبوس پسند کیا مگر مثنوی محض کائنات خارجی کی مرقع کشی پر بس نہیں کرتی بلکہ کیفیات اور احساسات اور جذبات کی ترجمانی بھی کرتی ہے مثلاً جذبات انسانی مناظر قدرت اور تاریخی واقعات وغیرہ جس جوش اسلوبی اور روانی سے مثنوی میں سما سکتے ہیں ان کی گنجائش اور کسی صنف سخن میں ممکن نہیں ہے۔

مثنوی نگار کے لیے قافیہ کی قید و بند بہت کم ہے۔ اس سہولت کی بنا پر ضخیم داستانیں مثنوی کی شکل میں لکھی گئی ہیں مثال کے طور پر شاہنامہ فردوسی جو ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور اردو میں داستان بزرگ، الف لیلیٰ تقریباً چون ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ ہفت خوان کسی اور صنف سخن میں ممکن نہیں تھے۔ مولانا امداد امام اثر مثنوی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "چنانچہ اس وقت صنف شاعری میں دنیا کی بڑی بڑی منظوم تصنیفیں انجام کو پہنچ گئی ہیں —— ہومر، ورجل، ملٹن، فردوسی، والمیکی وغیرہ نے اس صنف سخن میں اظہار کمال کیا ہے۔"

فارسی ادب میں مثنوی نویسی کی شروعات کب اور کہاں سے ہوئی اس سوال کا کوئی واضح جواز دستیاب نہیں ہے البتہ مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ "غرض یا تو ایران نے خود مثنوی نویسی ایجاد کی یا رجز کا کوئی نمونہ ان کے سامنے تھا اگر رجز کی تقلید بھی کی تو یہ تقلید ابتداء سے بڑھ کر تھی۔ عرب میں کوئی اچھا مثنوی آج تک شاعرانہ انداز میں نہیں لکھی گئی ہے۔ مگر ایران میں سیکڑوں، ہزاروں اعلیٰ درجہ کی مثنویاں موجود ہیں۔"

فارسی مثنوی کے موجد اعلیٰ کو تعین کرنا تو مشکل ہے لیکن رودکی کو ایران کا سب سے پہلا شاعر مانا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کا کلام ان کی عظمت پر گواہ ہے ان کے ہم عصر ابو الشکور بلخی، ابو المؤید بلخی، ان کے بعد

دقیقی، فردوسی، عنصری، ناصر خسرو، عطار، سنائی، رومی وغیرہ بڑے جلیل القدر شعرا نے مثنوی کی صنف کے بدولت ہی شہرت پائی۔

کشمیر باقاعدہ طور پر شہمیری عہد میں فارسی درس و تدریس اور شعر و ادب کا کام شروع ہوا تھا۔ تقریباً فارسی شعر کے تمام اصناف سخن پر شعرا نے اپنے اپنے جوہر دکھائے۔ اس کے عہد کے بادشاہ جیسے سلطان قطب الدین، سلطان شہاب الدین، سلطان زین العابدین، سلطان اسکندر وغیرہ تمام کے تمام علم و ادب خاص کر فارسی شعر سے بنیادی دلچسپی رکھتے تھے۔ بعض بادشاہ جیسے سلطان قطب الدین اور سلطان زین العابدین خود بھی شعر کہتے تھے ان کا کلام تذکروں میں بھی موجود ہے۔ شہمیریوں کے بعد چک خاندان کے امرا اور وزرا نے بھی فارسی زبان و ادب کی بہت آبیاری کی ہے حسن شاہ نے ایک بہت بڑا کالج بنوایا تھا جہاں علما اور فضلا کے درمیان بیٹھ کر بحث و مباحثے ہوا کرتے تھے جو آج سرینگر میں خواجہ بازار محلہ میں خانقاہ نقشبندی کے نام سے موجود ہے۔ حضرت شیخ حمزہ مخدوم کشمیر کے مشہور و معروف صوفی بزرگ اسی کالج کے طالب علم تھے۔ پیر حسن لکھتے ہیں:

> "چوں در عہد حسین شاہ چک کہ در سخن گستری طبع عالی داشت و
> پرورش وقدر دانی سخنوران بسیاری کرد۔"

چک عہد میں غزل، قصیدہ، رباعی اور دوسرے اصناف شعر کے علاوہ فارسی مثنوی نویسی کا بہت مقبول اور عام رواج تھا۔ اس دور کے اہم مثنوی نویسوں میں حضرت شیخ یعقوب صرفی کا خمسہ بہت ہی معروف ہے چونکہ یہ خمسہ رموز و اسرار، عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی اقدار کا مجموعہ ہے۔ اگرچہ مولانا جامی اور نظامی جیسے قادر الکلام اور بلند پایہ شاعر کے کلام ان کی ہمسری نہیں کر سکتا مگر بعض جگہوں پر شاعرانہ مذاق، شیریں ادائی، سلاست اور روانی میں ان سے بہتر ہے۔ سبک کے لحاظ سے ان کا کلام نہایت شیریں صاف اور رواں ہے اور ان کا کلام تعقید سے بالکل صاف و پاک ہے۔ تشبیہات، استعارات اور تراکیب کی ندرت دکھانے کے ساتھ ساتھ محاورات کے استعمال میں بھی آپ نے اپنی استادانہ مہارت کا ثبوت دکھایا ہے۔ مولانا کے کلام کو سمجھنے کے لیے ایک ذہن رسا کی ضرورت ہے جو نہ صرف عربی اور فارسی سے واقف ہو بلکہ اس سے دوسرے علوم و فنون پر بھی مکمل عبور ہونا چاہیے۔ چونکہ مولانا نہ صرف عربی و فارسی کے عالم تھے بلکہ ریاضیات، طبعیات اور مابعد طبعیات وغیرہ علوم میں بھی وہ خاصی مہارت کے مالک تھے۔ آپ کے موثر کلام میں آیات کلام اللہ، احادیث نبویؐ، صوفیانہ اصطلاحات، مقولے اور ضرب الامثال وغیرہ نہایت شگفتگی اور عمدگی کے ساتھ سموئے گئے ہیں۔

جس طریقے سے ایران میں مولانا جامی، نظامی اور رومی کی مثنویوں کو فخرا پیش کیا جاتا ہے یا

انھیں قومی اثاثہ سمجھا جاتا ہے۔ کشمیر کے لوگ مولانا صرفی کے پنج گنج کو بھی وہی مقام واہمیت دیتے ہیں۔ چونکہ مولانا کے خمسہ میں سوز وگداز عشق ومحبت اور توحید ومعرفت کے موضوعات کو نہایت ہی دلنشینی سے بیان کیا ہے۔ مولانا یعقوب صرفی کا خمسہ ان مثنویوں پر مشتمل ہے۔ مسلک الاخیار، وامق وعذرا، لیلیٰ ومجنون، مقامات مرشد اور مغازی النبیؐ ان تمام مثنویوں میں حمد باری اور نعت سرور کائنات کو شاندار انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کے کلام کا زیادہ تر حصہ اخلاقی موضوعات پرمبنی ہے۔ مسلک الاخیار میں مولانا نے دنیا کی بے ثباتی کا ذکر توبہ کی فضیلت، اخلاص محاسبہ اور تفکر کا بیان، تواضع، رضا شکر، توکل اور قناعت کی تعریف، نماز، زکوٰۃ، روزہ، جہاد، حج، عبادات، خاموشی اور گوشہ نشینی کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ اپنے موضوعات کو مستحکم کرنے کے لیے قرآنی آیات احادیث نبوی اور عرفانی رموز کی دلیل بھی پیش کرتے ہیں۔ وامق وعذرا اور لیلیٰ ومجنون دو عشقیہ داستانیں ہیں دو عاشق اپنی منزل پانے کے لیے کیسے کیسے مصائب کا سامنا کرتے ہیں بظاہر یہ داستان مجازی محسوس ہوتی ہے مگر ان کے اندر مولانا نے صوفیانہ تشبیہات، استعارات، کنایات، اشارات اور تلمیحات وغیرہ جیسی فنی خوبیوں کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ مغازی النبیؐ میں مولانا نے حضرت محمدؐ کی ان جنگوں کے احوال درج کیے ہیں جو انھوں نے کافروں کے ساتھ لڑی تھیں۔ اس رزمیہ مثنوی میں مولانا نے بہادری جوانمردی اور آپسی شجاعت اور دلیری کے جوہر بیان کیے ہیں۔ ان مقابلوں میں ان کی فتح مندی تمام محرکات اور جزئیات کا نقشہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔ مولانا کے خمسے کی آخری مثنوی مقامات مرشد کے نام سے موسوم ہے جس میں مولانا نے عرفانی نکات کی وضاحت سے اپنے مرشد کے عرفانی کمالات کو امثال کے ذریعے بیان کیا ہے کہ کس طریقے سے مرشد اپنے مرید کو روحانی عظمت سے سرفراز کرتا ہے۔[۷]

چک دور میں کشمیر میں فارسی شعروادب کا سبک ہی تقریباً مختلف تھا چونکہ یہاں کا ہر شاعر اور ہر ادیب علاقائی الفاظ اور ترکیبات اور تشبیہات کا استعمال اپنے کلام میں کرتا تھا جو اس عہد کے کلام کی ایک پہچان ہے۔ اگر اس سبک کو سبک کشمیر کے نام سے جانا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا چونکہ شعرا کا انداز بیان دوسرے ملکوں اور علاقوں سے بالکل مختلف ہوتا تھا جس کی زندہ مثال غنی کشمیری کے اس شعر سے ہے جس کی وضاحت کے لیے صائب کشمیر تشریف لائے تھے:

سبزہ ہرنگ زمین بود گرفتار شدم
گرد کا سہ ز سر جدا کرال پن

یہاں اس شعر میں غنی نے کرال پن علاقہ کی زبان سے لیا ہے جس کا مطلب کمہار کے دھاگے سے ہے جس سے وہ کاسے کو بناتے وقت مٹی سے الگ کرتا ہے ایسی تشبیہات اور تلمیحات شاید ہی فارسی ادبی دنیا میں کوئی اور شاعر استعمال کرتا ہو۔

مغلوں کا کشمیر میں تسلط پاتے ہی کشمیر میں روایتی فارسی شاعری کا قلعہ قمع ہوگیا۔ ہندوستان کی روایتی شاعری جسے سبک ہندی کہتے ہیں اس کے اثرات کشمیری شعرا پر پڑنے لگے۔ آہستہ آہستہ سبک ہندی سبک کشمیر پر حاوی ہوگیا۔ چونکہ مغلوں کے عہد میں نئے شعرا ایران سے ہندوستان اور پھر وارد کشمیر ہونے لگے ان کے ساتھ شعروادب کی نئی نئی روایات بھی کشمیر آ پہنچیں، کشمیر کی فارسی شاعری جو کہ خالصتاً علمیت، مذہبیت اور تصوف واخلاق پرمبنی تھی، اب نئے ادبی انداز اور مزاج میں نشوونما پانے لگی۔

مرزا اکمل الدین خان کامل بدخشی اس عہد کے بہت بلند پایہ شاعر تھے۔ انھوں نے تصوف اور عرفان کے رموز ونکات پر 'بحرالعرفان' کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہے۔ اس مثنوی میں ایران کے معروف استادوں شیخ فریدالدین عطار، مولانا روم اور دیگر علاقائی حضرات مثنوی گو شعرا کی پیروی کی ہے۔ سبک کے لحاظ سے یہ مثنوی نہایت سادہ اور رواں ہے۔ معنی میں بہت وسیع وضاحت کے لیے، فنی خوبیوں، قرآنی آیات اور احادیث نبوی کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ ان کی دوسری مثنوی ''اکندن'' جس میں حضرت مرزا نے ماں باپ کے صبر واستقلال اور بیٹے کی فرمانبرداری کو بڑی دلنشینی سے بیان کیا ہے۔ مثنوی داستانی شکل میں بیان کی ہے کہ ایک بار سادھو میں ایک درویش داخل ہوا جو مرد کے گوشت کا تقاضا کرتا تھا۔ اہل خانہ نے کئی قسم کی نعمتیں پیش کیں مگر درویش صرف ان کے بیٹے کے گوشت کا متقاضی تھا۔ آخر بیٹا اکندن گوشت دینے کے لیے رضامند ہوجاتا ہے اس درد بھری داستان کو اس شعر سے شروع کیا جاتا ہے:

به پدر نیز گفت این فرزند — من سر افگنده چند باشم چند
کن شهیدم که سر بر افرازم — زان بود تا بعرش پروازم
از تنم زود سر جدا سکین — ز انتظارم این رہا می کن
در زمان داد حکم بکشتن — والدش را سر ببر از تن

کشمیر میں ورود اسلام سے پہلے مقامی لوگ سادھو سنتوں پر بہت عقیدت رکھتے تھے۔ اسلامی تعلیمات کو بھی علما اور صوفی حضرات ایران اور وسط ایشیا سے لائے۔ اس لیے لوگوں کے عقائد ان حضرات پر اور مستحکم ہوگئے اس لیے یہ روایات ہزاروں سالوں سے چلی آرہی ہے کہ ان درویشوں اور سادھوؤں کی بات کو ٹھکرایا نہیں جاتا تھا اسی لیے حضرت مرزا نے بھی ایسی ہی علاقائی داستان کو بڑی درد بھرے انداز میں پیش کیا ہے۔ ایسے موضوعات اور تلمیحات فارسی مثنوی کے دوسرے شعرا کے ہاں بہت کم ملتے ہیں اسی لیے کشمیر میں اس عہد کے فارسی ادب کی ایک الگ ہی پہچان ہے۔

آصف خان کے زمانے میں اوجی کشمیری ایک قدآور شاعر کی حیثیت سے ابھرا۔ آصف خان

کے بعد جتنے بھی صوبیدار کشمیر میں آئے سب نے اوجی کی قدر دانی کی۔ ''ساقی نامہ'' ان کی مشہور نظم ہے جس کے ایک شعر میں مولانا محمد صوفی نے لکھا تھا کہ:

اگر میں اوجی کے ساقی نامہ کے اشعار پڑھ لیتا تو کبھی ساقی نامہ نظم کرنے کا ارادہ نہیں کرتا۔

چونکہ مولانا محمد صوفی نے بھی ساقی نامہ لکھا تھا۔ [۸]

ایک روایتی اور کلاسیکی داستان سیف الملوک اور بدیع الجمال کو خورم کشمیری نے منظوم کیا ہے۔ یہ مثنوی بہت طویل ہے۔ حمد و مناجات کے بعد حضرت مخدوم شیخ حمزہ کی منقبت میں کئی شعر کہے ہیں کشمیر کے اولیا شہنشاہ جہانگیر کی بھی مدح سرائی کی ہے۔

ملا محسن فانی کشمیری کسی تعریف کے محتاج نہیں۔ صاحب دیوان شاعر اور غنی کشمیری کے استاد رہے ہیں۔ ان کا خمسہ جو چار مثنویوں پر مشتمل ہے۔ ناز و نیاز، میخانہ راز، مصدر الآثار، ہفت اختر، فانی نے مثنویوں میں نظامی کو اپنا استاد مانا ہے۔ ناز و نیاز ایک عشقیہ داستان ہے۔ داستان کو ایسے رواں اور سلیس زبان میں لکھا ہے کہ حقیقی ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ عشق کے میدان میں بے چینی اور اضطراب کے حال کو یوں بیان کیا ہے:

قمی آمد بخوابش ماہروی   چو شب برسر پریشان کرد موی
قد او چون نہال شعلہ سرکش   میان در پیچ و خم چون پے آتش
نوشتہ خامہ تقدیر از مو   خطی خوش بر بیاض گردن او [۹]

مثنوی مصدر الآثار شاہ جہان کے نام معنون ہے:

شہاب الدین محمد بو المظفر   کہ برسر دارد وارد از اقبال افسر
شہی کز عدل چون نوشیروان است   امیر المومنین شاہ جہان است

فروغی شاہ جہاں کے عہد کا بہترین مثنوی گو شاعر گزرا ہے۔ ان کی دو مثنویوں میں ایک مثنوی شاہ جہان آباد پر اور دوسری باغ حیات بخش پر لکھی ہے۔ اس پر شاہ جہان کے دربار سے بارہ ہزار روپیہ انعام اور بارہ روپیہ ماہانہ مقرر کئے گئے تھے۔

کشمیر میں مغلوں کا تسلط ختم ہونے کے بعد افغانوں کا تسلط شروع ہوا جو ادبی، تہذیبی اور اخلاقی اعتبار سے بہت پیچھے تھے۔ سعد اللہ شاہ آبادی نے اس ناگفتہ بہ حالات کو یوں بیان کیا ہے:

پرسیدم از خرابی گلشن ز باغبان   افغان کشید و گفت کہ افغان خراب کرد

اس خلفشار اور ظلم و استبداد کے باوجود بھی کشمیر کے ذہین طبقہ نے ادبی روایات کو برقرار رکھا۔ دیگر اصناف سخن کے ساتھ ساتھ مثنوی نویسی کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ عبد الوہاب شائق اس عہد کے معروف شاعر

مانے جاتے ہیں۔ جرسکھ جیون مل نے جس سات شاعروں متین، مساتی، راتخ، حسن اور نوید کو شاہنامہ کشمیر کے نظم کرنے کا کام سونپا تھا ان میں شائق بھی شریک تھے۔ اس نامکمل شاہنامے میں تقریباً ساٹھ ہزار اشعار نظم کیے ہیں جو حضرات سادات، کشمیری رشیوں اور حضرت سلطان العارفینؒ کے بارے میں مرتب کیے تھے۔ اس مثنوی میں انھوں نے فردوسی کی پیروی کی ہے ان کا نام ریاض الاسلام تجویز کیا ہے۔

ملا محمد توفیق کشمیری اس عہد کے قد آور شاعر مانے جاتے تھے۔ شاہنامہ کشمیر کے دو ہزار اشعار آپ نے لکھے تھے۔ ان کی تصنیف تاریخ کشمیر کے نام سے موسوم ہے۔ یہ حصہ یوسف شاہ چک کے عہد سے لے کر عالمگیر کے عہد تک کا ہے۔ یوسف شاہ کے عدل و انصاف کو یوں بیان کیا ہے:

چمن کرد استاد رنگین سخن   گل رفتہ را بار زیب چمن
کہ چون گشتہ کشمیر بار دگر   بفرمان یوسف شہ نامور
دل مردم شیرودہ کرد شاد   بجود و بہ بخشش بعدل و بہ داد [۱۰]

مرزا جان محمد بیگ ساتی نے شاہنامہ کشمیر میں کشمیر کے قدیم راجاؤں کی تاریخ بیان کی ہے جس میں انھوں نے ان کے چال چلن، رعایا کے ساتھ عدل و انصاف، جنگ و جدل، شجاعت اور بہادری جیسے واقعات پیش کیے ہیں۔ مہاراجہ للتادت اور قنوج کے بادشاہ بشورم کے درمیان محاذ آرائی کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے بالآخر مہاراجہ للتادت کی فتح ہوتی ہے:

زدہلی شدش جمع بسیار فوج   از آنجا روان گشت سوی قنوج
چون آنجا رسید آن سپہدار دہر   بہ ویرانہ زد خیمہ بیرون شہر
بشورم سلطان آن سرزمین   کہ بودش ہمین نام نقش نگین
سخن را ز تیغ بہاران ظہور   ز کشمیر کردہ است چون باغ نور [۱۱]

میر سعد اللہ شاہ آبادی نے اس عہد کی مظلوم عوام کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ اس ضمن میں مثنوی باغ سلیمان لکھی ہے جو تاریخی لحاظ سے بہت اہم ہے۔ ملک کی تباہی و بربادی کو اپنے کلام کے ذریعے سے یوں بیان کرتے ہیں:

ظلم شاہان وجود سلطانان   یک قلم کرد ملک را ویران
نیست در شہر ہیچ پیشہ وری   کہ نہ در قہر اوست ہر ذری

تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ اس مثنوی میں اولیاء کرام کا ایک مفصل تذکرہ بھی ہے جو حقہ مین شعرا کی روش رہی ہے۔ منظوم السعد سیرت نبیؐ پر بھی ان کی ایک مثنوی ہے جس میں پیغمبر آخر الزماںؐ کے بچپن کا ذکر، مکہ سے ہجرت اور فتوحات کا بیان بھی تفصیل سے کیا ہے۔ اس مثنوی میں قرآنی آیات اور معتبر

احادیث کی کتابوں کے حوالے بھی دیے ہیں۔ ہجرت کے چھ سال بعد مدینہ شریف کے اطراف کے بادشاہوں کے نام جو خطوط حضورؐ نے بھجوائے تھے ان کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے:

در آن سال ذوالنشاوہ اہل سلوک　　فرستادہ شد نامہا بر ملوک
پس آنگاہ شش نامہ از حسن خط　　بہ مضمون نوشتند بریک نمط
یکی بر نجاشی کہ از فضل جود　　بعدالت گر خط حبشہ بود[۱۲]

ملا اشرف وبر بلبل اس دور کے ایک مشہور شاعر تھے۔ ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے انھیں ''نظامیٔ کشمیر'' کا لقب دیا ہے۔ ان کا خمسہ بہت مشہور ہے جو ان مثنویوں پر مشتمل ہے۔ ہمیاں نگری، ہشت اسرار، مہر وماہ، ہشت بہشت اور رضا نامہ۔ یہ خمسہ نظامی کی پیروی میں لکھا ہے جس کا ذکر انھوں نے رضا نامہ میں کیا ہے:

اگرچہ نظامی بسی رنج برد　　ز گنجینۂ معنوی گنج برد
من از روح او یاریٔ خواستم　　سخن را بہ معنی بیاراستم
دو چیز است اندر جہان پائیدار　　سخا و سخن نکتۂ آبدار

مثنوی رضا نامہ میں حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا حال بیان کیا ہے۔ حضور کی ان شہزادوں کی شہادت کی بشارت پہلے ہی مل چکی تھی جس کا اشارہ شاعر یوں کرتا ہے:

چنان نقل آمد درست از کتاب　　کہ پیغمبر پاک والا جناب
حسینؑ وحسن را چو جان جگر　　ہمی محترم داشتی در نظر
ہمی خم شان در جگر کاشتی　　وی دور از خویش نگذاشتی
وزیدی اگر باد بر روی شان　　پریشان شدی ہیچ گیسوی شان[۱۳]

پنڈت دیارام کاچرو متخلص بہ خوشدل افغان دور کے معروف شاعر گزرے ہیں ان عہد کے پنڈت شعرا میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ اپنے ایک سفر کا حال اپنی مثنوی میں یوں بیان کیا کہ کیسے انھیں وطن کی یاد ستاتی ہے:

مرا حب وطن آشفتہ تر کرد　　نمی دانم چرا قسمت بدر کرد

کجا آن سیر کشتی و کجا من　　کجا آن شالیمار و کوہ و دامن
کجا آن جوشش فوارہ اللہ　　کہ دریاوش بگردون میرود آہ[۱۴]

میر احسن اللہ خان راضی بھی افغان عہد کے معروف شاعر گزرے ہیں۔ جو فصاحت خان کے نام

سے معروف ہیں محمد تقی خان کے فسادات پر انھوں نے ایک طویل مثنوی ''شہر آشوب'' کے نام سے لکھی ہے:

ندارد خطہ با کشمیر نسبت　　عیان است این بہ ارباب بصیرت
ودرین گلشن ز رندان قدح نوش　　کہ چون خمند دائم بر سر جوش
عجب ہنگامہ گردید ظاہر　　ز جنگ شیعہ و سنی و کافر[۱۵]

عبدالغفور شوپیانی نے پنج گنج کے نام سے ایک مثنوی لکھی جس کی زبان نہایت ہی رواں سلیس اور آسان ہے۔ موضوع اور مفہوم واضح ہیں:

کس نداند قدر این اسرار با　　کس نیابد لذت انوار با
دو ہزار و چہار صد ابیات شد　　جملہ نص و پند و اخبار شد
از حقیقت در حقایق با پر است　　ہر حقایق اندرین چون گوہر است

اس پنج گنج میں دین اسلام کے بنیادی رکن کلمہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ موضوعات پر مفصل انداز سے بحث کی ہے۔ زبان بہت سادہ اور عام فہم ہے۔

خضر شاہ مقبل بجاڑی نے ''زبدۃ الاذکار'' کے نام سے سیرت نبوی پر ایک مثنوی لکھی ہے۔ سیرت پاک کے علاوہ خلفائے راشدینؓ کے احوال کو بھی بڑے مفصل انداز سے لکھا ہے۔ حضرت عمرؓ جو اپنی رعایا کے ساتھ عدل وانصاف میں بہت معروف تھے ان کے اقوال اور کارگزاری کو شاعر نے بڑی خوبصورتی سے اپنی مثنوی میں بیان کیا ہے۔

کشمیر میں سکھ عہد بہت ہی ظلم وبربریت کا دور گزرا ہے۔ سکھوں نے کشمیری قوم کو ہر طرح سے محکوم بنا رکھا تھا۔ ظلم کی انتہا یہاں تک ہوئی کہ لوگ ترک وطن کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چند علم دوست اور ادب پرور حضرات جن میں حمید اللہ شاہ آبادی، ملا بہاء الدین متو، مرزا مہدی مجرم، پنڈت شعرا میں بیربل کاچرو، پنڈت تابہ رام ترکی، بھوانی داس کاچرو وغیرہ شعرا خاصے شہرت کے حامل تھے۔

ملا حمید اللہ شاہ آبادی نے فردوسی کی پیروی میں ایک شاہنامہ لکھا تھا۔ انھوں نے پہلی جنگ انگریزوں اور افغانوں کے درمیان ۱۸۳۹ء کے واقعات کو بیان کیا ہے جس میں اکبر خان فرزند دوست محمد خان کو بحیثیت قومی ہیرو پیش کیا ہے اس کے علاوہ ظالم سکھوں اور افغانوں کے مابین ہونے والی جنگوں کا حال بھی بیان کیا ہے۔ یہ کتاب افغانستان سے ۱۳۲۵ھ میں چھپ چکی ہے۔ اس کا نام اکبر نامہ تھا جو اکبر خان کے نام سے منسوب تھی۔ ملا شاہ آبادی کو شاہنامہ لکھنے کے لیے کسی کی فرمائش نہیں تھی وہ قومی درد اور جذبہ رکھتے تھے قوم ظلم واستبداد سے تنگ آ چکی تھی۔ قحط اور وبائی بیماریوں نے کشمیر کو لپیٹ میں لے لیا تھا اس قومی شاعر نے شاہنامہ قومی جذبے سے لکھا تھا۔ تاکہ قومی بیداری ہو سکے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

مرا از کسی نیست امید زر　　چو لالہ خورم ہفت خون جگر

فروشم گہر مقصدم سود نیست ۔۔۔ نگاہم سوی دست محمود نیست

شکرستان ملا حمید اللہ شاہ آبادی کی دوسری مثنوی ہے جس میں انھوں نے حسن وعشق، طنز ومزاح، فلسفہ و اخلاق، حکمرانوں کے جبر واستبداد اور تصوف ومعرفت کی رنگین داستانیں درج کی ہیں۔

ملا بہاء الدین متو کشمیر کے بہت باوقار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ تصوف کی تمام منازل پر کامل مہارت رکھتے تھے۔ اس بارے میں ان کا خمسہ قابل فخر ہے۔ جو ریشی نامہ، سلطانیہ، غوثیہ، نقشبندیہ اور چشتیہ جیسی مثنویوں پر مشتمل ہے۔ ریشی نامہ میں حضرت شیخ نور الدین ریشیؒ کے کارناموں کا ذکر ہے۔ سلطانیہ میں حضرت سلطان العارفین، شیخ حمزہؒ کے احوال، غوثیہ میں حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کی زندگی اور تعلیمات کے بارے میں ہے۔ نقشبندیہ: یہ مثنوی نقشبندیہ سلسلہ کے بزرگوں کے احوال پر مشتمل ہے اور چشتیہ مثنوی چشتی سلسلہ کے بزرگوں کے بارے میں ہے۔

پنڈت بیربل کاچرو وارستہ، سکھ عہد کے معروف شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ غزلیات کے علاوہ مثنوی گوئی پر بھی عبور رکھتے تھے۔ ''قصہ ستی نامہ'' معروف بہ مثنوی سوز وگداز جو ایک ہندو مرد کی وفات پر اس کی بیوی کو لاش کے ساتھ ستی ہونے کی رسم کو بیان کیا ہے۔ اس شرمناک حادثے کو یوں بیان کیا ہے:

بآئین آئین باین زیور باین ساز ۔۔۔ باین شوخی باین خوبی باین ناز
برآمد چون مہ تابندہ از در ۔۔۔ می ذوق وصال یار در سر
بوسید آتش از تعظیم پایش ۔۔۔ برنگ شعلہ بر سرواد جایش
ز دلداری چنان در برکشیدش ۔۔۔ کہ جان در تن ز جسم خود دمیدش

انیسویں صدی کے وسط سے کشمیر پر ڈوگروں کا عمل دخل شروع ہوگیا۔ چونکہ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد ان کا کوئی باصلاحیت جانشین نہیں رہا اس لیے مہاراجہ گلاب سنگھ نے موقع غنیمت جان کر انگریزوں کے ساتھ مل کر ۱۸۴۶ء میں ریاست جموں وکشمیر دونوں خطوں کو ملا کر اپنا ملک ۷۵۰۰۰۰۰ روپے میں خرید لیا۔ یہ وہ عہد تھا جب انگریزی تعلیم، نئے طرز کے مدارس اور متداول علوم کا رواج شروع ہوگیا تھا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے دارالترجمہ فارسی عربی اور سنسکرت میں شروع کروائے۔ ملا احمد سہروردی اس عہد کے نامور عالم دین تھے ان کی ایک معروف مثنوی ''مغازی الصحابہ'' یا خلافت نامہ'' اسلام کی تاریخ پر طویل مثنوی ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ہے جس میں حضرت محمدؐ کی حیات طیبہ سے لے کر فتح مصر تک کے واقعات پیش کیے ہیں۔ یہ مثنوی فردوسی کی پیروی میں لکھی گئی ہے:

درآمد دو لشکر چو بریک دگر ۔۔۔ کشیدند شمشیر و تیر و تبر

نمودند باہم چنان کارزار ۔۔۔ کہ ماندہ جہان را از آن یادگار
درآن رزمگہ خالد رزم خواہ ۔۔۔ ہمی کشت و می کشت فوج سیاہ[۴۶]

خواجہ احمد میرابی جو گاندربل کے باشندے تھے۔ انہوں نے ایک طویل مثنوی ''جواہر المنظوم'' کے نام سے لکھی تھی۔ جس میں انھوں نے پیغمبروں کے حالات وواقعات نظم کیے ہیں۔ پیش رو استادوں کی پیروی میں مثنوی کا آغاز حمد باری تعالیٰ، نعت نبیؐ اور منقبت اولیا اللہ سے کیا ہے۔ منقبت میں حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ کے عظیم الشان مرتبے پر یہ منقبت کہا ہے:

قطب عالم غوث اعظم دستگیر ۔۔۔ زبدۂ رحمت فخر عالم دستگیر
شاہ شاہان ماہ تابان دستگیر ۔۔۔ جان احسان کان عرفان دستگیر
نور احمد پور زہرا دستگیر ۔۔۔ زین فلک وزین نمیرا دستگیر

مرزا جلال الدین کی مثنوی ''حسن وگوہر'' روایتی طرز کی بہترین مثنوی ہے۔ مثنوی کا موضوع علاقائی ہے مگر طرز بیان روایتی حمد باری کے بعد نعت سرور کائنات کے بعد منقبت اولیا اس کے بعد کشمیر کی خوبصورتی کے بارے میں شاعر رقم طراز ہے:

خوشا کشمیر و خوشتر کوہسارش ۔۔۔ طراوت بخش جانہا آلہ زارش
کنار آب ڈل دامان کوہسار ۔۔۔ بہشت آسا ہمہ سو باغ وگلزار
بشاخ آن درختان پر از گل ۔۔۔ نوای قمری و دراج و بلبل
گل بادام کردہ گلفشانی ۔۔۔ بفرق عاشقان از مہربانی

عشقیہ موضوعات کے بیان میں بھی انھوں نے تشبیہات استعارات اور کنایات وغیرہ جیسی فنی خوبیوں کا بھرپور استعمال کیا ہے:

قد بالا بلای جان عشاق ۔۔۔ بہ رعنائی چو شیرین شہرۂ آفاق
جبینش لوح سیمین جہان تاب ۔۔۔ ز نور افشانیش خورشید بیتاب
بعقیق لعل مین یاقوت جان است ۔۔۔ عجب درخندہ کان گوہرفشان است[۴۷]

پنڈت گوپال کول غیوری سرینگر میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں پیدا ہوئے تھے۔ گوپال اور غیوری ان کا تخلص تھا۔ ''وشتم اسکند'' کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی اس کا آغاز یوں کیا ہے:

اوم تت ست کو کہ ہست درکار ۔۔۔ او مکار مددکند بہر کار
اول گنپت گنیش کن یاد ۔۔۔ برہماوش و مہیش کن یاد

مثنوی کے آخر میں طویل مناجات ہے جس میں کشمیریوں کی زبوں حالی کا ذکر ہے:

لیک این همه مردمان کشمیر　　کز دست زمانه اند دلگیر
کشمیر اگرچه دل پذیر است　　بی شبہ بہشت بی نظیر است
خلق اما غنچہ سان در این خاک　　خندان رویند باول چاک[۱۸]

عبدالغنی بن عبدالغفار متخلص بہ عاقب نے تاریخ اسلام پر ایک مثنوی لکھی تھی جو عاقب کے نام سے مشہور ہے۔ حمد و نعت کے بعد پیر شاہ و سید احمد سامانی کی منقبت میں کچھ شعر کہے ہیں جن میں حضرت فاروق اعظمؓ کی فتوحات و واقعات بیان کیے ہیں:

پنڈت واسہ کول اوگرہ کا تخلص بلبل تھا۔ فارسی نظم و نثر پر کامل مہارت تھی۔ غزلوں کا مجموعہ دیوان بلبل کے نام سے مرتب ہوا ہے۔ اس کے علاوہ قصہ چہار درویش، گلزار بلبل، گلشن عندلیب اور ایک ناٹک ہریش چندر بھی لکھا ہے۔ 'گلشن عندلیب' مثنوی ہے جس میں بنارس کے ایک نوجوان کی کہانی ہے کہ اس نوجوان کی عورت کسی اور مرد پر عاشق ہو گئی تھی اور مرد کو بہانے سے شہر کے باہر کروا دیا۔

سرشت زنان چون بنا کردہ اند　　بآب گل مکر پروردہ اند

گلزار بلبل بھی طویل مثنوی ہے جو حمد و ثنا اور بہار کی آمد اور تعریف میں لکھی ہے:

چون گشت زمیں ز گل مزین　　شد چشم جہان چو چشم روشن
بہ شگفت گل و دمید سنبل　　زد جوش بہار آتش گل
در باغ بہار کردہ خانہ　　در زلف بنفشہ کرد شانہ[۱۹]

قصہ چہار درویش میں شاعر نے حرص و لالچ اور تکبر و غرور جیسی بری عادات کے نتیجے کے بارے میں مفصل انداز میں لکھا ہے کہ کیسے ایک عزت دار آدمی نفسانی خواہشات کے جال میں پھنس کر پستی تک پہنچ جاتا ہے۔
مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں کشمیر میں امن و امان تھا۔ غریب اور مفلس لوگوں کے لیے لنگر کا اہتمام کیا تھا۔ ان کے نام کی ایک مثنوی مہاراج نامہ سے معروف ہے جو بخت تخلص نے لکھی ہے یہ بھی بہت معروف مثنوی گو شاعر گزرے ہیں:

کہ مشہور جہان حشمت و فر　　مہاراج است شاہ ملک کشمیر
خدیو و عادل و روشن ضمیری　　چو او کس نیست در عالم نظیری
بلندی یافتہ در تاجداران　　ز بس انعام و لطف و جود و احسان[۲۰]

ملا صدر الدین نے تحفۃ العشاق ایک عشقیہ مثنوی لکھی ہے۔ یہ ایک مقامی عشقیہ داستان ہے۔ یہ مثنوی میں حمد باری تعالیٰ نعت سرور کائنات کے بعد حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند کے منقبت بھی درج کیے ہیں۔ داستان کو مزید دلچسپ بنانے کے لیے فنی خوبیوں کا استعمال کیا ہے۔ تشبیہات، کنایات اور

استعارات کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے:

جمال آن سراپا رشک گلشن　　بعارض گل و سنبل شاخ بیار
بیاد چشم ارزان گشتہ بیمار　　ز مژگان خدنگش خوردہ بیمار
ز دیدہ خون دل صد قطرہ میریخت　　فراز دیدہ خاک یاس می بیخت[۲۱]

رام داس مخلص نے رام اور سیتا کے پیار و محبت اور ان کے مخالف راون کے ساتھ لڑائی کے واقعات کو "رام نامہ" مثنوی میں بڑی دلچسپی سے بیان کیا ہے۔ مثنوی کی زبان نہایت رواں اور آسان ہے:

دو عاشق دو تا کردہ ماہ تمام　　بخوبیت یکتا و سیتا بنام
بگوہر بجو ہر لطیف و شریف　　بصورت بسیرت ظریف و عفیف
چہ گویم ز طرز پری پیکری　　کہ حیران دران حسن و حور و پری
نہ روی چنان دیدہ حوران ہمین　　نہ خوی چنان اہل چرخ برین

سید ولی اللہ شاہی شاہ آبادی کی دو مثنویاں نظم اسیر اور تحفہ شاہی ہیں۔ نظم اسیر میں حضرت آدمؑ سے لے کر پیغمبر آخرالزماں تک چند پیغمبر کے احوال کو نظم کیا ہے۔ یہ مثنوی چار حصوں پر مشتمل ہے۔ اور میں ہزار سے زائد اشعار ہیں۔ نبی آخرالزماں کی تعریف و توصیف میں لکھتے ہیں کہ:

خبر ہم ازان دادہ پروردگار　　زہی وصف پیغمبر نامدار
کہ ہستند بسیار بازیب و فر　　چہ کنیت چہ اسمای خیر البشر
رسول و نبی و شہید و کریم　　حبیب و عزیز و رؤف الرحیم
مزمل مدثر سراج و ہدات　　ہم الشمس و الفجر وہم والضحیٰ است

محی الدین اسلام آبادی نے مثنوی مشقنامہ نظم کی ہے کہ مثنوی پرانے عشقیہ قصوں مثلاً شیریں و خسرو، لیلیٰ و مجنوں، ویس و رامین وغیرہ کی پیروی کو ترک کر کے ایک نئے پیرائے اور نئے سانچے میں علاقائی عاشق و معشوق کے داستان عشق کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ داستان یوں لکھتے ہیں کہ اولسر نامی پرگنہ میں ایک نوجوان خواب میں ایک حسین لڑکی کو دیکھتا ہے دوسرے دن ہی وہ اس کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ آخرکار تھک ہار کر اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور عبادات و وظائف میں دن رات گزارتا تھا۔ اس کے مسکن کے قریب تاجر رہتے تھے جن کی بیٹی کی شادی منقطع ہوئی تھی۔ ایک دن چھت پر چڑھ کر وہ اس خانقاہ کی طرف ایک حسین مرد کو عبادات و ریاضات میں مصروف پاتی ہے تو اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس مرد کے پاس جائے۔ ایک دن اتفاق سے اس بزرگ نے تاجر سے خواہش ظاہر کی کہ وہ کسی نیک سیرت خادم کو میرے پاس بھیجے۔ تاجر نے بڑی لڑکی کو ہی مناسب سمجھا۔ پہلے تو خاموشی سے وہ لڑکی خدمت

کرتی رہی بہر حال عشق اضطراب لایا۔ ایک رات کو نقاب ہٹایا۔ مرد درویش اس کے مقصد کو سمجھ گیا اس طریقے سے عشق کی داستان شروع ہوئی۔

خواجہ عبدالعزیز نے کشمیر کے بلند پہاڑوں، صاف وشفاف، آبشاروں، دلکش باغ و بہاروں اور تاریخی مقامات کی تعریف وتوصیف اپنی مثنوی گلگشت کشمیر میں کی ہے:

خصوصاً داد کوہ چرخ فرسا — کز آن رہ رفت بر گردون مسیحا
ندارد ہیچ داری پایہ او — کہ داریں است زیر سایہ او
رہ پیچان چو ماری حلقہ زن ہست — کہ از داری معلق چون رسن ہست
بہر جانب کہ بینی سبزہ زاریست — بجنتی در زمرد گون حصاریست
کشیدہ لالہ و گل سر بافلک — جنون کو تا گریبانی کند چاک

حسینوں کے حسن و جمال کو بھی شاعر یوں نغمہ زن ہے:

بنام بہ جمال شعلہ رویان — کہ ہر یک بود ہمچون برق پویان
بدیدن ہر یکی سرچشمۂ نور — وز آن سرچشمہ بادا چشم بد دور
خصوصاً چون بروی چاہ آیند — ببرج دلو ہمچون ماہ آیند
بہم در آب بازی می ستیزند — کہ خون عاشقان چون آب ریزند[۲۲]

حواشی:

۱- کشمیر میں فارسی مثنوی نویسی کا ارتقا، ڈاکٹر محمد یوسف لون، ص ۲۹
۲- ایضاً، ص ۱۳
۳- تاریخ مثنوی اردو، جلال الدین احمد، ص ۲۰
۴- شعر العجم حضرت مولانا شبلی، جلد چہارم، ص ۲۹-۳۷
۵- گلدستۂ کشمیر، پنڈت ہرگوپال خاستہ، ص ۱۱۹
۶- کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، عبدالقادر سروری، ص ۳۷
۷- کشمیر، غلام محی الدین صوفی، ص ۳۵۰-۳۵۲
۸- کشمیر میں فارسی نویسی کا ارتقا، ڈاکٹر م. ی. لون، ص ۳۲
۹- کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، عبدالقادر سروری، ص ۱۳۵
۱۰- پارسی سرایان کشمیر، ڈاکٹر گردھاری لعل تیکو، ص ۱۳۸

۱۱- کلیات ساطع، مرزا جان بیگ ساطع، ص ۱۹
۱۲- منظوم الاسعد، میر سعد اللہ شاہ آبادی، ص ۴۲
۱۳- رضانامہ، ملا اشرف وزیر بلبل، ص ۳
۱۴- تذکرہ شعرای کشمیر، حسام الدین راشدی، ص ۲۳۱، جلد اول
۱۵- کشمیر میں فارسی مثنوی نویسی کا ارتقا، ڈاکٹر م. ی. لون، ص ۵۷
۱۶- ایضاً، ص ۲۶
۱۷- ایضاً، ص ۶۸
۱۸- بہارستان، پنڈت برج کشن کول، جلد دوم، ص ۲۸۷
۱۹- ایضاً، ص ۳۶۷، جلد دوم
۲۰- مہاراج نامہ، بخت تخلیق، ص ۱۹
۲۱- کشمیر میں فارسی مثنوی نویسی کا ارتقا، ڈاکٹر م. ی. لون، ص ۹۷
۲۲- تذکرہ شعرای کشمیر، حسام الدین راشدی، بخش اول، ص ۸۲۸

☆☆☆

شمس عارف*

ریاست بھوپال میں فارسی کا رواج

ریاست بھوپال کے لسانی موضوع پر غور وفکر کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس ریاست کے محل وقوع، اس کی تہذیبی انفرادیت اس کی ادب نوازی اور اس کے وجود کے تاریخی اور جغرافیائی پہلو پر ایک سرسری نظر ڈالتے چلیں۔

اس کا محل وقوع وندھیاچل پہاڑ کے اس علاقے میں تھا جس میں ہموار اراضی کے ساتھ ہی ہری بھری وادیاں بھی تھیں۔ سرسبز گھنے جنگلات، بہترین قدرتی مناظر کے ساتھ ہی سینکڑوں ندیوں اور تالابوں نے اس علاقے کو کافی زرخیز اور نظر فریب بنا دیا تھا۔ اس کے دائرے میں مالوہ، گونڈوانہ اور بندیل کھنڈ کے علاقے شامل تھے۔ قدیم اعداد وشمار کے اعتبار سے اس کا علاقہ سات ہزار دو سو چالیس مربع میل تھا اور اس کی آبادی سات لاکھ پچاسی ہزار سات سو ستر پر مشتمل تھی۔ انتظامی طور پر یہ ریاست چار نظامت پر منقسم تھی، اس کا تمام علاقہ گوالیار، اندور، ہوشنگ آباد اور ناگپور کی چھوٹی بڑی ریاستوں سے گھرا ہوا تھا اور وہاں مرہٹے اقتدار پر قابض تھے جن کے ساتھ بھوپال سے سرحدی اور فوجی ٹکراؤ ہوتا رہتا تھا۔

ایک افغان سردار دوست محمد خاں جو افغانستان سے ترک سکونت کر کے روزگار کی تلاش میں ہندوستان آئے تھے انھوں نے بھوپال کی مسلم ریاست کی بنیاد ۱۷۰۹ء میں ڈالی۔ بھوپال اس زمانے میں پہاڑ کے نشیب وفراز کے علاقے پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہاں گھنا جنگل تھا جہاں صحرائی جانوروں کا شکار کیا جاتا تھا۔ بھوپال تال کے کنارے پر ایک چھوٹا سا قلعہ تھا، اس کے قلعہ کے اندر ایک محل تھا جس میں گونڈ رانی کملاپتی رہتی تھیں۔ سردار دوست محمد خاں نے بھوپال آنے سے پہلے مالوہ کے کچھ علاقہ کو فتح کر لیا تھا، جب وہ بھوپال کے قریب گونڈ راجاؤں کی ریاستوں میں داخل ہوئے تو اس علاقے میں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ رانی کملاپتی کے شوہر کو باڑی کے گونڈ راجہ نے زہر دے کر ہلاک کر دیا تھا اور اس کے بیٹے

* شعبۂ فارسی، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال

کو قید کر دیا تھا۔ رانی کملاپتی نے سردار دوست محمد خاں سے مدد مانگی کہ وہ اس کے دشمنوں سے بدلہ لیں۔ انھوں نے اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے اور رانی کملاپتی کے علاقے کو فتح کر کے رانی کے حوالے کر دیے اور اس کے بیٹے کو رہا کروا دیا۔ اس مہم کی قدر دانی کے صلہ میں رانی نے سردار دوست محمد خاں کو بھوپال گاؤں عطا کیا، تاکہ وہ اس جنگلی علاقے میں اپنے شکار کے شوق کو پورا کر سکیں۔

بھوپال کے خودمختار ریاست کے وجود میں آنے کے بعد ملک کے مختلف علاقوں کے علما و فضلا نے یہاں آ کر بھوپال کے تہذیبی، تمدنی، علمی، ادبی و مذہبی وقار کو سربلند کیا۔ امرا نے اپنے اپنے ناموں پر محلے آباد کیے۔ مسجدیں تعمیر کرائیں اور مدرسوں میں درس وتدریس کے انتظامات کیے۔ رستم علی سرہندی نے لکھا ہے کہ بھوپال دارالامان کہلائے جانے کا مستحق تھا۔ سردار مرحوم کی دینداری اور علم نوازی کی بدولت اطراف ہند سے علما وفضلا بھوپال آتے رہتے تھے۔ نواب کے دسترخوان پر فقرا وعلما کی بڑی جماعت مجتمع تھی جن کی بدولت علم وادب کا چرچا عام تھا۔ محلہ تاریخ کے منتظم محمد امین زبیری کی رائے میں۔

''سردار دوست محمد خاں اہل علم کی قدر ومنزلت کرتے تھے خود ان کو انشا پردازی اور فارسی ادب میں کامل مہارت حاصل تھی۔ ان کے گرد وپیش اور دربار میں بڑے بڑے عالم وفاضل مسلمان وہندو تھے۔''

بھوپال ریاست کا جداگانہ وجود کئی مورخوں نے اندازاً ڈھائی سو سالہ قرار دیا ہے تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ اس کا قیام سردار دوست محمد خاں کے ہاتھوں ۱۷۰۹ء میں ہوا تھا اور اختتام جون ۱۹۴۹ء میں تو پھر حقیقت میں اس کا جداگانہ وجود ۲۴۳ سال تک برقرار رہا۔ اس کا نصف سے بیشتر حصہ ہنگاموں، خونریزیوں، بیرونی حملوں اور تخت وتاج کے لیے سازشوں میں نکل گیا اور باقی عرصے میں تعمیر وترقی، تہذیبی علمی وادبی کارنامے انجام پائے جس کی وجہ سے آزاد ہندوستان میں جب صوبوں کی نئی شیرازہ بندی ہوئی تو بھوپال کی تقدیر چمک اٹھی اور اسے مدھیہ پردیش کی راجدھانی بنا دیا گیا۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ایسا واقعہ ہے کہ مغل دور حکمرانی میں پورے ہندوستان میں دفتری زبان فارسی تھی اور غیر ممالک سے خط وکتابت بھی اسی زبان میں ہوتی تھی چونکہ ریاست بھوپال کا قیام اس دور میں ہوا تھا جب دلی میں مغل سلطنت برقرار تو تھی لیکن پورے ملک میں بدنظمی پھیل رہی تھی جس کی وجہ سے الگ الگ علاقوں میں کہیں چھوٹی اور بڑی ریاستیں قائم ہو رہی تھیں اور وہ اپنا کام کاج فارسی میں چلانے لگی تھیں جو ایک طرح سے انھیں مغل سلطنت سے ورثہ میں ملی تھی۔ ریاست بھوپال میں پٹھان خاندان کے حکمرانوں نے بھی شروع ہی سے انتظامی امور کے لیے فارسی کا سہارا لیا، اسی زبان میں علم وادب کا بڑھاوا ملا، درس وتدریس کے شعبے میں البتہ فارسی کے ساتھ ہی عربی اور اردو کا بنیادی کام ہوا جب دلی کے لال قلعے میں بہادر شاہ ظفر کی سرپرستی میں اردو کی شعری محفلیں جمنے لگیں اور غالب اور ذوق

کے کلام کو پورے ملک میں شہرت حاصل ہونے لگی تو بھوپال بھی اردو کے رنگ میں شرابور نظر آنے لگا، یہاں کے حکمراں اتنے علم دوست اور ادب نواز تھے کہ اودھ اور دلی کے باکمال افراد بڑی تعداد میں بھوپال کا رخ کرتے رہے ان میں سے زیادہ تر لوگ یہیں بس گئے اور باقی ملازمت ختم ہونے کے بعد اپنے وطن واپس چلے گئے۔ فارسی کا عمل دخل بھوپال میں اتنا بڑھ گیا کہ نواب جہانگیر محمد خاں فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور ان کا تخلص دولہ تھا نواب شاہجہاں بیگم اچھی شاعرہ تھیں فارسی میں وہ "شیریں" اور اردو میں "تاجور" تخلص کرتی تھیں۔ فارسی میں ان کا دیوان "دیوان شیریں" اور اردو میں "تاج الکلام" کے نام سے دیوان ہے ان کی ایک طویل مثنوی ،صدق البیان" بھی یادگار ہے۔ نواب حمید اللہ خاں کے نجی کتب خانہ میں بانی ریاست کے علاوہ دیگر نوابوں اور بیگمات کے قلمی روزنامچے اور متعدد دستاویزات پائے گئے ہیں جو فارسی میں تحریر کیے گئے ہیں۔

علم وادب کے بے شمار مشاہیر کی بھوپال سے وابستگی کے باعث دنیائے ادب کے نقشے پر اس ریاست کا نام روشن ہو گیا ہے۔ بیگمات کے دور حکمرانی کو اس اعتبار سے "عہد زریں" کہا جاتا تھا کہ اس میں بدنظمی اور خلفشار کی جگہ امن وامان اور تعمیر ترقی کا دور دورہ دیکھا گیا۔ ایک عرصہ دراز تک بھوپال ارباب علم وکمال کی سرگرمیوں کا مرکز رہا، پتہ نہیں علم وفضل کے کتنے آفتاب ومہتاب اس کی سرزمین میں دفن ہیں اور اس حقیقت کو کیسے فراموش کیا جاسکتا ہے کہ نواب صدیق حسن خاں جیسے عبقری انسان کو بھوپال ہی کے خوبناک اور خوشگوار ماحول میں پروان چڑھنے کا موقع ملا تھا اور مولانا برکت اللہ بھوپالی جیسے جلیل القدر بین الاقوامی انقلابی عالم دین اسی زمین سے اٹھا اور نئی اور پرانی دنیا کو اپنی انقلابی سرگرمیوں سے ہنگامہ زار بنائے رکھا۔

نواب سکندر جہاں بیگم نے اپنے دور حکمرانی میں جب دیکھا کہ ان کی ریاست کی رعایا ترسیل و ابلاغ کے لیے اردو کے حق میں ہے تو انھوں نے ۱۸۴۷ء میں دفتری زبان اردو کو قرار دے دیا اس کے باوجود علمی کاموں اور دفتری اصطلاحات کے استعمال میں یہاں فارسی کا عمل دخل بیسویں صدی کے ابتدائی ۲۵ سالوں تک دیکھا گیا۔ وہیں تدریس اور تالیف تصنیف کے کام کو یہاں جو باکمال اساتذہ انجام دیتے رہے اس سے فارسی عربی میں خاص طور پر اس اردو کی تعلیم میں عام طور پر یہاں کے لوگ فیضیاب ہوتے رہے۔

بھوپال میں جامعہ احمدیہ میں فارسی کی تعلیم کا بہت اعلیٰ پیمانہ پر اہتمام کیا گیا تھا۔ اس میں پڑھانے والے افغانستان اور ایران کے علماء کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی بھی اسی جامعہ کے سند یافتہ تھے۔ یہ ادارہ سلطان جہاں بیگم کے شوہر نواب احمد اللہ خاں کے نام نامی پر معنون کیا گیا۔

ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ جامعہ احمدیہ میں فارسی اور عربی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھوپال اور بھوپال کے باہر سے مدرسوں کے فارسی پڑھے ہوئے طلباء داخلہ لیتے تھے۔ شہر بھوپال میں جہانگیریہ ہائی اسکول ،حمیدیہ ہائی اسکول، سیفیہ ہائی اسکول اور سلطانیہ گرلس ہائی اسکول میں فارسی کی تعلیم کا مناسب انتظام تھا۔

بھوپال میں علم وادب کی ناقابل فراموش خدمات انجام دینے والی شخصیت نواب صدیق حسن خاں کو یاد نہ کرنا ایک گناہ عظیم کے مترادف ہوگا۔ وہ اپنے وقت کے مستند عالم دین تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انھیں کی ذات کے طفیل بھوپال علم وادب کا مرکز بن گیا تھا۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں ان کا تخلص نواب تھا اور اردو میں توفیق۔ ان کے کلام کا مجموعہ "گل رعنا" کے نام سے شائع ہوا۔

مولانا اشہری نے ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "جناب موصوف اپنی دلچسپی کے لیے ایک مجلس مشاعرہ منعقد کراتے تھے۔ نواب صاحب کا مذاق تغزل نہایت پاکیزہ اور قابل قدر ہے اور ان کا مواخذہ اور مجتہدانہ رنگ شاعری بھی اپنا اثر ظاہر کیے ہوئے ہے۔"

محکمہ تاریخ میں مہتمم کے عہدہ پر متعین محمد امین مارہروی "البرامکہ" کے مصنف مولانا عبدالرزاق کانپوری اور علامہ یوسف قیصر نے فارسی میں تصنیف وتالیف نیز اردو ترجمہ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ علاوہ ازیں "تاریخ فرمانروایان بھوپال" کو مولانا حبیب لی نے فارسی کے ادب اور تاریخی دستاویزات کی مدد سے اس شاہکار کتاب کی تالیف کی۔ علامہ قاضی سید عابد علی وجدی الحسینی صاحب کو فارسی ادب اور تواریخ پر زبردست دستگاہ حاصل تھی۔ ان علوم کی مدد سے موصوف نے تاریخ ریاست بھوپال اور ہندوستان اسلام کے سائے میں تالیف کی۔ بھوپال کی نامور ہستی اور گلابی اردو کے موجد ملا رموزی کو دیگر علوم کے علاوہ فارسی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ ان کی تصنیفات اور طنزیہ شاعری میں اس کا ثبوت ملتا ہے۔

زمانے کے گزرنے کے ساتھ ہی علم وادب کا یہ کارواں بڑھتا گیا اور فارسی اور عربی کے اثرات نے نئے زمانے میں اردو زبان کو اس لائق بنا دیا کہ درباری شان وشوکت اور تہذیب وتمدن کی وہ ترجمان بن گئی۔ گویا فارسی نے اردو کی شکل میں ایک نیا قالب اختیار کر لیا ہے جس نے ہندوستان کی تمدنی تاریخ میں ایک خاص جگہ بنائی ہے جو مشترکہ تہذیب کی علامت ہے اور عام طور پر گنگا جمنی تہذیب کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

بھوپال کی اسلامی ریاست جو ۱۷۰۹ء میں سردار دوست محمد خاں نے قائم کی تھی اس کا اختتام آخری حکمراں نواب حمید اللہ خاں پر ہوا جب یکم جون ۱۹۴۹ء میں ایک معاہدہ کے تحت انھوں نے اپنی ریاست کو ہندیونین میں ضم کر دیا۔ اس طرح شاہی خاندان کے تیرہ فرماں رواؤں نے جس میں چار نامور بیگمات بھی شامل تھیں اپنی انتظامی اور فوجی صلاحیتوں نیز سیاسی تدبر اور ہوشمندی کی صفات کا مظاہرہ کیا۔ ان چار بیگمات کے نام ہیں نواب گوہر قدسیہ بیگم، نواب سکندر جہاں بیگم، نواب شاہجہاں بیگم اور نواب سلطان جہاں بیگم بھوپال کے آخری نواب حمید اللہ خاں سلطان جہاں بیگم کے بیٹے تھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر شایستہ خان*

فارسی زبان وادبیات کے لئے خدابخش لائبریری کی خدمات

اٹھارہ سو ستاون کی قیامت صغریٰ کے بعد کی موت سے زندگی اور راکھ سے روشنی پیدا کرنے کی، جو کوششیں ہمارے اکابر نے کیں، وہ آج لیجنڈ بن چکی ہیں۔ سرسید ہمارے ان بڑوں میں سے ایک تھے جنھوں نے علیگڑھ کا ادارہ بنایا۔ سرسید کے جونیر معاصر، بہار کے خدابخش دوسرے اولوالعزم آدمی تھے جنھوں نے، ایک اور پہلو سے ایسا ہی عظیم کام انجام دے دیا۔ علوم مشرقیہ کے برباد ہوتے ہوئے قیمتی خزانے کو سارے جتن کر کے، انہوں نے ایسا محفوظ کیا کہ وہ آج دنیا بھر کے علم کے پیاسوں کے لئے ایک سرچشمۂ آب حیات بنا ہوا ہے۔ اور کتابوں کے تاج محل کے طور سے دنیا میں ہندوستان کی شناخت بن گیا ہے۔

بانکی پور (پٹنہ) کی خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، نادر مخطوطات کے ذخائر کے تعلق سے علمی دنیا میں ایک اہم مقام کی مالک ہے۔ اگر کوئی اس حیثیت کا بڑا مرکز مخطوطات ہو جیسا کہ خدابخش، تو اس کے بنیادی کاموں میں اولیں فرض یہ ہے، علمی دنیا سے متعارف کرانے کے لیے سارے ذخیرے کی ایک مختصر ترین فہرست شائع کر دے۔ انیسویں صدی کے اواخر تک ہندوستان کی علمی زبان فارسی تھی۔ خدابخش نے اپنے مخطوطات کے سارے ذخیرے کی ایک ایسی فہرست محبوب الالباب کے نام سے شائع کر دی۔ مخطوطات کی ہر بڑی لائبریری کو پہلی فرصت میں یہ کام انجام دے دینا چاہیے۔

خدابخش نے اپنے سارے مخطوطات کی مختصر فہرست تو علمی دنیا کو تحفہ دے ہی دی؛ ساتھ ہی دوسرے کئی ایسے ذخیروں کی فہرستوں کی اشاعت بھی کر دی جو اس طرف متوجہ نہ تھے: جیسے علی گڑھ کی مزمل لائبریری، دہلی کی شاہ ابو الخیر لائبریری اور گیا، بھاگلپور وغیرہ کے قلمی ذخیرے۔ بعض بڑی لائبریریوں کا احاطہ بھی کیا گیا۔ رضا لائبریری رامپور کے فارسی مخطوطات کی ہینڈلسٹ شائع کر کے خدابخش نے بڑی لائبریریوں کے مکمل ذخیرے کے تعارف کا سلسلہ بھی شروع کیا؛ اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی

* اسسٹنٹ لائبریرین، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کے مخطوطات کی ایک مکمل ہینڈلسٹ کی اشاعت کا پروگرام بنا۔ اس ذیل میں اردو مخطوطات پر کام منظر عام پر آچکا: فارسی عربی مخطوطات پر کام کا آغاز تو ہوا، مگر کسی وجہ سے وہ بیچ میں رک گیا۔ یہ اچھا اور نیک کام امید ہے آگے بڑھ رہا ہوگا۔

دوسرا اہم کام جو فارسی نوادر کے، خدا بخش جیسے ہر بڑے مرکز کے کرنے کا کام ہے، وہ یہ ہے کہ ہر مخطوطے کا تفصیلی تعارف ہو، ایسا کہ مخطوطے کو دیکھنے سے بے نیاز کردے۔ اس کام کی طرف بھی ان کی توجہ ہوئی اور بیالیس جلدوں تک توضیحی کیٹلاگ خدا بخش مخطوطات کے شائع ہو چکے ہیں۔

تیسرا ضروری کام یہ ہو کہ: فارسی زبان، علوم و ادبیات پر تحقیق و آگہی پھیلانے والے اہم موضوعات لے کر اس میدان کے ماہروں کی مدد سے، نادر مخطوطات کی نشاندہی کرائی جائے۔ اور ان کے بارے میں تفصیلی مقالے لکھوائے جائیں۔ اسی کے ساتھ یہ کام بھی کیا جائے کہ اہم موضوعات پر، مخطوطات کے جتنے ذخیرے ہندستان اور پڑوس کے کتاب خانوں میں محفوظ ہیں، ان کی چھان پھٹک کی جائے، اور اب تک شائع نہ ہو سکے ہوں، ان کی فہرست بنوائی جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ یہ کام بھی لائبریری کی طرف سے انجام پا گیا کہ: پہلے تو اہم موضوعات منتخب ہوئے، پھر ان موضوعات سے متعلق نادرترین مخطوطات پر ماہرین نے مقالے لکھے، جو لائبریری کے ان موضوعات سے مختص سیمناروں میں بحث کے لئے پیش ہوئے۔ ساتھ ہی یہ کام بھی ہوا کہ مختلف کتاب خانوں میں فارسی کے وہ مخطوطات جو اب تک طباعت و اشاعت سے محروم رہے ہیں، ان کی یکجا فہرستیں مرتب کی گئیں اور وہ بھی مخطوطات سیمنار میں بحث کے لئے پیش ہوئیں۔ بحث کا ہدف یہ رہا کہ: یہ بات طے پا جائے کہ ان فہرستوں میں شامل (۱) جو نسخے ہنوز اشاعت پذیر نہیں ہوئے؛ اور (۲) جو اس قابل ہیں کہ انہیں شائع کیا جانا چاہئے، ان کی متفقہ طور سے نشاندہی کی جائے۔

موضوعات جو ان امور پر بحث کے لئے اور متعلقہ فارسی (اور عربی) مخطوطات کی ندرت کا تعین کرنے کے لئے، آغاز کار کے طور سے طے ہوئے، وہ مندرجہ ذیل تھے:

(۱) علوم قرآنیہ (۲) علوم طبیہ (۳) تاریخ ہند (۴) تصوف (۵) ہندی الاصل مذاہب (۶) وسط ایشیا

بجا طور سے اگلی منزل لائبریری نے یہ سر کی کہ: مذکورہ موضوعات سے متعلق نوادر مخطوطات، جن پر سیمنار کے شرکا نے سیر حاصل بحث بھی کی، ان پر مشتمل مقالات کے مجموعے بھی شائع کئے۔

مزید برآں مذکورہ ہر موضوع پر برصغیر کے ان سارے فارسی مخطوطات کی فہرستیں شائع کردیں

جن پر بحث کے بعد مذاکرین (سیمینیرز) اس بات پر متفق ہو گئے کہ یہ، وہ مخطوطات ہیں جو ہنوز شائع نہیں ہوئے ہیں؛ اور یہ کہ انھیں شائع ہونا چاہئے۔

جو فہرستیں شائع ہوئیں ان کے پھیلاؤ کا اندازہ کرنے کے لئے ان فہرستوں میں سے ایک کے، متعلقہ عنوانات درج کئے جاتے ہیں، جو "برصغیر میں تاریخ ہند کے مخطوطات" کے نام سے شائع ہوئی ہے:

(۱) تاریخ ہند کے مخطوطات: خدا بخش لائبریری میں (۲) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں (۳) پاکستان میں (۴) بنگلہ دیش میں (۵) ہندوستان میں (مجموعی فہرست)۔

اسی طرح طب، تصوف وغیرہ کے موضوع پر ان مخطوطات کی فہرستوں کے مجموعے لائبریری نے شائع کیے، جو مخطوطات ہنوز غیر مطبوعہ رہے ہیں۔

ان موضوعات پر نادرترین مخطوطات کے بارے میں مقالات کے مجموعے، کچھ تو نامزد مخطوطے کے تعارف پر مشتمل تھے؛ اور کچھ پورے پورے ذخیروں کے تعارف پر: جیسے ذخیرہ ٹونک، کتب خانہ ناصریہ (لکھنؤ)، دارالعلوم دیوبند، گورنمنٹ لائبریری مدراس، کتاب خانہ ندوۃ العلما، سالار جنگ لائبریری، مولانا آزاد لائبریری، خانقاہ ابوالخیر کا کتاب خانہ، ہمدرد انسٹیٹیوٹ، ذخیرہ بھیرام ہینڈلسٹ، بوٹانیکل انسٹی ٹیوٹ، طبیہ کالج دہلی وغیرہ۔ لائبریری کی اس علمی خدمت سے علم کے پیاسے مدت دراز تک مستفیض ہوتے رہیں گے کہ ان کے سامنے ہر خزانے کے سب سے قیمتی جواہر، ماہروں کی پوری تفحص کے بعد یکجا پیش کر دیے گئے ہیں۔

یہ بڑا مفید سلسلہ تھا۔ ان منتخبہ موضوعات (تاریخ ہند علوم قرآنیہ، طب تصوف، وسط ایشیا ہندی الاصل مذاہب) اور ان پر منعقدہ سیمناروں، اور پھر جامع فہرستوں اور مقالات کی طرح سائنس، فلسفہ، کلام، فقہ اور دوسرے موضوعات پر بھی ماہرین کو جمع کرکے، ہر موضوع کے نادرترین مخطوطات پر مقالے لکھنے کی دعوت دی جائے۔ اور برصغیر کے ہر ذخیرے میں غیر مطبوعہ مخطوطات کی نشاندہی کرنے والی فہرستیں تیار ہو کر ماہرین کے سامنے پیش ہوں، اور ان پر بحث ہو۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے تاکہ اس طرح کم سے کم عرصے میں زیادہ سے زیادہ نوادر سامنے آسکیں۔

اگلا کام جو مخطوطات کے محافظوں کو کرنا چاہئے تھا، وہ بھی خدا بخش نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا؛ اور ایک راستہ دکھایا کہ کتاب خانوں کو یہ کام بھی انجام دینا چاہئے کہ، ان کے ذخیرے میں موجود اہم ترین مخطوطات کی ترتیب و تدوین ہو، تنقیدی ایڈیشن شائع ہوں۔ راستہ یہ بھی دکھایا کہ تنقیدی ایڈیشن کس کس طور سے مرتب ہوں۔

اسی سلسلے میں اولیں ترجیح تو خدا بخش کی یہ رہی کہ اپنے غیر معمولی اہمیت رکھنے والے کچھ

مخطوطات کو عکسی ایڈیشن میں چھاپا، اور انکے تدوینی لوازمات کی بھی تکمیل کی۔ یہ اہم ترین اس لئے تھے کہ مثلاً:

(۱) **مکتوبات صدی** کا وہ نسخہ جو اس کے مصنف مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری (۶۶۱۔۷۸۲ھ) کے عہد کا نسخہ ہے اور جس پر جا بجا ان کے مرید خاص حضرت مظفر شمس بلخی اور حضرت حسین معز بلخی کی تحریریں ہیں، وہ یقیناً اپنی اصل شکل میں ہی پیش کرنے کے لائق تھا۔ بقول مرتب مکتوبات یہ نسخہ اس لئے بھی اہم ہے کہ ہندوستان میں دستیاب فارسی مخطوطات میں اتنا قدیم مخطوطہ شاید اور کوئی نہ ملے۔ کتابت اس زمانے سے تعلق رکھتی ہے جب فارسی کتابیں بھی عربی یعنی نسخ خط میں لکھی جاتی تھیں۔ لائبریری کی ایڈیٹنگ کی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے، مدون شدہ اشاعت میں اس کے دریافت کنندہ پروفیسر عسکری کا تحریر کردہ تفصیلی تعارف بھی شامل ہے اور سو سے اوپر صفحات پر مشتمل تفصیلی حواشی اور اختلاف نسخ بھی۔

(۲) **دیوان حافظ** کا وہ نسخہ جس پر جا بجا ہمایوں اور جہانگیر کی تحریریں ہیں کہ انھوں نے فلاں شعر سے فلاں وقت میں فال نکالی، شاہزادہ دارا شکوہ نے بھی جس کے بارے میں اپنی کتاب سفینۃ الاولیا میں لکھا ہے کہ ہمارے خاندان میں دیوان حافظ کا ایک نسخہ محفوظ چلا آتا ہے جس سے ہمارے دادا پردادا فال نکالا کرتے تھے۔ نسخہ خاصا قدیم ہے، یعنی ہمایوں سے قبل کا۔ خوش خط ہے اور شاہی مہروں اور عرض دیدوں سے مزین۔ ان وجوہ سے اس نسخے کی عکسی اشاعت ہی لازم تھی۔

(۳) **دیوان موبد** دنیا میں تنہا پایا جانے والا نسخہ ہے (جس کا تنقیدی ایڈیشن بھی لائبریری کے زیر ترتیب تھا)۔ موبد سنسکرت، فارسی، پہلوی، دساتیری، کشمیری، اوڑیا، گجراتی اور پنجابی زبانوں سے واقف تھا، انہیں اپنے دیوان میں استعمال بھی کیا اور پھر اپنا دیوان کتابت کے لئے کسی ایسے کم سواد کو دے دیا جس نے اس ہفت زبان شاعر کے کلام کی قراءت کو مزید دشوار بنا دیا۔ لائبریری والوں کا بیان ہے کہ ہندوستان کے ڈیڑھ دو درجن منتخب روزگار فارسی اسکالر اسکے دشوار گزار مقامات کو حل کرنے کے لئے تین چار بار یکجا ہوئے، اجتماعی طور پر اسے پڑھا گیا اور پھر بھی جا بجا مسئلے لاینحل رہ گئے۔ امید ہے تنقیدی ایڈیشن نکلنے تک یہ حل ہو چکے ہوں گے۔ اس دیوان کی ایک اور اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ دبستان مذاہب کے مصنف کا کلام ہے۔ جو تقابلی مذہب پر دنیا کی اولین کتاب ہے۔ اس کی ایک عکسی اشاعت بھی لائبریری نے کر دی یہ دکھانے کے لئے کہ اس سے زیادہ مشکل اور دشوار گزار مخطوطے دنیا میں کم ہی ہوں گے اور اس امر کے لئے بھی کہ جب اس کا تنقیدی ایڈیشن نکلے تو اہل نظر اس میں، اصل کو سامنے رکھ کے ضروری ترمیم و اضافہ کر سکیں۔ ایک اور اسکی اہمیت یہ ہے کہ دبستان مذاہب اور اس دیوان، دونوں کی موجودگی میں، موبد عہد مغلیہ کی دانشوری کا نقطۂ عروج نظر آتا ہے۔

(۴) **سیف الدین باخرزی** کی رباعیات کا ایک قدیم نسخہ لائبریری میں مدت سے محفوظ چلا آتا تھا۔

اور زمانے تک خیال یہ تھا کہ اسکا کوئی اور نسخہ دنیا میں وجود نہیں رکھتا۔ پھر سعید نفیسی کو ایک اور نسخہ مل گیا اور انہوں نے اس پر قابل قدر کام کیا۔ لیکن جب تک یہ منحصر بفرد محسوب ہوتا تھا، اس وقت امپیریل لائبریری کے ہدایت حسین اور خدا بخش کے فرزند صلاح الدین خدا بخش نے اسے مغربی دنیا تک پہنچانے کے لئے اصل فارسی کے ساتھ انگریزی میں پیش کر دیا تھا۔ آزادی کے بعد جب خدا بخش لائبریری نے اپنے نئے پروگرام بنائے تو رباعیات باخرزی کا بھی اور پٹنہ نسخہ عکسی اشاعت میں شائع کیا۔ اس کے ساتھ ہی ہدایت حسین اور صلاح الدین کی ایڈیشن کو بھی شامل کر لیا، سعید نفیسی کو بھی، اور قاضی عبد الودود کی تحقیقات کو بھی۔ یہ ادبی دنیا کے لئے ایک خوبصورت تحفہ تھا: اس بڑے بزرگ سیف الدین کی یادگار، جس کے لئے علامہ اقبال نے کہا تھا:

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے ۔۔۔ پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

(۵) اکبر کے عہد میں نوشتہ تاریخ الفی کا ایک نیا ایڈیشن اکبر کے حکم سے، غالباً ابو الفضل کی نگرانی میں، تیار ہوا جس میں دربار اکبری کے سب سے بڑے مصوروں کی بنائی ہوئی سو سے زیادہ تصاویر نے اس نسخے کو دنیائے مصوری کا تاج محل بنا دیا۔ علمی دنیا میں ہندستان کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ اس ملک میں تاریخ خاندان تیموریہ کا مصور نسخہ محفوظ ہے، جس کی تصاویر سولہویں صدی کے عظیم ترین مصوروں کا کارنامہ ہیں۔ خدا بخش نے جزوی طور سے مصوری کے اس شاہکار کو عکسی ایڈیشن میں شائع کر دیا جس کا مختصر تعارف لکھنے کی سعادت ہمیں حاصل ہوئی۔ خدا بخش لائبریری نے ہمارے مرتبہ چند مزید نوادر بھی عکسی اشاعت میں شائع کئے جن میں ایران کے علامہ احمد بہبہانی (م ۱۸۱۹) کا سفرنامہ ہند "مرآۃ الاحوال"، اور مورخ کرم علی کا مظفر نامہ۔ تاریخ بہار و بنگال (۱۷۷۲ء) اور علی ابراہیم خاں خلیل کی، معاصر تاریخی دستاویزیں، بعنوان سوانح سلطان حیدر علی، اور سوانح مہاراجہ چیت سنگھ (اٹھارویں صدی کا آخری ربع) کے اصل مخطوطات کے عکس، ان کے ترجمہ اور ضروری تعارف و تحشیہ کے ساتھ شامل ہیں۔

سوانح حیدر علی کے عنوان سے تاریخ ہند کے اہم معاصر، معتبر، چشم دید احوال کا ترجمہ اور تعارف مع اصل مخطوطہ کے عکس، کے، علمی دنیا کے سامنے پہلی بار لایا گیا (تدوین: ڈاکٹر شائستہ) یہ وہ نادر تاریخی دستاویز ہے، جو اب تک سلطان حیدر علی اور میسور کی تاریخ لکھنے والوں نے استعمال نہیں کی۔

اسی طرح سوانح چیت سنگھ، بنارس کے آخری آزاد حکمراں راجا چیت سنگھ کے بارے میں، تاریخ ہند کے اہم معاصرانہ معتبر ترین، چشم دید احوال کا ترجمہ اور تعارف مع اصل مخطوطہ کے عکس کے علمی دنیا کے سامنے پہلی بار لایا گیا۔ (تدوین: ڈاکٹر شائستہ) یہ وہ نادر تاریخی دستاویز ہے، جو اب تک بنارس کی تاریخ لکھنے والوں نے استعمال نہیں کی۔

لائبریری میں جو دوسرے اہم مخطوطات منحصر بفرد تھے، ان کی ترتیب کی طرف بھی توجہ کی گئی اور ایسے نوادر بھی تدوین کے لئے منتخب ہوئے جن کا ایک آدھ نسخہ دوسرے ذخیروں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس ذیل میں تاریخ، تذکرہ، شاعری اور تصوف کے نادر نسخوں سے لائبریری نے کام کا آغاز کیا۔ بارہویں صدی کے شعرائے معاصر کے تذکرے ایڈٹ ہو کے شائع کیے گئے جن میں تذکروں میں نقش علی کا باغ معانی، سراج الدین علی خان آرزو کا مجمع النفائس، علی ابراہیم خان کا صحف ابراہیم، موہن لال انیس کا "انیس الاحبا" وغیرہ شامل ہیں۔ شاعری میں دیوان عرفی شیرازی، دیوان اظہر علی آزاد کاکوروی، دیوان مظہر اور مثنوی تصویر محبت (شمس الدین فقیر کی فارسی مثنوی جو میر کے شعلۂ عشق کا ماخذ ہے) اور تصوف میں انیس الطالبین: ملفوظات واحوال خواجہ بہاؤالدین نقشبند (م ۱۳۸۹ھ) مرتبہ صلاح بخاری (م ۱۳۸۳ھ) اور گلزار ابرار (محمد غوثی) تذکرہ صوفیا وعلما ۱۳ ـ ۱۷ صدی عیسوی وغیرہ شامل ہیں۔ مزید برآں لغت ترکی وفارسی (نسخہ خدابخش (ترتیب: دل آرام فیض اللہ قیری کرامت) مجمع الافکار، تاریخ ہند عہد وسطیٰ (ڈاکٹر اقتدار حسین صدیقی) سیرت فیروز شاہی (نسخہ خدابخش (تعارف: پروفیسر سید حسن عسکری) بھی لائبریری کی فارسی کارناموں میں قابل ذکر ہیں

اوپر مذکور منظم، مرتب، اور پلان کے تحت، پانچ چھ اقسام کے جو بڑے کام خدابخش لائبریری نے انجام دیے، ان کے علاوہ متفرق میدانوں میں بھی، فارسی شعروادب پر اہم کام ہوتے، ان میں:

رومی کے زبان زد اشعار پر بہت تحقیقی کام سامنے آیا۔ بجا طور سے یہ کام نواب رحمت اللہ خاں شیروانی ہی کر سکتے تھے۔ جس کے لیے سارے چھ دفتروں کو کھنگھالنا پڑا ہوگا۔ اسی ذیل کا ایک کام شیروانی صاحب کے ذریعہ لائبریری نے اور بھی کرایا یعنی فارسی کے وہ ورد زبان اشعار جن کے صحیح مالک کا پتا اکثر گم رہا ہے، ایسے اشعار کو ان کے مالک کی ملکیت میں از سر نو لے آنا تحقیقی کام تو تھا ہی، ایک نیک کام بھی ہوگیا۔ یہ کتاب آوارہ گرد اشعار، خدابخش لائبریری کی ایک اہم اشاعت ہے۔

قاضی عبدالودود کا فارسی کے اہم محققوں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے تحقیقی مقالات کا ایک مجموعہ فارسی شعروادب کے نام سے لائبریری نے شائع کیا جس میں نوعی خبوشانی وغیرہ پر اہم مضامین ہیں۔ قاضی صاحب کی ایک اور کتاب بھی لائبریری نے شائع کی جس کے مطالعہ سے فارسی لغات، دساتیری، پہلوی اور قدیم فارسی زبانوں کی بہت سی گتھیوں اور تاریخ ہند وایران کے کئی پیچیدہ مرحلوں کا حل نکل آتا ہے۔ یہ بڑا کام دلچسپ بات ہے کہ عظیم المرتبت شاعر مرزا غالب کے بہانے انجام پایا، قاضی صاحب کے اس کارنامے کا نام ہے غالب بحیثیت محقق۔ اصل میں قاضی صاحب نے بڑی جستجو اس امر میں کرنے

کے بعد کہ دساتیری زبان ایک جعلی زبان ہے، (جسے بڑی ذہانت اور چابک دستی سے آذر کیوان نے اکبر کے زمانے میں ایجاد کیا تھا اور خود ہی اس کا لغت بھی لکھا تھا) ثابت کیا کہ، غالب دھوکہ کھا گئے اور اسے پہلوی سے بھی قدیم تر زبان سمجھنے لگے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے قاضی صاحب لغت وفرہنگ کے بہت سے اسرار ورموز وا کر گئے ہیں۔ یہ بھی لائبریری کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ قاضی صاحب کی ایک اور اہم کتاب جو زباں شناسی کے عنوان سے لائبریری نے شائع کی ہے، اس میں (۱) حافظ اور ذال فارسی (۲) فرہنگ ابوحفص سغدی (۳) مجمع الفرس (۴) بازکتب فارسی کے مستعملہ مفردات ومرکبات (۵ مخطوطات ومطبوعات) جیسے اہم موضوعات شامل ہیں۔

عہد سلطنت کے مشہور شاعر مسعود بک کی ایک کتاب بھی لائبریری کے علمی سیمناروں میں دریافت ہوئی جو اس وقت تک عین القضاۃ ہمدانی سے منسوب تھی، اور جس کے نسخے عام طور سے نہیں ملتے۔ یہ کتاب خیالات عشاق بھی لائبریری نے شائع کردی ہے۔

بنارس کے مہاراجہ چیت سنگھ کے بارے میں ایک معاصر دستاویز کے عکسی ایڈیشن کا ذکر اوپر آچکا ہے، بنارس پر ایک مزید کتاب بھی لائبریری نے شائع کی جس میں لگ بھگ پونے دو سو مکاتیب کا ترجمہ و تعارف ہے، جو اٹھارویں صدی کے آخری ربع میں صاحب صحف ابراہیم کے نام لکھے گئے یا انھوں نے دوسروں کو لکھے۔ لائبریری میں محفوظ ان نادر مکاتیب کے مجموعے میں اس وقت کے ہندوستان کے سارے بڑے یکجا ہوگئے ہیں: گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز بھی ہیں، مغل شہزادہ جہاندار شاہ، آصف الدولہ، حسن رضا خان وزیر اعظم اودھ، امیر الدولہ (نائب دوم آصف الدولہ)، مختار الملک، (شاہ عالم کے ماموں)، محمد رضا خان مظفر جنگ (مرشدآباد)، تفضل حسین خان علامہ، حکیم شفائی خان، شاہ غلام علی، میر قمرالدین منت اور شاہ محمد اجمل الہ آبادی بھی، مادھو راؤ سندھیہ، مہاراجہ اودے پور، مہاراجہ رن بہادر ساہ (نیپال)، مہاراجہ بھونسلے، مہاراجہ بونڈی، مہاراجہ بندیلکھنڈ، بالاجی راؤ دکھنی، اہلیہ بائی (مہارانی مالوہ)، بھاؤ بخشی، راجہ چیت سنگھ (بنارس) اور مہاراجہ پورنیہ، جیسے اکابرین بھی!

اٹھارویں صدی کے یہ اہم ترین ۱۷۳ مکاتیب (تدوین وترجمہ: ڈاکٹر شائستہ) جو علی ابراہیم خاں نے بنارس میں بیٹھ کر اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کے شعراء وادباء، امرا ونوابین، شہزادگان ہند اور گورنر جنرل (Warren Hastings) اور دیگر صاحب اقتدار انگریز صاحبان کے نام لکھے، اس عہد کی ادبی، سماجی، معاشرتی، سیاسی اور معاشی ومذہبی احوال پر روشنی ڈالتے ہیں۔ خاص کر چونکہ یہ خطوط علی ابراہیم نے بنارس سے لکھے تھے جب وہ وہاں کے چیف جوڈیشل مجسٹریٹ تھے، اس لئے بنارس اور اہالیان بنارس، اور خصوصاً وہاں کے مندروں کے انصرام کے بارے میں سند رکھتے ہیں۔

فرہنگ زفان گویا فارسی لغت کا منحصر بفرد نسخہ خدا بخش میں محفوظ تھا، جس کا تفصیلی تعارف فارسی کے مشہور اسکالر پروفیسر سید حسن نے کرایا۔ بعد ایک اور نسخہ روس میں بھی دریافت ہو گیا، جس کی مدد سے ڈاکٹر نذیر احمد نے اسے مرتب کیا۔ اور اس طرح خدا بخش کو اہم ترین فارسی لغات میں ایک اور اضافہ کر دینے کا موقعہ میسر آ گیا۔ یہ دو جلدوں میں چھپا ہے۔

مخطوطات سے منسلک لائبریری کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ مخطوطات کے آخر میں کاتب یا دوسروں کے قلم سے جو اختتامی عبارتیں لکھی ہوتی ہیں، اور جو اکابر کی مہریں ہوتی ہیں اور جو عرض دیدے ہوتے ہیں، ان کی قرار واقعی اہمیت پر خوب اطمینان سے ماہرین کی گفتگو ہو۔ خدا بخش لائبریری نے اس کا اہتمام کیا کہ شرکاء سیمینار اپنے اپنے ذخیروں سے اپنی اپنی پونجی جمع کر کے لائیں اور سب نے پتے کھول کے رکھ دئے۔ بہت اچھی بحث ہوئی جو نتیجہ خیز بھی تھی۔ سارے ذخیروں پر مشتمل، دستاویزات کا یہ مجموعہ بھی لائبریری نے ترقیمے، مہریں اور عرض دیدے کے نام سے شائع کر دیا ہے۔

تاریخ منازل بخارا، کا وسط ایشیا کا سفر نامہ جو حافظ محمد فاضل خاں نے ۱۸۱۳ء میں ترتیب دیا اور اقتدار حسین صدیقی صاحب نے ازبک، وسط ایشیا مخطوطات سیمینار کے دوران پیش کیا، یہ اس زمانے کی وسط ایشیا کی تاریخ اور تہذیب کے لیے ایک اہم ماخذ ہے۔

تاریخ بہار و بنگال (سدۂ ہیجدہم) کے عنوان سے کرم علی کی مشہور تصنیف مظفر نامہ (تدوین و ترجمہ: ڈاکٹر شائستہ) کی صورت میں ایک اہم معاصر تاریخ کی اشاعت بھی قابل ذکر ہے۔ کرم علی کی تاریخ کی یہ اہمیت ہے کہ مصنف ناظمان بنگالہ کے گھر کا گویا ایک فرد تھا، اور اس لحاظ سے یہ ۱۸ ویں صدی کے نصف آخر کی معتبر ترین تاریخ ہے۔

ایک اور اچھا کام بھی ہوا۔ تحقیق و تدوین کے مخاطب مخصوص لوگ تھے جن کے لئے لائبریری نے بہت کچھ کیا مگر عمومی مخاطبین میں فارسی ادب کی آگہی پھیلانے کے لیے بھی کچھ راستوں کی تلاش ضروری تھی: خدا بخش نے اس کے لیے راستہ نکالا اور خدا بخش خطبات کا ایک سلسلہ شروع کیا جس کے تحت، فارسی ادب کے اہم موضوعات پر اکابر کو دعوت سخن دی جاتی رہی، اس ذیل میں فارسی کے متعدد بڑوں کے اہم خطبات لائبریری نے شائع کیے: ان میں قاضی عبد الودود کا خطبہ دساتیر پر، پروفیسر نذیر احمد کا خطبہ فارسی اور ہندستان، پرنسپل عبد السلام خاں کا خطبہ افکار رومی پر، بروس لارنس کا خطبہ صوفی لٹریچر عہد سلطنت میں، پروفیسر سید حسن عسکری کا خطبہ صوفیا کے ملفوظات و مکتوبات: سماجی سیاسی تاریخ کا ایک اہم ماخذ: ڈاکٹر ضیاالدین ڈیسائی کا فارسی ملفوظاتی لٹریچر میں ۱۵ ویں صدی کا وسط ہند: پروفیسر امیر حسن عابدی

کا خطبہ فارسی ادبیات میں ہندستان کا حصہ جدید تحقیقات کی روشنی میں: پروفیسر عطا کاکوی کا خطبہ، بیدل اور ان کے نکات: اور ڈاکٹر سید نور محمد اکیلوی کا خطبہ فارسی زبان میں سکوں پر اشعار، اور ان کا پس منظر (گجرات، کشمیر، عادل شاہیاں، قطب شاہیاں، شاہان مغلیہ، سلطان سلاطین میسور، حاکم اودھ، سکھ حکمراں، ٹونک، جودھ پور: ایران، افغانستان) قابل ذکر ہیں۔

خدا بخش کے فارسی نوادر پر اردو میں، پروفیسر سید حسن، (ترتیب: دیوان صائب ہروی و دیوان مظفر حسین ثنی وغیرہ) پروفیسر عطا الرحمان عطا کاکوی (سفینۂ خوشگو اور کئی مزید تذکروں کی تدوین) پروفیسر حسن عسکری صاحب، اور قاضی عبد الودود (جس سے اوپر مجموعہ ہائے مقالات) نے بیش بہا تحقیقی کام انجام دئے۔ عسکری عبد الودود کا جو اردو مجموعہ مضامین ہندستان کے عہد وسطی کا مقالات کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں (۱) تاریخ کشمیر کے قلمی نسخے (۲) جارج نامہ ملا فیروز (گویا جدید شاہنامہ) (۳) ظفر نامہ، عالم گیری (۴) نسخہ دل کشا: احوال عالمگیری (۵) نسخہ مفید الانشا (۶) مخدوم بہار کے لطائف و مکاتیب (۷) حضرت حسام الدین، ۱۵ویں صدی کے چشتی بزرگ (۸) گنج فیاضی: خانوادہ رشیدیہ کے ایک بزرگ کا ملفوظ (۹) دیوان نانک شاہ (۱۰) دیوان سید راجا جیسے فارسی ادب پر تحقیقی مقالے شامل ہیں۔

قاضی عبد الودود کی دساتیر پر قیمتی تحقیق، عطا کاکوی صاحب کی بیدل پر کتاب اور نکات بیدل کا ترجمہ: اور پروفیسر مخفوظ الحق کی دیوان کامران نسخہ خدا بخش، کی تدوین اور دوسرے تحقیقی مقالے فارسی ادبیات میں اہم اضافے ہیں (تدوین دیوان کے سلسلے میں ڈاکٹر ہادی حسن کی دیوان ہمایوں نسخہ خدا بخش کی ترتیب بھی قابل ذکر ہے) مگر انگریزی میں خدا بخش فارسی نوادر پر سب سے اہم کام پروفیسر سید حسن عسکری نے انجام دیا جن کے سات آٹھ مجموعے تصوف و تاریخ پر، فارسی مخطوطات کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ ان مجموعوں میں ایک مکمل کتاب امیر خسرو پر خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ عسکری صاحب کے ایک اور انگریزی مجموعہ میں (۱) عہد وسطی میں بہار میں تصوف لٹریچر (۲) ملفوظات، کی اہمیت سماجی تاریخ کے لیے: جون پور اسکول کی گنج رشیدی (۳) عوفی کی جوامع الحکایات جیسے اہم موضوعات شامل ہیں۔

پٹنہ (یا یوں کہیے کہ چھپرہ، سیوان) کے خدا بخش (۱۸۳۹-۱۹۰۸) نہ نواب رام پور تھے نہ نواب سالار جنگ! پھر بھی انہوں نے نوابانہ ذخیروں سے زیادہ وقیع، زیادہ بڑا قلمی ذخیرہ جمع کر لیا تھا جو مشرقیات کی علمی دنیا میں ہندوستان کی پہچان بن گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ خدا بخش نے ایک قابل قدر لائبریری ہی نہیں بنائی بلکہ لعل و جواہر سے زیادہ قیمتی

قلمی کتابوں کے ذخیرے کو اپنی ذات تک محدود نہ کر کے، قوم کے نام وقف کر دیا۔ یہ اور بھی بڑا کام تھا جس کی دوسری مثال برصغیر میں اور کہیں نہیں ملتی۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنی ساری جائداد اور محنت کی کمائی کا ایک ایک پیسہ بھی لائبریری کی نذر کر دیا۔

تیسرے یہ کہ بہت سے نادر قلمی ذخیروں کے مالکوں کے برخلاف، خدا بخش خود بھی صاحب علم تھے۔ اور جو کچھ کتابی زر و جواہر انہوں نے جمع کیے، ان کی اہمیت اور عظمت سے وہ پوری طرح واقفیت بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے ذخیرے کی تمام کتابوں کا ایک تفصیلی کیٹلاگ بھی تالیف کیا تھا جس میں مصنفوں اور تصانیف کے بارے میں ضروری واقفیت بہم پہنچا دی ہے۔ خدا بخش خاں کی یہ تالیف پہلی بار اٹھارہ سو چھیانوے کے آس پاس شائع ہوئی۔

یہ کارنامہ فارسی زبان و ادبیات کے میدان میں خدا بخش لائبریری کا پہلا تحفہ شمار ہو سکتا ہے۔ مشرق میں فہرست کے مخطوطات کے فن میں یہ ایک تاریخ ساز اقدام تھا، خدا بخش اس وقت حیدر آباد میں چیف جسٹس تھے جب یہ کتاب ترتیب پائی۔ اسی لیے اس کا انتساب اس وقت کے نظام دکن میر محبوب علی خاں کے نام کیا، اور اسی نسبت سے کتاب کا نام بھی ''محبوب الالباب فی تعریف الکتب والکتاب'' رکھا۔ (محبوب الالباب بار دگر خدا بخش لائبریری نے ۱۹۹۱ء میں شائع کی۔ اس اشاعت ثانی کے موقع پر اشاعت اول کے بارے میں سہواً یہ جو لکھا گیا کہ یہ پہلی بار اٹھارہ سو اٹھانوے کے آس پاس شائع ہوئی، اسے انیس سو چھیانوے کے آس پاس کہنا درست ہوگا، جیسا کہ ترقیمہ کی عبارت سے ظاہر ہے، جو یوں ہے: اٹھارہ

''بعون اللہ الملک الوہاب این کتاب فوائد انتساب در مطبع مفتنی
واقع بلدہ حیدر آباد فرخندہ بنیاد، حرسہا اللہ عن الشرور و الفتن،
بکتابت میر تصدق حسین بشہر ذی الحجہ ۱۳۱۴ ہجری نبوی تکلیہ طبع
محلی گردید''۔

یعنی حیدر آباد دکن ہی کے مطبع مفتنی سے اس کی طباعت (واشاعت) ہوئی۔ اس تالیف کو خدا بخش لائبریری کی پہلی توضیحی فہرست یا آنے والی بیالیس انگریزی فہرستوں کا نقیب بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ خدا بخش نے اپنی اس قابل قدر تالیف میں جو وضاحتی طور اختیار کیا ہے اس کی اہمیت کا اندازہ کرانے کے لیے ایک مثال ملاحظہ ہو:

دیوان کمال خجند: نسخۂ قدیم، کاغذ ہندی، بخط نستعلیق خفی، پاکیزہ نوشتہ: کتابتش بردست شخصی مسمی محمد طاہر در سنہ ثمان و تسعین و تسعمائۃ صورت اتمام یافت۔ اگرچہ نسخہ از تکلفات ظاہری معرا است مگر نظر بحالت خط خیلی خوشنما است۔ تخمیناً بست و پنج جزو باشد۔ خوش تقطیع است۔ شیخ کمال خجندی از اکابر عصر خود

بود۔ در حالت اوائل عالم دو مذہب دارند: بعضی گویند از اولیا است و بعضی گویند از شعرا۔ شیخ در اکثر اوقات بریاضات مشغول بود۔ و تجرد او بہ مرتبہ رسیدہ بود کہ، بعد از فوت او در حجرہ اش غیر بوریای و سنگے کہ بزیر سری نہاد، چیزی نیافتند۔ رتبہ شاعریش بغایت بلند نیست، چنانکہ مولانا جامی فرمایند:

دو کمال اند در جہان مشہور یکے از اصفہان یکی زخجند
آں یکی در غزل عدیم المثل وان دگر در قصیدہ بی مانند
درمیان کمال این دو کمال نیست فرقی مگر بہ موئی چند

شیخ در تبریز رخت اقامت افگند، مدتہا بہ آنجا معتکف بود تا بجرای باقی شتافت۔ سلطان ابوالبقا ابوالحسن وفات او در سنہ ہشت صد و ہشت نوشتہ و ملا ادعدی بلیانی در سنہ ہفت صد و نود و دو یافتہ، تفاوت شانزدہ سال است: واللہ اعلم۔

مطلع دیوان شیخ این است:

ای باد کش طرۂ جانانہ مارا زنجیر مجنبان دل دیوانہ مارا

خدا بخش لائبریری نے فارسی زبان و ادب کے میدان کی جو سب سے نمایاں خدمت انجام دی ہے وہ انگریزی زبان میں اس کی چالیس سے اوپر جلدوں پر مشتمل فارسی (اور عربی) مخطوطات کی وہ وضاحتی فہارس ہیں جن کی مثال مشکل سے ملے گی۔ آج تک کی تاریخ میں کسی ادارے یا کسی فرد کی طرف سے اس فن میں ایسا جامع و مکمل، ایسا وقیع و وسیع اطلاعاتی مراجعتی کام شاید ہی دیکھا یا سنا گیا ہوگا جس کی افادیت آج کی تاریخ تک ایسی ہی ہے جیسی اول دن تھی۔ بلکہ اس عہد میں تو پھر بھی زبان داں، مضمون داں اور رسم خط کو سمجھنے والے عام طور پر مل جایا کرتے تھے، جبکہ آج ان کا فقدان ہوتا جا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ طلبہ کو اس بات کی تربیت و ترغیب دی جائے اور بتایا جائے کہ وضاحتی فہرست اس طرح مرتب کی جاتی ہے۔ ایک ایک نسخے کے لیے کئی کئی گھنٹے اور بعض اوقات کئی کئی دن، ہفتے، مہینے لگانا پڑتے ہیں تب جا کر ایسے کام وجود میں آیا کرتے ہیں۔

اس میدان میں اس طور کے کام انجام دینے کے لئے، اور ایک نمونہ ٹھہرانے کے واسطے یہ ایک اہم کام ہے۔ خدا بخش لائبریری نے اپنے فارسی خزائن کے بارے میں اسکالروں تک ساری ضروری اطلاعات، گویا ان کے گھر بیٹھے پہنچانے کا جو بیڑہ بردست بند و بست کیا، تو اس کے ساتھ ساتھ ایک مددگار کام اور بھی کر دیا، وہ یہ کہ چار جلدوں پر مشتمل، فارسی زبان میں، اپنے فارسی مخطوطات کا ایک سطری تعارف بھی کرا دیا تاکہ اگر کسی کو، اپنے موضوع پر تفصیل سے کھوج میں جانے کی ضرورت یا فرصت نہ ہو، تو وہ

آدھے ایک منٹ میں اپنے مطلوبہ نسخے کے بارے میں ضروری اطلاعات تو حاصل کر ہی سکے۔ اس ہینڈلسٹ یا مختصر فہرست کو لائبریری نے چار جلدوں میں مرآۃ العلوم کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ اچھا کام ہوا کیوں کہ ان چاروں مجلدات میں خدا بخش کا سارا فارسی ذخیرہ سما گیا ہے، جب کہ دوسری طرف انگریزی زبان میں فارسی مخطوطات کا تفصیلی تعارف ہنوز جاری ہے جسے شروع ہوئے ایک سو سات برس ہو چکے ہیں؛ اور اب تک بیالیس مجلدات شائع ہو چکے۔ چھ سات مجلدات ابھی شائع ہونا باقی ہیں۔

خدا بخش نے اپنے ذخیرے کا تعارف ہندوستان سے باہر کے ملکوں میں کرانے کے لیے بجا طور سے یہ حکمت عملی تیار کی کہ ان نوادر کا وضاحتی کیٹلاگ انگریزی زبان میں تیار کرایا جائے؛ جس کے لیے برٹش میوزیم ۱۸۷۹ء، ۱۸۹۵ء، ۱۸۹۹ء اور انڈیا آفس لائبریری ۱۹۰۳ء کے کیٹلاگ ان کے لیے نمونہ کا کام دے رہے تھے۔ لارڈ کرزن جو اس وقت وائسرائے تھے، ایرانی تاریخ اور ایرانی تہذیب و علوم سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ ایران پر ان کی خود اپنی مشہور تصنیف کلاسیک کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے۔ خدا بخش کے ذوق اور شوق، دونوں کے وہ قدردان تھے۔ ان کی لائبریری کو ۱۹۰۳ء میں وائسرائے کی وزٹ سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ لارڈ کرزن نے اس وقت کی امپیریل لائبریری کلکتہ (آج کی نیشنل لائبریری) کے ایڈوائزر اور مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل، سر ڈینی سن راس کے سپرد یہ کام کر دیا کہ وہ خدا بخش لائبریری کا توضیحی کیٹلاگ اپنی نگرانی میں تیار کرائیں۔ ۱۹۰۲ء میں یہ عظیم الشان کام شروع ہو گیا۔ خان بہادر عبد المقتدر فارسی فہرست سازی کے سربراہ مقرر ہوئے (اور ڈاکٹر عظیم الدین احمد عربی کے)۔ انگریزی زبان میں اتنا وسیع، وقیع اور جامع کیٹلاگ نہ اس وقت وجود رکھتا تھا اور نہ ۲۰۱۱ء تک کوئی اس قد کو پہنچ سکا ہے۔

خدا بخش کے اپنے تالیف کردہ کیٹلاگ بہ زبان فارسی موسوم بہ ''محبوب الالباب فی تعریف الکتب والکتاب'' کے بعد انگریزی میں یہ چالیس جلدوں سے اوپر ضخیم فہرست علمی دنیا کو خدا بخش، لارڈ کرزن، سر ڈینی سن راس کا مشترک تحفہ، فارسی علوم اور ادبیات دونوں کے لیے ایک یادگار کارنامہ ہے جو ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ صرف اس کام کی وقعت اور کیٹلاگ کرانے کا رکی عظمت کا قرار واقعی اعتراف ہوا، اور بجا طور سے عبد المقتدر کو خان بہادر کا خطاب ملا۔ اس عظیم کام کے مشتملات سے آپ بھی کچھ اندازہ کر سکیں گے کہ نام کو تو یہ ایک کیٹلاگ ہے لیکن محیط کل ہونے کی حیثیت سے اس نے علوم و ادبیات فارسی کا کتنا وسیع احاطہ کر لیا ہے۔

سائنس، تصوف، شاعری، تاریخ، (خصوصاً تاریخ ہندوستان) تذکرہ، لسانیات، لغات، طب، اور دائرۃ المعارف کے لیے الگ الگ مجلدات مرتب کیے گئے ہیں؛ بلکہ شاعری کے لیے تو ایک چھوڑ تین

تین مجلدات مختص ہیں، اور اسی طرح سائنس کے مخطوطات بھی کئی جلدوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دوسرے علوم میں قرآنیات، علوم حدیث، علم کلام، علم فقہ، تاریخ علوم وفنون، منطق، ریاضی، ہیئت، نجوم، رمل، تفاؤل و تعبیر رویا، ملٹری سائنس، داستان و قصص وغیرہ، غرض ہر وہ موضوع جو ہمارے بزرگوں کے زیر قلم و زیر تکمیل رہا، اس پر قیمتی مخطوطات کا تفصیلی ذکر ان مجلدات میں محفوظ ہے۔

ہر مخطوطے کا تعارف اتنی تفصیل سے اور ایسے تجزیاتی انداز سے کرایا جاتا ہے کہ اکثر و بیشتر تو اصل مخطوطے کو دیکھنے کی ضرورت سے بھی بے نیاز کر دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح ہر اسکالر صرف کیٹلاگ کو دیکھ کر اپنے متعلقہ نسخہ کے بارے میں پوری معلومات حاصل کر لیتا ہے۔ تعارف کرانے میں اوراق کی تعداد، فی صفحہ سطور کی تعداد، اور مخطوطے کا ناپ یعنی طول و عرض دینے کے بعد مصنف کا نام مع باپ دادا کے نام دیا جاتا ہے۔ پھر نسخہ کے آغاز کی عبارت درج کی جاتی ہے، تاکہ ہمیشہ کے لیے (اگر خدانخواستہ نسخہ ادھر ادھر ہو جائے) اور ہر کہیں کے لیے اس کی شناخت متعین ہو جائے۔ اس کے بعد تفصیلی حصہ شروع ہوتا ہے یعنی مصنف کا احوال اور کتاب کے متعلق تفصیلات دینے کے بعد، کتاب کے مشتملات/ابواب کے بارے میں تفصیل ہوتی ہے، جس سے کتاب کا سیر حاصل تعارف ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب کسی اور ذخیرے میں بھی دستیاب ہو تو اس کا حوالہ بھی دے دیا جاتا ہے۔ پھر کتابت کی تفصیلات دی جاتی ہیں، کہ خط نستعلیق ہے یا نسخ یا ثلث یا شکست وغیرہ؛ کاتب کا نام اور اسکا واجبی تعارف، سال کتابت اور کتاب کا تتمہ دے دیا جاتا ہے جو اکثر اسی نسخہ کے کاتب ہی کے قلم سے ہوتا ہے۔ آخر میں، اگر کتاب میں دوسروں کے قلم سے کچھ یادداشتیں یا نوٹ ملتے ہیں، یا کچھ مہریں لگی ہوتی ہیں تو ان کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ اور اس طرح مکمل نسخہ پڑھنے والے کے سامنے آئینہ ہو جاتا ہے۔

ان فہرستوں کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لئے مثلاً فارسی شاعری کو لیں تو اس میں مندرجہ ذیل مخطوطات رشاعروں پر آپ کو اعلی درجہ کی ریسرچ کئے ہوئے کئی درجن گویا تحقیقی مقالات مل جائیں گے۔ فارسی شاعری کے یہ نوادر تین جلدوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پہلی جلد عہد فردوسی سے عہد حافظ تک یا دوسرے لفظوں میں محمود غزنوی سے تیمور تک کے عہد کے شعرا کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں ۳۶ شعرا کے نادر کلام اور ان کے احوال سے بحث ہے۔

دوسری جلد میں ان شعرا کا ذکر ہے جو ایران، توران میں ۱۵ ویں اور ۱۶ ویں صدی میں بام شہرت پر تھے۔ اس جلد میں ۳۸ شعرا مذکور ہیں۔

تیسری جلد ان شعرا کا احاطہ کرتی ہے جو ایرانی ہندوستانی ہیں اور، جو ۱۷ ویں، ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی میں داد سخن دے رہے تھے۔

ان تین جلدوں میں جن قلمی نسخوں کا بیان کیا گیا ہے، ان کا یہاں ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ جلد اول میں:
شاہ نامہ، خلاصہ شاہنامہ، منتخب رام نراین، یوسف زلیخا، دیوان منوچہری، رباعیات عمر خیام، حدیقۃ الحقیقہ، منتخب حدیقہ، لطائف الحدائق من نفائس الدقائق، دیوان سنائی، دیوان احمد جام، دیوان نوری، دیوان مختاری، دیوان خاقانی، قصائد انوری، کلیات خاقانی، تحفۃ العراقین، شرح دیوان خاقانی، دیوان ظہیر فاریابی، خمسہ نظامی، مخزن الاسرار شامل ہیں۔

جلد دوم، حسینی کے شہنشاہ نامے سے شروع ہو کر کلیات حسرت پر ختم ہوتی ہے۔

اس دوسری جلد میں جن شعراء کا احاطہ کیا گیا ہے ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:
حسینی، یوسف گدا، کمال خجندی مغربی، قاسم انور، نعمت ولی، کاتبی، (محمد بن عبداللہ نیشاپوری)، عارفی هروی شاہی (امیر آقا ملک)، رشید، ابن حسین، جامی، رگی، ہمایوں (امیر) بنائی، کمال الدین، فغانی، آصفی (قطب الدین)، ہاتفی، نجی لاری، ہلالی، لسانی، اہلی شیرازی، میرم سیاہ، شریف تبریزی، حیدر کلوچ، کامران (مرزا) ہجری، وحشی، ارسلان، شنائی، عرفی، صیدی، عراقی، محتشم، شرف جہاں قزوینی بہلول شاہ، بیرام سقا۔

تیسری جلد میں جن شعرا کا بیان ہے وہ اس طور سے ہیں:
مجری، صاحبی، ولی، علی نقی کمرہ ای، نوعی خبوشانی، مومن حسین، جعفر، ناظر، ترابی، زلالی، وصلی، ظہوری، قسیم، حبیب بہاؤ الدین، طالب آملی، یزدی، شفائی، محمد صوفی، روح الامین، جلال اسیر، فصیحی، سلیم تہرانی، ولی محمد، کلیم، قدسی تھانیسری، مسیح، حاذق، ملا شاہ، احسن، کاشی، ظفر، اغنی، نظام، عظیم، رفیع، بینش، صائب تبریزی، مجذوب کرمانی، معز فطرت، شوکت بخاری، راسخ، عاقل خاں رازی، ناصر علی سرہندی، تسلیم، وحید، اشرف، غنیمت کنجاہی، جویا کشمیری، نعمت خان عالی، خالص، آزاد، شہرت، خادم، ثابت، برہان، انجب، امید، حسینی، آرزو، آزر، مشتاق، شمس الدین فقیر، علی حزیں، فقیر، عاشق، فوقی، طوفان، ملا شاہ، عسکری، رضا، فاخر مکیں، موجود، خاموش، مسکین، قائل، حشمت، غلام علی قانع، غالب، ولایت، حافظی، نصر، حسرت عظیم آبادی۔

فارسی شاعری کے مخطوطات پر ضروری اطلاعات فراہم کرتے ہوئے فاضل کیٹلاگر نے جس اعلی درجے کی تحقیق کا نمونہ پیش کیا ہے، اس کی کم سے کم ایک مثال دلچسپی سے خالی نہ ہوں گی:

دیوان حافظ:

مخطوطے کے بارے میں خط، زمانہ، تصاویر، اور مہریں عرض دیدے وغیرہ کی تفصیلات دینے کے بعد فاضل کیٹلاگر نے لکھا ہے کہ، یہ دیوان حافظ کا ۱۲۰۱ اوراق کا وہ نادر و نایاب نسخہ ہے، جس پر جہانگیر، ہمایوں اور شاہجہاں وغیرہ کی تحریریں موجود ہیں کہ جب یہ شاہان مغل کسی مہم یا مسئلے سے دوچار ہوتے تھے تو کس کس طرح دیوان حافظ سے فال نکالتے تھے۔ اس میں مختلف صفحات پر جگہ جگہ حاشیوں میں یادداشتیں لکھی ہوئی ملتی ہیں جو ہمایوں جہانگیر اور شاہ جہاں کی تحریریں ہیں۔ جو اس دیوان سے فال نکالنے کے بعد کسی کام کو عمل میں لانے اور اس کے نتائج درج کرتے رہے ہیں۔

مسلمان عام طور سے قرآن سے فال نکالتے رہے ہیں صوفیانہ کلام میں مثنوی مولانا روم کو بھی یہ درجہ حاصل رہا ہے، مگر درجہ کامل دیوان حافظ کو ملا۔ اس سلسلے میں کیٹلاگر نے جو تفصیل دی ہے وہ ۱۵ طویل سطور پر پھیلی ہوئی ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ مسلمانوں اور دیگر اقوام کا کس کس کتاب سے کیسے کیسے فال نکالنے کا رواج ان زمانوں میں رائج تھا۔ اس سلسلے میں دیوان حافظ نے مرجع خاص و عام کا مرتبہ حاصل کیا۔

حاجی خلیفہ کا بیان ہے کہ شیخ محمد الہروی نے ایک کتاب دیوان حافظ سے نکالی گئی فالوں پر لکھی، کہ کن کن مواقع پر کیسے کیسے فال نکالی گئی اور کیا کیا اشارے ملے اور ان کے کیا کیا نتائج رہے۔ حاجی خلیفہ نے یہ بھی لکھا ہے مولی حسین (جن کا انتقال ۱۵۷۲/۹۸۰ میں ہوا) نے ایک کتاب ترکی زبان میں لکھی ہے، جس میں حافظ کے ان اشعار کا ذکر ہے جن سے فال نکالی گئی، ساتھ ہی ان واقعات و حادثات کا بھی تفصیلی بیان ہے جو ان فالوں سے وابستہ رہے ہیں۔ (فالنامہ عنایت خان راسخ خود خدا بخش نے شائع کر دیا ہے)۔

پھر دیوان حافظ سے فال نکالنے کے مختلف طریقے رہے ہیں وہ مذکور ہیں ان میں اولیں اور بہت سہل طریقہ یوں ہے کہ اگر فال نکالنا ہو تو فال نکالنے والے لوگ، غزل کے پہلے شعر یا مطلع سے فال نکالتے ہیں، کچھ لوگ غزل کے پہلے شعر یا مطلع سے فال کچھ مطلع سے آگے ساتویں شعر سے فال نکالتے ہیں مہدی علی خان مصنف تاریخ نادری میں صفحہ ۲۶ پر لکھتے ہیں کہ ۱۷۲۹/۱۱۴۲ میں نادر شاہ دیوان حافظ سے فال نکالتا ہے اور مندرجہ ذیل اشعار برآمد ہوتے ہیں:

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گل بیز است	بہ بانگ چنگ مخور می کہ محتسب تیز است
عراق و فارس گرفتی بہ شعر خوش حافظ	بیا کہ نوبت بغداد و وقت تبریز است

دوسرے شعر کے مطابق نادر شاہ نے فارس اور بغداد کو فتح کیا، یہ غزل کا ساتواں شعر ہے۔
حافظ کو لسان الغیب بھی کہا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے۔ اس لقب کے سلسلے میں بھی کیٹلاگر نے تفصیلات دی ہیں۔ نتائج الافکار سے ایک واقعہ بھی بیان کرتے ہیں کہ: حافظ کے انتقال پر ان کی بظاہر گناہ گاری پر ان کے قریب آنے سے پرہیز کیا جا رہا تھا، تو یہ طے کیا گیا حافظ کے اشعار کو ٹکڑوں میں لکھ کر بکھیر دیا جائے، پھر ایک معصوم بچے سے ٹکڑا اٹھانے کو کہا گیا جس میں مندرجہ ذیل شعر درج تھا:

قدم دریغ مدار از جنازہ حافظ
کہ گرچہ غرق گناہست میرود بہ بہشت

تمام لوگوں نے، اس طرح نکالی ہوئی فال یا نشان دہی پر یقین کیا اور ان کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔ نتائج الافکار کا مصنف کہتا ہے کہ اسی دن سے حافظ کو لسان الغیب کہا جانے لگا۔

محمد گل اندام جو حافظ کا دوست اور معاصر تھا اور جس نے حافظ کے انتقال کے بعد اس کا دیوان ترتیب دیا ہے، اس کو اس طرح کے کسی لقب سے یاد نہیں کرتا ہے۔ ۱۴۳۱ء تک لسان الغیب ہونے کا یا کہلانے کا کہیں واضح ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ جامی نے نفحات الانس میں (۱۴۷۰ء ترتیب) حافظ کو لسان الغیب اور ترجمان الاسرار کے لقب سے یاد کیا ہے۔ اور اپنی دوسری تصنیف بہارستان میں بھی۔

تزک جہان گیری (سرسید ایڈیشن) میں جہاں گیر خود اس بات کو اس طور سے بیان کرتا ہے کہ بارہا اس نے کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کے سلسلے میں دیوان حافظ سے فال نکالی ہے۔ خود جہاں گیر کے الفاظ اس طرح ہیں:

...... از مطالب بدیوان خواجہ رجوع نمودہ ام و حسب اتفاق آنچہ برآمدہ نتیجہ مطابق همان کشیدہ، وکم است کہ تخلف نمودہ۔

اس قیمتی و نادر نسخے میں جو حاشئے پر اہم تحریریں رکھتا ہے اس میں ہمایوں اور جہانگیر نے وہ مواقع اور وجوہات اپنی تحریر میں بیان کیے ہیں کہ کن مواقع پر اس دیوان سے فال نکالی گئی۔

فاضل اسکالر کیٹلاگر کا بیان ہے کہ دوران مرمت دیوان کے حاشئے پر ہمایوں اور جہانگیر کے تحریر کردہ کچھ الفاظ کٹ گئے ہیں، ان کو مکمل کرنے کے لیے، محقق موصوف نے اکبر نامہ، منتخب التواریخ، تزک جہان گیری (۱۰۳۳/۱۶۲۳) تاریخ سلیم شاہی، اقبال نامہ جہانگیری (۱۰۳۷/۱۶۲۷) مآثر جہان گیری (۱۰۴۰/۱۶۳۰) مصنفہ کامگار حسینی، تاریخ ہمایوں (۹۹۵/۱۵۸۹) مصنفہ جوہر آفتابچی کو دیکھ کر تمام تحریروں کو مکمل کیا ہے۔

دیوان کے حاشیے پر درج تھا:

''ای نور چشم شاہ ...... شادیم امید کہ از تفرقہ امان آید''

فاضل کیٹلاگر نے لکھا ہے کہ یہ درست طور سے اس طرح پڑھا جائے گا

[بر] ای نور چشم شاہ خرم کشادیم امید کہ از تفرقہ امان آید

اسی طور سے اسکالر کیٹلاگر نے باقی ساری فالوں کو نقل کرتے ہوئے، جلد سازی میں ان کے قطع و برید شدہ حصوں کی تکمیل کرتے ہوئے اپنا سرخ مقالہ پورا کیا ہے۔

ہمایوں اور جہاں گیر نے فالیں نکالیں، کیٹلاگر نے ان کی تفصیل دی ہے۔ ہم چند فالیں نقل کرتے ہیں۔

ستارۂ بدرخشید و ماہ مجلس شد
دل رمیدہ ما را رفیق و مونس شد

اس شعر سے فال نکال کے ہمایوں نے لکھا ہے:

از فال مصحف کہ ربک برآمد از دیوان حافظ این شاہ بیت آمد ......

جہانگیر نے جب شہزادہ خرم کو رانا کے خلاف جنگ پر بھیجا تو فال نکالی۔ اس پر جہاں گیر نے ۱۰۲۳ھ کا سال درج کیا ہے۔ یہ فال بھی اسی شعر سے نکالی گئی جو ہمایوں کو ملا تھا یعنی ستارہ بدرخشید الخ

ایک جگہ ہمایوں نے ایک نوٹ میں لکھا ہے عید قلستین اور اسکے مقابل یہ شعر لکھا ہے جس سے فال نکلی:

دیدی کہ یار جز سر جور و ستم نداشت
بشکست عہد از غم ما هیچ غم نداشت

جب شاہجہاں کو راجپوتانہ کی مہم سر کرنے کے لئے بھیجا تھا، خود اپنا قیام اجمیر میں تھا۔ حافظ سے فال نکالی تو وہ غزل نکلی جس کا پہلا شعر یہ تھا:

کنون کہ در چمن آمد گل از عدم بوجود
بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود

جہاں گیر نے شاہزادہ خرم کی طرف سے پریشانی کے عالم میں فال نکالی تو نکلا کہ تفرقہ سے نجات ملے گی۔ شعر یہ تھا:

چشم بد دور کز ان تفرقہ خوش باز آورد
طالع نامور و دولت مادر زادت

ایک ایلچی گری (سفارت) پر بھیجنے کا مسئلہ درپیش تھا، جہاں گیر نے فال نکالی تو یہ شعر نکلا اور شخص مذکور کو سفیر بنا کے بھیج دیا گیا۔

حافظ از بہر تو آمد سوئے اقلیم وجود   قدمے نہ بہ وداعش کہ روان خواہد شد

برادر گزیدہ ہمایوں نے لکھا ہے کہ یہ غزل خاص کر یہ شعر کئی بار فال میں نکلا:

عزیز مصر برغم برادران غیور   ز قعر چاہ برآمد بہ اوج ماہ رسید

جہاں گیر نے حکیم ابوالفتح کے بیٹے فتح اللہ کو سزا دے کر، معاف کرنے کا جو فیصلہ کیا، اس کے لئے، دیوان حافظ ہی سے فال نکالی تھی۔ جہاں مندرجہ ذیل شعر نکلا تھا۔

آنکہ پامال جفا کرد چو خاک راہم   خاک می بوسم عذر قدمش می خواہم

اکبر کا آخری وقت تھا، جہاں گیر کی اکبر سے ناراضی چل رہی تھی، ہمدردوں نے مشورہ دیا ملاقات کرلو، الہ باد میں قیام تھا، وہاں سے چلے، آگرہ آئے، راستے میں فال نکالی، تو وہ غزل نکلی جس کا پہلا شعر یہ ہے:

غم غریبی و محنت چو برنمی تابم   بشہر خود روم و شہریار خود باشم

اس واقعہ سے متعلق جہاں گیر کا ایک طویل نوٹ ہے جس کا آغاز یہ ہے: ''وقتی کہ از الہ باس بقصد ملاقات حضرت والد بزرگوار خود وارد آگرہ ورانتہائی راہ ورسید کہ تفال بدیوان حافظ باید نمود ایں غزل برآمد''۔ (پہلے مصرعہ میں غریبی، الہ آباد کے دل پاس میں غریب الوطنی کی طرف اشارہ ہے، بشہر خود روم میں آگرہ کی طرف واضح اشارہ ہوا، اور باپ بیٹے کی ملاقات کے نتیجے میں رنجش دور ہوئی، اکبر کا چند مہینے بعد انتقال ہوگیا، اور وہ جو دوسرے مصرعے میں شہریار ہونے کی طرف اشارہ ہے، جہانگیر اکبر کا جانشین ہوگیا۔

اسی طرح تاریخ کے مخطوطات پر فاضل کیٹلاگ کرنے جو سرچ کی، جو زبردست محنت اور جو تحقیق کئے ان توضیحی فہرستوں میں ملتے ہیں، انکی ایک مثال پیش خدمت ہے:

جہانگیرنامہ: تزک جہاں گیری کا یہ خدا بخش کا مخطوطہ، تزک کے بارہ سال اور سترہ سالہ ورژنوں کے برخلاف، تین سالہ احوال پر مشتمل ہے۔ نسخہ اس لئے مزید قیمتی ہے کہ اس پر قطب شاہی بادشاہوں کی مہریں ثبت ہیں۔ یہ اس لئے اور بھی قیمتی ہوگیا ہے کہ اورنگزیب کے بیٹے محمد سلطان نے قطب شاہیوں کے خلاف جنگ اور پھر فتح یابی میں اسے مال غنیمت کے طور سے حاصل کیا۔ اور یہ واقعہ مخطوطے کے ٹائٹل پر اپنے ہاتھ سے لکھ بھی دیا۔ غالباً یہ نسخہ جہانگیر نے اپنے معاصر قطب شاہی سلطان کو، جب انکی سلطنت کے ساتھ دوستی کے تعلقات تھے، تحفہ میں بھیجا ہوگا۔

فاضل کیٹلاگ کرنے اوپر مندرج اطلاعات دیکر اس نسخے کی اہمیت واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مزید براں انہوں نے جو عالمانہ تعارف اس نسخے کا کرایا ہے، وہ ریسرچ کی بہترین مثال ہے۔ اور تفصیل بھی اتنی ہے کہ معمولی کتابی ٹائپ کے آٹھ دس صفحوں پر آئے گی۔ ہم اس کے ضروری حصے درج کرتے ہیں تاکہ مرتب کی اسکالرشپ کا کسی حد تک اندازہ ہوجائے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

یہ غیر معمولی قیمتی مخطوطہ جو حیدر آباد میں 1020ھ/1611ء یعنی جہاں گیر کے چھٹے سال جلوس میں لکھا گیا، جہاں گیر کی آٹو بایوگرافی کے پہلے ورژن کا سب سے پرانا نسخہ ہے، جو اب تک دنیا کی کسی لائبریری میں مل سکا ہے۔ یہ ورژن شہنشاہ نے اپنی حکومت کے تیسرے سال میں لکھا تھا پھر بعد میں اس

نے زیادہ مکمل ضخیم تر شکل میں از سرنو لکھا۔ اس کا آغاز اس طرح ہے:

''حمد بی غایت وشکر بی نہایت مبدئی را بیک امر کن''۔

اتنا لکھنے کے بعد کیٹلاگر نے کہا ہے کہ شہنشاہ کی یادداشتوں کے مختلف ورژن ملتے ہیں، ان میں بارہویں سال جلوس والا ورژن سب سے معتبر ہے۔ اور شہنشاہ کا اپنا لکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد معتمد خاں نے قلم سنبھالا لیکن نگرانی شہنشاہ ہی کی رہی۔ عہد محمد شاہ بادشاہ (1719-1748ء) میں اسے پھر محمد ہادی نے ایڈیٹ کیا۔ جس کو جہاں گیر کے آخری سال تک لایا گیا۔ ہادی نے ایک مقدمہ بھی لکھا جس میں جہاں گیر کی پیدائش سے تخت نشینی تک کے حالات بڑھائے۔ مکمل نسخہ سرسید نے تزک جہاں گیری کے نام سے علی گڑھ 1864ء میں شائع کیا۔ سید احمد علی رامپوری نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو نظامی پریس کانپور سے 1291ھ میں شائع ہوا۔

جہاں گیر نے خود 17 ویں سال جلوس کے تحت لکھا ہے کہ معتمد خاں جن کو اس کے عہد حکومت کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا گیا، ان سے یہ بھی کہا گیا کہ شہنشاہ نے جہاں تک اپنی سوانح عمری لکھ دی ہے وہ اسے اس سے آگے بڑھائیں۔

شاہنواز خاں نے مآثر الامراء میں لکھا ہے کہ جہاں گیر نے خود صرف بارہویں سال جلوس تک ہی اپنی سوانح عمری لکھی ہے۔ شاہنواز خاں کو اس کا علم نہیں تھا کہ سوانح عمری کا یہ سلسلہ آگے بھی چلتا رہا۔ تیرہویں سال جلوس کے اندراج پڑھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ جب 12 سال تک کی جلد پوری ہوئی تو، اس کی کئی خوش خط کاپیاں ہوا کر جہاں گیر نے مختلف اپنے افسروں/کارکنوں کو بھیجنے کا حکم دیا اور پہلا نسخہ شاہ جہاں کو عنایت کیا گیا۔ احوال جہاں گیر کے اس حصے کی طرف سب سے پہلے جیمس اینڈرسن نے توجہ دلائی (Asiatic miscelleny Calcutta.786)۔

آٹو بایوگرافی کا دوسرا متن جسے عام طور سے جعلی قرار دیکر رد کردیا گیا ہے۔ اس میں احوال کو 15 ویں سال تک لے آیا گیا ہے۔ اس میں سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کی تفصیلات، ہاتھی گھوڑوں کی تعداد اور تعمیرات میں آنے والے خرچوں کو بڑے بڑے مبالغے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جادوگروں کے کرتب اور اسی قسم کی دوسری باتیں بھی جو شاہی قلم کو زیب نہیں دیتیں اس میں موجود ہیں، تاریخی تعینات سے خالی یہ ورژن بہت سی ضروری باتوں سے معرا ہے۔ اسی لئے اس کو معتبر نہیں سمجھا جاتا۔

دوسری طرف مستند ورژن میں تاریخی ترتیب ہے، واقعات سال بسال بیان کئے گئے ہیں۔ لکھنے کا بھی سادہ اور غیر مرصع ہے اور جادوگروں یا کرتب بازوں کے قصے کہانیاں یا لعل وجواہر کے بیانات بھی نہیں ملتے۔

میجر ڈیوڈ پرایس نے جعلی ورژن کو مستند خیال کرتے ہوئے اورینٹل ٹرانسلیشن کمیٹی کے واسطے اس کا ترجمہ کر دیا جو لندن سے 1829ء میں چھپا۔ اور بد قسمتی سے یہی ورژن یورپ میں پھیل گیا اور درجۂ اعتبار اختیار کر گیا۔

اس ورژن کا ۱۰۴۰ھ (جہاں گیر کی وفات کے ۳ سال بعد) کا جعلی نسخہ جو اتنی جلد تیار ہو گیا تھا کہ ابھی جہاں گیر کی وفات ہوئی ہی تھی اس میں لوگوں کی خیال تھا کہ شاہ جہاں کا ہاتھ تھا، جو ممکن ہے، تو شاہ جہاں کی نیت غالباً یہ رہی ہوگی کہ اس مستند نسخے پر جو ۲ سالہ عہد کو بیان کرتا ہے اس جعلسازی کو فوقیت حاصل ہو جائے۔ (یہ نسخہ لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے) اور جس میں شہزادہ خرم (شاہ جہاں) پر بہت سخت تنقید ہے۔

معتبر نسخوں کے بارے میں پہلی بار روی سای نے ۱۸۳۰ء میں سوال اٹھایا تھا، اور پھر مورلے نے، اور پھر بالآخر سب سے زیادہ تفصیل سے ایلیٹ و ڈاؤسن نے (تاریخ ہند جلد ۶)۔ زیر نظر نسخہ جو جہاں گیر کی حکومت کے تیسرے سال میں لکھا گیا وہ متن ہے جس پر جعلی سوانح کی بنیاد ہے۔ مقابلے سے اندازہ ہو کہ بیانات میں جابجا یکسانیت ہے۔ لیکن اشعار کی تعداد جعلی نسخے میں بہت زیادہ ہے جب کہ معتبر نسخے میں اس کثرت سے نہیں۔

زیر نظر نسخہ جو ۱۰۱۷ / ۱۶۰۸ کا احاطہ کرتا ہے جب جہانگیر کی عمر ۴۰ سال تھی، اس کے ورق نمبر ۴۳ پر شہنشاہ نے مرزا رستم کی بیٹی سے شہزادہ پرویز کی شادی کا تذکرہ کیا ہے جو گیارہ شعبان ۱۰۱۷ھ کو ہوئی۔ یہ وہی سال ہے جو اس متن کے احاطے کا آخری سال ہے۔ ورق ۱۰۶ پر وہ واضح طور سے یہ بھی لکھتا ہے کہ والد یعنی اکبر کے ساتھ کشمیر کی پہلی وزٹ کی، اس وقت اس کی عمر اس ۴۰ سال تھی۔

حمد و نعت کے بعد شہنشاہ اپنے جلوس سے اس آٹو بایوگرافی کا آغاز کرتا ہے جو تاریخ ۸ جمادی الاول ۱۰۱۴ / ۱۶۰۵ء کو وقوع ہوا۔ متن کا بڑا حصہ خسرو کی بغاوت سے بھرا ہوا ہے لیکن جابجا اکبر کے بارے میں بھی ذکر آ جاتا ہے۔ خسرو کی قید اور اس کی ماں کی وفات کا ذکر بھی کرتا ہے۔

مرتب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا نام جہاں گیر نامہ خود شہزادہ محمد سلطان بن اورنگزیب (م ۱۰۸۷ھ) کی تحریر میں سرورق پر ثبت ہے۔ اور اس پر شہزادہ کی مہر بھی لگی ہوئی ہے۔ یہ پورا لوٹ نقل کر کے مرتب نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ شاہجہاں کے انیسویں سال جلوس میں پیش آیا ہوگا جب مغل فوجوں نے گولکنڈہ فتح کیا۔ اس کے دوسرے نام تاریخ سلیم شاہی، تاریخ سلیمی، تاریک جہاں گیر نامہ، سلیمی، تزک جہاں گیری، واقعات جہاں گیری، کارنامہ، جہاں گیری، مقالات جہانگیری، اور اقبال نامہ، جہاں گیری ملتے ہیں۔

ترقیمہ کی عبارت اس طرح ہے:

بتاریخ یوم الاربعاء سلخ ذوالحجہ سنہ ۱۰۲۰ در دار السلطنت حیدرآباد مصئون عن کل شر و فساد برسم خزانہ کتب اعلیٰ حضرت السلطان العادل الکامل افتخار السلاطین فی الزمان و اشرف الخواقین فی الدوران السلطان ابن السلطان الخاقان ابن الخاقان ...... لا زال رایات دولتہ منصورہ و اعداء حضرتہ مقہورہ بید فقیر محمد مومن مشہور بہ عرب شیرازی سمت تحریر یافت۔

۱۰۲۰ھ کی مہر سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس ترقیمے میں جو جگہ بن لکھی رہ گئی، وہاں اس بادشاہ کا نام آتا تھا جس کی لائبریری کے لئے یہ مخطوطہ تیار ہوا تھا۔

تاریخ ۱۰۲۰ھ کا آخری عدد صفر سے ۵ میں تبدیل کیا گیا ہے۔ جس کی طرف خیال نہ جاتا اگر قطب شاہیوں کے پانچویں بادشاہ محمد قطب شاہ بن قلی قطب شاہ کی مہر اس میں خلل نہ ڈالتی۔ مہر میں ۱۰۲۰ھ درج ہے۔ اس مہر کے بازو میں چھٹے قطب شاہی یعنی محمد قطب شاہ کی مہر بھی ہے۔ آخری صفحے پر کئی عرض دیدے بھی ہیں جن میں سے ایک پر ۱۰۶۸ھ کی تاریخ پڑی ہے۔

☆☆☆

خدا بخش کے فارسی نوادر پر اردو میں، پروفیسر سید حسن، (ترتیب دیوان صائب ہروی و دیوان مظفر شمس بلخی وغیرہ) پروفیسر عطا الرحمان عطا کاکوی (سفینہ، خوشگو اور کئی مزید تذکروں کی تدوین) پروفیسر سید حسن عسکری (دو مجموعے اردو میں اور بقیہ انگریزی میں) اور قاضی عبد الودود (بیس سے اوپر مجموعہ ہائے مقالات) نے بیش بہا تحقیقی کام انجام دیئے۔ قاضی صاحب کی دساتیر پر قیمتی تحقیق، عطا کاکوی صاحب کی بیدل پر کتاب اور نکات بیدل کا ترجمہ؛ اور پروفیسر محفوظ الحق کی دیوان کامران کی تدوین اور دوسرے تحقیقی مقالے فارسی ادبیات میں اہم اضافے ہیں (تدوین دیوان کے سلسلے میں ڈاکٹر ہادی حسن کی دیوان ہمایوں نسخہ، خدا بخش کی ترتیب بھی قابل ذکر ہے)، مگر انگریزی میں خدا بخش فارسی نوادر پر سب سے اہم کام پروفیسر سید حسن عسکری نے انجام دیا جن کے سات آٹھ مجموعے تصوف و تاریخ پر، فارسی مخطوطات کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ ان مجموعوں میں ایک مکمل کتاب امیر خسرو پر خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

ایک نمونہ اس توضیحی فہرست سے ہم اور دینا چاہتے ہیں۔ یہ فارسی کے اس فن سے متعلق ہے جسے انگریزی میں انسائیکلوپیڈیا اور فارسی میں دائرۃ المعارف کہتے ہیں۔ لائبریری میں اس فن کی متعدد کتابیں ہیں جن میں سے ایک کا، فاضل کیٹلاگر نے جو بیان دیا ہے وہ بطور مثال پیش ہے:

جواہر العلوم ہمایونی : یہ ایک ضخیم انسائکلوپیڈیا ہے جس میں سائنسی علوم کی مختلف شاخوں کا خاص کر احاطہ کیا گیا ہے۔ محمد فاضل بن علی بن محمد السکیتی القاضی السمرقندی (عہد ہمایوں) کی تصنیف ہے، جس کی ابتدا

اس طرح ہوتی ہے :

فاضل ترین منظومات جواہر و تصنیفات مصنفات فاضل و کامل ترین منثورات نوادر رسوم و تالیفات مولفان کامل الخ

مصنف مقدمہ کتاب میں بیان کرتا ہے کہ وہ اوائل عمری میں ہی حصول علم میں مشغول ہو گیا اور علماء و فضلاء عہد سے درس لیا۔ امام فخر الدین رازی (م ۱۲۰۹/ ۶۰۶) کی نفائس الفنون و عرائس العیون وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ بعد ازاں اس نے یہ کتاب ترتیب دی۔

مصنف نے بادشاہ وقت ہمایوں کی تعریف و توصیف کی ہے جس کے نام اس کتاب کو معنون کیا ہے۔ یہ کتاب ہمایوں کے دوبارہ تخت نشیں ہونے (۹۶۲/۱۵۵۴) کے وقت تک کا احاطہ کرتی ہے۔

کتاب ۱۲۰ حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے مقدمہ ہے، پھر تین مقالات، اور خاتمہ۔

مقدمہ تین قسم پر مشتمل ہے۔

(۱) قسم اول در بیان شرف علوم و فضیلت علماء (۲) قسم دوم در بیان تعریف و تقسیم (۳) قسم سیوم در بیان تعداد و ابواب و فہرست ایں کتاب

مقدمہ کے بعد مقالات شروع ہوتے ہیں:

ہر مقالہ کی دو قسمیں ہیں اور ہر قسم کے ابواب میں تقسیم ہوتی ہے، ہر قسم میں ایک الگ موضوع ہے۔

مقالہ اول کی قسم اول کے بائیس ابواب ہیں:

(۱) در علم خط (۲) در علم انشا (۳) در علم شعر (۴) در علم قافیہ (۵) در علم عروض (۶) در علم معما و حل معمیات امیر حسین و بیا لغز (۷) در علم بدائع و صنائع شعری و اظہار مضمر (۸) در علم لطائف و مطائبات (۹) در امثال و حکایات بر سبیل تشبیہ و استعارات (۱۰) در علم لغت (۱۱) در علم صرف (۱۲) در علم نحو (۱۳) در علم معانی (۱۴) در علم بیان (۱۵) در علم مغالطات منقولہ و معقولہ (۱۶) در علم مناظرہ (۱۷) در علم معرفت ابیات (۱۸) در علم امور عامہ (۱۹) در علم اعراض (۲۰) در علم حکمت (۲۱) در علم منطق (۲۲) در علم مناظرہ و آداب بحث

دوسری قسم میں بارہ ابواب ہیں :

(۱) در علم قصص الانبیا (۲) در معرفت تاریخ ملوک فرس کہ قبل از عہد سید المرسلین بودہ اند (۳) در علم سیرۃ النبی و بیان معجزات و ذکر معراج (۴) در معرفت واقعات و غزوات نبوی و بیان اوصاف خانہ کعبہ (۵) در معرفت اوصاف و احوال جمیع خلفا (۶) در معرفت تاریخ سلاطین کہ بعد از خلفا بودہ اند تا عہد بندگان حضرت صاحبقران (۷) در معرفت تاریخ بندگان حضرت صاحبقران و اولاد و احفاد بزرگوار ایشان (۸) در علم انساب (۹) در علم مقالات عالم (۱۰) در علم سیر و مقامات طبقہ اولیٰ اولیا (۱۱) در معرفت مراقبات و

مقامات طبقہ ثانیہ از مشائخ طریقت از خواجہا نقشبندی وغیرہم و بیان مقابر و مزارات انبیا و اولیا و بیان طرح و وضع خانہ کعبہ (۱۲) در بیان عجائب المخلوقات و امور اخروی و دینوی و دنیوی

مقالہ دوم میں بھی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم میں بائیس ابواب ہیں :

(۱) در تہذیب اخلاق (۲) در علم تخلیہ نفس از اوصاف ذمیمہ (۳) در علم معاش و معرفت حقوق والدین و اولاد (۴) در بیان معاملات بازوجات (۵) در معرفت آداب اتحاد دوم (۶) در معرفت حقوق ممالک (۷) در معرفت جیران (۸) در علم مجالس و محاضر (۹) از علم آداب ملوک و در بیان علم حقوق رعایا بر ملوک (۱۰) در علم حقوق ملوک بر رعایا (۱۱) در بیان معرفت جواہر نامہ (۱۲) در بیان معرفت فرس نامہ و بعضی از حیوانات (۱۳) در بیان معرفت فرسنامہ (۱۴) در بیان معرفت بازنامہ وغیرہ (۱۵) در علم تشریح اعضا (۱۶) در معرفت کلیات طبی (۱۷) در بیان اسباب ستہ ضروری ناو متعلق بہا (۱۸) در بیان علم نبض (۱۹) در بیان معالجات طبی (۲۰) در بیان حمیات (۲۱) در بیان علم قرابادین یعنی معرفت ادویہ مفردہ و مرکبہ بترتیب حروف تہجی (۲۲) در امراض عین۔

دوسری قسم میں انیس ابواب ہیں :

(۱) در علم عبادات بر مذاہب اربعہ (۲) در علم مناکحات و تطلیقات (۳) در معاملات (۴) در معرفت عقود شہادات و ما ناسب بہذہ والسطورات (۵) در علم عقوبات و جنایات (۶) در علم فرائض و قسمت مواریث و ایراد قواعد چند جہت نسبت و ضرب و قسمت و مسکہ حساب (۷) در علم اداب القاضی و متفرقات (۸) در علم ملوک و قبالجات (۹) در علم محاضر و دعاوی (۱۰) در علم سجلات (۱۱) در علم فتوی (۱۲) در علم اصول فقہ (۱۳) در علم اسید (۱۴) در علم صید و اصطیاد و حلت و حرمت اکثر حیوانات (۱۵) در علم سنن و احکام (۱۶) در علم آداب طعام (۱۷) در معرفت مباحث (۱۸) در معرفت فرید فوائد متفرقہ و لطائف مجتمعہ فقہیہ (۱۹) در علم موعظ و نصائح

مقالہ سوم کی پہلی قسم میں بارہ ابواب ہیں :

(۱) در علم تفسیر و حل الفاظ مشکلہ قرآنی (۲) در علم قرأت سبعہ (۳) در علم خواص اوراد و فتیے و ترجمہ قصیدہ بردہ و حزب البحر (و سورہ و آیات) (۴) در علم ادعیہ ماثورہ و دعوات مشہورہ (۵) در علم حدیث (۶) در علم اصول حدیث (۷) در معرفت قواعد و اصطلاحات صوفیہ (۸) در علم سلوک (۹) در علم توحید و مراتب مکاشفات (۱۰) در معرفت مشاہدات (۱۱) در معرفت مقامات و مراتب آن (۱۲) در علم حقیقت

دوسری قسم میں تینتیس ابواب ہیں :

(۱) در معرفت تقویم شمسی و قمری و اختیار ساعات (۲) در معرفت استخراج تقویم و شبکہ نجومی (۳) معرفت

احکام نجوم (۴) در علم ہیئت (۵) در علم اصطرلاب و بیان صنعت آن (۶) در معرفت کرۂ افلاک (۷) در معرفت اقالیم سبعہ (۸) در معرفت صور کواکب (۹) در معرفت مسالک و ممالک (۱۰) در علم تکسیر (۱۱) در علم آداب وقف (۱۲) در علم حروف (۱۳) در علم جفر جامع (۱۴) در طلسمات (۱۵) در علم نیر نجات (۱۶) در علم کیمیا (۱۷) در علم سیمیا (۱۸) در علم تفوہ اسماء و شرایط آن (۱۹) در علم تسخیر کواکب (۲۰) در علم غرایم (۲۱) در علم رمل (۲۲) در علم حساب (۲۳) در علم مساحی و جر اثقال و بیان مصرات (۲۴) در علم استخا (sic) (۲۵) در علم قیامت (۲۶) در تعبیر خواب (۲۷) در معرفت اختلاجات و علم شانہ و معرفت تفاول (۲۸) در معرفت طالع مولید و زائچہ (۲۹) در معرفت اشکال اقلیدس (۳۰) در علم متوسطات (۳۱) در علم موسیقی (۳۲) در علم ... کہ حکما و ہندواں علم کتب معتبر تصنیف کردہ (۳۳) در علم شطرنج۔

کلاسیکی فارسی کا نصف سے زیادہ لٹریچر پردہ خفا میں ہے۔
جو کتاب خانوں میں دفینہ بنا ہوا ہماری آگہی کی راہ تک رہا ہے۔
خدا بخش لائبریری نے سم سم کھل جا کہنے کی کوشش کی۔
خاصی کامیابی بھی ہوئی، ایک دو جگہ اس طور کو اپنایا بھی گیا، مگر یہ روش عام تحریک نہ بن سکی۔
علیگڑھ کے لئے خاص طور سے جی چاہتا ہے کہ
جس جس طور سے خدا بخش نے اپنے فارسی عربی خزانوں کو عام کیا ہے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا ہے
وہ طور یہاں بھی اپنا لیا جائے۔ اور مولانا آزاد لائبریری علمی دنیا کے نقشے پر وہ مقام حاصل کرلے جو اسکی واقعی حیثیت ہے۔
اور: مولانا آزاد لائبریری ہی کیوں!
سارے بڑے (اور چھوٹے) ذخیرے یہ طور کیوں نہ اپنائیں۔

☆☆☆

عابد حسین حیدری*

خمریاتِ جوش اور حافظ و خیام: ایک تقابلی مطالعہ

جوش ملیح آبادی اردو زبان کا ایسا شاعر ہے جسے شاعر انقلاب، شاعر جذبات، شاعر فطرت، شاعر شباب، شاعر اعظم، شاعر رومان اور شاعر آخر الزماں جیسے خطابات سے نوازا گیا اور خود جوش ملیح آبادی نے بھی اپنی شاعری کی شروعات میں بڑے فخریہ انداز میں کہا تھا

شاعری کیوں نہ راس آئے مجھے   یہ مرا فن خاندانی ہے

جوش ملیح آبادی کے اجداد فرخ آباد ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے اور ملیح آباد کی خوشگوار فضا اتنی پسند آئی کہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ جوش ملیح آبادی کے پردادا حسام الدولہ تہور جنگ فقیر محمد خان گویا بادشاہ غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر شاہ کی افواج میں اہم عہدوں پر فائز رہنے کے علاوہ اردو زبان و ادب کے گیسو سنوارنے اور سلجھانے میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ فارسی کی مشہور کتاب "انوار سہیلی" کا اردو ترجمہ "بستان حکمت" ان سے یادگار ہے۔ جوش ملیح آبادی کے دادا محمد احمد خاں احمد اور والد بشیر احمد خاں بشیر بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔ بزرگوں کی وہ تلوار جس کی آب بشیر احمد خاں تک آتے آتے اتر چکی تھی جوش ملیح آبادی نے قلم سے تبدیل کرلی پھر بھی ان کا خیال تھا:

اہل دنیا کی نظر میں محترم ہوتا نہیں   مرد جب تک صاحب سیف و قلم ہوتا نہیں

سیف کا تصور جوش کے ذہن کو ماضی کی گرمی ضرور بخشتا رہا لیکن قلم نے ان کے سر پر عظمت اور شہرت کا ایسا تاج رکھ دیا جس کی چمک سے وہ بیسویں صدی کی اردو شاعری کے بلا شرکت غیرے تاجدار کہے جانے لگے اور جوش نے سیف کی اس جھنکار کو اپنے لفظوں کے گلے میں پہنا دیا اور انہوں نے بڑے فخریہ انداز میں اعلان کیا

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوش کہتے ہیں
کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

جوش کا فارسی ادب کا مطالعہ اور فارسی اثرات قبول کرنا کوئی تحقیق طلب بات نہیں لیکن جوش نے

---

* صدر شعبہ اردو، ایم۔ ایچ۔ پی۔ جی۔ کالج، سنبھل، مراد آباد

مندرجہ بالا شعر میں حافظؔ و خیامؔ سے اپنے ذہنی ربط کا اعتراف کیا ہے اس لئے یہاں پر حافظؔ و خیامؔ کی شعریات کا سرسری جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

حافظؔ ایک ایسا خوش نصیب شاعر ہے جس کی شراب کو لوگوں نے شراب معرفت سمجھا لیکن خیامؔ فارسی زبان کا ایسا بدقسمت شاعر ہے کہ اس کی شراب معرفت کو بھی اہل ادب یہی بھٹی والی شراب سمجھتے رہے اور انہوں نے یہ تصور کیا کہ وہ ایک رند مے خوار تھا جو ہمیشہ سرمست و سرشار رہتا تھا۔ جس کے اردگرد ٹوٹی صراحی اور چھوٹے پیالوں کے ٹکڑے پڑے رہتے تھے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حافظؔ و خیامؔ نے جس عہد میں آنکھ کھولی اس زمانے کے سلاطین و امراء بلکہ بعض اہل علم بھی شراب پیتے تھے۔ خیامؔ کے عہد میں سلطانی مصاحبت پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں شراب نوشی کے اصول و قواعد بھی لکھے گئے۔ امیر کیکاؤس نے اپنے ''قابوس نامہ'' میں جہاں اپنے بیٹے کو اور باتیں نصیحت کے طور پر لکھی ہیں وہیں شراب نوشی کے آداب بھی بتائے ہیں۔ خود خیام سے منسوب کتاب ''نوروز نامہ'' کے چودھویں باب میں شراب نوشی پر ایک مستقل فصل ہے۔ سلطان کے خسرو سلجوقی کے عہد میں ابوبکر محمد ابن علی راوندی نے "راحة الصدور و آیة السرور" کے نام سے سلجوقیوں کی جو تاریخ لکھی ہے اس کا آخری باب شراب کی خصوصیت اور اس کے نفع و نقصان سے متعلق ہے۔ ان کتابوں اور دوسری کتابوں کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شراب سلاطین و امراء اور اہل علم کے معمولات میں تھی اور خیامؔ کے عہد کے شعراء نے شراب کی مدح و توصیف میں کثرت سے شعر کہے۔

بہرحال حافظؔ و خیامؔ کے عہد کی آب و ہوا اور ساری فضا میں شراب کا نشہ بھرا تھا اس لئے زاہد و طرح شراب و جام بھی تشبیہات و استعارات کا ضروری جزو بن گئے تھے۔ اسلامی شاعری کی ترکیب میں شراب کی آمیزش اس طرح ہوئی کہ بنی امیہ کے دربار میں بعض عرب عیسائی شعراء داخل تھے۔ ان میں مشہور نام اخطل کا ہے۔ یہ شراب پیتا تھا اور شراب کے مضامین نظم کرتا تھا۔ بنی عباس کا دور آیا تو یہ رنگ اور تیز ہو گیا اور خاص طور سے ہارون رشید کے درباری شاعر ابونواس نے خمریات کی بنیاد ڈالی۔ اس کے خمریہ اشعار آج تک وہی اثر رکھتے ہیں۔ فارسی شاعری اسی زمانے میں پیدا ہوئی اسی لئے اس کی گھٹی میں شراب ملی۔ چنانچہ آج تک فارسی شاعری اس نشے سے چور ہے۔ کبھی وہ شراب معرفت تھی اور کبھی مے محبت بنی۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی کے وہ شعراء جنہوں نے شراب کبھی چھوئی بھی نہیں، جب شعر کہنے لگتے تھے تو کم از کم لفظوں میں اس کا خیالی لطف ضرور اٹھا لیتے تھے۔ یہاں تک کہ بارہویں صدی ہجری کے اقراری شراب نوش شاعر غالبؔ کو یہ کہنا پڑا:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

جہاں تک خیامؔ کی خمریات کا تعلق ہے خیامؔ کی اکثر خمریات کا ماحصل غالبؔ کے اس شعر میں ادا ہو سکتا ہے:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو　　یک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

خیامؔ کی اکثر رباعیوں میں عالم کی کشاکش اور دنیا کے مصائب، فلسفہ کے پیچیدہ شکوک، آخرت کے خوف، روحانی سرمستی اور رضائے تقدیر کی شراب ہے:

در پردۂ اسرار کسے را رہ نیست　　زیں تعبیہ جان ہیچ کس آگہ نیست
جز در دل خاک ہیچ منزل گہ نیست　　می خور کہ چنیں فسانہا کوتہ نیست

ایں قافلۂ عمر عجب می گذرد　　دریاب دمے کہ با طرب می گذرد
ساقی غم فردائے قیامت چہ خوری　　دردہ قدح یادا کہ شب می گذرد

خیامؔ کی رباعیوں میں رندی و میخوارگی کا ایک اور پہلو بھی دکھائی دیتا ہے جس میں وہ شراب کو نور ماہ و صراحی و پیالہ اور گل کوزہ اور اس کے ٹوٹنے پھوٹنے کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ ان سے پینے کا نہیں بلکہ دیکھنے کا کام لیتا ہے۔ یعنی اس کے ذریعہ وہ زوال و فنا اور تغیر کی تشبیہوں اور استعاروں کو ادا کرتا ہے:

ایں کوزہ چو من عاشق زاری بودست　　واندر طلب روئے نگاری بودست
ایں دستہ کہ بر گردن اوی بینی　　دستیست کہ در گردن یاری بودست

مطلب یہ کہ اس مٹی کی صنعت گری ہے کہ کبھی وہ ذی ہوش آدمی بنتی ہے اور کبھی جماد کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، پھر کبھی اسی سے عاشق کا دل دیوانہ اور کبھی کسی شراب کا پیالہ و پیمانہ بنایا جاتا ہے۔ پھر وہی خاک ہو کر کبھی معشوق کی چشم مخمور اور کبھی خاک سر فغفور بنتی ہے اور کبھی وہی کسی شہریار کی شہ رگ کا خون اور کبھی لالۂ بستانی کا رنگ:

ہر جا کہ گل و لالہ زاری بودست　　از سرخی خون شہریاری بودست
ہر شاخ بنفشہ کز زمیں می روید　　خالے است کہ بر رخ نگاری بودست

خیامؔ کی شراب اخلاص سے بھی معمور ہے چونکہ زاہدوں اور عابدوں کے نزدیک بادہ و مے، رندی اور اوباشی کی علامت بھی جاتی تھی اور یہ کھوریا کار زاہد و عابد مکر و فریب میں مبتلا رہتے تھے۔ اس لئے صوفی شعراء رندی کے ان ظاہری لوازم جام، ساغر اور بادہ کو اخلاص اور نکوکاری کے معنوں میں اور تسبیح و

سجادہ و دستار جو زاہدوں اور عابدوں کی ظاہری فریب کی علامتیں ہیں تلبیس و نفاق کے معنوں میں تعبیر کیا ہے۔ خیام بھی اس موضوع سے بچ نہیں سکے:

اے مفتی شہر از تو پرکار تریم　　با ایں ہمہ مستی ز تو ہشیار تریم
تو خون کساں خوری و ما خون رزان　　انصاف بدہ کدام خونخوار تریم

تا چند ملامت کنی اے زاہد خام　　ما رند و خراباتی و مستیم مدام
تو در غم تسبیح و ریا و تلبیس　　ما با مئے و مطربیم و معشوق بکام

جہاں تک حافظ کا تعلق ہے۔ حافظ کا وہی مسلک ہے جسے حکیم سنائی، شیخ عطار، مولانا جلال الدین رومی اور سعدی نے اپنی زبان اور اپنے بیان میں مختلف طریقوں سے تعبیر کیا ہے۔ وہ توحید و تصوف میں ایسے ڈوبے کہ شعریات فارسی میں وہ ان کی شناخت بن گیا۔ حافظ کثرت عالم، اختلاف ادیان، جنگ و جدل اور بے ہودہ بحثوں کے قائل نہ ہو سکے:

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ　　چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

حافظ در حقیقت وحدت اور یک رنگی کے عاشق تھے۔ اسی لئے وہ ہر طرح کے اختلاف اور نفاق کی برائی کرتے تھے۔ حافظ نے ایسے ریاکار صوفیوں کی خوب خبر لی ہے جو حافظ کی طریقت سے انتساب رکھتے تھے لیکن اصل میں اہل ظاہر تھے اور قلندری کا ڈھونگ رچائے ہوئے تھے:

ز خانقاہ بہ میخانہ می رود حافظ　　مگر ز مستی زہد و ریا بہوش آمد

ریاکاری اور سالوس پر شعرائے ایران میں کسی کو اتنا غصہ نہیں آیا جتنا کہ حافظ اس سے برہم نظر آتے ہیں۔ عارفانہ غزل نے حافظ کے ہاتھوں میں پہونچ کر ایک طرف فصاحت و بلاغت کا درجہ کمال حاصل کیا تو دوسری طرف ایک مخصوص سادگی اختیار کی۔ حافظ نے ہر طرح کی ظاہر پرستی سے اعراض کیا اور حیلہ و مکر و ریا کے دام کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اپنے اشعار میں شیخ، زاہد اور صوفی جیسے ریاکاروں کی خوب خبر لی ہے:

دلم گرفت ز سالوس و طبل زیر گلیم　　خوشا دمے کہ بہ بے خانہ بر کشم علمی

عیب رنداں مکن اے زاہد پاکیزہ سرشت　　کہ گناہ دگراں بر تو نخواہند نوشت

جہاں تک اردو شاعری میں خمریات کا تعلق ہے فارسی کے زیر اثر اردو میں خمریات کا ایک وافر ذخیرہ موجود ہے اور اردو کا تقریباً ہر شاعر اس موضوع سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی شراب چاہے شراب معرفت رہی ہو یا خیام کی مفروضہ بہشتی والی شراب۔ خمریات کے حوالے سے اردو میں سب سے اہم نام ریاض خیرآبادی کا ہے لیکن جوش کی خمریات حافظ و خیام کی خمریات سے اتنی زیادہ متاثر ہیں کہ جوش بذات خود اپنے آپ کو بیسویں صدی کا حافظ و خیام کہتے ہیں۔

یوں تو جوش نے اپنی رباعیوں کو پانچ موضوعات میں منقسم کیا ہے (۱) حقائق (۲) حسن و عشق (۳) پیران سالوس (۴) خمریات (۵) متفرقات۔ گذشتہ سطور میں ہم نے حافظ و خیام کی خمریات پر سرسری نظر ڈالی ہے اور یہاں پر جوش کی خمریات پر اظہار خیال کیا جائے گا۔ یہاں پر یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ حافظ و خیام کی خمریات معرفت اور بہشتی کی شراب کے مابین سعی کرتی رہی ہو یا ہمارے علمائے شعر نے ان کی خمریات کو معرفت اور بہشتی کی شراب کی کشمکش بتائی ہو لیکن حافظ و خیام کے زہد، تزکیہ نفس اور پاکیزگی اخلاق نے دونوں کو زمانے کی لے دے سے کافی حد تک بچا لیا۔ جوش اتنے خوش نصیب ثابت نہیں ہوئے۔ چونکہ جوش اخلاق و تزکیہ نفس کی منزلوں سے جتنا دور بھی نہیں تھے اس سے زیادہ دور ہونے کا اعلان خود اپنی زبان سے کرتے رہے۔ اس کے علاوہ حافظ و خیام کو ان سیاسی اور سماجی جھگڑوں کا سامنا بھی نہیں تھا جن سے جوش کو دوچار ہونا پڑا۔ اس لئے جوش کے لہجہ خمریات کو تشہیر اور رسوائی زیادہ حاصل ہوئی۔ دوسرے حافظ اور خیام کے لہجے کے گداز اور مٹھاس کے مقابلے میں جوش کے لہجے کی گھن گرج اور شوکت الفاظ نے ان کی خمریات کو ان سے زیادہ دزمی اور ارزل بنا دیا جتنی کہ وہ تھیں۔ یوں بھی جوش نے کبھی اپنے ایمان کا اعلان اتنا بانگ دہل نہیں کیا جتنا ہے جھجک اعلان الحاد کیا۔ اس لئے جوش کی خمریات کا لہجہ غزل کے دل پذیر لہجے سے دور نظم اور رباعی کی شان و شوکت سے سجا ہوا زیادہ شدید، زیادہ قوی نظر آتا ہے لیکن اگر غور کیجئے تو یہ لہجہ حافظ و خیام سے الگ نہیں ہے بس فرق اتنا ہے جتنا ایک غزل اور نظم غیر معری کے لہجے میں ہوتا ہے۔ ذیل میں جوش کی خمریات سے کچھ رباعیاں پیش کی جارہی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ حافظ و خیام کے اشعار خمریات کی نشاندہی کی جارہی ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ جوش حافظ و خیام کی خمریات سے کس حد تک متاثر ہیں:

ہشیار کہ آفتاب ہوتا ہے تجھے　　بیخبر انقلاب ہوتا ہے تجھے
ہر صبح کو آتی ہے یہ ساقی کی صدا　　بیدار کہ خود شراب ہوتا ہے تجھے

دل گشادہ دار چوں جام شراب　　سر گرفتہ چند چوں خم دنی (حافظ)

اوہام و یقیں میں فرق کر دے ساقی　　آ ذہن رسا کو برق کر دے ساقی
اس وسوسۂ ارض و سما کو للہ　　اندر طل گراں میں غرق کر دے ساقی

چوں ز جام بیخودی رطلے کشی　　کم زنی از خویشتن لاف منی
دل بے بر بند تا مردانہ وار　　گردن سالوس و تقویٰ بشکنی (حافظ)

یہ ولولہ یہ شباب اللہ اللہ　　یہ نشہ یہ ماہتاب اللہ اللہ
کل تک تو فقط شراب کا بندہ تھا میں　　اور آج ہوں خود شراب اللہ اللہ

مرنے پر نوید جاں ملے یا نہ ملے　　یہ کنج یہ بوستاں ملے یا نہ ملے
پینے میں کسر نہ چھوڑ او خانہ خراب　　معلوم نہیں وہاں ملے یا نہ ملے

جوشؔ کی ان دونوں رباعیوں کو پڑھ کر بے ساختہ طور پر خیامؔ کی یہ رباعی یاد آجاتی ہے:

گویند کساں بہشت با حور خوش است　　من می گویم کہ آب انگور خوش است
ایں نقد بگیر و دست ز نسیہ بدار　　کآواز دہل شنیدن از دور خوش است

جوشؔ نے اپنے مجموعہ "نقش و نگار" میں خمریات کے عنوان سے تیرہ نظمیں شامل کیں ہیں۔ "یوم بہار، چند جرعے، شب نشاط، آج کی رات، کل کی رات، رقاصۂ میکدہ، جشن نو، ایک تمنا، دعوت نا و نوش، پیام کیف، جواب اس شب کا دنیا میں نہیں، صبح میکدہ، اور ہو"۔ ان میں سے کوئی بھی نظم حافظؔ و خیامؔ کی خمریات اور ان کے اثرات سے خالی نہیں ہے۔ مضمون کی طوالت کے پیش نظر صرف ایک نظم "چند جرعے" کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

جوشؔ نے "چند جرعے" کو پانچ بندوں میں تقسیم کیا ہے جس میں علی الترتیب ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۱، ۱۱ اور ۲۵ اشعار ہیں اور ہر بند میں ایک بیت کی تکرار کی ہے:

اٹھا ساغر کہ پھر آواز آئی　　کہ بد مستی بہ از زہد ریائی

جوشؔ نے پہلے بند میں جہاں بادہ خواری کو نئی ہلچل اور نرالی بے قراری سے تعبیر کیا ہے وہیں مئے پرستی کو بغیر اسباب شادی اور شادمانی بتایا ہے۔ اس بند کو پڑھ کر خیامؔ کی مشہور رباعی یاد آجاتی ہے اس لئے کہ:

پئے بیٹھا ہوں آج اے زاہد خام　　شراب رند خوار و ساغر آشام

اب خیامؔ کی رباعی ملاحظہ فرمائیں:

تا چند ملامت کنی اے زاہد خام　　ما رند و خراباتی و مستیم مدام
تو در غم تسبیح و ریا و تلبیس　　ما با مئے و مطربیم و معشوق بکام

جوشؔ کے اس بند کو پڑھ کر حافظؔ کی ایک غزل یاد آجاتی ہے جس کا مطلع حاضر خدمت ہے:

ساقیا سایۂ ابر ست و بہار لب جوئے　　من نگویم چہ کن از اہل دلی خود تو بگوئے

"چند جرعے" کا دوسرا بند جہاں خوبصورت شعریات کا مرقع ہے، وہیں اس کے اشعار خمریات جوشؔ کی شاعری کی نمایاں خصوصیات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں:

سبو کی آگ سے دہکے ہوئے ہیں　　فضا میں پھول سے مہکے ہوئے ہیں
چمن بر دوش ہے کوئل کی کوکو　　صراحی در بغل پھولوں کی خوشبو
کبھی ظلمت کبھی انوار مہتاب　　خدا معلوم بیداری ہے یا خواب

جرعۂ سوم میں جوشؔ نے جہاں حافظؔ و خیامؔ کے خمریات سے کشید کی ہے وہیں ہندی خمریات سے بھی اپنے قاری کو آشنا کرایا ہے:

ندی ساون کی چڑھتی آرہی ہے　　سوئے میخانہ بڑھتی آرہی ہے
اٹھی ہے جھومتی کالی گھٹائیں　　گھٹائیں شوخ متوالی گھٹائیں
ابلتی ہے شراب ارغوانی　　برستا ہے مزے لے لے کے پانی
سر میخانہ حوریں آرہی ہیں　　نگاہیں رام رس ٹپکا رہی ہیں

اس بند کو پڑھ کر حافظؔ کی ایک مشہور غزل یاد آجاتی ہے جس کا مطلع اور ایک شعر نذر قارئین کیا جا رہا ہے:

زہے خوش رقم کہ بر گل رخسار میکشی　　خط بر صحیفۂ گل و گلزار میکشی
کاغل روی چو باد صبا را ببوئے زلف　　ہر دم بقید سلسلہ در کار میکشی

جرعۂ چہارم میں جوشؔ نے مے نوشی کے بعد ہونے والی متعدد کیفیات کا ذکر کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شراب ہر ایک کو نہیں پینی چاہیے اس لئے کہ اس کے لئے باظرف ہونا ضروری ہے۔ انہوں نے اس کی طرف بڑا خوبصورت اشارہ کیا ہے:

نہ دل کو امتیاز این و آں ہے　　نہ خود پر بندہ ہونے کا گماں ہے

نظم کے اس بند کو پڑھ کر حافظؔ کا ایک شعر ذہن میں گونجنے لگتا ہے:

بروے نوش و رندی ورز و ترک زرق کن زاہد
کزیں بہتر ہنر دیگر عجب دارم گر آموزی

اس نظم کا آخری بند ایک طرح سے نظم کی جان ہے۔ جوشؔ نے اس نظم کے حوالے سے خمریات کا فلسفہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس بند میں وہ حافظؔ و خیامؔ کی خمریات ہی سے نہیں بلکہ فارسی زبان سے بھی بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں اور کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ وہ بھول جاتے ہیں کہ یہ نظم اردو زبان کی لکھ رہے ہیں۔ بطور مثال چند شعر ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ قارئین اندازہ لگائیں کہ یہ اشعار اردو کے ہیں یا فارسی کے:

تھا مست و حیات جاوداں مست　　تھا سر شار و مرگ نا گہاں مست

ہوائے تاک و برگ یاسمن مست | بت تو خیز و صہبائے کہن مست
بلند و پست مست و جزو کل مست | عنادل مست گل چیں مست و گل مست
شگوفہ مست و دل مست و چمن مست | زباں مست دہاں مست و سخن مست
تدبر مست حکمت مست دیں مست | عقائد مست ظن مست و یقیں مست
ملک مست و فلک مست وقضا مست | قمر مست و فضا مست و صبا مست
مغنی مست بربط مست لے مست | سبوکش مست ساغر مست مے مست
جہاں مست وزماں مست ومکاں مست | عناصر مست جوہر مست جاں مست

اور آخر میں جوش عالم سرشاری میں یہ کہہ دیتے ہیں:

فلک کیا عرش کو بھی پست کر دوں | خودی کیسی خدا کو مست کر دوں

اردو شاعری نے فارسی سے جتنا کچھ بھی اخذ کیا ہے اسے بیان کرنے کے لئے جوش سے زیادہ عمدہ مثال دوسری ہو بھی نہیں سکتی۔ حالانکہ ہم نے یہاں فارسی سے قبول شدہ اقدار و اثرات پر گفتگو نہیں کی بلکہ حافظ و خیام کے خمریاتی لہجے کے اثرات جوش کے خمریاتی لہجے پر تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور خمریات میں بھی بخوف طوالت جوش کی ایک نظم سے آگے نہیں بڑھ سکے لیکن "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور اگر ہم جوش کے لہجہ خمریات پر غور کریں تو یہ حافظ و خیام کے لہجے کی بازگشت نہیں بلکہ اس لہجے کی رفعتوں کی جانب پرواز کی آخری منزل نظر آتی ہے۔ حالانکہ جوش نے صرف اتنا ہی دعوی کیا تھا:

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوش کہتے ہیں | کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی

جوش نے خود کو اپنی صدی کا حافظ و خیام کہا تھا اور میں اس شعر کو تھوڑے سے تصرف کے ساتھ اس طرح پیش کرنا چاہتا ہوں:

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوش کہتے ہیں | کہ یہ اردو زباں کا حافظ و خیام ہے ساقی

☆☆☆

زرینہ خان*

عہد اورنگ زیب کی فارسی غزل کا اجمالی جائزہ

ہندوستان میں عہد مغلیہ میں شعرائے جس مخصوص طرز ادا کی داغ بیل ڈالی تھی اس نے رفتہ رفتہ فارسی نظم و نثر کو پوری طرح متاثر کر دیا۔ ہندوستان کے فارسی گو شعرا اور ادبا فیضی اور ظہوری جیسے خیرہ کنندہ اور باکمال صاحبان ہنر کی جوشر بانظم و نثر کی صناعی اور تازگی سے ایسے مبہوت اور متاثر ہوئے کہ وقت کی گزران کے ساتھ ایران کے قدیم طرز کو فراموش کرتے گئے۔ ان کا سرمشق اب حافظ و سعدی کا کلام نہیں بلکہ عرفی اور ابوالفضل کی نظم و نثر تھی۔ لب و لہجہ کی سادگی کی جگہ صناعی، تخیل اور پر پیچ تراکیب و اصطلاحات نے لے لی تھی، بے ساختگی اور روانی کا مقام تصنع اور آرائش لفظی نے حاصل کر لیا تھا۔ اور شعر احساس سے گزر کر ادراک و افکار کی منزل میں آ گیا۔ جو صاحبان سلیقہ تھے انھوں نے اس تغیر سبک اور تبدیلی ادا کو ایک نظم و ضبط کے ساتھ برتا جس سے ان کے کلام میں مزید حسن و لطافت و کشش پیدا ہوئی لیکن افراطیوں نے اس مصنوعی طرز نگارش اور پر پیچ طریقہ ادا کو کچھ ان حدوں کو پہنچا دیا کہ صاحبان ذوق کے نظر و دل محظوظ ہونے کے بجائے مجروح ہونے لگے اور وہ بے ساختہ پکار اٹھے:

> "شعر فارسی یک بارہ گوئی با خواجہ حافظ علیہ الرحمہ بہ بہشت رفت و باز تخت و در فردوس برین با دری گویان جای خوش کرد۔ سبک پیچیدہ و متصنع و بیروح کہ از عالم الفاظ فرو مایہ تجاوز نمی نمود شعر را از قصیدہ و غزل بحالت ابتذال افگند۔ طرز بیان در نثر و نظم سجع و پر از مترادفات و کنایات و استعارات و استدلالات قرآنی است۔ اما این ادبیات روق ادبیات قدیم را نداشت۔"[1]

اٹھارہویں صدی یعنی عہد عالمگیر میں بالعموم شعراء کے کلام میں سبک ہندی اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ وہی پر پیچ تراکیب، مصنوعی عبارت، عبارت اور تخیل کی بلند پروازیاں

* گ۔ فیلو، [illegible]

اور اشارتی و رمزی کیفیت اس دور کے شعر پر بھی غالب نظر آتی ہے۔ اورنگ زیب کی شدت پسند طبیعت نے شعرا کو خواہ مخواہ کی قصیدہ سرائی اور لفاظی سے روکا ضرور لیکن جو انداز فکر اور طرز ادا برسوں سے لوگوں کے ذہنوں کو اپنے تحت تاثیر کیے ہوئے تھا اس کو یک قلم ترک کر دینا ممکن نہ تھا۔ البتہ اس عہد کی شاعری کو گذشتہ ادوار کی شاعری کے مقابلے میں معنوی برتری حاصل ہے۔ راقم الحروف نے اس مقالے میں اٹھارہویں صدی بالفاظ دیگر عہد اورنگ زیب کی غزل گوئی کو موردِ بحث بنایا ہے اور اس کی خوبیاں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

عہد عالمگیر کی شاعری کو جس صنف سخن کے باعث دوام حاصل ہوا اور جو اس عہد کی شاعری کو گذشتہ ادوار کی شاعری سے علیحدہ کرتی ہے اور اسے ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہے وہ 'غزل' ہے۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ اس عہد کی غزل معنوی اعتبار سے گذشتہ ادوار کی غزل سے مختلف ہے۔ اگرچہ تصنع اور لفظی صنائع بدائع کا عنصر اس عہد کی غزل میں بھی نمایاں ہے لیکن خیالات اور افکار کا دائرہ وسیع ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ باوجود شعراء کی تعداد کم ہونے کے اس عہد کی شاعری میں معنوی گہرائی اور بلندی ہے، انفرادیت ہے۔ اس معنوی گہرائی کا سب سے زیادہ اور نمایاں اثر ہم کو غزل پر نظر آتا ہے۔ اب تک غزل عام طور پر محض عشقیہ جذبات و احساسات کے بیان پر مبنی تھی۔ یہ روایت ہندوستان میں ایران سے آئی تھی۔ وہاں اب تک غزل کے موضوعات عموماً عشق اور عاشق کی قلبی واردات کا بیان اور معشوق کے حسن کے بیان تک محدود رہی تھی۔ جب ہندوستان میں فارسی غزل نے رواج پایا تو یہاں بھی شعراء نے اس روایت کو مد نظر رکھا، فرق صرف اتنا تھا کہ ایران کی غزل سادگی اور سرشاری کا نمونہ تھی جس کو اعلیٰ سادہ طرز ادا میں نظم کیا جاتا تھا اور ہندوستان میں عہد مغلیہ کے دوران اور سبک ہندی کے تحت تاثیر آ کر غزل کی زبان اور طرز بیان میں تغیر رونما ہوا اور تصنع، تکلف اور آورد کو دخل ہو گیا۔ لیکن اورنگ زیب کے عہد سے پہلے فقط غزل کی زبان اور طرز ادا میں تبدیلی ہوئی۔ معنوی اعتبار سے فی الجملہ زیادہ تغیر نظر نہیں آتا ہے۔ غزل کے معنی کا تغیر ہی عہد اورنگ زیب کی غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس دور میں غزل کی زبان تو وہی رہی جو مغل دور میں رائج ہو چکی تھی، لیکن اس کے موضوع اور افکار میں نمایاں تبدیلی ہوئی غزل گو شاعر کو اب احساس ہوا کہ عشق و عاشقی کے علاوہ بھی زندگی کے اور بہت سے پہلو ہیں۔ یہ صنف صرف محبوب سے شکوے گلے کرنے اور اس کے حسن و جمال کے بیان کرنے کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ اس کے اشعار میں وہ کائنات کے کنہ و کیف اور اسرار و رموز کی کنج کاوی بھی کر سکتا ہے۔ وہ تمام سوالات جو وجود انسانی، اسرار فطرت، نظام کائنات اور موت و زیست کی الجھنوں کے متعلق اس کے دماغ میں ابھرتے ہیں وہ غزل کے وسیلے سے ان تک پہنچ سکتا ہے۔ عالمگیر کے عہد کا غزل گو شاعر دوسرے ہر دور کے غزل گو سے ممتاز و منفرد نظر آتا

ہے کیونکہ وہ حسن و عشق کے دائرے سے باہر قدم رکھ چکا ہے۔ اور اس کا مطمح نظر اب دو انسانوں کا باہمی رابطہ نہیں بلکہ انسان اور کائنات کا باہمی تعلق اور توازن ہے۔ موضوعات کی یہ گہرائی اور گیرائی، فطرت کی گتھیوں کو سمجھنے اور سلجھانے کا یہ جرأت مندانہ اقدام، فلسفیانہ نکات کو تشبیہات اور استعارات کے پردے میں بیان کرنا ہی عہد عالمگیر کی غزل کو نمایاں اور منفرد بناتا ہے۔ غزل کی ان تمام صفات کو اپنے میں سمو لینے والی اور اس عہد کی غزل گوئی کا Symbol بیدل کی ذات ہے، جس نے فکر و فلسفہ، تفکر و تعقل و احساس و ادراک کی روشنی سے اس تمام دور کو منور کر دیا۔ اگرچہ فلسفہ و فکر کی آمیزش نے اس عہد کی غزل میں رومانیت، اور خود سپردگی کی سرشاری کو کم کر دیا ہے۔ در حقیقت عہد عالمگیر کی غزل والہانہ سرخوشی میں گنگنانے کی نہیں بلکہ خوانندہ سے غور و فکر کا مطالبہ کرتی ہیں۔

عہد عالمگیر کی غزل کی وہ خوبی جو نئی نہیں ہے یعنی سبک ہندی کے دلدادہ دیگر شعرا کے مانند اس عہد کے سخنوروں کو بھی مشکل پسندی اور ایہام مرغوب تھا۔ شعر مصنوع کی وہ روایت جو عہد اکبری میں ذروۂ کمال پر تھی، جہانگیر اور شاہجہاں کے دور میں جاری و ساری رہی، اورنگ زیب کا عہد بھی اس روایت کا پابند نظر آتا ہے۔ سبک ہندی پر نظر رکھنے والا منتقد جانتا ہے کہ یہی مشکل پسندی، ایہام، شعری رمزی کیفیت، عبارت کی پیچیدگی، دور از کار تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال ہی اس سبک کے نمایاں رجحانات ہیں۔ عہد عالمگیر کا شاعر بھی ان تمام بری یا بھلی خصوصیات کو اپنے شعر میں برتتا ہے۔ اس کی توجہ لفظی آرائش، پیچ در پیچ تراکیب کے استعمال، سلسلہ در سلسلہ معانی، اور پر تکلف و مسجع عبارت کی طرف رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو وہ معانی کے حسن کو الفاظ پر قربان کر دیتا ہے اور رعایت لفظی اور استعارہ در استعارہ عبارت کے چکر میں ایسا الجھتا ہے کہ معانی کا سرا اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اس کے نزدیک شعر ایک لفظی گورکھ دھندہ ہے جس میں وہ خود بھی پھنستا ہے اور خوانندہ کو بھی پھنساتا ہے۔ اس کا شعر جتنا زیادہ تشبیہوں اور استعاروں کے پردے میں لپٹا ہوا ہو اس کے شعری ذوق کو اتنا ہی زیادہ مطمئن کرتا ہے۔
غالباً اس دور کا عام پڑھنے والا بھی یہی ذوق رکھتا تھا جس کی تسکین اس قسم کے اشعار سے ہوتی تھی:

دوری از اسباب ما و من تکلف پیوستن است زین تکلف ہا کہ داری اندکی وارستن است[2]

غرہ منشین بکمالی کہ کند ممتازت بیشتر قطرۂ گوہر نشد و یک دریاست[3]

سادگی دل را اسیر فکرہای خام داشت تا تحیر بود در آئینہ فکر آرام داشت[4]

عہد اورنگ زیب کے نمائندہ شعراء ناصر علی، بیدل، غنی کشمیری، صائب، عاقل خاں رازی کی

غزلوں میں ہم کو جا بجا نئی نئی تشبیہات و استعارات اور جدت پسندی کا اظہار ملتا ہے۔ اصطلاحات میں جدت اور تشبیہ و استعارہ میں ندرت اور تازگی پر بیشتر توجہ دی ہے۔ مثلاً غنی کشمیری کا یہ شعر ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے انوکھی تشبیہ دی ہے کہتے ہیں آسمان پر یہ ماہ نو نہیں ہے بلکہ اس کے دل پر ناخن چبھا ہوا ہے، یا محبوب کے ابرو ایک مصرع کی مانند آب زر سے لکھے ہیں:

ہلال نیست کہ ناخن زدہ است بر دل چرخ — نوشتہ مصرع ابروی او بآب طلا[5]

ناصر علی سرہندی کا یہ شعر تشبیہ کی ندرت اور تازگی کا مظہر ہے:

در فیض است منشین از کشایش ناامید اینجا — ہبرگ دانہ از ہر قفل می روید کلید اینجا[6]

بیدل کی غزل میں بھی اصطلاحات نو، تشبیہات و استعارات کی جدت اور طرفگی سے مالا مال ہے۔ ان کا ہر شعر ایک نئی تازگی اور ندرت لیے ہوئے ہے۔ کہتے ہیں عارف کے قلب پر خاص اوقات میں تجلی کا نزول ہوتا ہے۔ اس کی قلبی واردات کا بیان بیدل نے استعارے کی مدد سے کیا ہے:

سحر نسیمے در آمد از در پیام گلزار وصل در بر — چو رنگ رفتم ز خویش دیگر چہ رنگ باشد نثار بوئیت

کف پای تجلہ نشین ما بخیال کرد کمین ما — پی آرزوی جبین ما بچراغ رفت حنا طلب[7]

صائب تبریزی کے بارے میں متقدمین کہتے ہیں کہ ایران میں غزل رودکی سے شروع ہوئی اور صائب پر آ کر ختم ہو گئی، ان کی وفات عہد عالمگیر میں ہوئی۔ انھوں نے غزل میں استعارات و تشبیہات میں خاص طور پر جدت اور اختراع سے کام لیا ہے۔ مثلاً ان کا یہ شعر نذر ہے جس میں وہ محبوب کے دراز گیسو جو ایک چوٹی کی شکل میں اس کی پیٹھ پر لہرا رہے ہیں۔ اسے صائب نے ایک ایسے ہرن سے تشبیہ دی ہے جس کی پیٹھ پر سیاہ خط کھنچا ہے:

کاکل عنبر فشان بر پشت آن سیمین بدن — ہست چون خط سیاہ بر پشت آہوی سفید[8]

اسی طرح غنی کشمیری کا یہ شعر ملاحظہ ہو جو صائب کو اتنا مرغوب تھا کہ وہ اس کے بدلے اپنا پورا دیوان دینے کو تیار تھے:

حسن سبزی بخط سبز مرا کرد اسیر — دام ہمرنگ زمین بود گرفتار شدم[9]

عہد عالمگیر کے شعرا نے نادر و نایاب مضامین، فکر بدیع اور خود ان کی اصطلاح میں "معنی بیگانہ" پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس دور کے غزل گو شعراء کے کلام کو پڑھ کر قاری اپنے آپ کو شعر و ادب کی جدید ترین معانی کی دنیا میں پاتا ہے اور جدید نکات، تازہ و دقیق مضمون و معانی سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ ان کو شعر اکی دقت نظری، باریک اندیشی اور معنی آفرینی دانتوں تلے انگلی دبانے پر مجبور کرتی ہے۔ مثال کے طور پر غنی کا

یہ شعر ملاحظہ ہو:

گر نقلی ز روی نسخۂ حسن تو بردارد — کہ مہ امشب کشید از ہالہ جدول صفحہ روزانہ[10]

ناصر علی کی غزل میں مضمون آفرینی اور تازہ گوئی بام عروج پر ہے۔ انھیں اس فن میں مہارت حاصل ہے۔ ذیل کے شعر میں انھوں نے ایک نیا مضمون پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں شب عید جب بام پر مہ نو دیکھنے کے لیے گئے اور آسمان پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ 'مہ نو' اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز ہے اور کواکب غایب ہیں گویا مہ نو کے باعث انھوں نے اپنے قالب تہی کر دیے ہیں اور غائب ہو گئے ہیں۔ یہاں 'حسن تعلیل' ہے۔

شب عید آمدی بر بام و بر گردون نظر کردی — کواکب ہمچو ماہ نو تہی کردند قالبہا[11]

معانی کی اس تازگی اور ندرت کا زندہ ترین نمونہ کلام بیدل ہے۔ ان کے تقریباً ہر شعر میں نیا مضمون ہے۔ ان کا فن ذہنی اختراع کے باعث اس میدان کا شہسوار ہے۔ انھوں نے اگر کسی روایتی موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے تو اس میں بھی ندرت اور نکھار پیدا کیا ہے اور اپنے مخصوص انداز بیان سے اسے ایک نئے مضمون کا جامہ پہنایا ہے:

تا زندگیست عمر اقامت نصیب نیست — وحشت شکستہ دامن صبح دمیدہ را[12]

زندگی از قماش راحت نیست — تا نفس داری اضطراب فروش[13]

صائب تبریزی کے شعر بھی مضمون تراشی اور خیال بافی کا عمدہ نمونہ ہیں اور شاعر کے پیش نظر افکار دقیق اور مضامین عجیب رہے ہیں۔

سبزی گرود ز حیرت حرف در منقارشان — طوطیان آئینہ گر سازند رخسار ترا[14]

عہد عالمگیر کے شعرا نے غزل میں اختصار نویسی کے فن میں بھی اپنی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ وسیع مطالب کو مختصر ترین الفاظ میں اور ایک ہی شعر میں ادا کرنے کے رجحان نے اس دور کو امتیازی حیثیت بخشی۔ یہ وصف شاعرانہ اصطلاح میں 'ایجاز' کہلاتا ہے۔ اس قسم کے اشعار حافظے پر زور دیے بغیر سمجھ میں نہیں آتے ہیں اور ذہن کو گہرائی تک سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں وسیع مطالب ادا کرنے کے باعث شعر میں الجھاؤ اور پیچیدگی تو ضرور پیدا ہو جاتی ہے اور اس سے شعر کا حسن اور لطافت بھی متاثر ہوتی ہے مگر معنوی اعتبار سے گہرائی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اختصار کے فن میں بیدل نے خاص مہارت اور ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ انسان کا باطن وسیع ہے اہل بصیرت خارجی مظاہر سے لطف اندوز ہونے کے بجائے 'سیر در باطن' کرتے ہیں، اپنی ذات کا عرفان حاصل کرتے ہیں اور اپنی ہستی کی گتھیوں کو سلجھاتے

ہیں۔ لیکن ایک کم ظرف انسان ہوا و ہوس کا غلام ہوتا ہے وہ اپنے باطن کے بجائے اپنے خارجی وجود میں کھویا رہتا ہے۔ اس وسیع مطلب کو اس مختصر شعر میں بیدلؔ نے ہنرمندی سے سمو دیا ہے:

ہمت اگر ہوست گلشد کہ بہ سیر سرو و سمن درآ　　　　تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل گشا بہ چمن درآ[۱۵]

اختصار نویسی کے فن میں ماہر نعمت خان عالی کا یہ شعر ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے وسیع مضمون کو پرو دیا ہے۔ خدا کی عبادت تمام کائنات کا ہر ذی روح کرتا ہے۔ ہر پتا جو زمین پر روئیدہ ہے وہ دراصل زمین کی زبان ہے جو خدا کی حمد و ثنا کر رہا ہے۔ آسمان کی جنبش بھی دراصل حمد و ثنا ہے:

تنہا فلک از ذکر خدا نیست بجنبش　　　　ہر برگ کہ روئیدہ زبانیست زمین را[۱۶]

عہد عالمگیر کے شعرا نے دیگر 'سبک ہندی' کے شعرا کی طرح بیشتر مبالغہ آرائی اور غلو سے کام لیا ہے۔ عہد اکبری کے قصیدہ گو شعرا نے مبالغہ آرائی سے اپنے قصاید کو دلکش و جاذب بنایا ہے، کہ مبالغہ اور تغزل ہی قصیدہ کی روح ہے۔ چونکہ اورنگ زیب مدح گوئی کے سخت خلاف تھا۔ اس لیے اس دور میں قصیدہ تقریباً متروک ہو چکا تھا لہٰذا غزل گو شعرا نے اس مبالغہ آرائی کو اپنی غزل میں صرف کیا اور اس عہد کی شناخت اس خصوصیت کے باعث ہونے لگی۔ جو درحقیقت قصیدے کا وصف ہے۔ غنی کشمیری اور ناصر علی کے اشعار میں بیشتر مبالغہ آرائی سے مملو اشعار ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند ابیات نذر ہیں:

غنی کشمیری: چشم ما روشن شد از خاک در میخانہ ہا　　　　ریختند از سرمہ گویا رنگ این کاشانہ ہا[۱۷]

ناصر علی: از سر خاکی کہ آن شیرین شمایل بگذرد　　　　بیضۂ طوطی شود تخم بجای دانہ ہا[۱۸]

عہد عالمگیر کے شعراء نے طرز ادا کی جدت پر خصوصی توجہ دی ہے اور اس فن میں اپنی استادی اور قدرت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ بات نہیں کہ اس عہد کے شعرا نے ہمیشہ ہی کوئی نئی بات کہی ہو، یا کسی نئی حقیقت کا انکشاف کیا ہو، اس دور کے شعرا کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اگر انھوں نے روایتی موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے تو اس میں بھی نئے نکتے پیدا کیے ہیں اور نئے معنی دیے ہیں۔ مثال کے طور پر قصہ شمع و پروانہ روایتی اور قدیم ترین ہے اور قدیم زمانے سے شعراء کے سر مشق رہا ہے اور عموماً روایتی معنی ہی اس سے وابستہ رہے ہیں، لیکن جب بیدلؔ نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تو اس 'پیش پا افتادہ' مضمون کو تازگی بخشی:

چون شمع سربلندی عشاق صفت نیست　　　　آخر بقدر سوختن ست آبروی ما[۱۹]

عہد عالمگیر کے شعرا فن ارسال المثل میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ تمثیلی اشعار میں شاعر پہلے مصرع میں کوئی دعویٰ کرتا ہے اور اپنے دعوے کی صداقت کے لیے دوسرے مصرع میں ایک دلیل پیش کرتا ہے۔ عموماً اس فن تمثیل اور استدلال کا استعمال شعرا نے اخلاقی مضامین کے لیے کیا ہے۔ فن تمثیل کی ابتدا

فارسی شاعری میں امیر خسرو نے کی اور اس کو عروج پر پہنچایا صائب تبریزی نے۔ عہد اورنگ زیب کے شاعر غنی کشمیری نے صائب کی پیروی کی اور اسے مستقل فن بنا دیا۔ اس کی پیروی ان کے بعد آنے والے شعراء نے کی۔

غنی کشمیری:

لباس ما سبک ساران تعلق بر نمی تابد　　　　بود چون حباب از بخیہ خالی پیرہن ما را
فلک در گردش است از بہر خواب بخت ناسازم　　　　بود در جنبش گہوارہ راحت طفل بد خو را[۲۰]

اشرف مازندرانی:

دلبران را بہر مستوری نقاب اندازیست　　　　شمع را در پردۂ فانوس پنہان کردنست[۲۱]

ماہر اکبرآبادی:

ز جود پر تہی از زر، کف حاتم نمی گردد　　　　فروغ آفتاب از نور بخشی کم نمی گردد[۲۲]

عہد عالمگیر میں فلسفیانہ اور اخلاقی شاعری کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ غالباً اس کی وجہ اس زمانے کے معاشی حالات تھے۔ معاشرے میں کچھ ایسی اخلاقی پستی آ گئی تھی جس نے مجبور کیا شعرا کو معاشرے کی اصلاح کے لیے، اور اپنی شاعری کو انھوں نے وسیلہ بنایا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اورنگ زیب ذاتی مدح گوئی اور تملق کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ لہٰذا شعرا جو شعر کہتے وہ بادشاہ وقت کے تفنن طبع کے لیے نہیں بلکہ اپنے احساسات درونی اور خارجی عوامل سے متاثر ہو کر ان کے قلم سے نکلتے تھے۔ بیدلؔ کے یہاں ہم کو اخلاق و پند و نصائح پر مشتمل اشعار کثرت سے ملتے ہیں جن میں بیدلؔ ہم کو اعلیٰ اخلاقی اقدار کے نقیب نظر آتے ہیں۔

ای بغیر از کم فروان شکوہ چہ لازم　　　　آدم نبود آنکہ ز حیوان گلہ دارد[۲۳]

غنی کے یہاں بھی ہم کو اخلاقی موضوعات سے مملو اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔

نی باشد مخالف قول و فعل راستان باہم　　　　کہ گفتار قلم باشد ز رفتار قلم پیدا[۲۴]

عہد عالمگیر کی غزل کی ایک اور خوبی جو 'سبک ہندی' سے ناشی ہے، وہ یہ ہے کہ اس عہد کے شعرا نے صنائع و بدائع کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ شعراء نے بیشتر صفت تلمیح، تضاد، مراۃ النظیر، ایہام، تشبیہ کا اپنے اشعار میں بڑا خوبصورت و برمحل استعمال کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

صنعت تضاد:

گفتگو یکرنگ نبود غافل و ہشیار را　　　　در نفس باشد تفاوت خفتہ و بیدار را[۲۵]

صنعت مراۃ النظیر:

ز شوقِ حسنِ گندم گون بگندم کردہ او آدم — نیم فرزند آدم گر گزاری روی نیکو را[۲۶]

ذیل کے شعر میں صائب نے قاصد، کبوتر، نامہ، پیغام وغیرہ الفاظ استعمال کیے ہیں جو صنعت مراعات النظیر کا دلکش نمونہ ہے:

در دیار اہل غیرت قاصد پیغام نیست — نامہ مقراض پر و بال کبوتر می شود[۲۷]

تلمیح غزل کا بنیادی عنصر ہے اور غزل کا حسن اس کے خوبصورت اور برمحل و بامعنی استعمال سے اجاگر ہوتا ہے۔ غنی کشمیری نے نہایت خوبصورتی سے اپنے اشعار میں قصہ "یوسف و زلیخا" کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

غنی روز سیاہ پیر کنعان را تماشا کن — کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

خضاب موی زلیخا مگر کند یوسف — کہ بردہ است سیاہی ز دیدۂ یعقوب[۲۸]

اس عہد کے شعرا نے خالص فلسفیانہ غزلیں کہی ہیں۔ اکثر شعرا نے فلسفہ کے ساتھ تصوف کو بھی آمیختہ کیا ہے، لیکن کلام میں دلکشی و دلنشینی برقرار رکھی ہے۔ اس دور کے غزل گو شعرا کی غزلیں باوجود فلسفہ و تصوف کی آمیزش کے، خوانندہ کے دامن دل کو کھینچتی ہیں۔ ان شعرا میں سرفہرست غنی کشمیری، ناصر علی اور بیدل ہیں۔ چند اشعار ان شعرا کے ملاحظہ ہوں:

ہزاران معنی باریک باشد بیت ابرو را — بغیر از موشگافان کس نفہمد معنی ابرو را

عنان نفس کشیدن جہاد مردان است — نفس شمردہ زدن کار اہل عرفان است[۲۹]

ما گرفتاران ہستی را بہ چشم کم مبین — بوی یوسف میدمد ہر ذرہ از زندان ما

علی تار نفس در سینہ مہجوم نمی یابم — ز گوہر قطرہ دارد ابر نیسانی کہ من دارم[۳۰]

بیدل:

در تماشاگاہ ہستی کور نتوان زیستن — محرم آن جلوہ شو یا مرگ ناگاہی گزین

چشم عبرت ہر کہ بر اوراق روز و شب کشود — ہیچو بیدل معنی بی حاصلی فہمید و رفت[۳۱]

عہد عالمگیر کی غزل کی ایک اور خوبی جو خوانندہ کے دامن دل کو کھینچتی ہے یہ ہے کہ غزل میں موسیقی

اور غنائیت کا عنصر غالب ہے۔ اس عہد کے شعرا نے اکثر ترنم ریز غزلیں کہی ہیں۔ یہ وصف ہم کو اس عہد کے شعرا میں نمایاں نظر آتا ہے۔ غنی، بیدل اور ناصر علی کے یہاں ہم کو نغمہ بار غزلیں ملتی ہیں۔ جن میں طولانی بحریں الفاظ کی دروبست اور تکرار سے موسیقی پیدا کی ہے۔ یہ غزلیں اگرچہ فکری اعتبار سے سنجیدہ و متین ہیں لیکن ساتھ ساتھ ان میں دلکشی، لطافت، رنگینی بھی ہے۔ یہ ترنم ہم کو بیدل کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ ملتا ہے۔ ان کے کلام میں جہاں فلسفہ کی خشکی ہے وہیں ایسی غزلیں بھی ہیں جو باوجود فلسفیانہ ہونے کے مترنم ہیں۔ خوانندہ کے کانوں میں رس گھولتی ہیں اور ذہن و دل کو طراوت بخشتی ہیں۔

بیدل: کہ کشیدہ ای ز خرامت کہ بسیر باغ نمی آمدی — تو بہار عالم دیگری ز کجا باین چمن آمدی

شعلہ ہستی بی اثر چہ نقاب شوق کم از حیا — تو کجا بہ نظری کی کردی عرق کم از حیا[۳۲]

ناصر علی کی غزلیں بھی ترنم ریز اور نغمہ بار ہیں انھوں نے بحروں کے انتخاب سے اور مخصوص ردیف و قافیہ کی مدد سے اشعار میں لطافت، شیرینی اور موسیقیت پیدا کی ہے۔ ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

چشم خود معروف نالہ دیدن آرزو دارم — یک دو دم با این شرر پریدن آرزو دارم

چون زخم را از ریزۂ الماس پر کردم — باین خندان لب تیغش گزیدن آرزو دارم[۳۳]

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ عہد اورنگ زیب کی شاعری ایک مخصوص رنگ اور آہنگ رکھتی ہے۔ جو ہمیں گذشتہ ادوار میں معدوم نظر آتی ہے۔ اس عہد میں خصوصاً غزل ترقی کی معراج پر پہنچی۔ غزل اصناف سخن کی وہ لطیف شاخ جو بیشتر حسن و عشق کے موضوعات کی تعبیر سے اختصاص رکھتی ہے لیکن عہد عالمگیر کی غزل میں فلسفہ، اخلاقی، اجتماعی، معاشرتی موضوعات اور تصوف اس طرح باہم آمیختہ ہو گئے ہیں کہ انھیں جدا کرنا محال ہے۔ یہی وہ مشخصات ہیں جو عہد عالمگیر کی غزل کو ممتاز و منفرد کرتے ہیں۔

مآخذ:

۱- سبک شناسی ج ۳، مصنف محمد تقی بہار، چاپ ایران
۲- دیوان بیدل مع نکات ۱۳۰۳ھ مرزا عبدالقادر بیدل، نول کشور لکھنؤ
۳- دیوان غنی ۱۹۹۳ء، غنی کشمیری، جموں کشمیر اکیڈمی، سری نگر
۴- کلیات صائب تبریزی، میرزا صائب تبریزی، نول کشور لکھنؤ
۵- دیوان نعمت خان عالی (مخطوطہ) ۱۳۰۲ھ نعمت خان عالی، حبیب گنج کلکشن، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ
۶- دیوان ناصر علی، ۱۸۷۹ء، ناصر علی سرہندی، منشی نول کشور لکھنؤ

۷- Dreams Forgotten، ۱۹۸۴ء، پروفیسر وارث کرمانی، اے۔ایم۔یو پریس، علی گڑھ
۸- تذکرہ خزانۂ عامرہ، مؤلف میر غلام علی آزاد بلگرامی، نول کشور، کانپور

حواشی:

۱- سبک شناسی، ج ۳، ص ۱۸۶
۲- دیوان بیدل مع نکات، ص ۱۰۴
۳،۴- ایضاً، ص ۸۹، ۱۰۲، ۱۶۴
۵- دیوان غنی کشمیری، ص ۷
۶- دیوان ناصر علی، ص ۷
۷- دیوان بیدل مع نکات، ص ۲۸-۲۹
۸- کلیات صائب تبریزی، ص ۳۱۰
۹،۱۰- دیوان غنی، ص ۹۰-۱۹۱
۱۱- دیوان ناصر علی، ص ۵
۱۲،۱۳- دیوان بیدل مع نکات، ص ۳۳-۱۶۶
۱۴- کلیات صائب تبریزی، ص ۵۶
۱۵- دیوان بیدل، ص ۸-۱۱۹
۱۶- دیوان نعمت خان عالی (مخطوطہ) ص ۹
۱۷- دیوان غنی کشمیری، ص ۹۲
۱۸- دیوان ناصر علی، ص ۹
۱۹- دیوان بیدل مع نکات، ص ۳۰
۲۰- دیوان غنی کشمیری، ص ۵۹
۲۱- Dreams Forgotten، ص ۳۰۹
۲۲- خزانۂ عامرہ، ص ۴۲۰
۲۳- دیوان بیدل مع نکات، ص ۱۳۲
۲۴،۲۵- دیوان غنی کشمیری، ص ۲۶

۲۶- دیوان نعمت خان عالی (مخطوطہ)
۲۷- کلیات صائب تبریزی، ص ۵۰۷
۲۸- دیوان غنی، ص ۹۳، ۵۸
۲۹- دیوان غنی کشمیری، ص ۱۰۳، ۹۰
۳۰- دیوان ناصر علی، ص ۷۳، ۹
۳۱- دیوان بیدل، ص ۱۰۸، ۲۳۰
۳۲- دیوان بیدل مع نکات، ص ۱۴
۳۳- دیوان ناصر علی، ص ۷۵، ۷۳

☆☆☆

آزاد حسین*

سلک السلوک ضیاء نخشبی — ایک تعارف

''سلک السلوک'' ضیاء نخشبی کی ایک بہت مشہور و معروف تصنیف ہے۔ اگر اس کتاب کو فن معرفت و سلوک میں بے نظیر و بے مثال کہا جائے تو شاید مبالغہ آرائی نہیں ہوگی۔ اس کتاب کا ہر ہر لفظ معرفت کے پیمانے سے چھلکتا ہوا عرفان کا جام شراب ہے۔ یوں تو ضیاء نخشبی کی دیگر تصانیف بھی موجود ہیں لیکن سلک السلوک اپنی شیریں بیانی اور لطافت زبانی کی بنیاد پر امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ان کی تمام تصنیفات کا اجتماعی طور پر تذکرہ کرتے ہوئے انفرادی طور پر ''سلک السلوک'' کا ذکر کرتے ہیں جو انہیں سب سے زیادہ پسند تھی۔ چنانچہ اپنی تصنیف اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں:

> ''سلک السلوک او بغایت کتاب شیرین و رنگین است بزبانی لطیف و موثر، مشتمل بر حکایات مشائخ و کلمات ایشان، اکثر تصنیفات وی مملوست از قطعہای کہ ہمہ یک طریقہ، یک نمط واقعہ''[1]

اگر بنظر دیگر ہم ان کی تمام تصنیفات پر اجتماعی نظر ڈالتے ہیں تو غیر معمولی اہمیت کی متحمل نظر آتی ہیں جیسا کہ خزینۃ الاصفیاء کے مصنف اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''این ہمہ کتب مملو از قطعات رنگین و دلچسپ کہ بیک طریق و یک طرز واقع شدہ اند''[2]

ان کی تمام تصنیفات میں ''سلک السلوک'' اور ''طوطی نامہ'' بہت زیادہ مقبول ہوئیں۔ اس کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بیان کی جا سکتی ہے کہ نخشبی جس مسئلے کو بیان کرتے ہیں خواہ وہ توبہ، حال اور وجد ہو، قبض و بسط، علم الیقین، حق الیقین، مشاہدہ یا اس کے علاوہ اور کوئی بھی مسئلہ کیوں نہ ہو، ایسی صفائی اور دلکشی سے بیان کرتے ہیں کہ خوانندہ کے دل میں گھر کرتا چلا جاتا ہے۔ یہی پاکیزگی تخیل اور شگفتگی عبارت،

* پروجیکٹ فیلو، مرکز تحقیقات فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سلک السلوک کو اہم اور مفید بنا دیتی ہے۔ اصطلاحات کی تشریح کے بعد وہ اقوال و احادیث اور علماء مشائخ کے ارشادات سے اس کی وضاحت کرتے ہیں اور بسا اوقات قرآنی آیات کو بھی دلائل و براہین کے طور پر استعمال کیا ہے جو سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور پھر جستہ جستہ جو ان کا مخصوص اور منفرد انداز بیان ہے اس کے ذریعہ مخاطب کرتے ہیں اور دلچسپ واقعہ کے ذریعہ اس کی وضاحت کرتے ہیں اور جب کسی نازک مسئلے کو بیان کرنا ہوتا ہے تو ''عزیز من'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، جس سے اس کی وضاحت و صراحت اور صداقت و تیقن سے روز روشن کا کوئی پہلو باقی نہیں رہ جاتا اور اگر تصوراتی دنیا میں سیر کرنے والے کے لیے کوئی پہلو باقی رہ بھی جاتا ہے تو وہ اپنے مناسب اور موزوں قطعات کے برمحل استعمال سے جو انگشتری سے نگینے کی مناسبت کے مترادف ہوتا ہے، دور ہو جاتا ہے۔

صوفیائے کرام کا طریقہ رہا ہے کہ وہ پہلے عمل کرتے ہیں اس کے بعد دوسروں کو اس کار خیر کے کرنے کا حکم صادر فرماتے ہیں یعنی ماذا تقولون مالا تفعلون کا عملی کردار ہوتے ہیں اور اپنے اقوال و افعال دونوں کے ذریعہ عبد حقیقی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں نخشبی سلک السلوک میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں جس سے قرآن مقدس کی آیت مقدسہ ماذا تقولون مالا تفعلون کی وضاحت بھی ہوتی ہے

> ''عالمان عالم حقیقت گویند، بندہ چنانچہ باقوال بندہ است ہمی باید کہ بافعال ہم بندہ باشد''[3]

عالم حقیقت کے علماء کہتے ہیں، بندہ جیسا کہ اپنے اقوال سے بندہ ہے، چاہیے کہ افعال سے بھی بندہ ہو۔

> ''وقتی طائفہ یحیٰی معاذ را گفتند مارا پندی دہ گفت کونوا عبیدا بافعالکم کما کنتم عبیدا باقوالکم آری چنان باش کہ بنمائی و چنان نمائی کہ باشی و چنین بودن و چنین نمودن کاریست بس عظیم''

> ''ایک مرتبہ ایک جماعت کے لوگوں نے یحیٰی معاذ سے کہا: ہمیں نصیحت کیجیے۔ انھوں نے فرمایا: تم اپنے افعال کے ذریعہ بندگی کا ثبوت دو، جیسا کہ تم اپنے اقوال کے ذریعہ بندہ ہو، یعنی تم ویسے ہو جاؤ جیسا دکھا رہے ہو اور ویسے ہی دکھو جیسا کہ تم ہو اور جیسا ہونا ویسا ہی دکھانا بہت بڑی بات ہے۔''

دوسری حکایت بیان کرتے ہیں:

''حسن بصری نے اپنے دوستوں میں سے ایک سے کہا، آپ
مخلوق کو نصیحت کیوں نہیں کرتے انھوں نے کہا میں ڈرتا ہوں کہ
کہیں وہ چیز نہ کہہ دوں جو میں خود نہیں کرتا۔ حسن نے کہا اللہ آپ
پر دائمی رحمت کرے، جو کہتے ہو وہ کرو۔ اے میرے پیارے وہ
لوگ جن کا قول ان کے فعل کے مطابق ہو، کم ہیں اور وہ جن کا
کام ان کے قول کے برعکس ہے بہت ہیں۔ حکماء کہتے ہیں، لوگوں
کے چار گروہ ہیں، پہلے وہ جو کرتے ہیں کہتے نہیں، پھر وہ جو کہتے
ہیں اور کرتے بھی ہیں، پھر وہ جو صرف کہتے ہیں کرتے نہیں، پھر
وہ جو نہ تو کہتے ہیں اور نہ کرتے ہیں۔ اے برادر کہنے اور نہ کہنے
سے کام کی ترقی نہیں ہوتی۔ کام کرنا چاہیے اگر تمام اچھے کام نہیں
کر سکتے تو تمام اچھے کاموں کو چھوڑو بھی مت''۱۴

سالکین راہ سلوک اتباع نفس کی مخالفت اور اس کام کو کرنا جس کا نفس متقاضی ہو، ناپسند کرتے ہیں اور بہت حد تک یہ طریقہ ان کی زندگی میں جزو لاینفک کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اس بات کے قائل و فاعل ہیں کہ کسی کا محکوم ہونا نفس کے محکوم ہونے سے بہتر ہے۔ اس نظریے کو مرکز بنا کر ایک دل کو چھونے والا واقعہ بیان کرتے ہیں:

''سجادہ نشینوں میں سے ایک جو صرف ہر جمعہ کو خانقاہ سے باہر آتا
اور دوستوں سے پوچھتا کہ مسجد جانے کا کیا راستہ ہے۔ ایک دن
ایک شخص نے اسے کہا، سالوں ہو گئے مسجد جاتے ہوئے اور
تو راستہ نہیں جانتا؟ کہا جانتا ہوں لیکن وہ راستہ جس میں ہم نے
قدم رکھا ہے اس میں کسی اور کا محکوم ہونا نفس کے محکوم ہونے سے
بہتر ہے''۱۵

ضیاء الدین آپ کا اسم مبارک تھا اور جائے قیام بدایوں تھا۔ اصلی وطن نخشب (بخارا) تھا۔ اسی مناسبت سے شاعرانہ تخلص نخشی اختیار کرتے تھے۔ زندگی کے شب و روز گوشہ تنہائی میں گزارے مگر اپنی صلاحیت و استعداد کی وجہ سے شہرت و نامداری کی سرحدوں کو پار کر گئے۔ وطن اصلی کے سلسلے میں تو چہل ناموس میں لکھتے ہیں:

ز ہر شہری و ہر جائی متاع قیمتی خیزد ضیاء از نخشب و شکر ز مصر و سعدی از شیراز

نخشی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، میدان علم و فضل اور کمال میں شہرۂ آفاق تھے مگر دنیوی مال اور جاہ و حشمت سے محروم تھے، عسرت و تنگی کو گلے سے لگایا اور زندگی کے نشیب و فراز کو اتنی خوش طبعی سے گزارا کہ ''الفقر فخری'' کا عملی نمونہ نظر آتے ہیں، جو ان کے لیے باعث تسلی بھی تھا، فرماتے ہیں:

نخشی نقد دین ز دست مدہ خلق فضل کریم مر ہمہ یافت
فقر را پای بر سر گنج است نقد دین ہر کہ یافت ہر ہمہ یافت

عزت و شہرت کے خواہاں نہ رہے چونکہ انھوں نے اپنے دل کی دنیا سوز و مستی اور جذب و شوق سے تعمیر کی تھی اور تمنا تھی کہ اس سوز و مستی کی سرسبز و شادابی پر موسم خزاں کا اثر نہ ہو، دل کے نہاں خانوں سے بھی صرف یہی دعا زبان پر آتی تھی:

الٰہی اہل دل را ذوق دل دہ ضیاء نخشی را شوق دل دہ

منگولوں کے تسلط کے بعد جب حالات از حد گزر گئے تو دیگر مسلمانوں اور علماء کی طرح نخشی نے بھی ہندوستان کا رخ کیا اور بدایوں جو شمالی ہند میں واقع ہے، سکونت اختیار کی۔ نوعمری کا زمانہ تھا کسب علم سے مکمل طور پر تشنگی نہیں بجھی تھی چنانچہ شہاب الدین مہمرہ کی شاگردی اختیار کی جو صاحب علم و فضل ہونے کے ساتھ ساتھ بقول امیر خسرو اپنے زمانے کے استاذ الشعراء بھی تھے اور بدایوں میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ نخشی کے ہندوستان میں آنے کا زمانہ بقول عصامی کے وہ زمانہ تھا کہ:

بسی عالمان بخارا نژاد بسی زاہد و عابد و ہر بلاد
در آن شہر فرخندہ جمع آمدند چون پروانہ بر نور شمع آمدند

ہوائے نفس کو مغلوب اور عبادت و ریاضت کو غالب کرنے کے لیے کم خوردنی اور فاقہ کشی صوفیاء کرام کے نزدیک محبوب ترین شئی ہے۔ بقول نخشی شیطان شکم سیر ہو کر کھانے والے سے محبت کرتا ہے اگرچہ وہ عبادت الٰہی میں کیوں نہ مصروف ہو اور فاقہ کش انسان سے شیطان گریز کرتا ہے اگرچہ وہ خواب غفلت میں ہو، اس کی وضاحت کرتے ہوئے نہایت فصیح و بلیغ زبان میں ایک حکایت بیان کرتے ہیں:

''شیطان کہتا ہے، شکم سیر اگرچہ نماز میں ہو میں معانقہ کرتا ہوں
اور بھوکا جو سو رہا ہو اس سے دور بھاگتا ہوں، جاننا چاہیے کہ پیٹ
بھرا انسان جب نماز سے باہر ہوگا تو شیطان اس پر کس حد تک
مسلط ہوگا اور بھوکا اگرچہ نماز میں ہو کس قدر شیطان کو اس سے
نفرت ہوگی۔''۱۶

مزید وضاحت صراحت کے لیے ایک مرد فقیر کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں اور اپنا قطعہ

بھی نقل کرتے ہیں تاکہ قاری کے ذہن میں شکوک وشبہات کا کوئی گوشہ باقی نہ رہ جائے۔

"ایک شخص ایک فقیر کے پاس گیا اور کہا مجھے عبادت کرنا سکھاؤ۔
فقیر نے کہا: تو کھانا کیسے یعنی کتنا کھاتا ہے۔ پیٹ بھر کے یا آدھا
پیٹ۔ اس نے کہا: پیٹ بھر کے۔ فقیر نے کہا: پیٹ بھر کے کھانا
جانوروں کا طریقہ ہے۔ جاؤ پہلے کھانا کھانا سیکھو، اس کے بعد آؤ
تاکہ میں تجھ کو عبادت کرنا سکھاؤں" ے

تصوف وعرفان ایک ایسا بحرِ بیکراں ہے جس کی تہوں تک پہنچ کر دُرِ نایاب حاصل کرنا امرِ دشوار ہے، لیکن اس میں قدم رکھنے کے بعد اس کے مختلف عناصر ذہن کے پردے پر منعکس ہوتے ہیں اور ہر عنصر اپنے اندر ایک خاص پہلو رکھتا ہے۔

تصوف وعرفان کی راہوں پر گامزن ہو کر اپنے وجود کو فنا فی اللہ کی سرحدوں سے گزر کر بقا کی زندگی حاصل کرنا آسان نہیں۔ عشاقانِ راہِ الٰہی کے دلوں میں سوز و مستی اور جذب وشوق کا وہ آتشیں شعلہ بھڑک رہا ہوتا ہے جس کا تقابل وتوازن کرنے سے دنیاوی طاقتیں قاصر ہوتی ہیں۔ شرابا طہورا کا جامِ سرمست ان کے دل کی دنیا کو آئینۂ معرفت بنا کر ایک غیر مجسم اور غیر مصور کی شبیہ ان کے دل میں جلوہ گر کر دیتا ہے۔ جس کے وصال و دیدار کی تمنا میں جان قربان کر دیتے ہیں اور احساس نہیں ہوتا اور اس مقام پر فائز ہو جاتے ہیں جہاں سالک فنائیت کے مقام پر متمکن ہو جاتا ہے اور وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کی عکاسی امیر خسرو نے کی ہے:

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی
تاکس نگوید بعد از این من دیگرم تو دیگری

اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نخشبی ذوالنون مصری ایک واقعہ نقل کرتے ہیں:

"نقلست ذوالنون مصری میگوید رحمۃ اللہ علیہ روز عید خلق بقربانی
مشغول بود وکسی بکسی چون زمانی بگذشت روی سوی آسمان
کرد وگفت ان ہولاء تقربوا الیک بقرابینہم وانا لا اجد شیا سوی
نفسی انا اتقرب الیک بذبحہا ثم اشار بسبابۃ حلقۃ فخط فیہ خطا کما
یفعل بالسکین فخر میتا۔
نخشبی جان بباز در رہ عشق عشق در چشم خلق خاری دان"

ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، فرماتے ہیں:

"قربانی کے دن تمام مخلوق قربانی میں مشغول تھی اور کوئی کسی کو
نہیں دیکھ رہا تھا۔ ایک جوان میرے پاس کھڑا تھا اور بالکل
خاموش تھا، جب تھوڑی دیر گزر گئی تو اس نے اپنا چہرہ آسمان کی
طرف کیا اور کہا بے شک یہ لوگ گائے کی قربانی سے تمہارا تقرب
حاصل کر رہے ہیں اور میرے پاس میری ذات کے علاوہ کوئی
تحفہ نہیں ہے جسے پیش کر سکوں، میں اسی کو تیری راہ میں قربان کر
کے تقرب حاصل کر رہا ہوں۔ پھر اس نے اپنی شہادت کی انگلی
سے اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا اور اسے چھری کی طرح گھونپ
دیا اور مردہ ہو کر گر گیا" ۸

نخشبی ایک جگہ مردِ فقیر اور مالدار کی حالت بیان کرتے ہیں اور دونوں کو چار چیزیں حاصل ہوتی ہیں مگر دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک مالدار جب دنیا کو الوداع کہتا ہے تو غم واندوہ کا کوہِ گراں لے کر جاتا ہے۔ مگر ایک مردِ فقیر جب دنیا سے جاتا ہے تو نہ صرف مسرت وشادمانی کے شادیانے بجاتا ہوا جاتا ہے بلکہ **الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون** کا عملی پیکر بن کر جاتا ہے۔ فرماتے ہیں، اس سے متعلق ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

"مالداروں کو مالداری سے چار چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ جسم کی
تکلیف، دنیا کی مشغولیت، دین کی کمی اور قیامت کا حساب۔
درویشوں کو بھی اپنی درویشی سے چار چیزیں حاصل ہوتی
ہیں۔ جسم کی آسائش، دل کی فراغت، دین کی سلامتی اور قیامت
سے چھٹکارا۔ مال دار منکر نکیر سے چھٹکارا پاتے ہیں اور فقرا حق کی
مجلس میں عظیم قدرت والے بادشاہ کی بارگاہ میں پہنچے ہوتے ہیں" ۹

پھر ایک بہت دلچسپ، شبلی علیہ الرحمۃ کا واقعہ نقل کرتے ہیں:

"شبلی کو وصال کے بعد لوگوں نے خواب میں دیکھا۔ کہا تو نے
منکر نکیر کے سوال سے کیسے چھٹکارا پایا؟ انھوں نے کہا: یہ پوچھنے
کی چیز ہے؟ اگر اس وقت تم لوگ وہاں ہوتے تو دیکھتے کہ منکر
نکیر مجھ سے کیسے چھٹکارا پائے اور باہر ہوئے۔ جب ان لوگوں
نے آغاز کیا کہ تمہارا رب کون ہے؟ تو میں نے کہا اے فرشتو مجھ
سے کہہ رہے ہو، کہ تمہارا رب کون ہے؟ میرا خدا وہ ہے کہ جس

نے تم لوگوں کو تمام ملائکہ کے ساتھ میرے باپ آدم کا سجدہ کرنے
کا حکم دیا کہ **اسجدو لآدم** آدم کا سجدہ کرو اور میں اس وقت
اپنے تمام بھائیوں کے ساتھ اپنے باپ کے صلب اطہر سے تم
لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ منکر نکیر نے کہا ہمیں اس کے پاس سے چلنا
چاہیے۔ اس لیے کہ ہم سوال اس سے کر رہے ہیں اور یہ تمام
ذریات آدم کا جواب دے رہا ہے۔" [۱۰]

اس کے علاوہ تصوف و عرفان، معرفت و طریقت و حقیقت کے بے شمار واقعات تحفی کی اس
کتاب میں درج ہیں۔

سالکین راہِ سلوک کا ہر کام خالص اور رضائے الٰہی کے لیے ہوتا ہے۔ ریاکاری و مکاری کا شائبہ
تک اس میں نہیں پایا جاتا۔ تحفی فرماتے ہیں:

"مردان خدای ہر چہ کنند از برای خدای کنند و نیت ایشان ہمہ بر
حق باشد نہ دون حق"

یعنی مردِ فقیر جو بھی کام کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے کرتا ہے
اور اس کی نیت میں ہمیشہ خدا کی ذات ہوتی ہے نہ کہ اس کے
علاوہ۔

اس کی وضاحت کرتے ہوئے بڑا دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں:

"ایک مردِ فقیر نے ایک تارک الدنیا شخص کے لیے کھانا جمع کیا
جو پانی کے کنارے رہتا تھا اور اپنی بیوی سے کہا کہ پانی کے
کنارے جو فقیر بیٹھا ہے اسے دے دو۔ عورت نے کہا کہ پانی
ڈوبنے والا ہے اور گزرنے کے لیے کوئی آلہ نہیں میں پار نہیں
کر سکتی۔ اس شخص نے کہا جاؤ اور پانی سے کہنا میرے اس شوہر
کی عزت کا واسطہ کہ جس نے کبھی بھی میرے ساتھ صحبت نہیں کی
ہے، مجھ کو راستہ دے، پانی کے کنارے گئی اور یہ بات کہی، وہ پھٹا
اور راستہ پیدا ہو گیا، وہ عورت گزر گئی اور کھانا فقیر کو دے دیا، وہ
فقیر اس کے سامنے کھایا بھی اور کہا واپس جاؤ، عورت نے کہا
میرے شوہر نے ایک بات کہی تھی، اس کی برکت سے میں پانی

پار کر گئی اور اب کس چیز کو ظاہر کر کے پانی سے گزروں؟ درویش
نے کہا جاؤ اور پانی سے کہو اے پانی اس درویش نے تیس سال
سے کھانا نہیں کھایا ہے۔ اس عظمت کے واسطے سے راستہ دے
دو۔ عورت نے ایسا ہی کہا اور راستہ ظاہر ہو گیا، عورت گھر آئی اور
کہا، اے خواجہ، تو سالوں سے میرے ساتھ صحبت کر رہا ہے اور
اس درویش نے بھی میرے سامنے کھانا کھایا ہے میں دو جھوٹ
اس پانی سے بولی۔ پھر بھی مجھے کیسے راستہ دے دیا۔ شوہر نے کہا
تو نے جھوٹ نہیں بولا۔ اس لیے کہ میں نے جب بھی تم سے صحبت
اختیار کی ہے وہ تیرے حق کی ادائگی کے لیے، نہ کہ اپنے نفس کی
خواہش کے لیے اور اس درویش نے بھی تیس سال سے اپنے نفس
کی خواہش کے لیے کھانا نہیں کھایا ہے۔ مگر صرف اس لیے کہ
اطاعت و فرمانبرداری کی طاقت حاصل ہو جائے" [۱۱]

اہل تصوف و عرفان کا یہ طریقہ ہے کہ ان کی ایک نظر کی غفلت سالہا سال کی عبادتوں کو رائگاں کر
دیتی ہے۔ تحفی اس سلسلے میں ایک حکایت یوں بیان کرتے ہیں:

"بنی اسرائیل میں رواج تھا کہ جب کوئی عابد ساٹھ سال عبادت
کر لیتا تو اس کے سر پر ابر سعید اپنا سایہ کر دیتا۔ ایک مرتبہ ایک
عابد نے ساٹھ سال عبادت کی مگر اسے یہ سعادت نصیب نہ
ہوئی۔ دوسرے عابدین اس کے پاس گئے اور کہا تو نے کیسے
عبادت کی، کہ اس سائے سے محروم رہ گیا۔ اس نے کہا ساٹھ سال
تک کبھی بھی میں نے خلاف راہ کام نہیں کیا۔ مگر ایک بار بغیر تفکر
کے میں نے آسمان کی طرف نظر کی، ان لوگوں نے کہا اس راہ
میں اس سے بڑھ کر گناہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ سب کچھ اسی ایک
نظر غفلت کی وجہ سے ہے" [۱۲]

زندہ اور مردہ کی تعریف کرتے ہوئے تحفی ایک قاعدۂ کلیہ بیان کرتے ہیں کہ:

"بباید دانست کسی کہ مستغرق یا محجوب است زندہ است اگر چہ بمیرد
و آنکہ از یار محجوب غافل است مردہ است، اگر چہ زندہ نماید" [۱۳]

اسی ضمن میں ایک واقعہ طویل مگر دلچسپ بیان کرتے ہیں:

''عبداللہ مصری فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے ایک مردہ کو
غسل دینے کا ارادہ کیا، جب میں نے اس کا میزر
(پگڑی) کھولنا چاہا تو اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور
نہیں کھولنے دیا۔ میں نے کہا: کیا تم مرنے کے بعد بھی زندہ ہو؟
تبھی گھر کے گوشے سے میں نے آواز سنی، کیا تم نہیں جانتے؟ کہ
جس نے اللہ کو پہچان لیا وہ مرتا نہیں، میرے عزیز، زندہ دل ہو،
ہر زندہ کو زندہ نہیں کہتے اور نہ ہر مردہ کو مردہ کہتے ہیں، ان کے
نزدیک زندگی اور موت معاملات سے تعلق رکھتے ہیں''[۱۴]

ایک اور واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''کہ جنید رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار نماز میں پانچ تکبیریں کہہ دیں۔
لوگوں نے کہا مردے پر چار سے زیادہ تکبیریں نہیں کہی جاتیں۔
آپ نے پانچ کیوں کہیں، انھوں نے جواب دیا، چار تکبیر تو میں
نے اس مردے پر کہیں اور پانچویں ان لوگوں کی زندگی پر جو کہ
اس مردے سے بھی زیادہ مردہ ہیں۔ اے میرے عزیز، زندہ،
مردہ، اسے کہتے ہیں جو گناہ سے خوف نہ کرے، بہت سے ایسے
لوگ ہیں، جنھیں دوسرے کا گناہ سن کر بخار اور بے قراری آجاتی
ہے اور اب تمہارے اپنے گناہ کی وجہ سے تمہارا باطن بھی گرم نہیں
ہوتا۔ بہت پرانی رسم ہے کہ موسم بہار کے آتے ہی لوگ لہو ولعب
میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اس خوف سے ہر سال موسم بہار کی
آمد پر معروف کرخی جو کہ عالم طریقت کے بہار تھے غمزدہ
ہو جاتے اور کہتے، موسم بہار آ گیا، پھر لوگ لہو ولعب میں مشغول
ہو جائیں گے''[۱۵]

بزرگان دین دولت عرفان سے مالا مال ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک دنیاوی مال و زر اور دولت
کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے واقعہ بیان کرتے ہیں:

''وقتی یکی از پادشاہان دیدن درویش رفت و دینار چند بہ درو

درویش آں قبول نکرد، بادشاہ گفت: اگر دنیا نمی ستانی از من حاجتی بخواہ
درویش گفت حاجت من آنست کہ بارہ دیگر تو مرا زحمت ندہی''

گنجی فقیر گنج بہ کنج است   اہل عطیت ہمیشہ در رنج اند
پای درویش کہ ذری زدہ   فقراء را پای بر سر گنج اند

ایک بادشاہ، ایک فقیر کی زیارت کے لیے گیا اور دینار لے گیا،
فقیر نے اسے قبول نہیں کیا، بادشاہ نے کہا: اگر تو دنیا کو نہیں
خریدتا، تو تو مجھ سے اپنی حاجت طلب کر۔ فقیر نے کہا کہ میری
حاجت یہ ہے کہ دوبارہ تو مجھے زحمت نہ دے۔

قطعہ   فقیری کا خزانہ ہی خزانہ ہے۔ صاحب مال و دولت ہمیشہ رنج میں ہیں
فقیر کا پیر مال و دولت کی طرف نہیں جاتا، فقراء کا پیر خزانوں پر ہوتا ہے

بطور خلاصہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا ضیاء الدین نخشبی کی ذات والا صفات اور ان کی یہ مشہور تصنیف ''سلک السلوک'' اپنی جامعیت، معنویت، فصاحت و بلاغت کی بنیاد پر جس میں گوہر ہائے آبدار کو پرو کر تصوف و عرفان کے اسرار و رموز کا دلکش گلدستہ پیش کیا گیا ہے۔ قارئین سے خراج تحسین لیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس کی شیریں بیانی، شگفتگی عبارت، لطافت زبان، وضاحت وصراحت، دلائل و براہین، تحلیل و تفصیل، واقعات و حکایات، قطعات و منظومات بہت اعلیٰ درجے کے ہیں جو بے نظیر و بے مثال ہیں۔

حوالے:

۱۔ اخبار الاخیار، ص ۱۰۲
۲۔ خزینۃ الاصفیا، ص ۴۹۱
۳۔ سلک السلوک، ص ۱۹۱
۴۔ سلک السلوک، ص ۱۹۲
۵۔ سلک السلوک، ص ۱۲۰
۶۔ سلک السلوک، ص ۱۲۹
۷۔ سلک السلوک، ص ۱۲۹
۸۔ سلک السلوک، ص ۵۲
۹۔ سلک السلوک، ص ۱۰۱

۱۰- سلک السلوک، ص ۲۰۳
۱۱- سلک السلوک، ص ۱۳۲
۱۲- سلک السلوک، ص ۱۰۰
۱۳- سلک السلوک، ص ۷۰
۱۴- سلک السلوک، ص ۷۴
۱۵- سلک السلوک، ص ۷۴

☆☆☆

Fikr-O-Nazar

University Literary Journal
Quarterly

Year of establishment: 1960

July 2011

Farsi Adab Number

Editor
Prof. Azarmi Dukht Safavi

1-Shibli Road
Aligarh Muslim University
Aligarh

Price per issue: Rs. 20/-

Annual Subscription : Rs. 60/-

For A.M.U Students :

Rs. 35/- Annual

Overseas : 15 $ Annual

Price of this issue: Rs.

Ph.: 2700937 Ext. 1542/1229
Email: fikronazaramu@yahoo.in
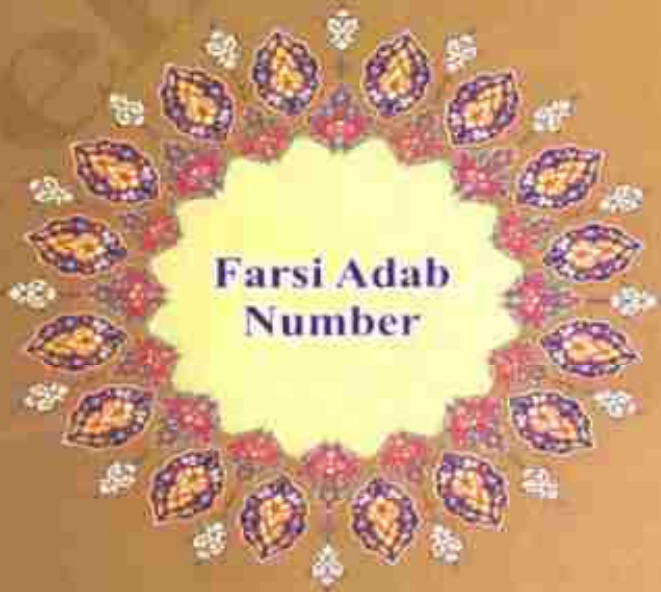
FIKR-O-NAZAR

Aligarh Muslim University, Aligarh

Fikr-O-Nazar

University Literary Journal
Quarterly

Year of establishment: 1960

July 2011 Farsi Adab Number

Editor
Prof. Azarmi Dukht Safavi

1-Shibli Road
Aligarh Muslim University
Aligarh